آنکس کہ عاشقش شد شد مخزن معارف
واں بیخبر ز عالم کیں عالمے ندیدہ
مخزن معارف
مشتمل بر
مؤلفہ
پیر معین الدین
ایم۔ایس سی
خلاصہ تفسیر کبیر
سورۃ
مریم تا عنکبوت
جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مخزنِ معارف

یعنی

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ

کی تصنیف

تفسیر کبیر کا خلاصہ

(جلد چہارم)

سورۂ مریم تا عنکبوت

از پیر معین الدین ایم۔ ایس سی

فہرست سُوَر

جلد چہارم - سورۃ مریم تا عنکبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

اللہ تعالےٰ کا احسان ہے کہ باوجود میری انتہا درجہ کی کم علمی کے اس نے مجھے خلاصہ تفسیر کبیر کی تالیف اور اشاعت کی توفیق دی ہے۔

خلاصہ کا طریق کوئی نیا نہیں خود قرآن کریم نے یہ طریق اختیار فرمایا ہے اور ایسا کر کے اس کی اہمیت کو واضح فرما دیا ہے۔ چنانچہ اول خود قرآن کریم پہلی کتب الہامیہ میں بیان شدہ تمام صداقتوں کا خلاصہ ہے۔ دوسرے سورۃ اخلاص، فاتحہ اور سورۃ اخلاص سے سورۃ الناس تک کی تین سورتیں قرآنی مضامین کا خلاصہ ہیں۔

اس خلاصہ میں ایک حد تک حضرت مصنف تفسیر کبیر کے الفاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر جہاں اختصار کے مدنظر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا وہاں حضور کے بیان کردہ مضمون کو خاکسار نے اپنے الفاظ میں ادا کر دیا ہے ایسا کرنے میں پوری احتیاط کی گئی ہے لیکن پھر بھی انسان سے غلطی کا احتمال ہوتا ہے اسلئے اگر کوئی صاحب کہیں کوئی غلطی سمجھیں تو تفسیر کبیر کے مطابق اس کی اصلاح کر لیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اصل بہرحال تفسیر کبیر ہی ہے اگر کہیں ادائیگی مفہوم میں غلطی نظر آئے تو دوست مجھے مطلع کر کے ممنون فرمائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ بعض دفعہ غلطی نکالنے والے بھی غلطی پہ ہو سکتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ ہر ایک کے کہنے کے مطابق اگلے ایڈیشن میں تبدیلی ہو سکے۔

اس خلاصہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہو سکتے ہیں :-

(۱) جنہوں نے تفسیر کبیر پڑھی ہوئی ہے لیکن اسے بار بار نہیں پڑھ سکتے وہ اس کے خلاصہ سے تھوڑے وقت میں اپنے علم کو تازہ کر سکیں گے۔

(۲) جن کے لئے پھیلے ہوئے مضمون کو سمجھنا مشکل ہے وہ اس خلاصہ سے بآسانی تفسیر کبیر میں بیان شدہ مضامین کو سمجھ سکیں گے۔

(۳) جن کے لئے تفسیر کبیر کا خریدنا مشکل ہے وہ اس کا خلاصہ پڑھ کر کم از کم ایک حد تک اپنی تشنگی دور کر سکیں گے اور کافی حد تک علوم قرآنیہ سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

(۴) سفروں میں اس کا ساتھ رکھنا آسان ہوگا۔

(۵) درس قرآن دینے کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس میں قرآنی متن بھی ہے، ترجمہ بھی ہے اور تفسیری نوٹ بھی ہیں

اگر تفسیر کبیر میں بیان شدہ مضامین میں سے چند ایک بیان کر دیئے جاتے تو یہ کتاب بہت مختصر ہو سکتی تھی مگر اس خلاصہ کو ترتیب دینے میں یہ بات مدنظر رکھی گئی ہے کہ تفسیر کبیر میں ہر آیت کے نیچے جتنے مضامین بیان ہوئے ہیں کم و بیش وہ سب کے سب اس میں آجائیں۔ اس لئے زیادہ اختصار مشکل تھا۔

جن دنوں میں ہماری شادی کے لئے استخارے ہو رہے تھے ان دنوں میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنی اس بیٹی کے متعلق جو بعد میں میرے عقد میں آئیں یہ رؤیا دیکھی تھی کہ انہوں نے ایک لونگ پہنا ہوا ہے جو ستارے کی شکل کا ہے اور اس کے چھ کونوں پر جو نگ لگے ہوئے ہیں وہ عام نگوں سے بالکل مختلف روشن اور چمکدار ہیں (یہ رؤیا الفضل میں طبع ہو چکی ہے) اس رویاء کی وجہ سے مجھے ہمیشہ خیال رہا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے خدمت اسلام کی توفیق دے گا مگر عجیب بات ہے کہ میں یہی سمجھتا رہا کہ حضور نے آٹھ نگوں کا لونگ دیکھا تھا۔ مگر مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو رویا الفضل سے نقل کر کے بھیجی تو معلوم ہوا کہ حضور نے چھ نگ کا لونگ دیکھا تھا۔ چنانچہ خدا کے فضل سے پہلی دفعہ قرآن کریم کے قریباً چھ پاروں کی تفسیر کا خلاصہ شائع کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر یہ اس رؤیا کا پہلا اور یوں کہنا چاہیئے کہ ادنیٰ ظہور تھا۔ پورا ظہور انشاء اللہ اس وقت ہوگا جب سارا قرآن کریم ایسے نوٹوں کے ساتھ پانچ پانچ پاروں کی چھ جلدوں میں مکمل کر کے اسے چھ زبانوں میں شائع کرنے کی توفیق مل جائے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری کوئی ظاہر یا پوشیدہ معصیت آڑے نہ آجائے اور یہ کام جو خالصۃً للہ کیا جا رہا ہے پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے متن پڑھنے کے بعد پہلے ترجمہ پڑھ کر پھر نوٹ پڑھے جائیں تو ان کا مضمون سمجھنا زیادہ آسان ہو جائیگا کیونکہ جو نکتہ ترجمہ میں بیان ہو گیا ہے وہ نوٹوں میں دہرایا نہیں گیا حوالہ دیتے ہوئے سورۃ کا نام لکھکر سامنے اس کا نمبر دیا گیا ہے اور نیچے آیت کا نمبر مثلاً یونس ۱۰/۵ کا یہ مطلب ہے کہ سورۃ یونس جو قرآن کریم کی دسویں سورۃ ہے کی پانچویں آیت۔

کتاب کے شروع میں جو فہرست مضامین لگائی گئی ہے احباب اس کا بغور مطالعہ فرمادیں تو انشاء اللہ یہ ان کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی

قرآن کریم مجھے میری امی اور میرے والد میر اکبر علی صاحب نے بہت ہی شوق سے پڑھایا تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کے فضل سے اس کی خدمت کا شوق ہے اس لئے میں احباب سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کی بلندی درجات کیلئے دعا فرمادیں۔

پچھلے جلسہ پر سورۃ یونس سے کہف تک اور النباء سے الناس تک دو الگ الگ جلدیں جو قریباً چھ سپاروں پر مشتمل ہیں شائع کی گئی تھیں اب سورۃ مریم سے عنکبوت کی جلد شائع کی جا رہی ہے سورۃ یونس سے کہف تک بھی قریباً پانچ پارے ہیں اور سورۃ مریم سے عنکبوت تک بھی قریباً پانچ پارے۔ چونکہ یہ سورتیں ایک دوسرے کے تسلسل میں ہیں کچھ جلدیں اکٹھی بھی کروادی گئی ہیں۔ ان تین جلدوں میں ساری مطبوعہ تفسیر کبیر (جو قریباً چار ہزار ستاسو صفحات پر مشتمل نو جلدوں میں ہے) کا خلاصہ آگیا ہے صرف ایک جلد اس میں نہیں آئی جس میں پہلے پارے کے نوٹ ہیں اور ابھی نامکمل ہے۔

آخر میں یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان جلدوں کی تیاری میں عزیزم محمد شفیق صاحب قیصر متعلم جامعہ احمدیہ کا بھی ہاتھ ہے میری لکھی ہوئی کاپیاں نقل کرنے اور پروف پڑھنے کا کام انہوں نے بڑی محنت سے کیا ہے خدا تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دین و دنیا میں برکت کے سامان کرے۔ آمین

خاکسار۔ پیر معین الدین ایم ایس سی

فہرست مضامین

خدا کا عہد اسحاق اور اسماعیل دونوں سے تھا ۳۵، ابراہیم کیلئے بہت بڑا ابتلاء ۳۶/۴۴، ابراہیم کے غصہ کی وجہ دلیل کا نہ ہونا ۴۷/۴۴، ابراہیمی قربانی کا مقصد ۱۱۱، ابراہیم اور ہاجرہ کی دعا کا بدلہ ۱۱۳/۲۰-۲۸، ابراہیم کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم ملا اس سے مراد ۱۱۶/۳۵، ابراہیم نے اپنے اب کیلئے دعائے مغفرت تبلائی ۲۵۰/۸۶، اب سے مراد آپ کے چچا تھے ۲۵۰/۸۶، آپ نے بتوں کی بیچارگی کس طرح ظاہر کی ۲۴۵/۵۰-۷۲، آپ کے زمانہ میں شرک کا فلسفیانہ مضمون بن جانا ۳۴۲/۱۸

لوطؑ:- لوط کی اونٹنی کی پیدائش نہیں اس کی آزادی نشان تھی ۲۵۸/۱۵۸-۱۵۵، قرآن لوط کو بلند اخلاق تبلاتا ہے اور بائیبل بدچلن ۲۶۰/۱۶۹، لوط کی بیوی کے متعلق بائیبل کے متضاد بیان ۲۶۰/۱۷۲-۱۷۱،

داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح کرنا، مراد ۹۵، قصۂ داؤد میں طیر سے مراد انسان ۹۵-۹۶

سلیمانؑ:- یہ خیال کہ سلیمان کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی صحیح نہیں ۲۷۸/۱۷، آپ پر ایمان لانے والے جن تو رسول اللہ پر ایمان لانیوالے جنوں کی طرح انسان ہی تھے ۲۷۷/۱۸، واقعہ سلیمان میں بھی نملہ کا ذکر ہے وہ ایک قوم تھی ۲۸۰/۲۰-۱۹، سلیمان کے لشکر میں سچ مچ کے پرندے نہیں تھے ۲۸۱/۲۲-۲۱، ۲۸۳/۲۹-۲۸، ۲۸۴/۳۵-۳۳، ۲۸۵/۳۶-۳۴، سبا پر اس کے عقیدہ شرک کی غلطی واضح کرنے کے لئے سلیمان کی تدبیر ۲۸۵/۴۵۔

ایوبؑ:- کے متعلق بعض معلومات ۹۷/۸۵-۸۴، ہر شخص چند ایوب ایک ہی وجود تھے ۹۸/۸۵،

موسیٰؑ:- موسیٰ کو بھی زکوٰۃ لینے کا حکم تھا ۵۸/۱۹-۱۸، ید بیضا کشفی نظارہ تھا اور بیماری کا نتیجہ نہیں تھا ۵۹/۲۳۔ موسیٰ کے نو نشان ۶۹/۲۳، زمانہ موسیٰ کے ساحروں کو ایمان نصیب ہونے کی وجہ ۶۵/۴۶، ساحروں کی سونٹیاں کیونکر حرکت کرتی تھیں ۶۵/۴۷، معجزہ فرق البحر کی حقیقت ۶۷/۸۰-۷۰، موسیٰ کے جانے کے وعدہ پر قوم سے پہلے پہنچنے کی وجہ ۶۸/۸۶-۸۳، موسیٰ کے وقت مصر میں گائے بازی کا رواج تھا ۷۰/۹۵، موسیٰ اور آنحضرتؐ کا قوم سے محبت میں فرق ۲۳۲/۱۴-۱۳، موسیٰ کی برتری کی نسبت آنحضرت کی دلیل ۲۳۲/۱۴-۱۳، حضرت موسیٰ نے مددگار مانگا مگر آنحضرت اکیلے ہی بوجھ اٹھانے کو تیار ہو گئے ۲۳۳/۱۴، حضرت موسیٰ کا خوف اس لئے تھا کہ ادائیگی فرائض سے پہلے قتل نہ ہو جائیں ۲۳۳/۱۶-۱۵، موسیٰ کا بڑا کام بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانا ۲۳۳/۱۸-۱۷، بائیبل کی رو سے خدا نے موسیٰ کو دھوکا کی تعلیم دی قرآنی بیان اس کے برعکس ہے ۲۳۴/۱۸-۱۷، موسیٰ مختص القوم نبی تھے مگر آنحضرتؐ ساری دنیا کے لئے نبی تھے ۲۳۴/۱۸-۱۷، موسیٰ نے قبطی کو دانستہ قتل نہیں کیا ۲۳۴/۲۲، موسیٰ کو پالنے والا فرعون اور تھا اور دعوے کے وقت والا اور ۲۳۵/۳۴، معجزہ ید بیضا میں اشارہ ۲۳۸، بائیبل کا ید بیضاء کو کوڑھ کرنا اور پھر اس میں سے ہی اس کا ثبوت ۲۳۹، عصا کا معجزہ اوروں نے نہیں موسیٰ نے دکھایا تھا بائیبل کے بیان کی غلطی ۲۳۹، عصائے موسیٰ اور عصائے محمدؐ میں فرق ۲۳۶، موسیٰ کے ہاتھ اور آنحضرتؐ کے ہاتھ میں فرق ۲۳۹، آنحضرتؐ اور موسیٰ کی تربیت یافتہ قوموں میں فرق ۲۳۹، فرعون نے موسیٰ کے نشان کو جادو کیوں سمجھا ۳۴۰/۲۶-۲۵، موسیٰ کو دریا میں ڈالنے کے واقعہ سے متعلق قرآن و بائیبل کے اختلافات ۳۱۳/۲۸-۲۴، ۳۱۴/۳۸، موسیٰ سے درخت نہیں خدا بولا تھا ۳۱۵/۳۰-۲۹، موسیٰ کے واقعات کے متعلق قرآن و بائیبل کے بعض اختلافات ۳۱۵-۳۱۶/۳۰-۳۶، معجزہ عصا اور ید بیضا کشفی نظارہ تھے ۲۳۶/۳۴-۳۱، آپ کی بعثت مدین سے واپسی پر ہوئی ۳۰۹/۱۶۔ موسیٰ کے واقعات آنحضرتؐ کیلئے بطور پیشگوئی بیان ہوئے ہیں ۳۱۸/۴۳-۴۱، موسیٰ کی ہجرت کے ذکر میں آنحضرتؐ کی ہجرت کی پیشگوئی ۳۱۹/۴۶

ہارونؑ :- بائیبل کا بیان کہ ہارون نے شرک کیا تھا غلط ہے ۷۶/۹۲-۹۰ ، ہارون نے کیوں قوم سے سختی نہ کی ۷۱/۹۵ - آپ کے صاحبِ کتاب نہ ہونے کے ثبوت ۲۰۷/۳۰-۴۰ ۞

زکریاؑ کی دعا کے متعلق قرآن و بائیبل کا اختلاف ص۱۶ ، زکریا کی خاموشی بطور نشان تھی نہ کہ بطور سزا ص۱۶ ، زکریا نے قبولیت دعا کے لئے ظاہری نشان کیوں مانگا ص۱۷

یحییٰؑ قوم کو مسیح کے لئے تیار کرنے آئے تھے ص۱۵ ، مسیح کے ارہاص ص۱۶ ، خدا تعالیٰ کے یحییٰ نام رکھنے میں اشارہ ص۱۵ ۞

مسیحؑ :- شارح نہیں تھے ۱۸/۱۴-۱۳ ، یحییٰ میں بھی مسیح والی خصوصیات تھیں ۱۸/۱۴-۱۳ ، ۱۹/۱۶ ، مسیح کی بن باپ پیدائش میں اشارہ ۱۱/۱۷ ، ۲۱/۲۲ ، بائیبل کا بیان کہ مسیح اپنی والدہ سے متنفر تھے غلط ہے ۲۰/۱۷ ، مسیح کی تاریخ پیدائش ، ۲۴/۲۸-۲۶ ، مسیح کی اسماعیل سے مشابہت ۲۲/۲۸-۲۶ ، مسیح کی جائے پیدائش ۲۴/۲۸ ، مسیح کی دعا اسلامی دعا سے بہت ادنیٰ ہے ص۲۱ ، مسیح نے شریعت کو منسوخ نہیں کیا ص۲۷ ، مسیح کی مسِ شیطان سے پاک ہونے میں کوئی خصوصیت نہیں ہے ۲۹/۲۴ مسیح اور یحییٰ ایک ہی جوہر کے ٹکڑے ص۳۰ مسیح کو بطور نبی کے زندگی اسلام کے ذریعہ ملی ص۳۰ ، مسیح کی زندگی کے متعلق اختلاف ۱۳۱/۳۵ ، مسیح کی اصل پہچان ابن مریم ہونا ۱۳۱/۳۵ ، اگر مسیح خدا ہیں تو ادریس بدرجہ اولیٰ خدا ہیں ۱۴۱/۵۸ ، مسیح کے آسمان پر نہ جانے کی دلیل ۶۳/۵۶ ، مسیح روحانیت کا آخری نقطہ نہیں تھا ۱۰۵ مسیح موجودہ مسیحیوں کی شفاعت نہیں کرینگے ۵۱/۵۹ مسیح کو کشمیر میں پناہ ملنا ۱۴۴/۵۱ ، کشمیر میں یوز آسف کی قبر ۱۴۵/۵۱ ،

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :- آنحضرتؐ کی صداقت کے پانچ دلائل ص۱۰۵ ، آپ کو سفاعت کا انعام دیا گیا ۵۱/۸ ، آپ تمام اعلیٰ مردانہ صفات کے حامل تھے ۵۴/۲ ، آپ نے موسیٰ کی طرح کام میں مددگار نہیں مانگا ۵۴/۲ ، ۶۰/۳۳-۳۱ ، آپ کے مثیلِ موسیٰ ہونے کا ایک ثبوت ۵۸/۱۷ ، واقعہ پرورش میں آپ کی موسیٰ سے مشابہت ۶۱/۴۲-۳۷ ، آپ میں اور موسیٰ میں فرق ۶۱/۴۴-۴۳ اور ۶۲/۴۹-۴۵ آپ کی طرح کسی نے بھی شرک کی بیخکنی نہیں کی ۸۴/۲۹ ، آپ کی زندگی کا ہر لمحہ اشاعت توحید میں گذرا ۸۵/۲۶ ، آپ کے بعد روحانی چاند کی پیشگوئی ۸۷/۳۵-۳۴ ، ابراہیمؑ اور آنحضرتؐ کے بتخانے توڑنے میں فرق ۹۲/۷۰-۶۹ ، ابراہیمؑ اور لوطؑ سے آنحضرتؐ اور عمرؓ کی مماثلت ۹۳/۷۲ ، کفار کا آپ کو شاعر کہنا کن معنوں میں تھا ۱۰۱/۶ ، نسلِ اسماعیلؑ پر آپ کی قوتِ قدسیہ کا اثر ۱۱۲/۲۷ ، آنحضرتؐ کے ساتھ تائیدِ الٰہی دیکھکر ایمانوں میں تازگی کا پیدا ہونا ۱۱۳/۳۰-۲۸ آنحضرتؐ پر تائیدِ شرک کا بہتان اور اس کا رد ۱۳۱/۵۳ ، دنیا کو بالآخر آنحضرت کی تائید کی طرف آنا پڑے گا ۱۳۵/۶۷ ، آپ کے کاتب وحی کا ارتداد ص۱۳۵ ، آپ پر مجنون ہونے کا لغو اعتراض ۱۳۹/۲۴ ، دشمنوں کا آنحضرت کی تکذیب کرنا حیرت انگیز ہے ۱۴۹/۷۰-۶۹ ، آپ کے انکار کی وجہ — قربانیوں کا خوف ۱۴۹/۷۱ ، آنحضرتؐ کی جدوجہد ذاتی برتری کے لئے نہ ہونے کی دلیل — لالچ کا نہ ہونا ۱۵۰/۳ ، آنحضرتؐ کے احادیث لکھنے سے منع فرمانے کی وجہ ۱۶۰ ، اور انبیاء کو فرقان اور کتاب ملی آنحضرتؐ کو جو کتاب ملی وہی فرقان ہے ۱۹۳/۲ ، اس کا رد کہ آنحضرتؐ کسی سے سیکھ کر قرآن بناتے تھے ۱۹۶/۵-۴ ، آپ کے دو باغ ۱۹۸/۱۱ ، اوروں کے لگائے ہوئے باغ آنحضرتؐ کو مل گئے ۱۹۸/۱۱ ، آپ کو اعلیٰ درجہ کے روحانی شاگرد ملنے کی پیشگوئی ۱۹۹/۱۱ ، آپ کے غلبہ کے لئے ساعت کا لفظ ۱۹۹/۱۲ ، آپ کے مستجاب اللہ ہونے کا ثبوت ۲۰۹/۴۶ ، ۲۱۱/۴۵-۴۴ ، آپ کی بنی نوع انسان سے شدید محبت ۲۲۹/۴ ، آپ کا عشق ۲۳۰-۲۲۹/۴

آپ کی موسٰیؑ پر فضیلت ۲۳۳/۱۵-۱۶، آپؐ کے توکل کا موسٰیؑ کے
توکل سے کہیں بڑھ کر ہونا ۲۴۳، ۲۴۴، آپؐ ساری
دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے ۲۶۳/۱۹۳، آپؐ اعلیٰ خاندان
سے تھے ۲۶۸/۲۲۰، آپؐ کے شاعر نہ ہونے کی دلیل ۲۶۹/۲۲۵،
آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر روح الامین
کا کلام لانا اور خدا تعالےٰ کا بالمشافہ کلام کرنا — اس میں
اختلاف نہیں ۲۷۴/ہے، آپؐ کے عہد کی بطور نشان نازل
ہونیوالی بارش ۲۹۰/۵۵-۵۹، آپ کو جبر کی اجازت نہ ملنے
کی وجہ ۳۰۳/۲۳، حضرت ابوبکرؓ بھی آنحضرتؐ کے اہل میں سے
تھے ۲۹۰/۵۵-۵۹، مسیحؑ پر ہی نہیں آنحضرتؐ پر بھی روح القدس
کلام لاتا تھا بلکہ آپؐ پر روح الامین نازل ہوا ۲۹۳/۱۹۴

الوہیت مسیح کا ردّ

مسیحؑ کا عالم الغیب نہ ہونا ۱/۳، ۱۵۳/۹۳، علم کامل اور
صداقت کامل کا صرف خدا کو حاصل ہونا (بائیبل) ۲/۳،
خدا تعالےٰ کو برابر کے مدبر کی ضرورت نہیں ۲/۹، مسیحؑ
کو فرشتہ تقویت دیتا تھا ص۵، مسیحؑ کا انسان ہونا ص۲۶
اس کی تعلیم اپنی نہیں خدا داد تھی ص۲۶، بائیبل کی
رو سے بھی مسیحؑ صرف نبی تھے ص۲۷، خدا کو کوئی سلامتی
نہیں دیتا مگر مسیحؑ کو دی گئی ۲۹/۳۴، مسیحؑ برکت مانگتا تھا
مگر خدا برکت دیتا ہے ص۲۷، مسیح نے دعا مانگی اور دُعا
انسان ہی مانگتا ہے ص۲۷، پرانے اور نئے عہد نامہ کی رُو
سے خدا کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں ص۳۶، خدا کو بطور مددگار
بھی بیٹے کی ضرورت نہیں ص۳۶، ابن اللہ محاورہ ہے جو سب
مومنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۴۳/۶۴، فطرت انسانی عقیدہ
ابنیت کے خلاف ہے ۱/ب، یہ عقیدہ خدا تعالےٰ کی صفت
رحمانیت کے خلاف ہے ۵۲/۹۳، ہر شے کا مالک خدا تعالیٰ
ہے اس لئے کوئی اور معبود نہیں ہو سکتا ۵۶/۹۰،

آیات

آیات بیّنات سے مراد ۱۸۴/۴۷، امت محمدیہ میں آیات
بیّنات کا نمونہ ہمیشہ موجود رہا ہے ۱۸۴/۴۷

بیت اللہ

کعبہ کو خدا کا رتبہ نہیں دیا گیا ۱۱۲/۲۸-۳۰، بیت اللہ حضرت
ابراہیمؑ سے قبل موجود تھا۔ لوگوں کے فائدہ کے لئے
پہلا گھر، سب لوگوں کو جمع کرنے کا ذریعہ ۱۱۳/۲۸-۳۰
زمانہ قدیم سے لوگوں کا مرکز ۱۱۴/۲۸-۳۰، عزت شعائر اللہ
میں انسانوں ہی کا فائدہ ہے ۱۱۵/۳۳-۳۴،

پردہ

ایک عمر کے بعد احکام پردہ ساقط ہو جاتے ہیں ۱۹۰/۹۰،
چہرہ کا پردہ ہے ۱۹۰/۹۱،

پیشگوئیاں

غلبہ اسلام کے وقت غلاموں کی بہتات کی پیشگوئی
۱۸۹/۵۹-۶۰، فلسطین اور کشمیر پھر مسلمانوں کو مل جائیں گے
۱۹۸/۱۱، کفار کے باغ مسلمانوں کو ملنے کی پیشگوئی ۱۹۸/۱۱،
پیشگوئی کہ محمد رسول اللہ کی قوم کی اکثریت منکر نہیں
رہے گی ۲۵۳/۱۰۷، صالحؑ کے مخالف نو آئمۃ الکفر کی تباہی
کے ذکر میں آنحضرتؐ کے ۹ دشمنوں کی تباہی کی خبر ۲۸۹/۴۹-۵۴
استثناء ۱۸/۱۸ کی پیشگوئی اور آنحضرتؐ کے وجود میں اس
کا پورا ہونا ۳۲۰/۴۷، یسعیاہ نبی کی آنحضرتؐ کے متعلق
پیشگوئی ۳۳۴/۸۶ ؛

پیدائش

جسم کی طرح روح کی پیدائش بھی تدریجاً ہوتی ہے
۷/۶-۷، جسمانی پیدائش کے ہر درجہ کے مقابل پر روحانی
پیدائش کا درجہ ۱۳۴-۱۳۷/۱۳-۱۸، لمبے مجاہدات کے بعد ملنے
والا روحانی انعام — خلقاً آخر ۱۳۶/۱۷،

توبہ

توبہ کے لئے سات شرائط ۲۲۰/۷۱-۷۲، سچی توبہ کرنیوالوں سے خدا تعالےٰ کا سلوک ۳۳۹/۸

تورات

کا ہدایت اور رحمت ہونا ۳۱۸/۴۴، قرآن کی طرح تورات بھی کئی سالوں میں مکمل ہوئی ۳۲۱/۴۹ ؛

توحید

موحدوں کے مختلف مدارج ۱۰۹/۱۸، توحید کے ذریعہ مسلمانوں کا اتحاد ۱۱۳/۲۸-۳۰، خدا تعالےٰ بیٹے کے مقام پر بھی کسی کو کھڑا نہیں کرتا ۱۹۵/۳، وحدانیت الٰہی کا ایک ثبوت ۱۹۵/۴ معبودانِ باطلہ میں احتیاج الی الغیر ہوتی ہے ۱۹۶/۵-۶،

توکل

توکل کیا ہے۔ علمی و عملی توکل ۲۱۳-۲۱۴/۵۹،

جلوۂ طور

جلوۂ طور روحانی نظارہ تھا ۵۶/۱۰-۱۱، اس کے متعلق قرآن و بائیبل کا اختلاف ۵۷/۱۱، آگ نہیں خدا بولا تھا ۵۷/۱۴،

جنّت

مقامِ امن ہے ۱۱۱/۲۵، جنّت میں مشغولیت ہوگی ۲۹۸/۸۰ ایک دن ہر انسان جنت پالیگا ۳۰۱/۹۰-۹۱۔

جہنم

جہنم کی تشریح ۴۰/۶۹، متقی جہنم سے بچائے جائیں گے ۴۵/۷۲-۷۵ مومن و کافر دونوں دوزخ میں داخل ہونگے مگر ان کے لئے دوزخ کا مفہوم الگ الگ ہے ۴۶/۷۳، جہنم عارضی ہے ۹/۴۸، ۲۱۸/۶۷، جس پر حجت تمام نہیں ہوئی وہ دوزخ میں نہیں جائے گا ۲۵۴/۱۱۲-۱۱۴،

جہاد

سب سے بڑا جہاد، جہاد بالقرآن ہے ۲۱۰/۵۳، جہاد کی ذمہ داری افراد پر ڈالی گئی ہے ۲۱۰/۵۳، جہاد کی تین اقسام، دشمن اسلام سے، شیطان سے اور نفس سے ۲۱۰/۵۳، جہاد کیونکر حق ہوتا ہے ۲۱۰/۵۳، حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جہاد بالسیف کیوں بند قرار دیا۔ ۲۱۰/۵۳، آئندہ مسلمانوں کو جہاد بالسیف کی ضرورت پیش آسکتی ہے ۲۱۱/۵۳، ہر فعل جو بطور نیکی و تقویٰ کیا جائے جہاد ہے ۲۱۱/۵۳،

حج

حج کی اصل غرض ـــ انسان خدا تعالےٰ کا ہو جائے، حج سے مرکزیت کی روح پیدا ہوتی ہے، حج خوف و اخلاص سے ہو تب فائدہ دیتا ہے ۱۱۳/۲۸،

خدا تعالیٰ

خدائے رحمان کی طرف سے عذاب کی وجہ ۳۶/۴۶، خدا کی رحمت خاص اور رحمت عام ۳۸/۵۱، خدا تعالےٰ مرنے کے بعد انسان کو زندہ کر سکتا ہے ۴۲/۶۸، آزمائش الٰہی کے دو طریق۔ بالشر اور بالخیر ۸۷/۳۶، خدا کے حضور حصول عزت کا طریق، محرماتِ الٰہیہ کی عزت ۱۱۴/۳۱، کئی خدا ہوتے تو قانونِ نیچر بھی کئی ہوتے ۸۴/۲۳، ہدایت خدا تعالےٰ کی طرف سے ہی آتی ہے ۵۹/۲۰-۲۵، خدا تعالےٰ بیک وقت محی و ممیت ہوتا ہے ۱۲۵/۶۷، نظام عالم میں خدا تعالیٰ کے دخل کی وجہ ۱۲۳/۶۳-۶۴، احسن الخالقین سے یہ مطلب نہیں کہ ماسوا اللہ بھی کوئی خالق ہے ۱۳۶/۱۷، اعلیٰ روحانی تعلیم صرف خدا تعالےٰ کی طرف سے آنیکی وجہ ۱۵۲/۸۶، ہر شے ثابت کر رہی ہے کہ خدا تعالےٰ بے عیب ہے ۱۸۰/۴۲-۴۴، نزول فرقان خدا تعالےٰ کے تبارک ہونیکا ثبوت ہے ۱۹۳/۲، صفات الٰہیہ کا ظہور دو طرح پر ہوتا ہے ۲۱۲/۶، خدا کی صفت محی و ممیت کا اظہار ہر وقت ہوتا رہتا ہے ۲۴۷/۸۲، خدا تعالےٰ کے سمیع و بصیر ہونے کی دلیل، ... مومن کا واقعہ ۲۷۴/۸، خدا تعالیٰ ہر عیب سے

خلافت

دنیا

دعاء

رؤیاء

زنا

سامری

شاعر

شرک

رکوعاتها ۶	سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ	آیاتها ۹۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) میں اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے پڑھتا ہوں
كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ (۲) کٓھٰیٰعٓصٓ۔

نزول و ترتیب:- چونکہ اس سورۃ میں زیادہ تر ایسے امور بیان ہوئے ہیں جو مریم اور مریمی صفات والے وجودوں کی طرف توجہ منعطف کرتے ہیں اس لیے اس کا نام مریم رکھا گیا ہے۔

یہ سورۃ ابتدائی مکی ہے چنانچہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا وفد نجاشی شاہ حبشہ کو ملا تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے اسے اس سورۃ کی ابتدائی آیتیں سنائی تھیں

دعویٰ نبوت کے پہلے تین سالوں کے الہامات میں عیسائی مخاطب نہیں تھے اس کے بعد یکلخت عیسائیت کو تفصیلی طور پر مخاطب کیا گیا اس میں یہ پیشگوئی تھی کہ جلد حبشہ کی طرف ہجرت ہونے والی ہے جہاں مسلمانوں کو عیسائیوں سے بحثیں کرنی پڑیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ قرآن کے عالم الغیب خدا کی طرف سے نازل ہونے کا ثبوت ہے۔

اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت نبی کریم صلعم نے خود خیال کیا کہ مسلمانوں کو حبشہ بھیج دیں اس لیے یہاں عیسائیت کا ذکر کردیا تو جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس سورۃ میں عیسائیوں کی تعریف ہوتی نہ کہ تردید۔

سورۃ بنی اسرائیل میں بتایا گیا تھا کہ موسوی سلسلہ کے لیے دو تباہیاں اور دو ترقیاں مقدر ہیں اور سلسلہ محمدیہ چونکہ سلسلہ موسویہ کے مشابہ ہے اس لیے مسلمانوں سے بھی ایسا ہی معاملہ ہوگا۔

یہودیوں کی دوسری ترقی مسیحیوں کی تبلیغ کے ذریعہ ہوئی تھی ایسا ہی مسلمانوں کے لیے مقدر تھا اسی لیے سورۃ مریم کو سورۃ کہف کے بعد رکھا ہے اور اس میں مسیح علیہ السلام کے واقعات بیان کرکے توجہ دلائی ہے کہ ایسا ہی نشان مسلمانوں میں ظاہر ہوگا۔ غرض سورۃ بنی اسرائیل۔ سورۃ کہف اور سورۃ مریم ایک ہی مضمون کی کڑیاں ہیں سورۃ کہف میں عیسائیت کی انتہا بیان ہوئی تھی سورۃ مریم میں ابتدا بیان ہوئی ہے۔

۲ کٓھٰیٰعٓصٓ:- رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مقطعات کے دو معنی منسوب ہیں ایک دفعہ یہود نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ حروف اعداد کے حروف ہیں اور حضورؐ نے ان معنوں کو رد نہیں کیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں نوٹ ۸۹/۵۳) علاوہ ازیں حضورؐ نے ان سے صفات الٰہیہ مراد لی ہیں۔ یہاں ان صفات کا بیان ابطال عیسائیت کے لیے کیا گیا ہے۔

یہاں "ک" اور "ھا" کی صفات تابع اور "ع" اور "ص" کی متبوع کے طور پر ہیں اور معنے یہ ہیں کہ یا علیمُ یا صادقُ انت کافٍ وانت ھادٍ۔ یعنی خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ وہ کافی بھی ہے کیونکہ جو علیم ہوگا وہ کافی بھی ہوگا اسی طرح ہادی بھی وہی ہوسکتا ہے جو صادق ہو کیونکہ جھوٹ گمراہ کرنے والی چیز ہے۔

متی ۲۴/۳۶ سے ظاہر ہے کہ علم کامل فرشتوں کو بھی نہیں صرف خدا کو ہے۔ لکھا ہے۔ "لیکن اس دن اور اس گھڑی کو میرے باپ کے سوا آسمان کے فرشتوں تک کوئی نہیں جانتا"۔ پھر لکھا ہے اے خداوند سچائی کے خدا تو نے مجھے مخلصی

دی" (زبور ۳/۵) اس سے ظاہر ہے کہ مخلصی یعنی نجات کا واسطہ سچائی کے خدا یعنی صادق سے ہے۔ پھر لکھا ہے۔ "تیری صداقت ابدی صداقت ہے تیری شریعت سچائی ہے" (زبور ۱۱۹/۱۴۲) گویا بائیبل اور انجیل کی رو سے علم کامل اور صداقت کامل خدا کو حاصل ہے اس لیے ثابت ہوا کہ وہی "کافی" اور "ہادی" ہے۔

مگر کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سکیم کے ماتحت دنیا کو چلایا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجے مگر وہ سکیم ناکام ہو گئی اسلئے اسے لوگوں کی نجات کے لیے اپنے بیٹے کی قربانی دینی پڑی۔ اگر یہ درست ہے تو وہ نہ علیم ہوا نہ کافی چونکہ وہ علیم اور کافی ہے یہ درست نہیں اسی طرح اگر خدا صادق اور ہادی ہے تو اس کی بھیجی ہوئی شریعت لعنت نہیں اور نجات کے لیے کفارہ کی ضرورت نہیں۔ ورنہ اگر شریعت سچائی ہے اور پھر لعنت بھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سچائی لعنت ہے۔ پھر کسی چیز کا کامل علم خلق پر قدرت دے دیتا ہے اس لیے "علیم کامل" خلق اور تدبیر کی کامل قدرت رکھتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور بیٹے کے مدبر کی ضرورت نہیں اس لئے تثلیث کا مسئلہ بھی غلط ہوا۔ اس کا جواب کہ پھر خدا کو فرشتوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہے کہ وہ تابع حیثیت رکھتے ہیں مگر عیسائی بیٹے اور روح القدس کو برابر کی حیثیت دیتے ہیں۔ اور بیٹے کے مدبر کی علیم کو ضرورت نہیں اور بلا ضرورت کام لغو ہوتا ہے۔ چونکہ ثواب ایمان بالغیب کا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کو پس پردہ رکھنے کے لیے کچھ روحانی اسباب یعنی فطرت صحیحہ اور فرشتے وغیرہ بنائے ہیں اور کچھ جسمانی اسباب یعنی مادہ اور اس کو حرکت دینے والے قوانین بنائے ہیں

اگر کفارہ کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی تو تمام انبیاء جو کہتے رہے ہیں کہ ہم پر ایمان لاؤ تو نجات پا جاؤ گے، وہ اور ان کو بھیجنے والا جھوٹے ٹھہرتے ہیں۔

کفارہ کی بنیاد ان باتوں پر ہے کہ (۱) انسان کو ورثہ میں گناہ ملا (۲) چونکہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا اس لیے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ (۳) انسان پاک نہیں ہو سکتا تھا مگر خدا رحیم بھی ہے، اس لیے اس کے رحم کے ماتحت اس کے لئے کسی قربانی کی ضرورت تھی (۴) اس قربانی سے اب یقیناً پاک ہو گیا۔

قرآن کی رو سے :- (۱) انسان معبودیت کے لیے بنا ہے اور اس میں فطری طور پر نیکی ہے جبھی شیطان ہر ایک پر غلبہ نہیں پا سکتا۔ (۱۷/۶۲ اور ۱۷/۶۳) کے الفاظ الا قلیلا سے ثابت ہے جب انسان فطرتاً نیک ہے تو اسے بدی پر غلبہ پانے کی طاقت بھی حاصل ہے اس لیے کفارہ کی ضرورت نہیں۔ بنی اسرائیل ۱۷/۶۵ سے پتہ لگتا ہے کہ چونکہ انسانوں کو شیطان کے مقابلہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے شیطان کو کوشش سے روکا تو نہیں گیا مگر اسے یہ بتا دیا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو فطرتاً نیک بنایا ہے۔ تم صرف بیرونی ذرائع سے ہی اسے متاثر کر سکتے ہو۔ اس کے برعکس عیسائی یہ کہتے ہیں کہ گناہ انسان کے دل میں گھس گیا اور ورثہ کے طور پر نسل انسانی میں چل پڑا۔

(۳) آیت وکفیٰ بربک وکیلا سے ظاہر ہے کہ اس سورۃ میں خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا ذکر ہے اور یہ بتا کر کہ جو اپنے تئیں خدا کے سپرد کر دیتا ہے گناہ سے بچ جاتا ہے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان ورثہ کے گناہ

کی وجہ سے فطرتاً ناپاک نہیں۔ اگلی آیت میں اس کی دلیل دی کہ تم گناہ گناہ کرتے ہو۔ گناہ تو ایک اعتداء کا نام ہے جس طرح وہی ہوائیں جو جہازوں کو چلاتی ہیں جب حد سے گذر جائیں تو انہیں غرق کر دیتی ہیں اسی طرح ترقی دینے والی قوتوں میں افراط و تفریط کا پیدا ہونا ہی گناہ بنجاتا ہے مثلاً بخل مال کی حد سے زیادہ حفاظت اور زنا رجولیت کا بے موقعہ استعمال ہی ہے) اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جیسے ہوائیں زیادہ تر فائدہ دیتی ہیں اور طوفان کبھی کبھار ہی بنتی ہیں اور طوفان سے بھی انسان بسا اوقات بچ نکلتے ہیں اسی طرح انسانی قوتوں کا غلط استعمال کبھی کبھار ہی ہوتا ہے اور وہ بھی ہمیشہ تباہی کا موجب نہیں ہوتا۔

(۴) سورۃ التین سے ظاہر ہے کہ انسان کو بہتر سے بہتر قوتیں دے کر پیدا کیا گیا ہے اور اسفل سافلین میں سارے انسان نہیں جاتے صرف وہ جاتے ہیں جو اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت کے مصداق نہیں ہوتے۔

اس اعتراض کا جواب کہ چونکہ فطرت انسانی میں بدی ہے وہ نیک عمل کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے کہ سورہ شمس آیت ۹-۸ کے مطابق نفس انسانی بغیر افراط و تفریط کے اعلیٰ قوتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں کجی نہیں تسویہ اور نیکی ہے۔ اسے نیک و بد سے آگاہ کرنے والی کانشنس دی گئی ہے اور جو اس سے فائدہ اٹھائے اور تزکیہ نفس کرے کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس مضمون کو سورۃ اعلیٰ میں اور واضح کیا گیا ہے تفصیل دیکھیں اس سورۃ کے نیچے۔

اگر نجات کفارہ پر منحصر ہو تو انسان کو خود دیکھنے کے لیے آنکھوں کی اور خود نہ دیکھ سکے تو دوسروں سے پوچھنے کے لیے ہونٹوں کی اور پوچھ بھی نہ سکے تو نیک و بد میں تمیز کرنے والی فطرت کے دیئے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ (البلد ۹۰ / ۹-۱۱)

نجد کے معنے اونچے راستہ کے ہیں اور چڑھائی چڑھنے میں کوشش کرنی پڑتی ہے مگر جو چیز ورثہ میں ملے (مثلاً آنکھ ہے اس کے استعمال کے لیے کوشش نہیں کرنی پڑتی اس سے ثابت ہوا کہ نہ نیکی ورثہ میں ملی ہے نہ بدی اور دونوں self acquired ہیں) سجدہ آیت ۱۴ سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کو نیک بھی جبر سے نہیں بناتا۔ کو الذاریات آیت ۵۷ سے پتہ لگتا ہے کہ انسان کو پیدا اسی لیے کیا گیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا عبد بنے۔ اور عبد وہ ہے جو خدا سے راضی ہو اور خدا اس سے راضی ہو جیسے آیت يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ ...... جَنَّتِیْ (الفجر) سے ظاہر ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعض ایسے بھی ہیں جو اس غرض کو فی الواقعہ پا لیتے ہیں اور جنت میں داخل کیے جاتے ہیں

(۵) جو گناہ بالعزم ہو صرف وہ نجات سے محروم کرتا ہے ورنہ وہی فعل اگر بغیر عزم ہو تو گو بعض دفعہ ظاہری سزا مل جاتی ہے مگر وہ نجات سے محروم نہیں کرتا جیسے آدم کو خدا تعالیٰ نے اس لیے بخش دیا کہ ان میں گناہ کا عزم نہیں پایا فرمایا لم نجد لہ عزمًا۔ (۲۰ / ۱۱۶)

(۶) توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ (الزمر ۳۹ / ۵۴)

(۷) خدا کا خوف رکھنے والوں کے لیے دو جنتیں ہیں ایک اس دنیا میں ایک اگلی میں (۵۵ / ۴۷)۔ دنیوی

جنت سے دنیوی نعماء مراد نہیں کیونکہ ان سے اکثر برگزیدہ لوگ محروم رہے ہیں مراد یہ ہے کہ وہ یہاں بھی خدا تعالےٰ کا مقرب
ہوگا اور اگلے جہان میں بھی گویا انسان میں مقرب الٰہی بننے کی قابلیت ہے لیکن جسے ورثہ میں گناہ ملا ہو۔ اور اس کی
فطرت بد ہو اس میں یہ قابلیت نہیں ہو سکتی۔ اس لیئے ورثہ میں گناہ کا ملنا غلط خیال ہے۔

(۸) آیت ومن کان فی ھذہٖ اعمیٰ وھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ (بنی اسرائیل آیت ۷۳) میں اشارہ ہے
کہ دنیا میں بعض ایسے بھی ہیں جو روحانی اندھے نہیں ہیں۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے پھر
ماں باپ اسے یہودی یا نصاریٰ بنا دیتے ہیں۔ یعنی بدی باحول کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ اگر
انسان نیکی کرے تو دل پہ سفید نقطہ لگ جاتا ہے اور بدی کرے تو سیاہ پھر نیکیاں کرتا جائے تو آہستہ آہستہ سارا دل
سفید ہو جاتا ہے اور بدیاں کرتا جائے تو سارا سیاہ۔ قرآن میں آتا ہے کلا بل ران علیٰ قلوبھم (سورۃ
تطفیف ۸۳/۱۵) یعنی انسان پیدا ایک فطرت لیکر ہی ہوتا ہے مگر بعض ایسے ہیں کہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دل پر
زنگ لگ جاتا ہے۔ غرض قرآن کریم ان تمام باتوں کو رد کرتا ہے جن پر کفارہ کی بنیاد ہے۔

اب ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں:-

کفارہ کی بنیاد اول اس امر پہ ہے کہ چونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اس لیے تمام نسل انسانی کو ورثہ میں گناہ ملا مگر یہ غلط
ہے۔ کیونکہ (۱) پیدائش ۲/۹ میں لکھا ہے "خداوند نے باغ کے بیچ میں حیات کا درخت لگایا اور نیک و بد کی پہچان
کا درخت بھی لگایا۔ پھر ۲/۱۶، ۱۷ میں لکھا ہے "خداوند نے آدم کو حکم دیا کہ نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی
نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا"۔ پھر لکھا ہے "سانپ (یعنی) شیطان نے عورت سے کہا
کہ تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند
نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے" (پیدائش ۳/۵) ان حوالوں سے پتہ لگتا ہے کہ جو درخت لگایا گیا وہ زندگی
کا درخت تھا اور اس کے کھانے سے نیک و بد کی پہچان حاصل ہوتی تھی۔ اس لیے اس درخت کا پھل کھانا
کار گناہ تھا ہی نہیں۔ مگر خدا نے یہ کہا کہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔ گویا خدا نے یا دوسرے
لفظوں میں یسوع نے جھوٹ بولا یعنی گناہ کیا۔ اس لیے وہ نجات دہندہ نہیں ہو سکتا۔

پیدائش ۱/۲۶ میں لکھا ہے "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا"۔ خدا کی ظاہری شکل تو ہے نہیں مراد یہ ہے
کہ انسان کو صفات الٰہی کا مظہر بننے کیلئے پیدا کیا۔ اب خدا کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچانتا ہے (پیدائش
۳/۲۲) اس لیے جب شیطان نے آدم کو کہا۔ کہ اس درخت کا پھل کھانے سے تم میں نیک و بد کی پہچان کی قابلیت
ہو جائے گی۔ تو گویا یہ کہا کہ تم خدا کی صورت پہ ہو جاؤ گے۔ اور مقصد زندگی پالوگے۔ اس پہ آدم کو اجتہادی
غلطی لگ گئی۔ اور اس نے سمجھا کہ فی الواقعہ اس درخت کا پھل کھانے پر میں مقصد زندگی پالوں گا۔ اجتہادی غلطی
گناہ نہیں اس لیے اس درخت کا پھل کھانا گناہ ہوتا پھر بھی آدم نے گناہ نہیں کیا۔ جب آدم ہی گناہ گار
نہ ہوا تو ورثہ کے گناہ کا سوال ہی نہ رہا۔

(ب) دوسرے کفارہ کی بنیاد اس پر ہے کہ چونکہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا ہے اس لیے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو ہم ثابت کر آئے ہیں کہ نہ آدمؑ نے گناہ کیا نہ ورثہ میں گناہ آیا۔ دوسرے اگر گناہ ورثہ میں آتا ہے تو آدم جس کا نہ باپ تھا نہ ماں کیسے گناہگار ہو گیا۔ اگر بغیر اس کے کہ ماں باپ نے گناہ کیا ہو انسان گناہگار ہو سکتا ہے تو بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی نیکی کی ہو وہ نیک بھی ہو سکتا ہے اس لیے ورثہ کا کوئی سوال نہ رہا۔

پھر بائیبل کی رُو سے آدم گناہ کر کے بخشا گیا اور اس کے بعد بھی مقدس رہا۔ اس لیے اس کی اولاد کو بھی بخشا جا سکتا ہے اس لیے بھی کفارہ کی ضرورت نہ رہی۔

پھر بائیبل سے پتہ لگتا ہے کہ آدم کا سارا واقعہ تمثیلی ہے۔ لکھا ہے (۱) تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں (پیدائش ۳/۷) اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ (پیدائش ۳/۸) تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور کہا کہ تو کہاں ہے (پیدائش ۳/۹) درخت کا پھل کھانے سے حوّا و آدم کی آنکھیں کھل جانا اور ان کا خدا کے حضور سے چھپنا حالانکہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے اور خدا کا آدم کو پکارنا کہ تو کہاں ہے حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے بتاتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے۔ پس جس عقیدہ کی بنیاد ہی تمثیل پر ہے وہ درست کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر رومیوں باب ۵/۱۴ میں لکھا ہے "آدم سے لے کر موسٰیؑ تک موت نے ان پر بھی بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا" گویا آدم کے بعد بھی بعض لوگ بے گناہ ہوئے اس سے ثابت ہے کہ گناہ ورثہ میں نہیں آیا —— اس کے جواب میں اگر یہ آیت پیش کی جائے کہ "شریعت کے دیئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا" (رومیوں ۵/۱۳) تو یاد رکھنا چاہیئے کہ گو کفر احکام شریعت کی خلاف ورزی ہی کا نام ہے لیکن اگر کسی موقعہ پر شریعت نہ ہو۔ تو بھی بُری چیز بہر حال بری ہے اور فطرت انسانی اسے بڑا ہی کہتی ہے۔ لیکن انجیل اگر فطرت انسانی کو لعنت کہتی تو مسئلہ کفارہ قائم بھی رہتا اس نے تو شریعت کو لعنت قرار دے دیا (گلتیوں ۳/۱۳) گویا وہ جو انسان کی فطرت بری چیز کو برا کہتی ہے۔ انجیل اس کے خلاف نہیں لیکن شریعت کے خلاف ہے کیونکہ لوگ اس کے احکام پر عمل نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں خدا نے شریعت بھیج کر غلطی کی تھی۔ جب لوگ عمل نہ کر سکے تو اس نے مسیح کے ذریعہ شریعت کو منسوخ کر دیا۔ حالانکہ منسوخ کرنے کا حکم یوشع کے ذریعہ بھی دیا جا سکتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ موسٰیؑ سے پہلے بھی تو شریعت نہیں تھی۔ اگر اس وقت بغیر کفارہ کے نجات ہو سکتی تھی۔ تو مسیح کے شریعت کو منسوخ کرنے کے بعد نجات بغیر کفارہ کے کیوں نہیں ہو سکتی۔ نیز اگر شریعت سے پہلے کوئی شخص مثلاً چوری کرتا تھا تو اسے سزا نہیں ملتی تھی۔ پھر اگر شریعت آنے کے بعد اسے اس جرم کی سزا ملنے لگی۔ کیونکہ اس کا نام گناہ رکھ دیا گیا تو خدا کا عدل کہاں رہا۔ اور اگر وہ عادل نہیں تو اس کے بے گناہوں کی سزا دینا کیوں کر ضروری ہوا۔ اور اگر کہو کہ وہ بغیر سزا کے چھوڑ سکتا ہے تو پھر

کفارہ کی کیا ضرورت ہے ۔ یہی نہیں بائیبل سے پتہ لگتا ہے کہ موسوی سلسلہ میں مسیحؑ سے پہلے بھی کئی لوگ نیک ہوئے ہیں لکھا ہے (۱) "حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا" (پیدائش ۵/۲۲-۲۴) (۲) پھر حنوک ہی کے متعلق لکھا ہے "آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے جو آسمان سے اُترا" (یوحنا ۳/۱۳) (۳) ملک صدق سالم کے متعلق پیدائش ۱۴/۱۸-۲۴ اور عبرانیوں ۷/۱-۳ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ راستباز اور صلح کا بادشاہ تھا اور ابراہیم کو برکت دینے کا حق رکھتا تھا۔ (۴) حضرت زکریا اور ان کی بیوی کے متعلق لکھا ہے "وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے"۔ (لوقا ۱/۶) (۵) یوحنا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا (لوقا ۱/۱۵) اور لکھا ہے "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں" (متی ۱۱/۱۱-۱۲) گویا یوحنا مسیح سے بھی بڑا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ سب لوگ مسیح پر ایمان لا چکے تھے اس لیے برگزیدہ تھے تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ ابراہیمؑ نے صرف پیشگوئی کی تھی کہ ان کی اولاد کو بابرکت کیا جاوے گا۔ اور ان کی اولاد میں سے اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، زکریاؑ اور اسمٰعیلؑ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نبی ہوئے پھر کیوں ان پر یہ پیشگوئی چسپاں نہ کی جاوے اور مسیحؑ پر کی جاوے جو بے باپ پیدا ہوا اور اس طرح ابراہیمؑ تک اس کا نسب نامہ نہیں پہنچتا۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ پیشگوئی مسیحؑ کے متعلق تھی اور وہی ابراہیمؑ کا موعود بیٹا تھا تو کفارہ کہاں رہا اس کی بنیاد تو اس پر ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے نہ کہ ابراہیمؑ کا۔ اگر مسیح خدا کا بیٹا ہے تو ابراہیم کی پیشگوئی اس پر نہیں لگ سکتی اور اگر ابراہیمؑ کا بیٹا ہے تو خدا کا بیٹا نہ ہوا اس لیے وہ کفارہ نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ کہو کہ مسیح نے دنیا کا نجات دہندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو یہ دعویٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے پھر ابراہیمی پیشگوئی کا مصداق آپؐ کو کیوں نہ سمجھا جائے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران ع۴) گویا محمد رسول اللہ صلعم کی پیروی سے صرف نجات ہی نہیں ملتی۔ بلکہ انسان خدا کا محبوب بھی بن جاتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ للرسول اذا دعاکم لما یحییکم (انفال ع۳) اس جگہ یہ دعویٰ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو زندہ کرتے ہیں اور انجیل تسلیم کرتی ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے اس لیے اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ لوگوں کو اس موت سے نجات دیتے ہیں جو گناہ سے پیدا ہوتی ہے۔

کفارہ کے متعلق یہ بھی سوال ہے کہ جب تین اقنوم تھے پھر مسیح کے ذمہ کفارہ کیوں لگایا گیا اگر یہ کہا جائے کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے مرنے سے دنیا فنا ہو جاتی تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مسیح کے مرنے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا اس لیے وہ ناقص ہوا اور ناقص خدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا باپ اور خدا روح القدس میں لوگوں کا اتنا اختیار نہیں تھا۔ جتنا خدا بیٹے میں تھا تو پھر یہ دونوں ناقص ہوئے مگر یہ بات انجیل کے خلاف ہے کیونکہ لکھا ہے خدا محبت ہے (کرنتھیوں ۲ ۱۳/۱۴)

کفارہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب گناہ معاف نہ ہو سکے مگر بائیبل گناہوں کی معافی کے تذکرہ سے اور ان قربانیوں کے تذکرہ سے جو مقبول ہوئیں بھری ہوئی ہے (پیدائش باب ۴/۳-۷ کے مندرجہ ذیل حوالے ملاحظہ ہوں۔ آدم کے بیٹے ہابل کے متعلق لکھا ہے "خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا" پھر قائن کے متعلق لکھا ہے کہ "اگر تو بھلا کرے تو کیا مقبول نہ ہوگا" یعنی اگر تو نیکی سے تو بن سکتا ہے اور مقرب الٰہی ہو سکتا ہے (جو نجات سے بڑا درجہ ہے)۔ پھر لکھا ہے "اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ باہر کے دروازوں پر دبکا بیٹھا ہے" اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ گناہ اس کے دل میں نہیں گیا بلکہ دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے (تاکہ جب انسان کمزوری دکھائے تو اس پر غالب آ جائے) پھر لکھا ہے "پر تو اس پر غالب آ" جب خدا حکم دیتا ہے کہ تو اس پر غالب آ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر غالب آ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا سے ثابت ہو گیا ہے کہ مسیح سے پہلے بھی دنیا میں نیکی موجود تھی۔ لیکن فرض کرو ایسا نہیں تھا۔ اور کفارہ کی ضرورت تھی پھر بھی یہ سوال ہے کہ (۱) کیا کفارہ کے لیے مسیح کو خدا کا بیٹا ماننا ضروری ہے اور (ب) کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا۔ یہ بات کہ کفارہ کے لیے مسیح کو خدا کا بیٹا ماننا ضروری ہے بالبداہت غلط ہے کیونکہ یوحنا ۸/۱۱ سے ظاہر ہے کہ مسیح نے ایک زانیہ کو بخش دیا۔ حالانکہ وہ اس کے کفارہ پر ایمان نہیں لائی تھی پھر متی ۹/۶ میں لکھا ہے "اس لیے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے (اس نے مفلوج سے کہا) اٹھ اور اپنی چارپائی اٹھا اور اپنے گھر چلا جا" گویا گناہ معاف کرنا ابن آدم کا کام ہے نہ کہ ابن اللہ کا

اب رہا یہ سوال کہ کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا بھی یا نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ متی ۲۶/۶۳ ۱۶/۱۶ اور یوحنا ۳/۱۸ وغیرہ سے ظاہر ہے کہ مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے مگر اس نے بہت جگہ اپنے آپ کو ابن آدم بھی کہا ہے لکھا ہے "ابن آدم اس لیے نہیں آیا کہ خدمت لے۔ بلکہ اس لیے آیا ہے کہ خدمت کرے" اور پھر لکھا ہے "جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا" (متی ۲۰/۲۸ و ۲۴/۳۸) نیز لکھا ہے "جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا ابن آدم آ جائے گا۔ (متی ۲۴/۴۴) "فانی خوراک کے لیے محنت نہ کرو بلکہ اس خوراک کے لیے کرو جو ہمیشہ کی زندگی تک باقی رہتی ہے۔ جسے ابن آدم تمہیں دے گا" (یوحنا ۶/۲۷) پھر لکھا ہے "اے یہوداہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے (لوقا ۲۲/۴۸) گویا مسیح جب آیا ابن آدم تھا جب دوبارہ آئے گا ابن آدم ہی ہوگا جب پکڑا گیا اس وقت بھی ابن آدم ہی تھا۔ جب مسیح نے اپنے آپ کو ابن آدم بھی کہا ہے اور ابن اللہ بھی تو کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی ایک بات کو مانیں اور دوسری کو رد کر دیں اور کیوں نہ سمجھیں کہ ایک بات استعارۃً بیان ہوئی ہے۔

متی ۵/۹ میں لکھا ہے "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے" یہاں مسیح کے علاوہ دوسروں کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خدا کے بیٹے کا نام دیا جانا ایک استعارہ ہے۔

یوحنا ۱۰/۲۵-۳۹ میں مسیح نے خود بتلا دیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا انہی معنوں میں کہا ہے جن میں بعض اور نیکوں کو "خدا" کہا گیا ہے۔ زبور ۸۲/۱ میں لکھا ہے "خدا کی جماعت میں خدا موجود ہے وہ الہوں کے

درمیان عدالت کرتا ہے (یعنی مومن لوگ خدا ہیں) ..... میں نے کہا تھا کہ تم اللہ ہو اور تم رب حق تعالےٰ کے فرزند ہو تو بھی تم آدمیوں کی طرح مروگے۔" (یعنی باوجود خدا کے فرزند کہلانے کے تم انسان ہی ہو اور انسانوں والی موت ہی مروگے) گویا کئی مومنوں کے متعلق خدا تک کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اس کا اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا استعارہ نہیں تھا تو کیا مسیح میں خدائی طاقتیں تھیں۔ لکھا ہے "تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر خدا۔" (مرقس ۱۰: ۱۷–۱۸) (بائیبل اردو مطبوعہ قبل از سنہ ۱۹۱۰ء) گویا نیکی خدا کی صفت ہے اور مسیح نیک نہیں تھا اس لیے وہ خدا نہیں ہوسکتا) پھر لکھا ہے "اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ" (متی ۲۴: ۳۲–۳۲) گویا خدا عالم الغیب ہے اور اس گھڑی کو جانتا ہے مگر مسیح عالم الغیب نہیں اس لیے وہ ناقص ہوا اور خدا نہ ہوا۔ پھر یوحنا ۵: ۴۴ سے پتہ لگتا ہے کہ خدا واحد ہے اسی طرح یوحنا ۱۷: ۳ میں لکھا ہے "اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔" یہاں مسیح کا ذکر خدائے واحد سے الگ کرکے لکھا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسیح اور ہے اور اسے بھیجنے والا خدائے واحد اور۔

پھر مسیح کے متعلق مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرح بے جسم تھا اس نے بنی نوع کے لیے پھانسی چڑھنے کے لیے جسم اختیار کیا تھا۔ کیونکہ گناہ کا نتیجہ موت ہے اور اس نے لوگوں کا گناہ اٹھا لیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو مسیح جب دوبارہ زندہ ہوا اسے بے جسم ہونا چاہیئے۔ لیکن لکھا ہے "اس وقت لوگ ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ بادلوں سے آتا دیکھیں گے۔" (مرقس ۱۳: ۲۳) گویا دوسری آمد کے وقت بھی اس کا جسم ہوگا جبھی لوگ اسے دیکھیں گے اور چونکہ دوبارہ اس پر موت نہیں آئی۔ اس لیے جسم عہد بھی قائم رہیگا جب اس کا جسم ہوا تو وہ خدا نہ ہوا۔

پھر عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ زید مقروض ہو اور بکر خوشی سے اس کا قرضہ اتارنے کے لیے تیار ہو تو زید کا یہ قرض اتر جاتا ہے۔ انسان چونکہ وراثت کے گناہ سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اور وہ گناہ گار ہو کر خدا تعالےٰ کے مقروض ہو گئے تھے۔ اور خدا بوجہ عادل ہونے کے ان کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے (بے گناہ) بیٹے سے لوگوں کا قرض وصول کر لیا۔" لیکن یہ تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کوئی خوشی سے کسی کا قرض دینا چاہے مسیح تو خوشی سے صلیب پر نہیں چڑھا تھا۔ لکھا ہے اور "وہ تھوڑا آگے بڑھا اور زمین پر گر کو دعا کرنے لگا کہ اگر ہوسکے تو یہ گھڑی مجھ پر سے ٹال دے" (مرقس ۱۴: ۳۲–۴۲) پھر لکھا ہے ..... "اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹالے۔ تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو۔" (یعنی مسیح نے کہا کہ میری مرضی تو اس میں نہیں لیکن تیری یہی مرضی ہے تو میں اسی پر راضی ہوجاتا ہوں۔ یعنی میں قرض دینا نہیں چاہتا تو چھیننا چاہتا ہے تو چھین لے) پھر لکھا ہے۔" اور آسمان سے ایک فرشتہ دکھائی دیا جو اسے تقویت دیتا تھا۔" (گویا خدا کو فرشتہ تقویت دیتا تھا) صلیب کے وقت مسیح نے کہا۔ "ایلی ایلی لما سبقتنی (متی ۲۷: ۴۶) یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو کس وجہ سے مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ کیا مسیح آدم کے گناہ سے پاک تھا

یہ تو ثابت امر ہے کہ ورثہ باپ اور ماں دونوں سے ملتا ہے۔ بائیبل سے ثابت ہے کہ حوّا آدم سے زیادہ گناہگار تھی بلکہ شیطان نے پہلے اسی کو ورغلایا "اور عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا ہے . . . تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا۔ اور اس نے کھایا تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں" جب خدا تعالےٰ نے آدم سے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کے متعلق پرسش کی تو اس نے جواب دیا "جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا" گرم اور ٹھنڈی چیزیں ملانے سے سموئی جاتی ہیں۔ مگر جو اولاد صرف زیادہ گناہ گار حوّا سے پیدا ہوا اس کا کم گناہ گار آدم اور زیادہ گناہ گار حوّا سے پیدا ہونے والی اولاد سے زیادہ گناہ گار ہونا ضروری ہے۔ اور مسیح نے صرف عورت کا حصّہ لیا۔ جو آدم سے زیادہ گناہ گار تھی۔ اس لیے وہ دوسروں سے زیادہ گناہ کے قریب ہوا۔ جس کی وجہ سے وہ کفارہ نہیں ہو سکتا۔

اگر کہا جائے کہ خدا کی طاقت میں تھا کہ گناہ گار ماں سے نیک بچے پیدا کر دے۔ تو پھر اس کی طاقت میں تو یہ بھی ہے کہ دوسرے لوگ بھی نیک پیدا ہو جائیں۔ بلکہ دوسرے زیادہ نیک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں باپ اور ماں دونوں کا حصّہ ہے۔

اگر کہا جائے کہ مسیح ابن اللہ تھا اسی لیے اس کا ماں سے گناہ ورثہ میں لینے کا سوال ہی نہیں تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابن اللہ ہونے کی وجہ سے اس نے ورثہ میں گناہ قبول نہیں کرنا تھا تو پھر اس کا باپ ہوتا تو وہ اس کا اثر بھی قبول نہ کرتا پھر کیا ضرورت تھی کہ اس کو بے باپ پیدا کر کے ساری دنیا میں ذلیل کیا جاتا۔ ہم بھی مسیح کو بے باپ مانتے ہیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسحاق کی بار بار کی وعدہ خلافی کی وجہ سے خدا تعالےٰ نے تنبیہ کے طور پر ان کا آخری نبی صرف عورت سے پیدا کیا تا کہ انہیں پتہ لگے سکے اگر انہوں نے وعدہ خلافی جاری رکھی تو آئندہ نبی بنی اسمٰعیل سے آئے گا۔ یعنی وہ نہ باپ کی طرف بنی اسرائیل میں سے ہوگا نہ ماں کی طرف سے۔

پھر یہ سوال ہے کہ کیا مسیح صلیب پانے سے دنیا کا کفّارہ ہو سکتا تھا؟ عیسائی عقیدہ کے مطابق دوزخ ابدی ہے پھر کروڑوں کروڑ آدمی کی ابدی جہنم کا کفارہ مسیحؑ کے صرف ڈیڑھ دن دوزخ میں رہنے سے کیسے ادا ہو سکتا ہے (مرقس باب ۱۶ کی رو سے مسیح صرف ۳۶ گھنٹے قبر میں رہا) یہ کہاں کا عدل ہے کہ اور لوگ دوزخ میں پڑتے تو ابدالآباد تک اس میں رہتے۔ لیکن جب اپنے بیٹے کی باری آئی تو خدا تعالےٰ نے صرف ۳۶ گھنٹہ اس کو دوزخ میں رکھ کر کہہ دیا کہ چل سب کا کفارہ ہو گیا۔

اگر کہو کہ بندے اور خدا میں بے انداز فرق ہے۔ اس لیے جو سزا بندوں کو ابدی جہنم سے ملنی تھی ابن اللہ کو ڈیڑھ دن میں مل گئی تو سوال یہ ہے کہ جب انسان اور خدا میں بے انداز فرق ہے تو پھر یہ اندازہ کس طرح لگ گیا کہ اسے سارا عذاب ملنے کے لیے ڈیڑھ دن کی ضرورت تھی۔

پھر یہ سوال ہے کہ دوزخ میں گیا کون تھا؟ ابن آدم یا ابن اللہ؟ اگر ابنِ آدم گیا تھا تو اس کا

جانا سمجھا جاتا ہے چونکہ اس کی روح جسم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس لیے روح دوزخ میں چلی گئی۔ لیکن ابن اللہ کے جسم کے اندر تو روح تھی ہی نہیں۔ خدا تھا اور خدا کو سردی گرمی نہیں لگتی۔ اس کے لیے نہ دوزخ عذاب نہ جنت راحت۔ پھر اس کے دوزخ میں جانے کے کیا معنی اگر کہو کہ یہ تمثیلی کلام ہے تو تمثیلی کلام سے نئے نئے مسئلے نہیں نکلا کرتے اس صورت میں بھی کفارہ باطل ثابت ہوتا ہے۔

اگر فرض کر لیا جاوے کہ مسیح ابن اللہ تھا اور کفارہ بھی کوئی ممکن چیز ہے پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح نے وہ قربانی پیش کر دی تھی جسے کفارہ کا موجب کہا جاتا ہے؟ یعنی کیا مسیح صلیب پر مر گیا تھا؟ اگر ثابت ہو جائے کہ بعد میں مسیح طبعی موت مر گیا تھا۔ تو اس سے مسلمانوں میں الحاد ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف مسیح کا صلیبی موت سے بچنا ثابت کر کے اسے لعنت سے بچایا ہے اور دوسری طرف عیسائیت کو مار دیا ہے اور اس کی طبعی موت ثابت کر کے اسلام کو الحاد سے بچا لیا ہے۔ انٹر یونیورسٹی فیلوشپ آف لندن کے سیکرٹری جنرل مسٹر Crichton-dom نے ۱۱ مارچ ۱۹۵۶ء کو لندن مسجد میں تقریر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ اگر فی الواقع مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو پھر عیسائیت کی ساری بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے

(الفضل ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء)

عیسائیت کے ابتدائی حالات ان کیٹا کومز سے ملتے ہیں جنہیں ابتدائی مسیحیوں نے ۳۰۰ سال تک پناہ دے رکھی تھی۔ اور وہ اصل ابتدائی مسیحی ہی عیسائیت کی اصل غرض کو سمجھتے تھے ان میں زیادہ تر تین تصویریں ملتی ہیں (۱) ایک گڈریے کی جس کے ارد گرد بھیڑیں ہیں (جس میں یہ اشارہ تھا کہ مسیح یہود کی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے آیا تھا) (۲) نوح کی کشتی کی (جس کے یہ معنے تھے کہ مسیح ہمارا نجات دہندہ ہے) (۳) یوناہ نبی کی مچھلی کے پیٹ میں جانے کی تصویر جس میں یہ اشارہ تھا کہ مسیح کو ویسا ہی معجزہ دیا گیا جیسا کہ یوناہ نبی کو۔ مسیح نے بھی اسے اپنا منفرد اور بنیادی معجزہ قرار دیا ہے۔ لکھا ہے۔ ... "لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا" (متی ۱۲/۳۸-۴۰)

یوناہ باب اتا ۳ سے ثابت ہے کہ یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا۔ اس میں تین دن زندہ رہا اور اس میں سے زندہ نکلا۔ اور یہ کہ اس کا تبلیغ کا زمانہ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتا ہے (گویا معجزہ خدا تعالیٰ کا یونسؑ کی حفاظت کرنا اور ان سے وہ کام لے لینا تھا جس کے لیے اس نے انہیں کھڑا کیا تھا اگر مسیحؑ قبر میں زندہ نہیں گیا یا وہاں زندہ نہیں رہا تو اس کی یوناہ نبی سے مشابہت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر وہ قبر سے دوبارہ زندہ ہو کر نکلے پھر بھی مشابہت نہیں رہتی کیونکہ یوناہؑ دوبارہ زندہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان پر موت آئی ہی نہیں تھی ـــ پھر اگر قبر سے زندہ نکلنے کے بعد اسے تبلیغی زمانہ میسر نہیں آیا۔ اور وہ بائیبل کے قول کے مطابق آسمان پر چڑھ گیا تو بھی اس کی یوناہ نبی سے مشابہت نہیں رہتی۔ اور اس کا یہ قول کہ

"جس طرح یوناہ نینواہ کے لوگوں کے لیے نشان ٹھہرا تھا۔ اسی طرح ابنِ آدم بھی اس زمانہ کے لیے ٹھہرے گا" (لوقا ۱۱/۳۰) پورا نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ نینواہ والوں نے کیا دیکھا انہوں نے نہ یوناہ کو مچھلی کے پیٹ میں جاتے دیکھا نہ نکلتے دیکھا دیکھا تو یہ دیکھا کہ یوناہ کو نینواہ جانے کا حکم ہوا۔ مگر وہ ترسیس کو بھاگ گیا لیکن خدا اسے مجبور کر کے واپس لایا اور اس سے وہ کام لیا جس کے لیے اس نے اسے کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح مسیح کے لیے یہ نشان اسی صورت میں تھا کہ وہ قبر میں زندہ جاتے وہاں زندہ رہے اور اس میں سے زندہ نکلے (مگر آسمانی صعود وہ ہوگا جو دشمن نہیں دیکھے گا) اس کے بعد وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جو نینواہ کے قریب اور ایران، افغانستان اور کشمیر میں رہتی تھیں اپنے مذہب میں داخل کرے کیونکہ اس کا مشن یہی تھا (دیکھیں متی ۱۰/۶) ۔ لکھا ہے "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ (متی ۱۵/۲۱-۲۸) کھوئی ہوئی بھیڑوں کے الفاظ بتاتے ہیں کہ نہ صرف ظاہری طور پر وہ قومیں غیر ممالک کو چلی گئی تھیں بلکہ روحانی طور پر بھی انہوں نے غیر مذاہب کا اثر قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ (یوحنا ۱۰/۱۶) میں بھی لکھا ہے "میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں مجھے ان کا لانا بھی ضروری ہے اور وہ میری آواز سنیں گی"۔

غرض جیسے یوناہ کو غیر ملک میں تبلیغ کے لیے بھیجا گیا اور وہاں کے لوگوں نے اس کا پیغام سنا اور یوناہ کا وہاں جانا اختیاری نہیں تھا بلکہ خدا تعالیٰ مجبور کر کے اسے لے گیا تھا اسی طرح مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہے کہ یہود کے ملک سے باہر بھی کچھ یہود قبائل تھے جن کی طرف مسیح کو بھیجا گیا وہاں کے لوگوں کے لیے مقدر تھا کہ وہ اس کی بات سنیں گے (چنانچہ انہوں نے بہت جلد مسیح کو مان لیا) اور مسیح کا ان تک جانا فرری تھا اختیاری نہیں تھا۔ اسی طرح مسیح کی بات سچی نکلی کہ "جس طرح یوناہ نینواہ کے لوگوں کے لیے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابنِ آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لیے نشان ٹھہرے گا۔ (لوقا ۱۱/۲۹-۳۰)

خود واقعہ صلیب سے بھی ظاہر ہے کہ مسیح صلیب پر مرا نہیں تھا

(۱) پیلاطوس جس کے سامنے مسیح پیش کیا گیا تھا یوسف آرمیتیا جیسے اور لوگوں کا جو دل سے مسیح پر ایمان لا چکے تھے دوست تھا اور خود بھی مسیح کا خیر خواہ تھا۔ چنانچہ جب مسیح اس کے سامنے پیش ہوا۔ جمعہ کا دن تھا اگلا دن سبت کا تھا اور اس دن ایک مقدس تہوار بھی تھا جس کی خوشی میں رومی حکومت ایک قیدی چھوڑا کرتی تھی۔ اس لیے پیلاطوس نے چاہا کہ مسیح کو چھوڑ دے مگر یہود نے مخالفت کی (انجیل متی ۲۷/۲۱-۲۳)

(۲) پیلاطوس کی بیوی نے عدالت میں پیغام بھیجا کہ میں ساری رات سوئی نہیں کیونکہ فرشتے مجھے بار بار آ کر کہتے رہے ہیں کہ یہ شخص بے گناہ ہے اسے سزا نہ دینا ورنہ مر جاؤ گے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۱۹) پیلاطوس نے جب یہ بات سنی تو اس نے مزید کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح یہودی مسیح کو رہا کرانا مان لیں مگر انہوں نے نہ مانا بلکہ انہوں نے دھمکی دی کہ ہم روم میں بادشاہ کو کہیں گے۔ (اس پر پیلاطوس نے کہا) میں اس کے گناہ

سے بری ہوں (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۲۴، ۲۵) بہرحال یہود کے اصرار کی وجہ سے پیلاطوس نے بادلِ ناخواستہ مسیح کو صلیب پر چڑھانے کی اجازت دیدی۔ جب یہود مسیح کو صلیب پر چڑھانے لے گئے۔ تو انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ چھٹا گھنٹہ (یعنی تین چار بجے کا وقت) ہو چکا تھا اور مسیح کے ساتھ دو اور آدمیوں کو بھی صلیب دیا جانا تھا جس کی وجہ سے صلیب پر لٹکانے میں زیادہ وقت لگنا ضروری تھا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ صلیب دیتے وقت کیل پنڈلیوں میں نہیں، بلکہ بازوؤں اور پنڈلیوں کے نرم گوشت میں گاڑے جاتے تھے۔ گو یہ بھی بہت تکلیف دہ چیز تھی مگر اس سے فوری موت واقع نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ کئی دنوں میں بھوک پیاس زخموں کے زہر اور تکلیف سے انسان مرتا تھا۔ چنانچہ مسیح کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے تھے مذاق کرتے رہے اور ایک نے کہا "اگر تو مسیح ہے تو اپنے کو اور مجھ کو بھی بچا (انجیل لوقا باب ۲۳۔ آیت ۴۰۔ ۳۹) مگر مسیح چونکہ حساس تھے وہ بیہوش ہو گئے۔ اس موقعہ پر پیلاطوس کی طرف سے جو پہریدار مقرر تھے وہ دل میں ان کے مرید تھے انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت مسیح تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ تو وہ فوراً دوڑ کر گئے اور انہوں نے اسفنج کا ایک ٹکڑا شراب میں بھگو کر مسیح کو چوسنے کے لیے دیا (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۳۶)۔ مغرب سے سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا (یہود میں بھی اسلامی تاریخ کی طرح مغرب سے نیا دن شمار کیا جانے کی رسم تھی) اور یہود کے نزدیک اگر کوئی سبت کے دن صلیب پر لٹکا رہے تو اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ دو تین گھنٹہ کے بعد ہی پیلاطوس نے توجہ دلائی کہ اگر مسیح صلیب پر لٹکا رہا اور سبت کا دن شروع ہو گیا تو تم پر عذاب آجائیگا۔ ادھر اللہ تعالے نے زوردار آندھی چلادی (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳) یہ دیکھ کر یہود اور بھی ڈر گئے۔ چنانچہ انہوں نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ اب اسے اتار لیا جائے (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱)

گویا دو تین گھنٹہ سے زیادہ مسیح صلیب پر نہیں رہے۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ لوگ کئی کئی دن صلیب پر مرتے نہیں تھے۔ پھر یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو لوگ صلیب پر سے زندہ اتر آتے تھے ان کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں۔ مگر پہریدار چونکہ مسیح کے مرید تھے انہوں نے چوروں کی ہڈیاں توڑیں مگر مسیح کی نہیں توڑیں۔ دراصل صلیب دینے کے معنے ہی ہڈیاں توڑ کر گودا نکالنے کے ہیں اور یہ نام اسی لیے دیا گیا ہے کہ اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ ان کی ہڈیاں توڑ کر گودا نکالا جاتا تھا۔ (انجیل یوحنا $\frac{19}{34}$)

(۳) جب حضرت مسیح کو اتارا گیا تو ایک سپاہی دوڑتا ہوا گیا اور اس نے آپ کی پسلی میں آہستہ سے نیزہ مار کر دیکھا تو اس سے خون اور پانی نکلا یعنی بہتا ہوا خون نکلا) انجیل یوحنا $\frac{19}{34}$ جو مسیح کے اس وقت زندہ ہونے کا قطعی ثبوت ہے مگر یہودیوں میں اس نے مشہور کر دیا کہ مسیح مر گیا ہے اس لیے ہم نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں۔ یہود کے دل میں پہلے ہی چور تھا کہ نیک پر ظلم کر رہے ہیں پھر آندھی سے اور بھی ڈر گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی بلکہ کہا اچھا اگر مر گیا ہے تو اسے دفن کر دو۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ۳ (اس سورۃ میں) تیرے رب کی (اس) رحمت کا ذکر (ہے) جو اس نے اپنے بندے زکریا پر
إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ۴ (اس وقت) کی جب اس نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا۔

آرمینیا نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ مسیح کی لاش میرے حوالے کر دی جائے چنانچہ پیلاطوس نے حکم دے دیا کہ لاش آرمینیا کو دے دی جائے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۵۸) اس کے بعد یوسف آرمینیا نے ان کو ایک قبر میں جا کر رکھ دیا وہ قبر ایک کھلی کوٹھڑی تھی جو چٹان میں کھدی ہوئی تھی (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۰) چونکہ مسیح کہا کرتے تھے کہ میں تین دن زمین میں رہونگا۔ یہود نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ اس کی قبر پر سرکاری پہرہ لگا دیا جائے مگر اس نے جواب دیا کہ تمہارے پاس پہرہ دار ہیں جاؤ جہاں تک تم سے ہو سکے اس کی حفاظت کرو (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۵) پیلاطوس نے سرکاری پہرہ دار اس لیے نہیں لگائے کہ مسیح آسانی سے قبر سے نکل سکے۔

پھر واقعہ صلیب کے بعد کے حالات لے لو۔ اگر مسیح مر کر زندہ ہو چکے تھے تو خدا کے بیٹے بن چکے تھے اس لیے لوگوں سے ڈر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مگر واقعہ صلیب کے بعد وہ چھپ چھپ کر پھرا کرتے تھے لکھا ہے "مسیح یکدم ظاہر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی کہیں ادھر ادھر غائب ہو جاتا" (لوقا $\frac{۲۴}{۴۱-۴۳}$)

پھر لطیفہ یہ ہے کہ جب لوقا کو یہ خبر پہونچی کہ مسیح زندہ ہیں تو اس نے کہا جب تک میں اس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھ لوں گا میں ماننے کو تیار نہیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس پر مسیح نے لوقا کو بلایا اور کہا "میرے ہاتھوں کو دیکھ ..... اور دیکھ کہ میں مسیح ہی ہوں کوئی روح نہیں (یوحنا $\frac{۲۰}{۲۱-۲۴}$)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب "مسیح ہندوستان میں" میں بھی تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیح ہجرت کر کے کشمیر آ گئے تھے۔

الغرض (۱) لوگ صلیب پر سات سات دن نہیں مرتے تھے اس لیے مسیح یقیناً صلیب پر مرا نہیں اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب اس کی پسلی میں نیزہ مارا گیا تو بہتا ہوا خون نکلا۔

(۲) مسیح کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں اس لیے وہ صلیب پر سے زندہ اترنے کے بعد بھی اس وقت نہیں مرے۔

(۳) تیسرا امکان قبر میں بند رہ کر مرنے کا ہو سکتا تھا مگر مسیح کو اس کے مرید یوسف آرمینیا نے کھلی قبر میں رکھا اس لیے وہاں بھی مرنے کا امکان نہیں تھا۔

(۴) واقعہ صلیب کے بعد مسیح نے ہاتھوں پر کیلوں کے نشان لوقا کو دکھائے اور کہا "دیکھ کہ میں مسیح ہی ہوں کوئی روح نہیں" اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح صلیب پر مرے نہیں تھے ورنہ جسم کے اندر تو خدا تھا کیا خدا کے ہاتھ تھے اور کیا خدا کے ہاتھوں پر کیلوں کے نشان ہو سکتے تھے جب مسیح صلیب پر مرا ہی نہیں تو اس لئے کفارہ ختم ہوا اور عیسائیت کا قصہ پاک۔

۳ یہاں مسیح کی والدہ کے کفیل زکریا کا ذکر ہے ۸۰۰ قبل از مسیح گزرنے والے زکریا کا نہیں۔ قرآن کریم کے

مطابق یہ زکریاؑ بھی نبی تھے مگر بائبل نے ان کا نام کاہن رکھا ہے۔ یہاں عیسائیت کے ذکر سے پہلے حضرت زکریاؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ملاکی ۴/۵ میں پیشگوئی تھی کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا آئے گا لکھا ہے "دیکھ خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیا نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا" اور حضرت مسیحؑ سے جب پوچھا گیا کہ آنے والا ایلیا کہاں ہے تو انہوں نے فرمایا چاہو تو مانو۔ ایلیا جو آنے والا تھا یہی ہے" (یعنی یوحنا)۔ متی ۱۱/۱۴) یعنی مسیحؑ سے پہلے جس آنے والے کی پیشگوئی تھی وہ ایلیاؑ کے بروز یحییٰؑ تھے۔ چونکہ یحییٰؑ زکریاؑ کے ہاں پیدا ہونے والے تھے اس لیے مسیحؑ سے پہلے ان کا ذکر کیا ۳/۳۷ سے پتہ لگتا ہے کہ جب زکریاؑ نے مریم سے پوچھا کہ تیرے پاس تازہ بتازہ رزق کہاں سے آتا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا اللہ سے۔ زکریاؑ کو خیال آیا کہ جب ایک بچی یہ سمجھتی ہے کہ ہر چیز کا "دینے والا خدا ہے" تو کیوں نہ میں بھی اپنی ضرورت خدا سے عرض کروں۔ مریم کی نیکی اور دنیا سے بے رغبتی اور لوگوں کے اس کی طرف رجوع کو دیکھ کر زکریاؑ کو خیال ہو گیا تھا کہ موعود مسیح جس پر بنی اسرائیل کی نبوت کا خاتمہ مقدر ہے مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہے۔ مگر زکریاؑ نہیں چاہتے تھے کہ وہ بنی اسرائیل کے آخری چراغ ثابت ہوں۔ ایک یہ وجہ ہوئی۔ دوسرے مریم کی بات سے دعا کی تحریک ہوئی اس لیے زکریاؑ نے اللہ تعالیٰ سے مخفی آواز میں اپنے دل کا بھید ظاہر کر دیا (نادیٰ کے معنی دل کی آواز ظاہر کرنے کے بھی ہیں اور بلند آواز کے بھی۔ مگر ساتھ خفیّاً کا لفظ ہے۔ اس لیے بلند آواز کے معنے چسپاں نہیں ہوتے)

ذکر کے معنے واقعہ کو بیان کرنے کے نہیں ہوتے اسے یاد کرانے کے ہوتے ہیں۔ رحمت تو زکریاؑ پر ہوئی مگر رحمت ربّک اس لیے فرمایا کہ یہ سب کچھ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لوگوں کو تیار کرنے کی خاطر ہوا۔ کیونکہ زکریاؑ یحییٰؑ کا پیش خیمہ تھے۔ اور یحییٰؑ مسیحؑ کے اور مسیحؑ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ مسیحؑ کو بن باپ پیدا کر کے خدا نے یہ اشارہ کر دیا تھا کہ اب نبوت بنی اسحاقؑ سے بنو اسماعیلؑ کی طرف منتقل ہونے والی ہے اور پیدائش ۱۷/۲ اور ۲۱/۱۸ والا وعدہ پورا ہونے والا ہے اور اسی طرح موسیٰؑ سے خدا کا جو وعدہ تھا کہ:۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سُننا (استثناء ۱۸/۱۵) وہ بھی پورا ہونے والا تھا۔

خدا کی رحمت صفت رحمانیت کے ماتحت بھی ہوتی ہے اور صفت رحیمیت کے ماتحت بھی۔ یہاں "عبد" کے الفاظ سے بتا دیا کہ زکریاؑ خدا کا عبد تھا۔ بہت نیک اور قربانی کرنے والا تھا۔ اس لیے اس کی قربانی اور دعا کے نتیجہ میں یعنی صفت رحیمیت کے ماتحت یہ رحمت نازل ہوئی ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ○

(۵) (اور) کہا اے میرے رب! (میری حالت تو یقیناً ایسی ہے کہ) میری تمام ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے اور اے میرے رب! میں کبھی بھی تجھ سے دعائیں مانگنے کی وجہ سے ناکام (و نامراد) نہیں رہا۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ○

(۶) اور میں یقیناً اپنے رشتہ داروں کے اپنے (مرنے کے) بعد کے سلوک سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ پس تو مجھے اپنے پاس سے ایک دوست (یعنی بیٹا) عطا فرما۔

یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ○

(۷) جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کی (جو دین و تقویٰ ہم کو ورثہ میں ملا ہے اس) کا بھی وارث ہو اور اے میرے رب! اسکو (اپنا) پسندیدہ (وجود) بنائیو۔

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣاسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ○

(۸) (اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی خبر دیتے ہیں (جو جوانی کی عمر تک پہنچیگا) (اور) اس کا نام (خدا کی طرف سے) یحیٰی ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے کسی کو اس نام سے یاد نہیں کیا۔

---

۵ شقاوت سعادت کی ضد ہے اور سعادت کے معنی ہیں خدا کی ایسی مدد شاملِ حال ہونا جس سے خیر حاصل ہو۔ ولم اکن بدعائك رب شقیا کے معنی ہیں بدعائی ایاك یعنی میرے تجھے پکارنے کی وجہ سے اور حضرت زکریاؑ کے مقام کے مطابق یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بدعائك ایای یعنی تیرے مجھے پکارنے اور مقرب بنانے کے بعد میں کبھی نامراد نہیں رہا۔

۶ حضرت زکریا کے پاس دنیوی دولت تو تھی نہیں دینی دولت یعنی نبوت تھی۔ اور اسی کی تعلیم مفقود ہونے کا خوف تھا اس لیے دعا کی کہ مجھے رشتہ داروں سے ڈر ہے کہ میری تعلیم کو بگاڑ دیں گے۔ ادھر میں بوڑھا ہوں اور بیوی بانجھ ہے مگر میں نے تیری قدرتوں کو دیکھا ہے اور کبھی تیرے دروازہ سے نامراد نہیں لوٹا۔ اس لیے یہ التجا ہے کہ بیٹا دے اور ایسا بیٹا جو میرے اور آلِ یعقوبؑ کے اخلاق کو پیش کرنے والا ہو اور لوگوں ہی میں خوشنما نہ ہو بلکہ تیرا بھی پسندیدہ ہو۔ حضرت زکریاؑ جانتے تھے کہ مسیحؑ آئے گا اور لوگ پھر بھی احکام الٰہی کی خلاف ورزی سے باز نہ آئیں گے تو بنی اسحاقؑ میں نبوت ختم ہو جائے گی، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مسیحؑ سے پہلے ایک نبی آئے جو قوم کو اس پر ایمان لانے کے لیے تیار کرے تاکہ وہ اس عذاب سے بچ جائے۔ چنانچہ یحیٰیؑ آئے تو انہوں نے مسیحؑ ہی کو آگے ڈیوس کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ "میں تو تم کو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے یعنی مسیحؑ وہ مجھ سے زور آور ہے میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں" (متی ۳/۱۱)

۸ یحیٰی کے معنے ہیں زندہ رہنے والا۔ دوسری طرف قرآن میں شہداء کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اس لیے خدا کسی کا نام یحیٰی رکھے تو یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شہید ہوگا اور یہ بھی کہ اس کا نام زندہ رکھا جائیگا اسلئے یحیٰی نام رکھنے میں یہ اشارہ بھی تھا کہ وہ شہید ہوگا اور یہ بھی کہ اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھا جائے گا۔

یحییٰؑ مسیحؑ کے ارہاص تھے اور مسیح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جو ہمیشہ زندہ رہنے والے نبی ہیں اس لئے یحییٰؑ کا نام مٹ نہیں سکتا۔ لم نجعل لہ من قبل سمیا۔ فرمایا: ہم نے "اس سے پہلے کسی اور کو اس کا مسمی یعنی ہم نام نہیں بنایا۔ یہ نہیں کہا کہ کسی انسان نے بھی کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا۔ اس لیے عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ یوحنا نامی تو اور بھی ہوئے ہیں بیہودہ ہے۔ دوسرے سمیاً کے معنے مثل کے بھی ہوتے ہیں۔ اور بے مثل کوئی کسی چیز میں ہوتا ہے کوئی کسی میں۔ یحییٰؑ اس بات میں بے مثل تھے کہ وہ پہلے نبی تھے جو ایک نبی الیاس (ایلیاہ) کے نام پر آنے والے نبی کے لیے بطور ارہاص کے آئے۔ انجیل بھی ان کو بے مثل قرار دیتی ہے لکھا ہے۔ "میں تم سے کہتا ہوں کہ ان میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں" (لوقا ۲۸/۷) انجیل نے انہیں پہلوں میں سے سب سے بڑا نبی ہونے کی وجہ سے بے مثل قرار دیا ہے اور قرآن نے مسیحؑ کا ارہاص ہونے کی وجہ سے مگر وہ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے تابع نبی تھے اس لیے بائیبل نے بے مثل ہونے کی جو وجہ بتلائی ہے وہ غلط ہے۔

(۱) لوقا باب ۱ آیت ۱۳ میں لکھا ہے "تیری دعا سُنی گئی"۔ اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ زکریاؑ نے دعا کی تھی مگر محرک اور دعا کا ذکر نہیں قرآن نے مریم کی معصومانہ بات کو زکریاؑ کی دعا کا محرک بتایا ہے۔ قرآنی بیان صحیح ہے کیونکہ اگر محرک نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ زکریاؑ جوانی میں تو یہ دعا نہ کرتے مگر بڑھاپے میں کرتے۔

(۲) بائیبل کہتی ہے فرشتہ نے زکریاؑ کو بشارت دی مگر قرآن کہتا ہے خدا نے دی یہ اختلاف نہیں کیونکہ اول تو فرشتے خدا ہی کا پیغام پہنچاتے ہیں دوسرے قرآن میں آتا ہے۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰي (آل عمران ۴/۳) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورۃ مریم میں جو خدا تعالیٰ کے بولنے کا ذکر ہے اس سے بھی جبرائیلؑ کی معرفت بولنا مراد ہے بائیبل میں ایسے کلام کی مثالیں ملتی ہیں۔ پیدائش ۱-۱۵/۱۸ میں یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نظر آیا۔ پھر خدا کی بجائے تین مرد کہا گیا۔

(۳) انجیل نے یحییٰؑ کو مسیحؑ کا ارہاص کہا ہے۔ قرآن نے بھی کہا ہے۔ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران ۴/۳) یعنی وہ صحف سابقہ کی) ایک پیشگوئی کو پورا کرے گا۔ اس لیے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۴) بائیبل کہتی ہے زکریاؑ نے فرشتہ کی بات پر شک کیا اس لیے انہیں بطور سزا گونگا رکھا گیا (لوقا ۱/۲۰) مگر قرآن کہتا ہے انہیں بطور نشانِ شکر یہ خاموشی سے ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا گیا (۴/۳) قرآنی بیان درست ہے کیونکہ اگر زکریاؑ کو بچہ مل سکنے پر شک ہوتا تو دعا ہی کیوں کرتے۔ اس سے ثابت ہے کہ انہوں نے صرف تعجب کا اظہار کیا اور اظہار تعجب ایسی ہی بشارت پر سارہ زوجہ ابراہیمؑ نے بھی کیا تھا۔ لکھا ہے "کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لیے شادمانی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے"۔ (پیدائش ۱۲/۱۸) پھر کیا یہ خدائی عدل تھا کہ اسی فعل کی سارہ کو تو سزا نہ ملی۔ یحییٰؑ کو مل گئی؟

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝

(۹) (زکریا نے) کہا۔ اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے۔ اور میں بڑھاپے کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہوں۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝

(۱۰) (الہام لانیوالے فرشتہ نے) کہا (کہ جیسطرح تو کہتا ہے واقعہ) اسی طرح ہے، (مگر) تیرا رب کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر آسان ہے اور (دیکھ کہ) میں تجھے اس سے پہلے پیدا کر چکا ہوں۔ حالانکہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْۤ اٰيَةً ۚ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝

(۱۱) (زکریا نے) کہا۔ اے میرے رب! میرے لیے کوئی حکم بخش۔ فرمایا تیرے لیے یہ حکم ہے کہ تو لوگوں سے تین راتیں متواتر کلام نہیں کرے گا (یعنی کلام نہ کرنا)

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝

(۱۲) اس کے بعد (زکریا) محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس گئے اور انہیں آہستہ آواز میں کہا۔ کہ صبح اور شام خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہو۔

ف ۹-۱۰ اور غلام میں یہ اشارہ تھا کہ بیٹا ہوگا جو نبوت کی عمر کو پہنچے گا۔ اور پہلے کہا تھا لم نجعل له من قبل سمیا۔ اس عمر میں ایسے لڑکے کی بشارت منجملہ عجائبات تھی اس لیے زکریا حیران ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہم نے تجھے بھی تو روحانی پیدائش دی ہے جبکہ پہلے تیری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پھر اس خبر پر حیرت کی کیا وجہ ہے۔ یہاں پیدائش روحانی مراد ہے جسمانی پیدائش مراد ہوتی تو ساری دنیا کا ذکر ہوتا، نہ کہ صرف یحییٰؑ کا۔

ف ۱۱ ابراہیمی عہد کا نشان ختنہ ٹھہرایا گیا تھا (دیکھیں پیدائش ۱۷/۹-۱۸) اسی طرح حزقیل نبی میں محبت کو نشان قرار دیا۔ ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں بعض نیک کاموں کا کرنا خدائی وعدوں کے لیے ظاہری نشان سمجھا جاتا تھا ایسا ہی نشان حضرت زکریاؑ نے مانگا تاکہ وہ خدا سے وعدہ پورا کریں تو خدا بھی ان سے وعدہ پورا کرے۔ یہاں لا تکلم نہیں کہا الا تکلم الناس کہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکریاؑ کی زبان نہیں رکی گئی تھی بلکہ لوگوں سے بات نہ کرنے کا حکم تھا تاکہ خاموشی سے عبادت الٰہی کر سکیں۔

ف ۱۲ سورۃ آل عمران پ۳ میں اوحی کی جگہ رمزًا کے الفاظ ہیں اور رمزًا کے معنے ثعالبی امام لغت کے نزدیک ہونٹوں سے اشارہ کے لیے خاص ہیں اور ہونٹوں سے اشارہ کا مطلب یہ ہے کہ آہستہ کلام کر سکتے تھے اور اس کی اجازت تھی۔ یاد رہے کہ بُکْرَةً سے صبح سے دوپہر تک کا اور عشاء سے زوال سے رات تک کا وقت مراد ہوتا ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ (۱۳) (اسکے بعد یحییٰ پیدا ہو گیا اور ہم نے اسے کہا) اے یحییٰ! (تورات الٰہی) کتاب
وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ　کو مضبوطی سے پکڑ لے اور ہم نے اسے چھوٹی عمر میں ہی (اپنے) حکم سے نوازا تھا۔
وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَ (۱۴) (اور یہ بات) ہماری طرف سے بطور مہربانی (اور شفقت کے تھی) اور
كَانَ تَقِيًّا ۙ　(اسے) پاک کرنے کے لیے (تھی) اور وہ بڑا متقی تھا۔
وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ (۱۵) اور وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا
جَبَّارًا عَصِيًّا ۝　اور ظالم اور نافرمان نہیں تھا۔
وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ (۱۶) اور جب وہ پیدا ہوا تب بھی اس پر سلامتی تھی اور جب وہ مرے گا
يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۧ　اور جب وہ زندہ کر کے اٹھایا جائیگا تب بھی اس پر سلامتی ہوگی)

۱۳-۱۴ بائبل اور قرآن دونوں میں حضرت یحییٰؑ پر کسی کتاب کے نزول کا ذکر نہیں اس لیے خذ الکتٰب میں یحییٰؑ کو تورات پر عمل کا حکم ہے اور مسیحؑ نے یحییٰؑ سے بپتسمہ لیا تھا یعنی ان کے دین کی اتباع کی تھی اس لیے ثابت ہوا کہ مسیحؑ پر بھی کوئی نئی شریعت نہیں اتری۔

مسیحؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "وہ حلیم بردبار اور گناہوں سے پاک تھا" یہاں یحییٰؑ کے متعلق بھی خدا نے فرما دیا کہ وہ ساری خوبیاں اس میں ہیں۔ پھر مسیحؑ کو لوگوں نے "صبی" کہا مگر یحییٰؑ کے متعلق خدا نے کہا کہ اٰتینٰہ الحکم صبیًّا اس لیے مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں صبیًّا سے بچپن ہی نہیں جوانی کا زمانہ بھی مراد ہوتا ہے اور گو اس کے معنے بچپن کے بھی ہوتے ہیں مگر یہ فقرہ ایسا ہی ہے جیسا کہتے ہیں فلاں تو ابھی بچہ ہی ہے یعنی نوعمر ہے۔

لفظ زکوٰۃ اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "تقویٰ" باہر سے آنے والی خرابیوں کو دور کرنے کے معنوں میں۔ اور یہ دونوں الگ الگ مفہوم ادا کرتے ہیں۔

۱۵ بَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ کے معنے ہیں اس نے والد کی پوری اطاعت کی جو باتیں اسے پسند تھیں اختیار کیں جو ناپسند تھیں چھوڑ دیں اور نرمی اور محبت کا سلوک کیا۔ یحییٰؑ کی یہ خوبیاں اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ مسیحؑ کو خصوصیت نہ دی جائے اور معلوم ہو کہ جو خوبیاں مسیحؑ میں تھیں یحییٰؑ میں بھی تھیں۔

۱۶ ان الفاظ سے کہ جب وہ مرے گا اس وقت بھی اس پر سلامتی ہوگی بعض نے یہ مفہوم لیا ہے کہ یحییٰؑ شہید نہیں ہوئے تھے مگر یہ استدلال غلط ہے۔ سلامتی کے یہ معنی کیے جائیں تو پھر اگلے فقرہ کے کہ قیامت کے دن اس پر سلامتی نازل ہوگی کچھ معنے نہیں بنتے کیونکہ اس دن قتل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سورہ نمل ۱۶/۲۹ طٰہٰ ۲ اور مائدہ ۵/۱۶ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب مومنوں پر سلامتی ہوتی ہے مگر ہزاروں مومن شہید بھی ہوتے ہیں اس لیے نزولِ سلامتی کا یہ مطلب نہیں کہ موت شہادت سے نہیں ہوگی۔

وقف لازم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ (۱۷) اور تُو (اس) کتاب میں مریم کا (جی ذکر آتا ہے اسے)
اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا — بیان کر (خصوصًا اس بات کو کہ) جب وہ اپنے رشتہ داروں سے
شَرْقِيًّا ۙ — مشرقی (جانب ایک) جگہ چلی گئی

دراصل یہاں تین زمانوں کا ذکر ہے (۱) جو پیدائش سے شروع ہو کر موت تک چلتا ہے (۲) موت سے قیامت تک کا زمانہ یعنی برزخی زندگی کا زمانہ (۳) قیامت سے اس وقت تک کا زمانہ جب کامل طور پر جنت یا دوزخ مستحقین کو مل جاتی ہے اور بتایا ہے کہ یحییٰؑ پیدائش کے وقت سے ہی مسِ شیطان سے پاک تھے جب فوت ہوئے اس وقت بھی روحانی بیماریوں سے پاک تھے اور جب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اس وقت بھی ان پر سلامتی ہوگی۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ مسیحؑ میں جو خوبیاں ہیں یحییٰؑ میں بھی ہیں پھر مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کیوں مانا جائے۔ لکھا ہے "میں تم سے کہتا ہوں کہ ان میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی نبی بڑا نہیں (انجیل لوقا ۷/۲۸) ثابت ہوا کہ مسیح جو عورت سے پیدا ہوئے یوحنا سے بڑے نہیں تھے اس لیے خدا نہیں ہو سکتے۔

۱۷۔ مریم سے مسیحؑ کے بن باپ پیدا ہونے میں یہ اشارہ تھا کہ اب بنی اسحاقؑ میں کوئی مرد ایسا نہیں رہا جس کی اولاد میں سے نبی پیدا ہو سکے۔ اور یہ کہ اب نبوت بنو اسمٰعیلؑ کی طرف منتقل ہونے والی ہے چنانچہ استثناء ۱۸/۱۵ میں لکھا ہے: "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے بھائیوں (یعنی بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا" اس لیے یہاں مسیحؑ کا ذکر مریمؑ کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے۔ مریم کے حاملہ ہونے سے پہلے کے حالات کے متعلق انجیل خاموش ہے متی ۱/۱۸ سے صرف یہ پتہ لگتا ہے کہ جب مریم کنواری حاملہ ہوئی تو ان کے منگیتر یوسف نے انہیں چھوڑنا چاہا۔ مگر فرشتہ نے اسے روک دیا اور لوقا سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ مریم زکریا کی بیوی کی رشتہ دار تھیں اور ان کے گھر آتی جاتی تھیں۔

قرآن کریم نے سورہ آل عمران ع۴ میں بتایا ہے کہ موسوی خاندان کی ایک عورت نے دین کی ابتر حالت دیکھ کر سوچا کہ دین کے لیے واقفین زندگی کی ضرورت ہے اور ارادہ کیا کہ اگر اس کے ہاں بیٹا ہوا تو اُسے وقف کر دے گی۔ مگر پیدا بیٹی ہو گئی۔ تو اس نے دعا کی کہ الٰہی میرے تو بیٹی ہو گئی ہے۔ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ جو کام اس بیٹی کے ذریعہ ہو سکتا ہے لڑکا نہیں کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد کا مقدر وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ اور مسیحؑ سے پہلے یحییٰؑ کا آنا بھی ضروری تھا اس لیے اگر خدا تعالیٰ والدہ مریم کی دعا اس رنگ میں سنتا کہ انہیں لڑکا یعنی مسیح عطا کر دیتا تو ایسا کرنا قبل از وقت ہوتا اس لیے اس نے ان کی دعا اس رنگ میں سن لی۔ کہ انہیں وہ لڑکی (یعنی مریم) عطا کر دی جس کے بطن سے مسیحؑ نے پیدا ہونا تھا۔ بہرحال ماں چونکہ نذر مان چکی تھی۔ اس نے مریم کو علماء کے سپرد کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شادی نہ کرے (کیونکہ اس نے تو دعا کی تھی کہ مریم اور اس کی اولاد شیطان سے محفوظ رہیں) بلکہ اس لیے کہ تربیت

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا قفہ (۱۸) اور (اپنے اور) ان (یعنی رشتہ داروں) کے درمیان پردہ ڈال دیا (یعنی ان سے قطع تعلق کر کے اپنے آپ کو چھپا دیا) اسوقت ہم نے اسکی طرف اپنا کلام لانیوالا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ فرشتہ (یعنی جبرائیل) بھیجا اور وہ اسکے سامنے ایک تندرست بشر کی شکل میں ظاہر ہوا۔

صحیح ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے والدہ مریم کی دعا سُن لی اور مریم کے دل میں اپنی محبت ڈالی اور اسے اس بات پر یقین بخشا کہ ہر نعمت اسی کی طرف سے آتی ہے۔ مریم ہی کے ایک ذکر سے متاثر ہو کر زکریا نے بیٹے کے لیے دعا کی جس کے نتیجہ میں یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ گویا مسیحؑ کی والدہ مسیحؑ کے ارہاص بننے والے نبی کی پیدائش میں ممد ہوئیں۔

متی ۱۲/۴۶-۵۰، مرقس ۳/۳۱-۳۵، لوقا ۸/۲۰ اور ۸/۲۷-۲۸ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ مریم سے متنفر تھے اور مریم مسیحؑ کی منکر اور کافرہ تھیں نیز انجیل متی ۱۳/۵۵-۵۷ میں لکھا ہے "نبی اپنے وطن اور گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا" اور انجیل مرقس ۳/۲۱ میں لکھا ہے "جب اس کے عزیزوں نے یہ سُنا تو اسے پکڑنے کو نکلے کیونکہ کہتے تھے کہ وہ بیخود ہے۔" یعنی وہ لوگ مسیحؑ کو دیوانہ سمجھتے تھے۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ مسیحؑ اپنی والدہ سے حسن سلوک کرنے والے تھے (۱۹/۳۳) اسی طرح مریم کے متعلق لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسیحؑ کی والدہ کی دعا کو قبول فرمایا اور وہ نیکی پہ پختہ ہو گئیں اور خدا تعالیٰ نے اسے غیر معمولی ترقی بخشی (۳/۳۸) اسی طرح ۳/۴۴ میں اسے بزرگ اور پاک کہا گیا ہے۔ پھر لکھا ہے یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین (۳/۴۴) اور راکع اسے کہتے ہیں جسے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان خالص عطا ہو۔ پس ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ از روئے قرآن مریم مومنہ تھیں اور بزرگ تھیں اور قرآنی بیان ہی صحیح ہے کیونکہ خود بائیبل کہتی ہے "خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا ہو گا اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہو گا اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔" (انجیل لوقا ۱/۲۰-۲۱) اس کے بعد مریم کے ہاں باوجود غیر شادی شدہ ہونے کے بچہ پیدا ہوا جو مندرجہ بالا صفات کا حامل بھی ہوا۔ ایسے شاندار نشان کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مریم مسیحؑ کا انکار کرتیں۔

قرآن نے ان حقائق کو امور غیبیہ قرار دیکر خود تبلا دیا ہے کہ بائیبل میں یہ واقعات درج نہیں ہیں فرماتا ہے ذٰلك من انباء الغيب نوحيه اليك (۳/۴۵)

اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا: شرقی کے معنے عربی میں اس مکان کے بھی ہوتے ہیں جس کا منہ مشرق کی طرف ہو اور اس کے معنے مشرق کے بھی ہوتے ہیں۔ یہود میں مشرق کا خاص احترام تھا اور وہ عبادتگاہوں کے رخ مشرق کی طرف رکھتے تھے اس لیے یہاں یہ بتایا ہے کہ مریم ایک عبادت گاہ میں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا عبادت کے لیے گئیں تاکہ جنت اولیٰ اور بشارت عظیمہ سامنے رہے۔

۱۸ فتمثل لها بشرا سويا: کلام الٰہی مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے جیسے خواب میں دیکھو کہ بکرا ذبح کیا گیا تو تعبیر یہ ہوتی ہے کہ کوئی قریبی رشتہ دار فوت ہو گا۔ یا دیکھو گھر میں چور آیا ہے تو داماد مراد ہوتا ہے یہاں بھی یہی بتایا ہے کہ وہ وحی ایسی نہیں تھی جو اس کے کان میں پڑی ہو یا زبان پر جاری ہوئی ہو بلکہ وہ کشف تھا جس میں فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ روح اس کے اندر چلی گئی بلکہ یہ کہا ہے کہ

قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ‎ (۱۹) (مریم نے اس سے کہا) میں تجھ سے رحمٰن خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تیرے اندر کچھ بھی تقویٰ ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ‎ (۲۰) (اس پر اس فرشتہ نے کہا) میں تو صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں تاکہ میں تجھے (وحی کے مطابق) ایک پاک لڑکا دوں (جو جوانی کی عمر تک پہنچے گا)

قَالَتْ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ‎ (۲۱) (مریم نے) کہا۔ میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا۔ حالانکہ اب تک مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا۔ اور میں کبھی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوئی۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ‎ (۲۲) (فرشتہ نے کہا بات) اسی طرح ہے (جس طرح تو نے کہی مگر) تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ (کام) مجھ پر آسان ہے (اور ہم ایسا اس لیے کریں گے) تاکہ اسے لوگوں کیلیے ایک نشان بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت (کا موجب بھی بنائیں) اور یہ (امر) ہماری تقدیر میں طے ہو چکا ہے۔

اسنے دم کی شکل میں متمثل ہو کر اسے خبر دی۔ اس لیے عیسائیوں کا یہ کہنا کہ قرآن کی اس آیت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مسیح خدا یا روح القدس کے نطفہ سے پیدا ہوئے تھے غلط ہے۔

۱۹ کفارہ کی بنیاد اس پر ہے کہ بندوں کا گناہ بخشنا عدل الٰہی کے خلاف تھا اس لیے اس نے بندوں کے گناہ بخشنے کے لیے بیگناہ مسیح کو صلیب پر موت دی۔ تاکہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو۔ مگر یہاں مریمؑ نے خدا کو رحمٰن کہکر پکارا ہے جس کے معنے ہیں بغیر عمل کے انعام کرنے والا جو بغیر عمل کے انعام کر سکتا ہے اور کرتا ہے وہ عمل کی کمزوری یعنی گناہ کو بخش بھی سکتا ہے یہاں کرب کے وقت کی دعا کا طریق سکھلایا کہ انسان کہے۔ الٰہی میرا تو کوئی عمل نہیں مگر تو بغیر عمل کے فضل کرنے والا ہے اس لیے مجھ پر فضل کر دے۔

۲۰ رسول کا لفظ بتاتا ہے کہ وہ صرف پیغامبر تھا۔ اھبؔ جس کے معنے دینے کے ہیں یہاں اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ خبر یقینی تھی۔

۲۱ لم یمسسنی بشرٌ جائز تعلق کی نفی کرتا ہے اور لم اكُ بغیًّا ناجائز تعلق کی۔

۲۲ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا۔ مسیح کی بے باپ پیدائش میں یہ نشان تھا۔ کہ ابراہیمی نور اب بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہوگا اس لیے وہ آیت تھا اور رحمت اس لیے کہ اس نے یہود کی خشونت کو دور کر کے محبت کی تعلیم دی۔ نیز اس لیے کہ وہ اس نبی کی پیدائش کا ذریعہ بننے والا تھا جو رحمۃً للعالمین تھا۔ عیسائیوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسیح غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن اول تو تمام انبیاء ہی آیت الٰہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور نبی کے متعلق لکھا ہے وَلِنَجْعَلَكَ

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (۲۳) اس پر مریم نے (اپنے پیٹ میں) اس (بچہ) کو اٹھا لیا۔ اور پھر اس کو لے کر ایک دور مکان کی طرف چلی گئی۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ (۲۴) پس (جب وہ وہاں پہنچی تو) اسے دردِ زہ (اٹھی اور اسے) مجبور کر کے ایک کھجور کے تنے کی طرف لے گئی (جب مریم کو یقین ہو گیا کہ اس کے ہاں بچہ ہونیوالا ہے تو اس نے دنیا کی انگشت نمائی کا خیال کر کے) کہا۔ اے کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی اور میری یاد مٹا دی جاتی۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ (۲۵) پس (فرشتہ نے) اس کو نچلی جانب کی طرف سے پکار کر کہا کہ (اے عورت) غم نہ کر [illegible] اللہ نے تیری نچلی جانب ایک چشمہ بہایا ہوا ہے (اس کے پاس جا اور اپنی [illegible]

وَهُزِّیْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ (۲۶) اور (وہ) کھجور (جو تیرے قریب ہو گی اس) کی ٹہنی کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا وہ تجھ پر تازہ بتازہ پھل پھینکے گی۔

اٰيَةً لِّلنَّاسِ (پ ۱۶ / ۳۳) نیز قرآن میں اونٹنی اور نعشِ فرعون کو بھی آیت قرار دیا گیا ہے (دیکھیں ۳/۷ اور ۱۰/۹۲) رحمت کا لفظ بھی مسیح کے لیے خاص نہیں یحیٰی کے متعلق آتا ہے حنانًا من لدنّا اور آنحضرت صلعم کے متعلق لکھا ہے ومآ ارسلنٰك الّا رحمة للعٰلمين (پ ۱۷ / ۲۱) اگر یہ اعتراض ہو کہ مریم کے متعلق جب یہ الفاظ آتے ہیں کہ واصطفٰك علٰى نساء العٰلمين تو وہاں عالمین سے مراد صرف قوم مریم کی جاتی ہے پھر کیوں نہ سمجھیں کہ رحمةً للعٰلمين میں صرف عرب کے لیے رحمت مراد ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ انبیاء میں غیر عرب اور خصوصًا بنی اسرائیل کا ذکر کر کے اس فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے وہاں سب قومیں ہی مراد ہونگی۔

۲۳ ۔ مسیح کی ولادت بے باپ ہوئی تھی اور بغیر باپ کے ولادت ایسا قانونِ قدرت ہے کہ ابھی تک انسان کو پورا علم نہیں گو ایسی ولادت کی مثالیں اور بھی ہیں مثلاً منچو خاندان کی بنیاد جس شخص سے پڑی وہ بھی اور چنگیز خان بھی دونوں بغیر باپ پیدا ہوئے تھے۔ اور دونوں کی ماں نے قبل از حمل خواب دیکھی تھی کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے جو بادشاہ بنا ہے چنانچہ یہ خوابیں پوری ہوئیں اس لیے ہم ان پر الزام نہیں لگا سکتے۔ فانتبذت بہ مکانًا قصیًّا میں اسی سفر کا ذکر ہے جو انہوں نے بیت الحم کی طرف جو یروشلم کے جنوب میں ہے کیا (دیکھیں انجیل لوقا ۲/۱-۲) بیت الحم میں انہیں سرائے میں جگہ نہ ملی اور وہ کہیں باہر ٹھہرے۔ وہیں حضرت مریم کو دردِ زہ شروع ہو گیا اور بچہ پیدا ہو گیا (لوقا ۲/۷)

۲۵-۲۶ ۔ فناداها من تحتها سے یہ مراد ہے کہ فرشتے نے نشیب کی طرف سے آواز دی کہ ادھر چشمہ ہے۔ بیت الحم جہاں بچہ پیدا ہوا کی بلندی ۲۳۵۰ فٹ ہے اور اس کے نشیب میں چشمے موجود ہیں۔ حضرت مریم کو چشموں کی جگہ کا علم نہیں تھا اس لیے فرشتہ نے علم دے دیا۔ مسیح کو اسماعیلؑ سے یہ مشابہت ہے کہ جب وہ مکہ میں چھوڑے گئے تھے تو انہیں بھی فرشتہ نے پاؤں کے نیچے چشمہ پھوٹنے کی خبر دی تھی۔

عیسائی تاریخ کے مطابق مسیح کی پیدائش ۲۵ دسمبر کو ہوئی تھی جبکہ قیصر اغسطس کے حکم کے ماتحت یہود کی

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا	(۲۷) پس (ان کو) کھاؤ - اور (چشمہ سے پانی بھی) پیو اور (خود نہا کر اور بچہ کو نہلا کر) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو - پھر اگر (اس عرصہ میں) تو کسی مرد کو دیکھے تو کہدے - میں نے رحمٰن (خدا) کے لیے (ایک) روزے کی نذر کی ہوئی ہے - پس آج میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی -

مردم شماری ہوئی تھی جس کے لیے مریم بیت الحم گئی تھیں لیکن اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح کی پیدائش ایسے موسم میں ہوئی تھی جب کھجور پکتی ہے اور جب چشمہ میں نہایا جا سکتا ہے یعنی جولائی اگست میں - قاضیوں ۱۶/۱ سے پتہ لگتا ہے کہ اس علاقہ میں کھجور ہوا کرتی تھی - مگر پہاڑ پر اور عرب کے شمال میں موسم سرما میں یہ باتیں ناممکن ہیں - بائیبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب مسیح پیدا ہوئے وہاں زیتون بادام اور انگور ہوتا تھا مگر دسمبر میں یہ میوے چیزیں نہیں ہوتیں - نیز جوزیفس جو زمانہ مسیح کا سب سے بڑا مورخ ہے لکھتا ہے کہ مسیح کی پیدائش کے سن میں کوئی مردم شماری نہیں ہوتی - پہلی مردم شماری ۶ بعد مسیح ہوئی تھی - لوقا ۸/۲ میں لکھا ہے اس علاقہ میں چرواہے تھے جو رات کو میدان میں رہ کر اپنے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے - فلسطین میں دسمبر کے مہینہ میں جب سخت بارش اور دھند ہوتی یہ ناممکن ہوتا ہے ان باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ مہینہ سردی کا نہیں تھا - چنانچہ بشپ جادکس نے بھی اپنی کتاب Rise of Christanity صفحہ ۷۹ پر یہی لکھا ہے -

اب ہم بتاتے ہیں کہ قرآنی بیان کس طرح سچا ثابت ہوتا ہے - بات یہ ہے کہ یوسف کو واقعی خواب آئی تھی کہ میری بیوی بے قصور ہے مگر خواب سے اس کی تسلی تو ہو سکتی تھی مگر لوگوں میں بدنامی کا ڈر پھر بھی تھا اس لیے جب تک حمل چھپ سکتا تھا یوسف نے مریم کو اپنے گھر میں رکھا - لیکن جب پیٹ بڑا ہونے لگا - تو وہ انہیں کسی دوسرے مقام پر لے گیا - لوقا نے پیدائش مسیح کے ساتھ ہی اس کے معجزے بیان کرنے شروع کر دیئے ہیں - لیکن اگر اسی وقت سے وہ معجزے دکھا رہا تھا تو بدنامی کا سوال ہی نہیں تھا اور حمل چھپانے کی بھی ضرورت نہیں تھی - اس لیے لوقا نے یوسف اور مریم کے باہر جانے کا جواز یہ نکالا ہے کہ سات سال بعد ہونے والی مردم شماری کے واقعہ کو پہلے بیان کیا ہے کہ اس کے لیے وہ گئے تھے -

وہ وہاں غالباً کئی سال رہے کیونکہ بچہ کچھ سالوں کا ہو جائے تو پتہ نہیں لگتا کہ وہ کب پیدا ہوا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو حمل ۱۵ اکتوبر سے ۱۵ نومبر کے درمیان ہوا تھا تبھی جا کر بچہ اس موسم میں ہو سکتا ہے جب کھجور زیادہ پھل دیتی ہے جب یوسف کو پتہ لگا تو اس نے پہلے تردد کیا مگر جب خواب میں مریم کا بے گنہ ہونا ثابت ہو گیا تو اسے گھر لے آیا اور چند ماہ گھر میں رکھا جب حمل کا چھپنا مشکل ہو گیا تو اسے لیکر کسی بہانہ سے بیت الحم چلا گیا - اور وہاں بچہ پیدا ہو گیا پھر وہ کئی سال باہر رہ کر واپس آئے - تاکہ مسیح کی عمر کے متعلق شبہ نہ ہو انجیل متی ۱۳/۲ سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ کئی برس مصر میں رہے تھے

۲۷ : یہاں کھانے پینے کا حکم ہے اور یہ الفاظ بھی ہیں کہ "کہدے میں نے روزہ رکھا ہوا ہے" اگر بولنا

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ (۲۸) اس کے بعد وہ اس کو لے کر اپنی قوم کے پاس اس کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہوئی آئی جنہوں نے کہا۔ اے مریم! تونے بہت بُرا کام کیا ہے۔
قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝

يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (۲۹) اے ہارون کی بہن! تیرا باپ تو بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی۔

سرے سے منع ہوتا تو وہ یہ بات کہہ کس طرح سکتی تھیں۔ اس لیے مراد یہ ہے کہ لوگوں سے رجان چھڑانے کے لیے (کہدد کہ آج میں نے خاموشی سے ذکر الٰہی کرنا ہے۔ گویا یہاں روزہ سے مراد خاموشی کا روزہ ہے۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ نفاس اور حیض کی حالت میں ذکر الٰہی منع نہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل ؓ فرماتے تھے کہ ایام حیض میں عورت صاف کپڑے سے پکڑ کر قرآن پڑھ سکتی ہے۔

۲۸ یہ مراد نہیں کہ مریم مسیح کو پیدا ہوتے ہی اپنی قوم کے پاس لے گئی تھیں کیونکہ اس صورت میں ان کے سفر کا مقصد جو حمل کو چھپانا تھا فوت ہو جاتا ۔ متی باب ۲ سے بھی پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ بیت الحم میں پیدا ہوا۔ پھر یوسف خدا سے خبر پا کر اس کو مصر لے گیا تھا اور اسے خدا تعالےٰ نے حکم دیا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں اسے واپس نہ لانا۔ پھر لکھا ہے کہ "مسیح نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں" نوزائیدہ بچہ نبی نہیں ہو سکتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ مسیح کی بلوغت کا زمانہ تھا چنانچہ وہ وہاں رہے یہاں تک کہ ہیرودیس جو مسیحؑ کو مروانا چاہتا تھا مر گیا۔ پھر خدا نے دوبارہ الہام کیا تو یوسف مسیح کو لیکر شہر ناصرہ میں گیا تا کہ جو نبیوں نے کہا تھا کہ مسیحؑ ناصری کہلائے گا پورا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح ناصرہ میں پیدا نہیں ہوئے تھے ورنہ ناصری کہلانے کے لیے وہاں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ الغرض ناصرہ میں مسیح کے رشتہ دار نہیں تھے۔ اور قرآن میں مسیح کے رشتہ داروں اور قوم سے گفتگو کا ذکر ہے۔ اس لیے اگر یوسف اسے ناصرہ لے گیا تھا پھر بھی وہاں اس کے بولنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ مسیحؑ یوحنا کے دعویٰ تک ناصرہ میں تھا۔ اس لیے یہ کلام اس وقت تک کا نہیں ہو سکتا۔ متی باب ۲۱ سے پتہ لگتا ہے مسیح دو دفعہ یروشلم گیا تھا۔ ایک دفعہ جب گیارہ برس کا تھا دوسری دفعہ جب ۳۰ برس کا تھا اور جبکہ اس کی بعثت کا تیسرا سال تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ مکالمہ جس کا قرآن میں ذکر ہے ۔ اسی ۳۰ برس کی عمر کا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہاں تو فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کے الفاظ ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ تحملہٗ کے معنے صرف گود میں اٹھانے کے نہیں سوار کر کے لے جانے کے بھی ہیں اور اس کے معنے تائید اور نصرت کے بھی ہیں جیسے آیت مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا میں حملوا کے معنے مفردات امام راغبؒ بھی یہی لکھے ہیں اس سے بھی ظاہر ہو گیا کہ بائیبل کے بیان کے خلاف مریم مسیحؑ کی تائید اور تصدیق کرتی تھیں۔

۲۹ عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ ہارونؑ تو مریمؑ سے بہت پہلے گذرے تھے یہ قرآن کی تاریخی غلطی ہے

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝

(۳۰) اِس پر اُس نے اُس (بچّہ) کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لوگوں نے کہا۔ ہم اس سے کس طرح باتیں کریں جو کہ (کل تک) گھوڑے میں بیٹھنے والا بچہ تھا۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝

(۳۱) (یہ سنکر ابن مریم نے) کہا۔ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب بخشی ہے۔ اور مجھے نبی بنایا ہے۔

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝

(۳۲) اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے بابرکت (وجود) بنایا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے۔

وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝

(۳۳) اور مجھے اپنی والدہ سے نیک سلوک کرنیوالا بنایا ہے۔ اور مجھے ظالم اور بدبخت نہیں بنایا۔

اس کا جواب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا تھا کہ "یہود انبیاء اور صلحاء کے نام پر نام رکھا کرتے تھے"۔ اس لیے اس مریم کے بھائی کا نام بھی ہارون ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں زکریا کی بیوی ہارون کے خاندان سے تھیں اور مریم ان کی رشتہ دار تھیں اس لیے اُخت ھٰرون کے الفاظ استعمال ہو سکتے تھے (القرآن از جالندھری)

۳۰ فاشارت الیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو پتہ تھا کہ مسیح اس کا جواب دینگے (یعنی وہ پہلے ہی باتیں کیا کرتے تھے) اس لیے اس موقعہ پر ان کا کلام کرنا معجزہ نہیں تھا۔ قرآن میں آتا ہے ومھدت لہ تمہیدا (۱۵/۷۴) یعنی میں نے کافر کو اس کی ترقی کے سامان دیئے۔ پس مھد کا لفظ استعارتاً اس زمانہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو تیاری کا زمانہ ہو اور تیاری کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر آل عمران ۴۶ میں مھد کے ساتھ کھل کا لفظ بھی ہے اور کہولت کا زمانہ تیس سے پچاس سال تک ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں بولنا معجزہ نہیں کہلا سکتا۔ اگر کہولت کا کلام عام بات ہے تو مھد کا زمانہ بھی وہی لیا جائے گا جس میں عام طور پر لوگ بولتے ہیں۔ اس پر سوال ہو سکتا ہے کہ پھر پیشگوئی کیوں کی۔ تو جواب یہ ہے کہ پیشگوئی یہ نہیں تھی کہ وہ فلاں زمانہ میں کلام کرے گا بلکہ یہ تھی کہ وہ معجزانہ نوعیت کا کلام کرے گا اور تمام انبیاء معجزانہ باتیں ہی کیا کرتے ہیں۔ اس لیے مھد کے ساتھ کھل کا لفظ لگایا کیونکہ کلام خاص جیسے جوانی میں معجزہ ہوتا ہے ویسے ہی بڑھاپے میں بھی ہوتا ہے۔

۳۱-۳۳ ۔ یہاں مسیح کی خصوصیات بیان ہو رہی ہیں اس لیے عبداللہ سے مراد محض مخلوق کے نہیں بلکہ خدا کی کامل اطاعت کرنے والے اور اسکی صفات کو ظاہر کرنے والے کے ہیں۔ اگر اس کلام کو مسیح کے بچپن کا کلام سمجھا جائے تو تمام باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں نہ اس وقت مسیح خدائی صفات کو ظاہر کرتا تھا نہ اس پر کتاب اتری تھی نہ وہ نماز پڑھتا تھا نہ زکوٰۃ دیتا تھا۔ اس لیے یہ کلام بچپن کا نہیں بلکہ دعویٰ نبوت کے بعد کا ہے اگر غرض

صرف یہود کو یہ معجزہ دکھانا تھا کہ مسیح اس عمر میں باتیں کر سکتا تھا تو کوئی اور بات کروائی جا سکتی تھی یہ جھوٹ بلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ دراصل جب مریم کئی سال کے بعد اپنی قوم کے پاس آئیں۔ اور اس وقت بھی ان کو معلوم ہوا کہ ان کی قوم مسیح کے بغیر باپ کے پیدائش کو جانتی ہے بلکہ اس نے مریم کو طعنہ دیا تو فاشارت الیہ انہوں نے مسیحؑ کی طرف اشارہ کر دیا۔ کہ یہی اس کا جواب دے گا۔ چنانچہ مسیحؑ نے مندرجہ بالا جواب دے کر بتایا کہ کیا حرامزادے ایسے ہو سکتے ہیں۔ نیز کہا برّا بوالدتی اگر ماں میرے لیے ٹھوکر کا موجب ہوتی تو میں اس کا ایسا خدمت گزار کیوں ہوتا؟

مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح تو خدا تھا پھر انّی عبداللہ اور اٰتٰنِیَ الکتٰب وجعلنی نبیًّا کے کیا معنے۔ ان کے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) غلط طور پر یہ کلمات مسیحؑ کی طرف منسوب کئے ہیں۔ مگر حقیقت میں بائیبل خود قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ پہلی بات قرآن کہتا ہے مسیح نے کہا انّی عبداللہ۔ متی ۴ : ۱-۱۱ میں لکھا ہے کہ (۱) "شیطان اسے آزمانے کے لیے آیا" معلوم ہوا کہ شیطان بھی جانتا تھا کہ وہ خدا نہیں ہے بلکہ لوقا ۴ : ۱-۱۳ کے مطابق تو شیطان چالیس دن مسیح کو آزماتا رہا۔ (۲) پھر لکھا ہے جب وہ چالیس دن اور رات روزہ رکھ چکا تو بھوکا ہوا۔" بھوک بھی انسان کو لگتی ہے خدا کو نہیں لگتی۔ (۳) شیطان نے مسیح کو کہا" اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ یہ پتھر روٹی بن جائے" اس پر مسیحؑ نے یہ نہیں کہا۔ کہ میں ایسا کر تو سکتا ہوں مگر کرتا نہیں۔ بلکہ یہ کہا کہ" انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے جیتا ہے"۔ شیطان تو روٹی کھاتا نہیں دوسرا وجود وہاں مسیحؑ ہی تھا۔ اور اس نے اپنے لیے یہ کہا کہ" انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ خدا کی باتوں سے جیتا ہے"۔ جو خدا کی باتوں سے جیتا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ (۴) شیطان نے مسیح کو کہا"۔ تو اپنے تئیں (ہیکل کے کنگورے سے) نیچے گرا دے"۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو تجھے چوٹ نہیں لگے گی۔ فرشتے تجھے ہاتھوں پہ اٹھا لیں گے۔ مگر مسیح نے کہا"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو مت آزما"۔ یعنی یہ کام خدا کو آزمانے کے برابر ہے اور میں بندہ ہوں خدا کو کیسے آزماؤں؟ (۵) مسیح نے کہا اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ"۔ (مرقس ۱۳ : ۳۲) گویا مسیح کو علم غیب نہیں تھا اس لیے وہ خدا نہیں تھا۔

(۶) مسیح نے کہا تو مجھے نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا" (مرقس ۱۰ : ۱۷-۱۸) یہاں مسیح نے دو دعوے کئے ہیں ایک یہ کہ نیک صرف خدا ہوتا ہے دوسرے یہ کہ وہ نیک نہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا نہیں۔ مسیحؑ نے جو یہ کہا کہ مجھ میں نیکی نہیں اس سے مطلب یہ تھا کہ مجھ میں ذاتی نیکی نہیں ذاتی نیکی صرف خدا میں ہوتی ہے۔

دوسری بات:۔ اٰتٰنِیَ الکتٰب ہے یوحنا ۸ : ۲۸ میں مسیحؑ کہتے ہیں میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا۔ اسی طرح کہتا ہوں۔ گویا مسیحؑ کی تعلیم اپنی نہیں تھی۔ خدا کی دی ہوئی تھی

پھر لکھا ہے "یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتب منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں" (انجیل متی ۵ : ۱۷-۱۸) گویا مسیحؑ تورات ہی کو رائج کرنے آئے تھے۔

تیسری بات:۔ بقول قرآن مسیحؑ نے کہا وجعلنی نبیًا۔ یہ بھی سچ ہے کیونکہ انجیل یوحنا ۸ : ۲۹ میں لکھا ہے "وہ جس نے مجھے بھیجا وہ میرے ساتھ ہے" اور نبی اسی کو کہتے ہیں جسے خدا خلق کی ہدایت کے لیے بھیجے۔ پھر لکھا ہے "ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا یسوع نے ان سے کہا کہ اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا۔ بلکہ اس نے مجھے بھیجا" اسی نے مجھے بھیجا کے الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ نبی تھا۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے لیے باپ کا لفظ بطور محاورہ استعمال ہوا جیسے فریسیوں نے کہا۔ "ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا"۔

متی ۲۱ : ۱۰-۱۱ میں لکھا ہے "جب وہ یروشلم میں داخل ہوا تو سارے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ اور لوگ کہنے لگے کہ یہ کون ہے بھیڑ کے لوگوں نے کہا یہ گلیل کے ناصرہ کا نبی یسوع ہے"۔ یہی بات قرآن نے کہی ہے کہ وہ نبی تھا۔

پھر لکھا ہے یسوع نے کہا "میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے" (یوحنا ۷ : ۱۴-۱۶)

مرقس ۶ : ۵ میں لکھا ہے "نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا"۔ پھر یوحنا ۴ : ۱۹ میں لکھا ہے "عورت نے اسے کہا اے خداوند مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نبی ہے" ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ کہ مسیحؑ خود اپنے تئیں نبی اور خدا کا فرستادہ سمجھتے تھے بلکہ لوگ بھی ایسا ہی خیال کرتے تھے۔

چوتھی بات قرآن نے یہ کہی ہے کہ وجعلنی مبارکًا اینما کنت۔ خدا اپنی ذات میں مبارک ہے اور انسان مبارک یعنی اس سے برکت حاصل کرنے والا ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیحؑ برکت مانگتا تھا۔ وہ خود برکت دینے والا نہیں تھا۔ یعنی وہ انسان تھا اور قرآنی دعویٰ ہی درست ہے۔ لکھا ہے "تب اس نے روٹیاں آسمان کی طرف دکھا کر برکت چاہی"۔ مرقس ۶ : ۳۹-۴۱۔ پھر ۶ : ۴۱-۴۲ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ برکت آ بھی گئی۔ اور چند روٹیوں سے بہت سے لوگ سیر ہو گئے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ خدا مبارِک اور مسیحؑ مبارَک ہے پھر لکھا ہے "اور جس نے مجھے بھیجا ہے میرے ساتھ ہے باپ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا (یوحنا ۸ : ۲۹) گویا مسیحؑ تسلیم کرتا ہے کہ وہ خدا سے برکت پانے کا محتاج ہے اور یہ کہ خدا نے اسے برکت دی ہے۔

پانچویں بات:۔ بقول قرآن مسیحؑ نے یہ کہا کہ واوصانی بالصلوٰۃ۔ یعنی خدا نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے۔ حکم انسان ہی کو دیا جاتا ہے۔ پھر نماز دعا ہے اور دعا انسان ہی مانگا کرتے ہیں۔ مگر لوقا ۹ : ۱۸، ۱۱ : ۱ اور ۲۲ : ۴۴ سے ظاہر ہے کہ مسیحؑ بھی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے۔ اس لیے وہ انسان تھے۔ مگر مسیحؑ کی دعا اسلامی نماز کی دعا یعنی سورۂ فاتحہ سے بہت ادنیٰ ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اول دعا شروع ہونے سے پہلے بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کو مدد طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ پھر اس میں خدا تعالیٰ کی چار بنیادی صفات کا بیان ہے۔ مگر مسیحؑ نے

خدا کو صرف قدوس کے نام سے پکارا ہے۔ پھر سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ کا اسم ذات بیان ہوا ہے مگر مسیحؑ نے اسے صرف باپ کہا ہے جس کے معنے صرف اتنے ہیں کہ اس میں باپ کی سی شفقت پائی جاتی ہے حالانکہ تخلیق اور وجود بھی ہیں۔ پھر انجیل کہتی ہے تیری بادشاہت آسمان پر سے زمین پر آوے۔ جو خدا کو دعا دینے والی بات ہے اور اس کی ہتک ہے مگر قرآن کہتا ہے وہ پہلے ہی ملک یوم الدین ہے۔ پھر سورۂ فاتحہ میں جو ایاک نعبد و ایاک نستعین کے الفاظ میں اظہارِ عبودیت ہے اس کا انجیل میں ذکر تک نہیں۔ پھر فاتحہ میں ہر کام میں کامیابی کا قریب ترین راستہ (صراط مستقیم) مانگا گیا ہے مگر مسیحؑ نے صرف روز کی روٹی مانگی ہے پھر انجیل نے صرف یہ دعا سکھلائی ہے "ہمارے گناہوں کو بخش"۔

گویا مثبت گناہوں کی بخشش مانگی گئی ہے لیکن منفی گناہوں کا ذکر نہیں۔ یعنی جو نیکیاں ہم نے نہیں کیں ان کے بدنتائج سے محفوظ ہونے کی کوئی دعا نہیں سکھائی گئی۔ مگر قرآن نے غیر المغضوب علیھم میں مثبت سے اور ولا الضالین میں منفی گناہوں سے بچنے کی دعا سکھلائی ہے۔

نماز کے بعد زکوٰۃ کا حکم ہے انجیل متی ۲۲/۱۸-۲۲ میں بھی لکھا ہے "جو چیزیں قیصر کی ہیں قیصر کو جو خدا کی ہیں خدا کو دو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسیحؑ نے اپنے مال میں سے خدا کا حصہ دینے کا قانون تسلیم کیا۔ یہی زکوٰۃ ہے اسی طرح متی ۱۵/۳۲ تا ۳۹ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ غرباء کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔

پھر حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔ وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ۔ یعنی مجھے والدہ سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے لوقا ۲/۵۱ میں ہے "وہ ان کے (یعنی مریم کے) ساتھ روانہ ہو کر ناصرہ میں آیا۔ اور ان کے تابع رہا۔ اور اس کی ماں نے یہ سب باتیں اپنے دل میں رکھیں" گویا مسیح ماں کی اطاعت کرتا تھا۔

پھر فرماتا ہے یجعلنی جبارًا شقیًّا۔ جبار کا لفظ جب انسان کے لیے آئے تو معنے ہوتے ہیں دوسروں کو گرا کر طاقت چاہنے والا گویا یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کے مقابلہ میں نرم دل اور لوگوں سے حسن سلوک کرنے والے کے لفظ آئیں گے۔ اب متی ۱۱/۲۹ میں لکھا ہے۔ "مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم اور دل سے خاکسار ہوں"۔ پھر لکھا ہے: "دیکھ تیرا بادشاہ فروتنی سے گدھی پہ بلکہ گدھی کے بچہ پر سوار ہو کر تیرے پاس آتا ہے" گویا وہ بجائے لوگوں کو گرانے کے اپنے تئیں فروتن کہتا ہے۔

لفظ شقی سعادت کے مقابلہ میں آتا ہے اور سعید کے معنے ایسے شخص کے ہیں جو جائز نصرت کرنے والے کی نصرت سے محروم نہ ہو۔ یوحنا ۱۶/۳۳ میں بھی یہی ہے۔ "لکھا ہے" میں نے تم سے باتیں کہیں تاکہ تم مجھ سے اطمینان پاؤ۔ تم دنیا میں مصیبت اٹھاؤ گے لیکن خاطر جمع رکھو کہ میں نے دنیا کو جیتا ہے" گویا مسیحؑ نے اپنے تئیں نصرت یافتہ کہا ہے۔

پس ان تمام امور میں انجیل قرآن کی مؤید ہے اور عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ یہ باتیں قرآن نے مسیحؑ کی طرف غلط طور پر منسوب کی ہیں بالبداہت غلط ٹھہرتا ہے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ	(۳۴) اور جس دن میں پیدا ہوا تھا اس دن بھی مجھ پر سلامتی نازل
وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ	ہوئی تھی اور جب میں مروں گا اور جب مجھے زندہ کر کے اٹھایا
حَیًّاo	جائیگا (اسوقت بھی مجھ پر سلامتی نازل کی جائے گی)

۳۴۔ یَوْمَ وُلِدْتُّ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مسیح مسِ شیطان سے پاک تھے۔ مگر حضرت یحییٰؑ کے متعلق بھی آتا ہے کہ وسلٰمٌ علیہ یوم وُلِدَ ویوم یموتُ ویوم یبعثُ حیًّا (مریم ۱۶) اس سے ظاہر ہے کہ مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ یوم یموتُ سے یہ استدلال کہ مسیحؑ صلیب پر نہیں لٹکائے گئے غلط ہے صلیب پر لٹکنا سلامتی کے خلاف نہیں صلیب پر مرنا سلامتی کے خلاف ہے کیونکہ از روئے بائیبل صلیب پر مرنا لعنتی موت ہے (استثناء ۲۱/۲۳)

ضمناً یہ بتانا ضروری ہے کہ یحییٰؑ کے متعلق یوم یموت کے الفاظ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ وہ شہید نہیں ہوئے مگر یہ غلط ہے ہم السلام علیکم کہتے ہیں تو یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تم مروگے نہیں۔ موت سلامتی کے خلاف نہیں لعنتی موت خلاف ہے اسی لیے یہاں موت کا ذکر بھی ساتھ ہی ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ سلامتی دینے والا کوئی اور ہے اور لینے والا کوئی اس سے معلوم ہوا کہ مسیحؑ انسان تھا خدا نہیں تھا کیونکہ خدا کو کوئی اور سلامتی نہیں دیتا مگر مسیحؑ کو سلامتی دی گئی۔

یوم یُبعثُ حیًّا۔ مسیحؑ چونکہ صلیب پر مرے نہیں بلکہ کالمیت ہوئے تھے اس لیے یوم یبعث حیًّا سے مراد وہ وقت ہوگا جب مسیح صلیب پر کالمیت ہوا لیکن پھر وہ اس موت سے بچا لیا گیا گیا۔ بلاشبہ ایک بعث مرنے کے بعد بھی ہے مگر اس سلامتی کا مسیحؑ دوسرے کو ثبوت نہیں دے سکتے تھے حالانکہ دشمن کے سامنے بلا دلیل دعویٰ پیش نہیں کیا جاتا۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد انسان زندہ کیا جاتا ہے اس کے لیے ثبوت ضروری ہے مگر یہ کہ مرنے کے بعد کیا سلوک ہوگا ایسی چیز ہے جس کا ثبوت غیروں کو دینے کی ضرورت نہیں۔

انجیل میں ان تینوں قسم کی سلامتی کا ذکر ہے مسیحؑ کی پیدائش پر گڈریوں نے کشف میں دیکھا کہ فرشتے کہتے ہیں "خدا کو آسمان پر تعریف اور زمین پر سلامتی اور آدمیوں سے رضامندی ہووے" (لوقا ۲/۱۴) "سلامتی ہووے" دعائیہ کلمہ ہے اور خدا خود سلامتی والا ہے۔ دعا کا محتاج نہیں اس لیے زمین پہ سلامتی کے الفاظ مسیحؑ کے لیے ہیں اور اس کی بشریت کو ثابت کرتے ہیں۔

یوم اموت والی سلامتی کا ذکر اعمال ۷/۵۶ میں ہے لکھا ہے "میں آسمان کو کھلا اور ابن آدم کو خدا کے داہنے ہاتھ کھڑا دیکھتا ہوں" اسی طرح یوم یبعث حیًّا والی سلامتی کا ذکر لوقا میں ہے۔ لکھا ہے "اب سے (یعنی واقعہ صلیب کے بعد سے) ابنِ آدم خدا کی قدرت کے داہنے ہاتھ بیٹھا رہے گا۔ (یعنی فضل الٰہی

اس کے شامل حال رہے گا) ۳۲/۵۶ - حضرت مسیح کے متعلق قرآن میں آتا ہے (۱) اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۱۹/۳۰ (۲) وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۱۹/۳۱) - (۳) وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۱۹/۳۲) - (۴) وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۱۹/۳۳) - بالکل اسی مفہوم کے الفاظ حضرت یحییٰ کے متعلق آتے ہیں دیکھیں اس سورۃ کی آیات ۱۳، ۱۴، ۱۵، اور ۱۶ - حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میں اس گہری مشابہت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے تھے مشابہت ملا میں مسیح اور یحییٰ دونوں کی پیدائش اور موت سلامتی والی بتلائی گئی ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے دنیا میں آنے سے دنیا پر سلامتی نازل ہوگی یعنی وہ کفر و گناہ سے نجات پائے گی ورنہ یہ معنے نہیں کہ وہ دونوں بچ جائیں گے کیونکہ سب بچے بڑے ہوتے ہیں - آخر بچے ہیں تب ہی بڑے ہوتے ہیں اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو قابل ذکر ہوتی - یہ جو کہا کہ موت بھی سلامتی والی ہوگی اس سے یہ مراد نہیں کہ قتل نہیں ہوں گے - کیونکہ جب انسان مرگیا تو خواہ کسی طرح سے مرا (سوائے لعنتی موت کے) اس سے فرق نہیں پڑتا - سلامتی والی موت وہ ہے جس کے بعد بھی انسان کا نام جاری رہے اور یہ سلامتی یحییٰ اور مسیح دونوں کو حاصل ہوئی - یحییٰ کو اس طرح کہ وہ مسیح کے لیے بطور ارہاص تھے - مسیح زندہ رہا - تو وہ بھی زندہ ہے اور مسیح کو بطور نبی زندگی اسلام کے ذریعہ ملی ہے ورنہ عیسائی گو مسیح کو مانتے ہیں مگر در اصل وہ مسیح کو نہیں خدا کے بیٹے کو مانتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں ہے - یہ جو فرمایا کہ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا یعنی ان پر اس دن بھی سلامتی ہوگی جب وہ مر کر دوبارہ اٹھائے جائیں گے - اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے دو باتیں دنیا میں پوری ہونے والی بتلائیں جب غیر موافق حالات میں وہ پوری ہوگئیں، تو انسان سمجھ سکتا ہے کہ تیسری بھی پوری ہوجائے گی - چنانچہ ان کے ذریعہ دنیا سے کفر اور گناہ مٹا اور ان کی پیدائش کے بعد بھی ان کے کام جاری رہے یعنی پیدائش اور موت دونوں میں ان کو سلامتی دی گئی - جب یہ باتیں ہوگئیں تو بعث بعد الموت کے وقت سلامتی کا ملنا بھی سمجھ آسکتا ہے - پھر مرنے کے بعد نبی کی ایک بعثت اس دنیا میں ہوتی ہے وہ اس طرح کہ جب اس کی سچائی کا رعب دلوں سے مٹ جاتا ہے اس وقت خدا ایک نیا نبی بھیجتا ہے جو اس کی سچائی کی گواہی دیتا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ کیا وہ جھوٹا ہوسکتا ہے جس کی زندگی بھی اس کی صداقت کا ثبوت ہے - اس کے متعلق ہونے کی پیشگوئی بھی موجود ہیں اور اس کے بعد اور نبی آئے گا جو اس کی صداقت کی گواہی دے گا (ہود ۱۱/۱۸) - اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یحییٰ اور مسیح کو الہام کی بنا پر نبی کہہ کر ان کی سچائی پر مہر لگادی - سورۃ جمعہ ۳-۴ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے (ایک بروزِ کامل کی شکل میں) اٰخَرِیْنَ میں مبعوث ہونے کا نام بھی بعثت رکھا گیا ہے -

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ (۳۵) (دیکھو، یہ حقیقی) عیسیٰ بن مریم ہے۔ اور یہ (اس کا اصل)
قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ سچا واقعہ ہے جس میں وہ (لوگ)، اختلاف کر رہے ہیں۔
مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ (۳۶) (خدا تعالیٰ) کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنالے۔ وہ اس
سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا بات سے پاک ہے وہ جب کبھی کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے (ایسا)
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ہو جائے تو ویسا ہی ہونے لگتا ہے (پھر امداد کیلئے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے)

---

۳۵ مسیحؑ کی ساری زندگی کے متعلق عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں میں اختلافات ہیں بعض انہیں بے باپ سمجھتے ہیں بعض کے نزدیک وہ یوسف کے نطفہ سے تھے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ خدا کے نطفہ سے تھے ایک فریق نے انہیں ولد الحرام قرار دیا ہے اسی طرح بعض انہیں نبی سمجھتے ہیں بعض خدا کا بیٹا اور بعض مفتری انسان۔ واقعہ صلیب کے متعلق عام مسلمان سمجھتے ہیں وہ صلیب پر لٹکائے ہی نہیں گئے ہم سمجھتے ہیں کہ صلیب پر لٹکائے گئے تھے مگر صلیب پر مرے نہیں عیسائی کہتے ہیں کہ صلیب پر مرکر پھر زندہ ہو گئے اور یہود کہتے ہیں وہ صلیب پر لعنتی موت مرے۔ اس آیت میں فرماتا ہے کہ حقیقی مسیحؑ وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں ورنہ تم سب کا اختلاف بتاتا ہے کہ حق تمہارے پاس نہیں۔

مسیحؑ کو ابنِ مریم کہنے پر عیسائی چڑتے ہیں حالانکہ مرقس ۶/۳ میں لکھا ہے "کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں"۔ دراصل ابن مریم ہونا ہی مسیحؑ کی صحیح پہچان ہے ورنہ صرف عیسیٰ یا صرف ابنِ آدم یا صرف ابن اللہ کہلانا اس کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ الفاظ تو اوروں کے متعلق بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور خود بائیبل میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

۳۶ یتخذ من ولد:۔ عیسائیوں میں سے بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیحؑ خدا بیٹا تھا اور بعض کا یہ کہ خدا کا نطفہ نہیں تھا بلکہ اس نے اسے بیٹا بنا لیا تھا۔ اس لیے یہاں ایسے الفاظ استعمال کیے جو دونوں قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ نہ خدا کا کوئی بیٹا ہے نہ اس نے بیٹا بنایا ہے۔ عیسائی مسیح کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہیں اس کا بارِ ثبوت ان پر ہے اگر وہ کہیں کہ بائیبل میں مسیح کو ابن اللہ کہا گیا ہے تو بائیبل سے ثابت ہے کہ یہ محاورہ تھا جو بیسیوں آدمیوں کے متعلق استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ لکھا ہے "جو لوگ اس جہان کے اور قیامت کے شریک ہونے کے لائق ٹھہرتے نہ بیاہ کرتے ہیں۔ نہ بیاہے جاتے ہیں۔ وے فرشتوں کی مانند ہیں اور قیامت کے بیٹے ہو کے خدا کے بیٹے ہیں" (لوقا ۲۰/۳۵-۳۶)

پھر لکھا ہے "تمہارا باپ تمہارے مانگنے سے پہلے جانتا ہے کہ تمہیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے" (متی ۶/۸)۔ اسی طرح لکھا ہے "اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشو تو تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہارے گناہ

بخشے گا" (متی ۶/۱۴) پھر لکھا ہے "ایک خدا جو سب کا باپ کہ سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور تم سب میں ہے۔" (افسیوں ۴/۶) اور لکھا ہے "اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے" (خروج ۴/۲۲) ان حوالوں سے ظاہر ہے۔ کہ خدا کے بیٹے کا لفظ محاورۃً انسانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مزید حوالوں کے لیے دیکھیں مرقس ۱۱/۱۴، لوقا ۶/۳۶ اور ۱۲/۳۰-۳۲ اور یوحنا ۸/۴۱۔

اب ہم بتاتے ہیں کہ پرانے اور نئے عہد نامہ سے ثابت ہے کہ خدا کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں تھا

استثناء ۶/۴ میں لکھا ہے "سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے" یعنی وہ وحدہٗ لاشریک ہے اس کا کوئی بیٹا نہیں۔ پھر لکھا ہے "یہوا میں ہوں یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا" (یسعیاہ ۴۲/۸) یعنی نہ صرف یہ کہ میرا اپنا بیٹا نہیں بلکہ میں کسی کو بیٹا بناؤں کا بھی نہیں۔

انجیل میں ہے (۱) "سب حکموں میں اوّل یہ ہے کہ اے اسرائیل سن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے" (مرقس ۱۲/۲۹) (۲) "اسی واحد دانا خدا کو یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ حمد پہنچا کرے" (رومیوں ۱۶/۲۷) (۳) "ازلی ابدی بادشاہ غیر فانی نادیدنی واحد حکیم خدا کی عزت اور جلال ابدالآباد ہووے۔" (تمطاؤس ۱ـ ۱/۱۶-۱۷) یہاں جو صفات الٰہی بیان ہوئی ہیں ان کے بعد کسی دوسرے خدا کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ الفاظ مسیح کے متعلق نہیں ہیں کیونکہ مسیح نادیدنی نہیں تھا۔ غرض ان حوالوں میں خدا کو واحد کہا گیا ہے جب واحد ہے تو اس کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ گویا پرانے اور نئے عہد نامے نے تصدیق کر دی کہ ماکان للہ ان یتّخذ من ولدٍ قرآن نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ سبحٰنہٗ۔ بیٹا تو اجرائے نسل کے لیے یا شہوت یا ساتھی کی خواہش کے نتیجہ میں ہوتا ہے مگر خدا ان چیزوں سے پاک ہے۔

کہا جا سکتا تھا کہ اس نے مددگار کے طور پر بیٹا بنا لیا ہے اس کا جواب یہ دیا کہ فاذا قضیٰ امرًا فانّما یقول لہٗ کن فیکون جب صرف اس کے کہنے سے کام ہونے لگتا ہے۔ تو اسے مددگار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ کُنْ کا حکم تو اسی وقت دیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شے موجود ہو۔ اس لیے ثابت ہوا کہ مادہ ازلی ہے۔ مگر یہ غلطی ہے لفظ کُنْ عربی میں محض اظہار خواہش کے لیے اور بغیر مخاطب کی موجودگی کے بھی بولا جاتا ہے جیسے نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ دور سے گرد اُڑتی دیکھی تو فرمایا "کن اباخیثمہ" اگر کوئی کہے کہ قرآن میں ہے ان اللہ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر تو کیا وہ مرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شی کے معنے عربی میں اس چیز کے ہیں جسے چاہا جائے۔ یعنی مشیت کے ہیں۔ اور جب خُدا کی یہ مشیت نہیں ہو سکتی کہ میں مر جاؤں تو آیت پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر امر کے معنے کسی ایسی چیز کے ہیں جس کا ارادہ کیا گیا ہو۔ اس جہت سے بھی اس آیت پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (٣٧) اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اُسی کی عبادت
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ (٣٨) مگر مختلف گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور سچائی کو
فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ چھوڑ دیا) پس جن لوگوں نے ایک بڑے دن میں حاضر ہونے
مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ کا انکار کیا۔ ان پر عذاب نازل ہوگا۔
اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ یَوْمَ (٣٩) جس دن وہ ہمارے حضور حاضر ہونگے۔ اس دن ان کی قوت
یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ شنوائی بہت تیز ہوگی۔ اور نظریں بھی بہت تیز ہوں گی لیکن
الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وہ ظالم آج بہت بھاری گمراہی میں مبتلا ہیں۔
وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ (٤٠) اور ان کو اس دن سے ڈرا جس دن (افسوس اور ملال کی) چھائی
قُضِیَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ ہوئی ہوگی (یعنی قیامت کے دن سے) جب سب معاملات کا فیصلہ
وَّهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ ہو جائیگا اور (اب تو) یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

---

٣٧ یعنی جب خدا تعالیٰ میری اور تمہاری دونوں کی ربوبیت کے لیے کافی ہے تو پھر سیدھی راہ یہی ہے کہ

٣٨ حزب انسانوں کے ایسے گروہ کو کہتے ہیں جس کے خیال اور اعمال میں ہم آہنگی ہو۔ مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو ایک ہی مسیح اور ایک ہی کتاب کو مانتے تھے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ جب اختلاف کیا تو ظاہر ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی گروہ حق پر ہو سکتا تھا۔ اس لیے جھوٹوں کے متعلق فرمایا۔ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا یعنی ان کے لیے عذاب ہے۔

٣٩ ۔ مومن جن صفاتِ الٰہیہ کو یہاں مانتے ہیں اگلے جہان میں زیادہ وضاحت سے ان کا ظہور ہوگا اور غلط روایتوں کی وجہ سے کانوں اور آنکھوں پر جو پردے ہیں وہ وہاں اُٹھ جائیں گے اس لئے نگاہیں زیادہ دیکھیں گی اور کان زیادہ سنیں گے۔ یہ حالت مومن و کافر دونوں کی ہوگی۔ اس لیے لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کے یہ معنے نہیں کہ اسمع بهم وابصر کے بعد ضلالت ملتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی غلطیوں کا پتہ تو لگ جائے گا مگر اس وقت کا ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا۔

٤٠ یوم الحسرۃ اس لیے کہا کہ اس دن حقیقت حال کھل جانے پر وہ چاہیں گے کہ کاش وہ ایمان لا چکے ہوتے۔ وھم فی غفلۃ وھم لا یؤمنون میں بتایا کہ باوجود ہر قسم کے نشان دیکھنے کے کفار کے دل سابق کفر اور بداعمالیوں کی وجہ سے غافل رہتے ہیں ان میں صفائی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔

ع ۲
۵

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ۝	(۴۱) ہم یقیناً (ساری) زمین کے بھی وارث ہونگے۔ اور ان لوگوں کے بھی جو اس پر رہتے ہیں۔ اور (آخرکار) سب لوگ ہماری طرف ہی لوٹا کر لائے جائیں گے۔
وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۝ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۝	(۴۲) اور تو قرآن کریم کی رُو سے ابراہیم کا ذکر کر۔ وہ یقیناً بڑا راستباز تھا اور نبی تھا۔

---

۴۱ ہ آیت کے نزول کے وقت عیسائیوں کی حکومت بہت محدود تھی مگر اس میں جو فرماتا ہے کہ ساری دنیا کی حکومت ان سے چھین لی جائیگی۔ اس میں دو پیشگوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک وقت آئے گا جب عیسائی ساری دنیا کے وارث ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ پھر یہ حکومت ان سے لے لی جائے گی۔ والینا یرجعون :- اور جو لوگ خدائے واحد سے منہ موڑ بیٹھے ہیں اس کی طرف لوٹائیں جائیں گے۔ یعنی انہیں تبلیغ کی جائے گی جس کی وجہ سے وہ شرک چھوڑ کر توحید کے قائل ہو جائیں گے۔

۴۲ ہ پیدائش $\frac{۲۰}{۲-۱۲}$ میں بتایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ نے بادشاہ سے ڈر کر اپنی بیوی کو بہن کہا اور اسے بھی کہا کہ تو مجھے اپنا بھائی کہنا گویا جھوٹ بولا اور جھوٹ کی ترغیب دی۔ اس لیے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ بائیبل ابراہیمؑ کو صدیق قرار نہیں دیتی۔ مگر وہ صدیق تھا اس لیے اے نبیؐ تو اسے اس شکل میں پیش کر جس میں یہ کتاب (قرآن) پیش کرتی ہے۔ صدیق کے ایک معنے تو اکثر سچ بولنے کے ہیں مگر یہ معنے بھی ہیں کہ وہ غلطی سے بھی جھوٹ نہ بولے۔ اور یہ بھی کہ وہ جھوٹ بول ہی نہ سکتا ہو۔ اور صدیق ایسے شخص کو بھی کہتے ہیں جو قول و اعتقاد دونوں میں سچا ہو۔ اور اس کا فعل بھی اس کی سچائی کی تائید کر رہا ہو۔ یہ گویا کمال صدیقیت ہے۔ چونکہ یہاں صدیق کا لفظ خدا تعالےٰ نے استعمال کیا ہے اس لیے نبی کی شان کے مطابق آخری معنے ہی ہو سکتے ہیں ہر نبی صدیق ہوتا ہے۔ پھر یہاں لفظ صدیق الگ بیان کیوں کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفاتِ حسنہ اپنے اندر دو معنی اور دو استعمال رکھتی ہیں۔ ان کا ایک استعمال بطور صفت ہوتا ہے۔ اور ایک بطور درجہ۔ مثلاً کبھی ہم کسی کو ایک آدھ جھوٹ بولنے پر کاذب کہیں گے۔ اور کبھی جھوٹ کا اتنا عادی ہونے پر کہ کاذب اس کا مقام بن جائے۔ جب ایسے الفاظ بطور صفات استعمال ہوں تو بڑے درجہ والے کے لیے چھوٹا درجہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ منجملہ اور صفات کے یہ صفت خصوصیت کے ساتھ اس کے عامل میں پائی جاتی ہے جیسے نبی کریم صلعم کو مومن کہا گیا ہے۔ لیکن جب درجہ کے لحاظ سے استعمال ہوں تو چونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہی خصوصیت مسلمہ اس میں پائی جاتی ہے اس لیے ہر لفظ اپنے درجہ کے لیے ہی بولا جائے گا۔ یہاں صدیق کا لفظ درجہ کے لیے نہیں بلکہ راستبازی کے اعلیٰ نمونہ کے معنوں میں آیا ہے۔

جس ترتیب سے انبیاء آئے ہیں قرآن نے اس ترتیب سے بھی ان کا ذکر کیا ہے اس لئے جہاں یہ ترتیب

بدلی ہے وہاں مصلحتاً بدلی ہے۔ اس سورۃ میں یہ ترتیب یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ ابراہیمؑ نے اسحٰقؑ اور اسمٰعیلؑ دونوں کے متعلق پیشگوئیاں کی تھیں۔ بنی اسحٰقؑ میں نبوت کو کبھی ختم ہونا چاہیے تھا۔ تاکہ بنی اسمٰعیلؑ سے الٰہی وعدہ پورا ہو۔ پس مسیحؑ کی آمد سے جو بن باپ تھا۔ اسرائیلی سلسلہ ختم ہوا تاکہ اسمٰعیلی سلسلہ شروع ہو۔ اسی لیے یہاں پہلے ذکر یا کا ذکر کیا۔ جو مسیحؑ کے لیے بطور ارہاص آنے والے وجود یحییٰؑ کے باپ تھے۔ پھر مسیحؑ کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ وہ توحید کے قائل تھے۔ اس کے بعد ابراہیمؑ کا ذکر کرکے بتایا کہ مسیحیت تو ابراہیمی سلسلہ کی شاخ ہے جب جڑ میں شرک کی تعلیم نہیں تھی تو شاخ میں کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر اس کے بعد اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ وعدے جو اسحاقؑ سے تھے پورے ہو گئے اب اسمٰعیلؑ کے ساتھ وعدوں کے مطابق محمد رسول اللہ صلعم آ گئے ہیں۔ پھر ان پر کیا اعتراض۔

پیدائش $\frac{21}{18،13}$ میں لکھا ہے:" اس لونڈی کے بیٹے (اسمٰعیل) سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے" پھر لکھا ہے میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ (آیت ۱۸) پھر لکھا ہے کہ تب خدا نے فرمایا کہ بے شک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا۔ تو اس کا نام اضحاق رکھنا میں اس سے بھی اور پھر اس کی اولاد سے اپنا عہد جو ابدی عہد ہے باندھوں گا۔ اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی ...... اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔ لیکن میں اپنا عہد اضحاق سے باندھوں گا۔ جو اگلے سال اسی وقت مقررہ پر سارہ سے پیدا ہوگا۔" (پیدائش $\frac{17}{19-21}$)

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ خدا کا عہد دونوں سے تھا مگر اسحاقؑ سے عہد پہلے پورا ہونا تھا پھر پیدائش $\frac{17}{8-7}$ میں بھی یہ عہد ساری نسل ابراہیمی کے متعلق ہے۔ نیز لکھا ہے میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک۔ جس میں تو پردیسی ہے ایسا دونگا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے"۔ ایک طرف کنعان کے متعلق دائمی طور پر نسل ابراہیمی کے ہاتھوں میں رہنے کی پیشگوئی تھی۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کنعان پر مسلمان تو ۱۲۵۹ سال قابض رہے اور یہودی ۱۰۸۰ سال اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ عہد بنی اسمٰعیلؑ سے ویسا ہی تھا جیسا بنی اسحاقؑ سے۔

انبیاء کے نام ان کی آئندہ زندگی کے کاموں کی طرف اشارہ کرنے والے ہونے میں بعض دفعہ انکے نام الہاماً رکھے جاتے ہیں اور بعض دفعہ ویسے الٰہی تصرف کے ماتحت رکھوائے جاتے ہیں۔ جیسے محمد رسولؐ اللہ کا نام تھا کہ آپؐ کے ماں باپ نے رکھا تھا۔ ابراہیمؑ کا نام بھی ان کے باپ نے الٰہی تصرف کے ماتحت رکھا تھا۔

بائیبل میں ابراہیمؑ کا نام ابرام آتا ہے اور لکھا ہے کہ تو بہت قوموں کا باپ ہوگا۔ اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا" پیدائش $\frac{17}{4-5}$) عبرانی عربی سے نکلی ہے۔ اور عربی میں ابرہم کے معنے ایسی اچھی بحث کرنے والے کے ہیں جو دوسرے کو اپنا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھا دے اور اسے ساکت کر دے چنانچہ $\frac{2}{259}$ سے بھی اور بائیبل سے بھی ظاہر ہے کہ ابراہیم بہت عمدہ بحث کرنے والے تھے عبرانی میں ھا

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا ۝

(۴۳) (اور اس وقت کو بھی یاد کر اور لوگوں کے سامنے بیان کر) جب ابراہیم نے اپنے باپ کو کہا تھا کہ اے میرے باپ! تو کیوں ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے جو سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، اور نہ تیری کسی تکلیف کو دور کرنے پر قادر ہیں۔

يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَٱتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا ۝

(۴۴) اے میرے باپ! مجھے ایک خاص علم عطا کیا گیا ہے جو تجھے نہیں ملا پس (باوجود اس کے کہ میں تیرا بیٹا ہوں) تو میری اتباع کر۔ میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

يَٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝

(۴۵) اے میرے باپ۔ شیطان کی عبادت نہ کر۔ شیطان یقیناً خدائے رحمن کا نافرمان ہے۔

يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ ٱلرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ۝

(۴۶) اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ تجھے خدائے رحمن کی طرف سے (نافرمانی کی وجہ سے) کوئی عذاب نہ پہنچے (جس کے نتیجہ میں تو شیطان کا دوست ہو جائے۔

لگانے سے جمع بن جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا۔ کہ جب تو کئی قوموں کا باپ بنے گا تو بہت سے افراد کا مجموعہ بن جائے گا۔ اس لئے تیرا نام ابراہام ہوگا۔ قرآن میں بھی ہے إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً (۱۶/۱۲۱)

۴۳ہ ہستی باری تعالےٰ کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ سمیع اور بصیر اور غنی ہے یعنی دعاؤں کو سنتا ہے ضروریات کو دیکھتا ہے اور پھر حاجتیں پوری کرنے پر قادر بھی ہے (غنی کے معنی ہیں کفایت کرنے والا) مگر بُت چونکہ ان تینوں صفات سے محروم ہیں اس لیے ان کی پرستش حماقت ہے۔

۴۴ہ ابراہیمؑ کے لیے یہ بہت بڑا ابتلا تھا کہ اپنے باپ کو کہنا پڑا کہ مجھے وہ آتا ہے جو تجھے نہیں آتا اور تو غلطی پر ہے پس میری اتباع اختیار کر۔

۴۵ہ کبھی کوئی شیطان کی عبادت نہیں کرتا اس لیے لَا تَعْبُدِ ٱلشَّيْطَٰنَ کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے کہ عبادت صرف سجدہ کا نام نہیں بلکہ کسی بات کو بلا دلیل پورے طور پر ماننا بھی عبادت کہلاتا ہے اور کسی کی خلافِ عقل اتباع شیطان ہی کی اتباع ہے۔

إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا۔ بے جان بتوں کیلئے نافرمانی کا لفظ نہیں لگتا۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ یہاں شیطان سے مراد بُت نہیں۔ بلکہ لا تعبد الشیطان میں بلا دلیل بات ماننے سے روکا گیا ہے

۴۶ہ رحمٰن تو رحمتیں نازل کرتا ہے نہ کہ عذاب مگر یہاں رحمٰن کی طرف سے عذاب بھیجنے کا ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صفتِ عذاب کسی اور صفت الٰہی کے رد کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ شرک میں سب سے بڑا انکار

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِيًّا ۝

(۴۷) اس پر ابراہیم کے باپ نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے متنفر ہو رہا ہے؟ اے ابراہیم! اگر تو باز نہ آئیگا تو میں تجھے ضرور سنگسار کر دونگا اور (بہتر ہے کہ) تو کچھ دیر کیلئے میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تاکہ غصہ میں میں کچھ کر نہ بیٹھوں)

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِيًّا ۝

(۴۸) اس پر ابراہیم نے) کہا۔ اچھا میری طرف سے تجھ پر ہمیشہ سلامتی کی دعا پہنچتی رہے (یعنی میں تجھ سے الگ ہو جاتا ہوں) میں اپنے رب سے تیرے لیے ضرور مغفرت کی دعا کرونگا۔ وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِيًّا ۝

(۴۹) اور (اے باپ) میں تم کو اور جن (معبودوں) کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو سب کو چھوڑ دونگا اور صرف اپنے رب کے حضور دعائیں مانگونگا۔ (اور) یقیناً میں اپنے رب کے حضور دعا کرنے کی وجہ سے بدنصیب نہ بنونگا۔

صفت رحمانیت کا ہی ہوتا ہے اس لیے مشرکوں کے لیے صفتِ رحمانیت عذاب کا موجب ہو جاتی ہے۔ مثلاً رحمانیت کا تقاضا ہے کہ خدا کی طرف سے شریعت آئے مگر عیسائی شریعت کو لعنت کہتے ہیں اس لیے انہوں نے رحمانیت کا انکار کر دیا پہلے فرمایا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کر اب فرمایا کہ تو باز نہ آیا تو شیطان کا دوست بن جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کی دوستی اس کی عبادت سے بھی بڑھ کر ہے۔

۴۷ اگر کسی کے پاس صداقت ہو تو اس کا عفو اور درگذر کرنا دونوں دلیل کے ماتحت ہوتے ہیں۔ والد ابراہیمؑ کے پاس صداقت نہیں تھی اس لیے ابراہیمؑ کی معقول بات پر بجائے دلیل دینے کے وہ بعید خفا ہو گئے مگر اپنی کمزوری کو خود محسوس کرتے ہوئے کہا کہ (اس وقت غصہ کی وجہ سے مجھے اپنے اوپر قابو نہیں ہے) اس لیے کچھ دیر کے لیے میرے سامنے سے ہٹ جا (ملیّا کا مطلب چند گھنٹے ہوتا ہے)۔ یہ ایک مشرک کا حال تھا مگر مولوی ہیں کہ غصہ میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ احمدیوں کی عورتیں اٹھا لینا بھی جائز ہے۔

۴۸ ابراہیمؑ نے کہا کہ آپ تو مجھ سے جھوٹے معبودوں کو نہ ماننے پر خفا ہو گئے ہیں اور میں یہ دیکھ کر کہ آپ میرے سچے معبود کے منکر ہیں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

جو لوگوں کے اعزاز و اکرام کے لیے انتہائی کوشش کر کے ان کی کامیابی پر بڑا خوش ہو ان کی تکلیف پر بیتاب ہو جاتا ہو اور ہر وقت اس کا خیال رکھنے والا ہو یعنی انتہائی خیر خواہ ہو اسے حفی کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ میرا خدا حفی ہے اور والدین میں اس کی اس صفت کا ادنیٰ پرتو ہوتا ہے۔ اس لیے محبت الٰہی کا یہ تقاضا ہے کہ میں اس کے لیے بھی دعا کروں جس کے وجود میں صفات الٰہیہ کا ظہور ہو۔

۴۹ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِيًّا۔ یعنی گو ملک اور عزیز و اقربا کو چھوڑنا اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے مگر میرا خدا مجھے پھر بھی نامراد نہیں رہنے دے گا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝

(۵۰) پھر جب (ابراہیمؑ) ان (یعنی اپنے لوگوں) سے بھی اور جن کی وہ اللہ کے سوا پُوجا کرتے تھے۔ (ان سے بھی) جُدا ہو گیا۔ تو ہم نے اسے اسحاقؑ اور (اس کے بعد) یعقوب عطا فرمائے اور ان سب کو ہم نے نبی بنایا

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

(۵۱) اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں سے ایک (وافر) حصہ عطا فرمایا۔ اور ہم نے ان کے لیے ہمیشہ قائم رہنے والا اعلیٰ درجہ کا ذکرِ خیر مقرر فرمایا۔

۳ع

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝

(۵۲) اور تو قرآن کے مطابق موسےٰؑ کا بھی ذکر کر۔ وہ ہمارا منتخب بندہ تھا۔ اور رسول (اور) نبی تھا

---

۵۰ کُلًّا کا لفظ دو کے لیے بھی آتا ہے یہاں مراد اسحاقؑ اور یعقوبؑ دونوں ہی ہیں۔

۵۱۔ رحمتِ عام کے ماتحت خدا تعالےٰ مومن کافر اور فاسق سب کی دعائیں سنتا ہے مگر رحمتِ خاص کے لیے مومن مخصوص ہیں یہاں موہوب چیز رحمت ہے۔ فرماتا ہے ہم نے اپنی رحمت ہی ان کے حوالے کر دی۔ صدق کی طرف کسی چیز کو اضافت دی جائے۔ تو اس کے معنے ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم میں کامل اور پسندیدہ ہو اور دائمی ہو اس لیے وجعلنا لھم لسان صدقٍ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو ایسی باتیں ملیں جو ہمیشہ قائم رہنے والی اپنی جگہ کامل اور پسندیدہ تھیں۔ لیکن لسان کے معنے ان کے متعلق دوسروں کی زبان کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ مطلب بھی ہے کہ ان کو ان کی تعریف کرنے والے بھی ملے۔ علیًّا کے معنے بلند۔ شریف اور شدید کے ہیں۔ اس لیے وجعلنا لھم لسانَ صدقٍ علیًّا کا یہ مطلب ہے کہ (۱) ہم نے ان کو اعلیٰ درجہ کی شستہ اور اظہارِ صداقت کے لیے دلیر زبان دی (۲) یہ کہ ان کو بلند، شریف اور شدید تعریف دی۔ بلند کا مفہوم تو واضح ہے شریف تعریف کا یہ مطلب ہے کہ لوگ ان کے اخلاق اور تقدس کی تعریف کرتے تھے۔ اور شدید کا یہ کہ گردن پر چھری ہوتی پھر بھی تعریف سے رُکتے نہیں تھے۔

۵۲ عیسوی سلسلہ کو سمجھانے کے لیے ابراہیمؑ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے بعد موسےٰؑ کا ذکر کیا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں شریعت کی بنیاد رکھنے والے نبی تھے۔ اور بنی اسحاقؑ کو کنعان ملنے کا جو وعدہ تھا وہ بھی حضرت موسیٰؑ کے عہد میں پورا ہوا۔ مخلص وہ ہوتا ہے جسے خدا تعالےٰ ہر قسم کے شبہات اور بدخیالیوں سے خود باہر نکال لے یعنی محض اپنے لیے منتخب کرلے۔ یہاں بھی یہ مطلب ہے کہ خاص خدمت کے لیے خدا تعالےٰ نے خود موسیٰؑ کو پاک کر لیا تھا۔ رسول بھیجے ہوئے کو کہتے ہیں اور نبی خبر دینے والے کو کوئی نبی نہیں ہو سکتا جب تک پہلے رسول نہ ہو اس لئے قرآن نے ہمیشہ رسول کا لفظ پہلے اور نبی کا بعد میں استعمال کیا ہے (دیکھیں احزاب ۶ع، اعراف ۱۹ع) وغیرہ۔ ویسے چونکہ رسول کو

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ (۵۳) اور ہم نے موسیٰؑ کو طور کی دائیں طرف سے پکارا۔ اور اس کو اپنے اسرار بتاتے ہوئے اپنے قریب کر لیا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝ (۵۴) اور ہم نے اس (یعنی موسیٰؑ) کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بنا کر (مددگار کے طور پر) دیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (۵۵) اور تو قرآن کے مطابق اسمٰعیلؑ کا بھی ذکر کر۔ وہ بھی یقیناً سچے وعدوں والا تھا۔ اور رسول (اور) نبی تھا۔

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ (۵۶) اور اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا رہتا تھا۔ اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ (وجود) تھا۔

جو پیغام ملتا ہے وہ آگے ضرور پہنچاتا ہے اس لیے وہ نبی بھی ضرور ہوتا ہے۔

۵۳ ایمن کے معنے دائیں کے بھی ہیں اور برکت والے کے بھی۔ جیسے ایک بزرگ کی جوتی بابرکت اور پلید کی منحوس ہو جاتی ہے یا انسان کسی بزرگ کا ہتھیار بن جائے تو اچھا ہو جاتا ہے اور کسی بد کا ہتھیار بن جائے تو برا ہو جاتا ہے اسی طرح جب پہاڑ پر الٰہی کلام نازل ہوا تو وہ بابرکت ہو گیا اور چونکہ وہ بیجان تھا اور بے جان چیزیں گناہ نہیں کرتیں اس لیے جو برکت اسے ملی وہ دائمی ہو گئی ـــــ نجیًّا کے معنے صرف بات، مخفی بات، اور تیز چلنے کے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے موسیٰؑ سے بات کی یعنی شریعت دی۔ مخفی باتیں کیں، یعنی اسے اپنا مقرب بنایا اور جب موسیٰؑ اس کی طرف تیزی سے چلے (وعجلت الیک رب لترضیٰ طٰہٰ ۸۵) تو وہ بھی موسیٰؑ کی طرف تیزی سے چلا۔ جیسے حدیث میں ہے کہ جب بندہ خدا کی طرف چل کر آتا ہے تو وہ بندہ کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔

۵۴ موسیٰ کی دعا واجعل لی وزیرا من اھلی (طٰہٰ ۳۰) کے مطابق ان کو ہارون دیئے گئے۔ اور گو وہ نبی تھے مگر اس آیت سے ظاہر ہے کہ موسےٰ کے تابع تھے۔

۵۵ ابراہیمی عہد کے پہلے ظہور کی طرف اشارہ ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسےٰؑ اور مسیحؑ کے ذکر سے کیا دوسرے ظہور کی طرف اشارہ کے لیے اسماعیلؑ کا ذکر کیا ہے۔ صادق الوعد میں بتایا کہ جب وہ میرے ساتھ وعدے پورے کرنے والا تھا تو ضرور تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ وعدہ پورا کرتا۔ پس جس طرح ہم نے بنو اسحٰق میں موسیٰؑ جیسا عظیم الشان نبی بھیجا اسی طرح اسمٰعیلی وعدوں کے پورا ہونے کے وقت ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر دیا۔

۵۶ فرماتا ہے جب میں نے اسمٰعیل سے وعدہ کیا کہ تیری نسل سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کروں گا تو اس نے (ظاہری خوشی کے طور پر) یہ طریق اختیار کیا کہ ہمیشہ اپنی اولاد کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کیا کرتا۔ ایک طرف

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ز (۵۷) اور تو قرآن کی رو سے ادریسؑ کا بھی ذکر کر۔ وہ
اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ بھی صدیق نبی تھا۔
وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ (۵۸) اور ہم نے اسے نہایت اعلیٰ مقام تک پہنچایا تھا۔

اس کی یہ کوشش بھی دوسری طرف وہ عند ربہ مرضیًا کا مصداق تھا اسی لیے ضرور تھا کہ اس کے ساتھ کئے ہوئے وعدے بھی پورے کیے جاتے۔

۵۷-۵۸ بعض دفعہ دوسرے کو سمجھانے کے لیے ناموں کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ ادریس بھی حنوک کا عبرانی سے عربی میں ترجمہ ہے عبرانی براہ راست عربی سے ہی نکلی ہے۔ عربی اصل تھی اور عبرانی ایک قبیلہ کی زبان تھی۔ چونکہ اسمٰعیلؑ اور جگہ رہے اور اسحاقؑ اور جگہ رہے اس لیے عربی اور عبرانی میں فرق پیدا ہو گیا۔ حنوک جسے انگریزی میں (Enoch) لکھتے ہیں کے معنے خوب سکھانے والے کے ہیں اور ادریس درس سے نکلا ہے جس کے معنی پڑھانے کے ہیں پس ادریس کے معنے پڑھنے اور پڑھانے والے کے ہوئے۔ یہ حنوک کے ہم معنی لفظ ہے اور حنوک کا عربی ترجمہ ہے جیسے اسرائیل کا عبرانی تلفظ یسرائیل ہے جو یسر (جنگجو اور بہادر سپاہی) اور ایل (یعنی خدا) سے مرکب ہے، پس اسرائیل کے معنے ہوئے خدا کا بہادر سپاہی۔ اسی طرح اسحاق ضحك سے نکلا ہے، یعقوب عقب سے اسمٰعیل سمیع سے اور یسوع ساح سے جس کے معنے ہلاکت اور زوال کے ہیں۔ اس نام میں مسیحؑ کے مصیبت میں مبتلا ہونے یعنی صلیب پر چڑھنے کی پیشگوئی تھی۔ جیسے رسول اللہ کے نام محمدؐ میں کامیاب اور اعلیٰ زندگی کی طرف اشارہ تھا عربوں کو جب حنوک کے معنی تبلائے گئے تو انہوں نے ان معنوں ہی کو نام سمجھ لیا۔ اور چونکہ بتانے والے یہودی تھے انہوں نے اسے عجمی نام سمجھا اور اسے غیر منصرف قرار دے دیا۔

اسلامی روایات کے مطابق آدمؑ کے نسب نامہ میں پہلے نبی آدمؑ تھے۔ جو باپ تھے دوسرے نبی ان کے بیٹے شیث تھے تیسرے نبی حنوک تھے جو آدم کے پانچویں پڑپوتے تھے۔ اور چوتھا نبی نوحؑ تھا۔ جو حنوک کا پوتا تھا۔

او ر عیسائیوں کے سب خیالات کی تردید کی جا چکی ہے مگر ان کے اس خیال کی تردید باقی تھی کہ مسیح آسمان پر زندہ چلا گیا۔ اس لیے یہاں ادریسؑ کا ذکر کر کے بتایا کہ انجیل میں جیسے الفاظ مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے متعلق ہیں ان سے زیادہ شاندار الفاظ حضرت ادریس کے متعلق آئے ہیں مسیحؑ کے متعلق تو صرف اتنا لکھا ہے کہ " وہ انہیں برکت دے رہا تھا کہ ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا۔ اور آسمان پر اٹھایا گیا (لوقا $\frac{24}{51}$) مگر ادریس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور وہ غائب ہو گیا۔ کیونکہ خدا نے اسے اٹھا لیا (پیدائش $\frac{5}{24}$) گویا ادریسؑ ساری عمر خدائی منشاء کے مطابق چلے۔ قرآن میں مسیحؑ کے متعلق لکھا ہے کہ رفعہ اللّٰہ علیہ (نساء) مگر ادریس کے متعلق فرماتا ہے رفعنٰہ مکانًا علیًّا کہ ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھا لیا۔ چنانچہ معراج کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی مسیحؑ کو دوسرے آسمان پر اور ادریسؑ کو چوتھے پر دیکھا۔ اس لیے اگر ان روایات کی بنا پر

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩

(٥٩) یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن پر خدا (تعالیٰ) نے نبیوں میں سے انعام کیا تھا ان (نبیوں) میں سے جو آدم کی اولاد تھے اور جو اُن لوگوں کی اولاد تھے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں بچایا اور ابراہیم اور یعقوب کی (اولاد تھے) اور ان (لوگوں) میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور اپنے لیے منتخب کر لیا جب ان کے اوپر (خدائے) رحمٰن کا کلام پڑھا جاتا تھا تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

السجدة

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ

(٦٠) پھر ان کے بعد ایک ایسی نسل آئی جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔ اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ پس وہ عنقریب گمراہی کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔

مسیح خدا ہیں تو ادریسؑ بدرجہ اُولیٰ خدا ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ سے کہ (خدا ...... نے اسے اٹھا لیا) جو مسیح کے متعلق الفاظ سے بہتر ہیں ادریسؑ کا بھی آسمان پر اٹھایا جانا ثابت نہیں اگر اٹھا لیا کے لفظی معنی کئے جائیں کہ خدا نے اسے اٹھا لیا تو ساتھ ساتھ چلتا تھا کے بھی یہ معنے کرنے پڑینگے کہ ادریسؑ ساری عمر آسمان پر رہے اور خدا کے ساتھ چہل قدمی کرتے رہے اور وہاں ان کی اولاد بھی ہوئی کیونکہ ساتھ ہی اولاد کا بھی ذکر ہے یا یہ معنے بنیں گے کہ خدا زمین پر آ گیا اور وہ آسمان پر نہیں گیا۔ اور ان کے ساتھ رہتا رہا۔ یعنی ان کی نصرت کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے معنے ہی درست ہیں کیونکہ دوسری جگہ بھی انہی معنوں میں یہ محاورہ استعمال ہوا ہے لکھا ہے "نوح خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا" (پیدائش ۶/۹) پھر لکھا ہے "سام (یعنی ابراہیمؑ) تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو" (پیدائش ۱۷/۱)

ف ۵۹ فرمایا اوپر جتنے انبیاء کا ذکر ہے وہ سب خدا تعالےٰ سے انعام یافتہ تھے مگر تھے ذریتِ آدم ہی خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ بلکہ ان کی فرمانبرداری کا یہ حال تھا کہ آیاتِ الٰہی سُنکر وہ سجدہ میں گر جاتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ ہی سمجھتے تھے۔ یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ کیا نبی ہدایت یافتہ نہیں بھی ہوتے جو نبی بننے کے بعد ان کا مہدی اور مجتبیٰ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی صفت ایک خاص خیال کے رد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہاں مسیحیوں اور اسرائیلیوں کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ مسیحؑ سے پہلے تمام انبیاء گناہگار تھے۔

ف ۶۰ یہاں شہوات کے معنے بدکاری کے نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے غلط اجتہاد کے تابع ہو گئے یعنی کتاب کی تفسیر خود اس کتاب کے ذریعہ کرنا چھوڑ دی اس لیے گمراہ ہو گئے۔ مفردات میں بھی لکھا ہے اَلْغَيُّ جَهْلٌ

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝

(۶۱) سوائے اس کے جو توبہ کرے گا اور ایمان لائے گا، اور نیک عمل کرے گا۔ یہ لوگ، جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝

(۶۲) (یعنی ان جنتوں میں) جو ہمیشہ رہنے والی ہیں اور جنکا (خدائے) رحمٰن نے اپنے بندوں سے ایسے وقت میں وعدہ کیا ہے جبکہ وہ ان کی نظروں سے ابھی پوشیدہ ہیں یقیناً خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝

(۶۳) وہ ان (جنتوں) میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے بلکہ صرف سلامتی (اور امن) کی باتیں سنیں گے) اور ان (جنتوں) میں ان کو صبح اور شام رزق ملے گا۔

مِنَ اعْتِقَادٍ فَاسِدٍ۔ یعنی جھوٹے اعتقادات اور غلط روایات کتاب الٰہی کی طرف منسوب کرنے کے نتیجہ میں جو جہالت پیدا ہوتی ہے اس کو غیٌّ کہتے ہیں اگر یہ لوگ نمازیں پڑھتے اور اپنے غلط اجتہادات کے پیچھے نہ چلتے تو اس کا یہ انجام نہ ہوتا۔ دراصل نماز نہ ہو تو صفاتِ الٰہیہ کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور ضلال پیدا ہوتا ہے۔ دعا کی کمی سے ناکامی آتی ہے اور اتباعِ شہوات سے علم و دلیل سے رغبت کم ہو جاتی ہے۔ ان سب کا نتیجہ جہالت ہوتا ہے۔

۶۱ قرآن نے ہر جگہ عمل صالح کا حکم دیا ہے اور عمل صالح کے معنی صحیح اور مناسب حال عمل کے ہیں مثلاً روزہ نیکی ہے مگر عید کے دن روزہ رکھنا شیطان کا کام ہے اس لیے قرآن کہتا ہے موقعہ کے مطابق نیکی کرو۔

۶۲ جَنّٰتِ عَدْنٍ: عدن کے معنے قائم رہنے اور مستقل رہائش گاہ کے ہیں۔ بالغیب سے یہ مراد ہے کہ (۱) جنت کا وعدہ اس وقت کیا گیا جب اس کے ملنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ جنتیں مسلمانوں کو دنیا میں ملیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت میں جنتوں کا جو وعدہ ہے وہ بھی پورا ہوگا (۲) بالغیب کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی وجہ سے ان سے ان جنّٰت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا:- مَاْتِیًّا کے معنے ہیں "لایا گیا"۔ یعنی وہ لوگ تو صرف وصل الٰہی کے خواہشمند ہوں گے مگر خدا کا وعدہ سامنے لایا جائے گا اور انہیں داخلِ جنت کر دیا جائے گا۔

۶۳ استثناء متصل کی صورت میں اِلَّا سَلٰمًا کے یہ معنے ہوں گے کہ وہاں اگر زائد کلام بھی ہوگا تو وہ بھی سلامتی ہی ہوگا۔ اور استثناء منقطع کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ لغو تو ان کے پاس بھی نہ پھٹکے گا ہاں سلامتی کی باتیں ہر جگہ ہوں گی کیونکہ خدائے سلام کے پاس ہوں گے دارالسلام میں ہوں گے اور فرشتے سلام کہہ رہے ہوں گے۔ لا یسمعون فیھا لغواً خود لغو باتیں کرنا تو درکنار وہ لغو باتوں کی طرف کان ہی نہ دھرینگے ولھم رزقھم

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّاه (٦٤) یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو کریں گے جو متقی ہوں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّاه (٦٥) اور (فرشتے ان سے کہیں گے کہ) ہم تو صرف تمہارے رب کے حکم سے اُترتے ہیں۔ اور جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان دونوں (جہات) کے درمیان میں ہے سب کچھ خدا کا ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّاه (٦٦) (وہ) آسمانوں کا (بھی) رب ہے اور زمین کا بھی (رب ہے) اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان (ہے)۔ پس (اے مسلمان) اسکی عبادت کر اور اسکی عبادت پر ہمیشہ قائم رہ۔ کیا تو اس کا کوئی ہم صفت جانتا ہے؟

ع ۴

فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا: — بُكْرَةً دن کے ابتدائی حصہ کو اور عَشِيًّا زوال شمس سے صبح تک کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ انہیں سارا دن رزق ملے گا۔ اگر کہا جائے کہ کیا سارا دن کھانا موجب بدہضمی نہ ہوگا تو جواب یہ ہے کہ رزق کے معنے ہیں "دی جانے والی چیز" اور وہاں جو چیز دی جائیگی وہ دیدار الٰہی، کلام الٰہی اور خدا کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے ان سے بدہضمی نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں یہاں وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ کے الفاظ ہیں۔ یعنی ان کے مناسب حال رزق ملیگا۔

٦٤ یعنی جنت صدقہ کا رنگ نہیں رکھے گی بلکہ خدا تعالیٰ بطور حق و اکرام کے مومنوں کو اپنے بیٹے قرار دیکر بطور میراث ان کو جنت دے گا۔ گویہ ورثہ باپ کی زندگی میں ہی مل جائے گا، اس میں سب مومنوں کو ابن اللہ قرار دے کر مسیح کی خصوصیت کو بھی رد کیا گیا ہے۔

٦٥ جب جنت کو عطاء میراث قرار دیا گیا تو مومنوں کو طبعاً خواہش ہوئی تھی کہ سلام باپ کی طرف سے ہو اس لیے فرشتوں نے کہا کہ ہم یہ سلام خدا ہی کی طرف سے پہنچا رہے ہیں۔ وما کان ربک نسیا:۔ خدا بھولنے والا نہیں کہ اپنی روحانی اولاد کو بھول جائے۔ ان آیات میں اس اعتراض کا بھی جواب دیا ہے کہ بنی اسرائیل کی بجائے عربوں میں کیسے نبی آگیا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ جہاں کا حکم ہوتا ہے ہم وہاں نازل ہو جاتے ہیں وما کان ربک نسیا۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں اس کو نبی اسمٰعیل کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی یاد ہے۔ اس لیے اس نے ہمیں کلام دے کر عربوں میں بھیجا۔

٦٦ واصطبر لعبادتہ یعنی تو عبادت کی خاطر جرأت و بہادری سے کام لے تاکہ تیری عبادت دوسری اشیاء کے لیے نہ ہو بلکہ دوسری اشیاء اس کے لیے ہوں اور عبادت ہی تیرا مقصود ہو۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ (۶۷) اور انسان ہمیشہ یہ کہتا رہے گا کہ کیا جب میں مرجاوں گا تو پھر زندہ کرکے اُٹھایا جاؤں گا؟

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ (۶۸) کیا انسان کو یہ (بات) یاد نہیں کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا تھا اور (اسوقت) وہ کوئی چیز نہیں تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ (۶۹) پس تیرے رب کی قسم ہم (جو تیرے رب ہیں) ان لوگوں کو (پھر ایک دفعہ) اُٹھائینگے اور شیطانوں کو بھی (اٹھائینگے) (اور) پھر ان سب کو جہنم کے گرد ایسی صورت میں حاضر کرینگے کہ وہ زانوؤں کے بل گرے ہوئے ہونگے۔

---

۶۷ بعث بعد الموت لوگوں کے لیے ہمیشہ ہی مشتبہ رہا ہے۔ ایک طرف لوگ مرنے والوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لیے کئی قسم کے کام کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کے اعمال میں کوئی اصلاح نہیں ہوتی اس لیے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بعث بعد الموت پر یقین نہیں رکھتے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں استفہامیہ رنگ اختیار کیا گیا ہے اور اظہار تعجب کیا گیا ہے یہ نہیں کہا کہ وہ بعث بعد الموت نہ ہونے پر متیقن رہے۔ موت کے بعد کی زندگی کا کُلّی انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ مگر یقینی اقرار بھی بہت کم ہے اور تردد زیادہ ہے۔ عیسائی بھی مذہبًا بعث بعد الموت کے قائل ہیں۔ لکھا ہے (۱) "قیامت میں بیاہ شادی نہ ہوگی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہوں گے" (متی ۲۲/۳۰) (۲) "جب ہمارا خیمہ کا گھر جو زمین پر ہے۔ گرایا جائے گا تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنا ہوا گھر نہیں ابدی ہے" (کرنتھیوں ۵/۱)۔ لوقا ۱۶/۱۹-۳۱ اور ۲۵/۳۸ اور مکاشفہ ۱۴/۱۳ سے بھی حیات بعد الموت کے عقیدہ ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہاں الانسان سے مراد وہ انسان ہے جو اُخری حیات پر تعجب کرتا ہے۔

۶۸ لَمْ يَكُ شَيْئًا یعنی وہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا نطفہ، جمادات یا نباتات کی حالت میں تھا جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۷۶/۲) فرمایا جب نا قابل ذکر شے سے اس نے انسان کو بنالیا تو پھر مرنے کے بعد اسے زندہ کیوں نہیں کرسکتا۔

۶۹ یہاں شیاطین کا ذکر بتاتا ہے کہ "الانسان" سے وہی انسان مراد ہے جو حیات بعد الموت پر پورا ایمان نہیں رکھتے اور لوگوں کو شبہ میں ڈالتے ہیں۔ لفظ جہنم اصل میں ذوھنم تھا یعنی چیتوں والی جگہ مجوسیوں نے اس لفظ کو "جہنّوم" بنالیا پھر عربوں نے مجوسیوں سے یہ لفظ لیکر جہنم بنالیا۔ یہ بھی ممکن ہے یہ لفظ جھن اور جھم سے بنا ہو۔ جہنم اصل میں جھن جھم ہے۔ جن کے معنے ایسی چیز کے ہیں جس کے قریب جانے کی انسان کوشش کرتا ہے جھن کے معنے قریب ہونے کے جھم کے بُرا منہ بنا کر ملنے کے ہیں مگر جب وہ آسے

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ (۷۰) پھر ہم ہر ایک گروہ میں سے ایسے لوگوں کو الگ کرلیں گے
اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا۝ جو (عذاب کے) رحمٰن کے سخت دشمن تھے۔
ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ (۷۱) اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے کون دوزخ میں جانے
اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۝ کے زیادہ قابل ہے۔
وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ (۷۲) اور تم میں سے ہر شخص اس (یعنی دوزخ) میں جانیوالا ہے یہ خدا تعالیٰ
عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۝ کا ایسا پکا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔
ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ (۷۳) اور ہم متقیوں کو بچالیں گے۔ اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں
الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا۝ کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

دیکھ لیتا ہے تو یہ جان کر کہ یہ تو برا مقام ہے، اس کا منہ بگڑ جاتا ہے۔

ت ۷۰-۷۱ پہلا ثُمَّ ترتیب کے لحاظ سے ہے یعنی پہلے واقعہ کے بعد یہ ہوگا لیکن ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ میں درجہ مراد ہے کیونکہ "ثُمَّ" زمانہ، مکان اور وضع کی ترتیب کے لیے بھی آتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کے مدارج کفر کیا ہیں اور کون کس مقام کا مستحق ہے۔ یہاں یاجوج ماجوج کا ذکر ہے اور یہ دونوں لفظ "اجّ" سے نکلے ہیں جس کے معنے آگ کے ہیں گویا ان کا نام ہی بتاتا ہے کہ انہوں نے آگ یعنی آتشین اسلحہ سے کام لینا تھا۔ اس لیے فرمایا هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۔ (۱) یہ بہ نسبت اور چیزوں کے آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی عذاب کئی قسم کے ہو سکتے ہیں مگر چونکہ انہوں نے لوگوں کو آگ سے عذاب دیا ہے یہ لوگ آگ ہی کے مستحق ہیں (۲) یہ بہ نسبت اور لوگوں کے آگ کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے آتشین اسلحہ کا استعمال دوسروں سے زیادہ کیا ہے۔

ت ۷۲-۷۳ جِثِيًّا کے معنے انگلیوں کے بل کھڑا ہونے اور گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہیں مطلب یہ کہ پہلے تو انسان ایڑیاں اٹھا کر دیکھتا ہے کہ کیا سزا ملنے والی ہے جب وہ نظر آجاتی ہے تو حوصلہ ہار کر گھٹنوں کے بل گر جاتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ نے فرمایا ہے کہ اوپر ایسے کفار کا ذکر تھا جو بعث بعد الموت کے متعلق شبہ میں تھے اس لیے ان منکم الا واردها ان کے متعلق ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بھی انہی معنوں کے قائل تھے اور فرماتے تھے کہ گو متکلم استعمال ہُوا ہے مگر مراد غائب ضمیر ہے جیسے ۲۲ میں اس کی مثال ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بدر کے صحابہ میں سے کوئی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اس پر حضرت حفصہ نے عرض کی کہ ایسا ہے تو یہ قول کہاں گیا کہ ان منکم الا واردها۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "بس بس ثُمَّ نُنَجِّي۔۔۔۔۔ الظالمین" یعنی یہ بھی تو لکھا ہے کہ متقی اس سے بچائے جائیں گے۔ یہاں ثُمَّ کے معنے "پھر" کے نہیں ہو سکتے کیونکہ اس طرح حضرت حفصہ کے شبہ کی تصدیق ہو جاتی ہے اور مراد تردید ہے۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ نجات پانے والے (اُخروی) جہنم میں نہیں جائیں گے۔ اور سورۃ انبیاء کی آیت ۱۰۲ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۴﴾

اور جب انہیں ہماری کھلی کھلی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں (بتاؤ تو) ہم دونوں فریق میں سے کونسا فریق درجہ کے لحاظ سے اور ہم جلیسوں کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے مستقل طور پر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مومن و کافر دونوں دوزخ میں داخل ہوں گے۔ مومن کی دوزخ دنیا کے مصائب ہیں اور کافر کی ایک دوزخ تو اطمینانِ قلب سے محروم ہونا ہے یہ دنیوی جہنم ہے اور دوسری آخرت میں ہوگی۔ چنانچہ حدیث میں بھی ہے کہ جتنا کوئی خدا کا زیادہ پیارا ہوتا ہے اتنی ہی دنیا کی تکالیف اسے زیادہ پہنچتی ہیں۔ اسی طرح لکھا ہے کہ بخار بھی ایک آگ ہے جو مومن پر اس لیے مسلّط کی جاتی ہے کہ آخرت کی دوزخ کا حصہ اسے یہیں مل جائے۔

۷۴ معجزہ صرف طاقت کا اظہار کرتا ہے مگر آیت وہ ہے جسے کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر اس مقصد کی وضاحت کے لیے بطور دلیل پیش کیا جائے۔ مذاہب چونکہ بعض پوشیدہ چیزیں بھی پیش کرتے ہیں مثلاً انبیاء پر فرشتوں کا اُترنا یا خدا کا عالم الغیب ہونا، حفیظ ہونا۔ حیّ و قیوم ہونا وغیرہ امور ہیں جو نظر نہیں آتے۔ اس لیے ان کی تصدیق آیات سے کی جاتی ہے۔ مثلاً انسان تو ان باتوں پر قادر نہیں لیکن کوئی نبی غیب کی خبریں بتلائے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرے، اور پھر وہ پوری بھی ہو جائیں تو یہ خدا کے عالم الغیب اور قادر ہونے کا ثبوت ہوگا اور یہ بھی ثابت کرے گا کہ بتانے والا نبی تھا کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ علم غیب تو اسے از خود ہو اور وہ اسے خدا کی طرف منسوب کرے۔ اسی طرح اگر کسی کی دُعا سے کوئی قریب الموت اچھا ہو جائے تو یہ خدا کے حیّ و قیوم ہونے کا ثبوت ہوگا۔

آیت بیّنہ:۔ اگر کوئی شخص مسمریزم کے ذریعہ کسی کو گرا دے تو چونکہ اس میں طاقت کا اظہار ہوا یہ آیت تو ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نطر ڈالنے والے کا خدا سے بھی تعلق ہے اس لیے یہ آیت بیّنہ نہیں کہلائیگی۔ آیت بیّنہ وہ ہے جو نہ صرف مقصد کو سامنے رکھے بلکہ اسے کھول کر بیان بھی کرے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے پیشگوئی فرمائی کہ میری تکذیب کی وجہ سے پنجاب میں بکثرت طاعون پھیلے گی۔ اور میرے مخالف بکثرت مریں گے لیکن میرے سچے ساتھی اس سے محفوظ رہیں گے۔ پھر اسی طرح ہوگیا اس میں چونکہ مقصد کو واضح کیا گیا تھا اس لیے یہ آیت بیّنہ تھی۔

غرض الٰہی آیات کسی اہم مقصد کو سامنے رکھ کر موقعہ اور محل پر ظاہر ہوتی ہیں اور اس مقصد کو کھول کر بیان کرتی ہیں۔ اس لیے وہ آیات بیّنات کہلاتی ہیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ (۷۵)	اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے زمانوں کے لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو سامانوں
هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝	کے لحاظ سے اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان لوگوں سے اچھے تھے۔
قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ (۷۶)	تو کہدے کہ جو شخص گمراہی میں (پڑا) ہو (خدا) رحمٰن اسے ایک عرصہ تک
لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰى اِذَا	ڈھیل دیتا جاتا ہے یہاں تک کہ جب ایسے لوگوں کے سامنے وہ عذاب
رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ	آجائیگا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا (یعنی) یا دنیوی عذاب یا
وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ	(قومی) کامل تباہی اس وقت وہ جان لیں گے کہ کون شخص مکان
مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ	کے لحاظ سے بدتر ہے۔ اور دوستوں کے لحاظ سے
جُنْدًا ۝	کمزور ہے۔

۷۵ اوپر کی آیت میں کفار کا یہ اعتراض درج کیا تھا کہ تم مستقبل کے غلبہ کی باتیں کرتے ہو مستقبل کو کون جانتا ہے حال کو دیکھو کہ ہم تم سے کس قدر بہتر ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ گو تمہارا حال واقعی بہتر ہے مگر تم سے بہت زیادہ طاقتور قومیں تباہ ہو چکی ہیں تو تمہارا تباہ ہونا غیر ممکن کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں عیسائیوں کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ پہلے ان سے بھی زیادہ طاقتور قومیں ہوئی ہیں۔ گو جو ساز و سامان ان کے پاس ہے پہلوں کے پاس نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قوموں کو اپنے دشمنوں کی نسبت اس سے زیادہ طاقت حاصل تھی جو آجکل کے عیسائیوں کو اپنے دشمنوں کے مقابل پر حاصل ہے اور طاقت نسبتی چیز ہے۔

۷۶ فرمایا اگر تم میں فی الواقعہ ضلالت پائی جاتی ہے۔ تو پھر خواہ تمہاری کتنی ہی طاقت ہو تم ایک دن ختم ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو۔

فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا۔ یہاں عربی قواعد کے مطابق امر کا صیغہ زور دینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور گو لفظی ترجمہ یہ ہے کہ خدا کو اسے مہلت دینی چاہیے۔ مگر مراد یہ ہے کہ خدا اسے ضرور مہلت دے گا تا کہ دنیا بڑی دیر تک اس کی شان و شوکت دیکھنے کے بعد اس کی عبرتناک تباہی دیکھے۔

اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ . . . . ساعۃ کے معنے قیامت یا آخری فیصلہ کے ہوتے ہیں۔ مگر قیامت عذاب سے متبادل نہیں اس لیے یہاں آخری (قومی) فیصلہ بھی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک وقت میں بعض قومیں عذاب دیکھیں گی۔ اور بعض بالکل تباہ ہو جائیں گی (جیسے گزشتہ جنگ میں انگریزوں نے عذاب دیکھا اور جرمنی بالکل تباہ ہو گیا)

فَسَيَعْلَمُوْنَ . . . . جُنْدًا یعنی مومنوں کے حق میں تائید الٰہی دیکھ کر ان کو سمجھ آجائیگی کہ گو مومن بظاہر کمزور تھے مگر ان میں ترقی کا مادہ تھا۔ اور وہ گو بظاہر طاقتور تھے مگر ان میں ہلاکت کا مادہ تھا۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا (۷۷) اور اللہ تعالیٰ، ہدایت یافتہ لوگوں کو ہدایت میں
هُدًى ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ بڑھاتا جائے گا۔ اور باقی رہنے والے (یعنی نیک) اعمال
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خدا کی نظر میں سب سے بہتر شے ہیں جزاء کے لحاظ سے بھی
خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝ اور انجام کے لحاظ سے بھی۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا (۷۸) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر کبھی غور نہیں کیا جس نے ہمارے نشانوں
وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ کا انکار کیا اور کہا کہ مجھے یقیناً بہت سا مال اور بہت سے بیٹے دیے جائیں گے
اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ (۷۹) کیا اس نے غیب (کا حال) معلوم کر لیا ہے؟ یا (خدائے)
الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔

كَلَّا ۭ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ (۸۰) ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ہم اس کے اس قول کو محفوظ رکھیں گے۔
وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ اور اس کے عذاب کو لمبا کر دیں گے۔

وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا (۸۱) اور (جس چیز) پر وہ فخر کر رہا ہے اس کے ہم وارث ہو جائیں گے
فَرْدًا ۝ اور وہ ہمارے پاس اکیلا ہی آئے گا۔

۷۷؎ یعنی گو مصائب مومنوں پر کبھی آتے ہیں مگر جب مخالفت کے بادل چھٹیں گے دشمن صداقت کمزور نظر آئے گا۔ اور مومن پہلے سے مضبوط ہو جائے گا۔ والبٰقیٰت ... مَّرَدًّا یعنی مقبولِ الٰہی اعمال ہی مومن کا اصل سرمایہ ہیں کیونکہ وہ ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور واپسی کے لحاظ سے بھی۔ یعنی اصل مال وہی ہے جو الٰہی بینک میں محفوظ ہو اور اسی کا انٹرسٹ اصل انٹرسٹ ہے وہ دنیوی مال جو عیسائی بینکوں میں جمع کرتے ہیں اور اس پر سود لیتے ہیں اصل نہیں ہے۔

۷۸-۷۹؎ فرمایا اس کا خیال ہے کہ اس کے پاس مال و اولاد ہے اس لیے اس کا مال اور نسل ضرور بڑھیں گے کیا اس نے (نجومیوں کے ذریعہ) علم غیب حاصل کر لیا ہے یا اس نے (کسی نبی کے ذریعہ) خدا سے کوئی وعدہ لے لیا ہے اگر ایسا نہیں تو صرف مال و اولاد کا ہونا اسے تباہی سے بچا نہیں سکتا۔

۸۰؎ فرمایا یہ غلط ہے (انہیں علم غیب حاصل ہے نہ خدا تعالیٰ نے ان سے کوئی وعدہ کیا ہے) اس لیے ان کا یہ قول کہ (مسلمانو! تم تو کمزور ہو) لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ہم محفوظ رکھیں گے وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا۔ اور جس طرح ہم نے ان کے آرام کی مدت لمبی کی تو انہوں نے یہ دعوے شروع کر دیئے ہم ان کے عذاب کو بھی لمبا کریں گے۔

۸۱؎ آیت ۸۰ میں کفار کا یہ دعویٰ درج تھا کہ بتاؤ مال و عزت کسے حاصل ہے اس لیے مایقول سے مراد عزت و مرتبہ اور اولاد ہے اور فرماتا ہے کہ یہ چیزیں ہم ان سے لے کر مومنوں کو دیدیں گے ایک طرف ان کی

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً (۸۲) اور ان لوگوں نے اللہ (تعالیٰ) کے سوا بہت سے معبود بنا چھوڑے لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۙ ہیں (اس امید سے کہ وہ ان لوگوں کے لیے عزت کا موجب بنیں گے)

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ (۸۳) ایسا ہرگز نہیں ہوگا وہ معبود ایک دن ان کی عبادتوں کا انکار وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۧ کریں گے اور ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ (۸۴) کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہم نے شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۙ وہ کافروں کو اکساتے رہیں۔

اولادیں مسلمان ہو جائیں گی جیسے عاص کا بیٹا عمروؓ یا ولید کا بیٹا خالدؓ ہوئے دوسری طرف جو خادم و مکتسب ان کی دولت کی وجہ سے ساتھ ہو گئے تھے وہ بھی الگ ہو جائیں گے اسلئے فرمایا دیا تینا فردًا وہ اکیلے رہ جائیں گے۔

۸۲ عزّ کا لفظ ذلّت کے مقابل پڑتا ہے۔ فرماتا ہے وہ بڑے بڑے معبود حصول شہرت و عزت کے لیے بناتے ہیں یا اس لیے کہ چونکہ ان کے خیال کے مطابق بُت مقرب بارگاہِ الٰہی ہیں ان کے خادم بن کر یہ بھی مقرب الٰہی ہو جائیں گے اور عزت پا لیں گے امانعبُدُھم الا لیقربُونا الی اللّٰہ زُلفٰی۔ (۳۹/۴)

۸۳ فرمایا کَلَّا اس طرح وہ ہرگز ہمارے مقرب نہیں بنیں گے ان کا یہ فعل عزت کا نہیں ذلت کا موجب ہوگا۔ وہ بھی بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور بت بھی ان کی عبادت کا انکار کریں گے (سیکفرون کی ضمیر دونوں کی طرف جاتی ہے) یہی مضمون ۲/۱۴، ۲۸/۹۲، ۱۶/۸۶، ۶/۲۴-۲۳ اور ۱۰/۲۹ میں بیان ہوا ہے۔

ضدًّا کے معنے معاون کے بھی ہیں اور مخالف کے بھی۔ یعنی اس دن معبودانِ باطلہ اور مشرک جہاں ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں گے وہاں دونوں سچائی کے معاون ہو جائیں گے۔

یہاں لفظ ضدًّا واحد استعمال کر کے بتایا ہے کہ مختلف گروہ ہونے کے باوجود وہ اس معاملہ میں یک زبان ہو جائیں گے۔ اگر یہ سوال ہو کہ بے جان معبود کیسے بولیں گے تو جواب یہ ہے کہ کچھ معبود جاندار بھی ہیں مثلاً ملائکہ مسیحؑ وغیرہ۔ دوسرے روحانی دنیا میں بے جان چیزیں متمثل ہو کر باتیں کر لیتی ہیں۔ چنانچہ رؤیا، کشوف میں ایسا ہوتا ہے۔ تیسرے بُت دراصل گذشتہ بزرگوں کی تمثیل کے طور پر بنائے گئے ہیں۔ اس لیئے جن کی وہ تمثیل ہیں چونکہ اصل معبود وہی ہیں اس لیے بولنے سے مراد ان کا بولنا ہے۔

۸۴ یعنی ہمارا اصل کام تو یہ ہے کہ ہم شیاطین سے اپنے بندوں کی حفاظت کرتے ہیں (۱۵/۴۲) لیکن اس قسم کے کفار سے ہم اپنی حفاظت واپس لے لیتے ہیں اور شیطان کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ جو چاہو کر لو۔ (ارسل کے معنے چھوڑنے کے اور ارادہ میں حراحم نہ ہونے کے بھی ہیں) شیطان شیطانی کاموں ہی پر اکساتے ہیں تؤزھم

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝ (۸۵) پس قرآن کے خلاف جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھا ہم نے ان کی تباہی کے دن گن رکھے ہیں۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ۝ (۸۶) جس دن ہم متقیوں کو زندہ کر کے (خدائے) رحمٰن کے حضور میں اکٹھا کر کے لے جائیں گے۔

اَزًّا کے معنے یہ ہیں کہ ان کو معاصی کی ترغیب دلاتے ہیں اور انہیں جہنمی کاموں پر یا مسلمانوں کی مخالفت پر اکساتے ہیں

۸۵ اوپر الم تر اکہہ کر اشارہ کیا گیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے مشیت ایزدی کے ماتحت ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی واقعہ عام قانونِ قدرت کے ماتحت ہو تو دشمن کے خلاف جائز تدابیر کی اجازت ہوتی ہے لیکن جب نظر آجائے کہ خدا تعالےٰ اپنی عام سنت کے خلاف ایک کام کر رہا ہے۔ تو اس وقت یہی حکم ہوتا ہے کہ فلا تعجل علیہم اس وقت ہر تدبیر منع ہوتی ہے۔ صرف دشمن کے حملوں پر صبر کرنے اور صرف روحانی تدابیر یعنی دعاؤں کا حکم ہوتا ہے۔ لاتعجل کا حکم رسول پاک صلعم کو نہیں بلکہ اس زمانہ کے مسلمانوں کو ہے جنہیں عیسائیوں کی ترقی دیکھ کر جہاد بالسیف کا خیال آتا تھا اور فرمایا ہے کہ نہ تمہیں مادی طاقت حاصل ہے اور نہ اس کے استعمال کا وقت ہے اس لیے جلدی نہ کرو ہم ان کی تباہی کی گھڑیاں گن رہے ہیں یعنی وقت آنے پر خود ہی اس کے سامان کر دیں گے۔

۸۶ وفد کا لفظ عربی میں اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی جماعت کسی بادشاہ کے سامنے اپنی حاجات لے کر پیش ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں لباس بھی اچھا ہونا چاہیے۔ نماز میں جماعت بھی ہوتی ہے خدا کے حضور حاجات بھی عرض کی جاتی ہیں اور لباس بھی صاف رکھنے کا حکم ہے (۷ ع ۳) پس وفد کی بہترین صورت نماز ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ جب کفار کی اوپر بیان کردہ شان و شوکت کی تباہی کا وقت آئے گا تو ہم مومنوں کے دلوں میں تحریک کریں گے کہ ہم سے ان کی تباہی کی دعائیں کرو۔ گویا یہاں حشر سے مراد رحمٰن کی طرف مومنوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ آخرت کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ مومن اس دن اجتماعی طور پر خدا کے حضور حاضر ہو کر انعام پائیں گے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ علاوہ انفرادی بعث کے مرنے کے بعد ایک اجتماعی بعث بھی ہوگا۔ انفرادی بعث تو مرنے کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اور اس میں انسان آخرت کے انعام یا سزا کو محسوس کرنے کی طاقتیں حاصل کرتا ہے مگر اس کی یہ حالت زمانہ طفولیت کے مشابہ ہوتی ہے اس کے بعد جب سب انسانوں کو ثواب و عذاب کامل طور پر محسوس کرنے کی طاقت حاصل ہو جائے گی اور ان کی حالت بالغ شخص کی سی ہو جائے گی تو اس وقت تمام انسانوں کا حشر ہوگا جیسے آلِ فرعون کے متعلق فرمایا ہے کہ یوں تو صبح و شام انہیں آگ میں ڈالا جاتا ہے مگر قیامت کو انہیں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۘ (۸۷) اور مجرموں کو ہانکتے ہوئے جہنم کی طرف لے جائیں گے لازم وقفہ

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ (۸۸) اس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا۔ سوائے اس کے جس نے

اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۘ (خدائے) رحمٰن سے عہد لے چھوڑا ہے۔ لازم وقفہ

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۘ (۸۹) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ (خدائے) رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۘ (۹۰) (تو کہدے) تم ایک بڑی سخت بات کہہ رہے ہو۔

میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا الی الرحمٰن کے متعلق اختلاف ہے کہ اس سے مراد جنت ہے یا خدا کی طرف جانا بعض نے کہا ہے خدا کی طرف جانے کا مطلب جنت کی طرف جانا ہی ہے جیسے ابراہیمؑ نے کنعان جانے کو خدا کی طرف جانا قرار دیا ہے (صفٰت ۳۷؍۱۰۰)۔ یا حدیث میں آتا ہے کہ جس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے ہے وہ اللہ اور رسول کی طرف جاتا ہے۔ مگر یہ اختلاف خدا کو ایک جگہ اور مجسم سمجھنے کے نتیجہ میں ہے حالانکہ خدا ہر جگہ ہے (بقرہ ۲؍۱۱۴، ق ۵۰؍۱۶، نور ۲۴؍۳۵) اس لئے خدا سے ملنے سے مراد اسی طرح ملنا ہے جیسے ایک محدود شئے غیر محدود سے مل سکتی ہے اور جیسے دنیا میں برگزیدہ لوگ خدا سے ملتے ہیں۔ فرق اتنا ہوگا کہ آخرت میں چونکہ مادی جسم نہیں ہوگا ملاقات زیادہ مکمل اور شاندار ہوگی

۸۷ وِرْدًا کے معنے پانی پر جمع ہونے کے قوم کے اور پیاسے کے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کفار کا حشر بھی اجتماعی ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ باوجود اس کے کہ وہ پیاسے ہوں گے ادھا انہیں ایسی جگہ کی احتیاج ہوگی جہاں ان کی پیاس بجھے مگر جہنم ایسا تکلیف دہ مقام ہوگا۔ کہ وہ اس کی طرف شوق سے نہیں جائیں گے بلکہ انہیں ہانک کر لے جانا پڑے گا۔

۸۸ جب ایک قسم کی دو چیزیں ہوں جن میں سے ایک ادنیٰ اور ایک اعلیٰ ہو تو ان کے ملانے کو شفاعت کہتے ہیں۔ اس لیے شفاعت کے لیے جس کی شفاعت ہونی ہو۔ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس نے شفیع کا مثیل بننے کی پوری کوشش کی ہو۔ گو اس میں اسے سو فیصدی کامیابی نہ ہوئی ہو (۲) خدا اس سے راضی ہو (۲۱؍۲۹) (۳) شفاعت کے لیے اذن الٰہی ہو (یونس ۱۰؍۴) اس جگہ الا من اتخذ عند الرحمٰن عهدًا سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کیونکہ حضور (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کا مقام عطا ہوا ہے۔

۸۹ یہ فرما کر کہ انہوں نے مسیحؑ کو ابن اللہ قرار دے رکھا ہے (حالانکہ وہ موحد تھا) یہ اشارہ فرمایا ہے کہ مسیحؑ سے ان کو مناسبت ہی نہیں اس لیے ان کا خیال کہ وہ ان کی شفاعت کرے گا غلط ہے کیونکہ شفاعت تو اسی کی ہو سکتی ہے جو شفیع کا مثیل ہو گو مقام کے لحاظ سے اس سے ادنیٰ درجہ پر ہو۔

۹۰ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ ایسا ہے کہ فطرت صحیحہ کو خود بخود اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ جو اس فتنہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں مسلمان انہیں کافر اور بیدین کہتے ہیں۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ (۹۱) قریب ہے کہ تمہاری بات سے) آسمان پھٹ کر گر جائیں۔
وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر جا پڑیں۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ (۹۲) اسلیے کہ ان لوگوں نے (خدائے) رحمٰن کا بیٹا قرار دیا ہے۔
وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ (۹۳) اور (خدائے) رحمٰن کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے وَلَدًا ۗ کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۹۴) کیونکہ ہر ایک جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ (خدائے) رحمٰن اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۗ کے حضور غلام کی صورت میں حاضر ہونے والا ہے۔
لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۗ (۹۵) (خدا نے) ان کو گھیر رکھا ہے اور گن رکھا ہے۔
وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۹۶) اور وہ سب کے سب قیامت کے دن (فرداً) فرداً اس کی خدمت میں فَرْدًا ۝ حاضر ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا (۹۷) یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ عمل کئے ہیں (خدائے) رحمٰن ان کے لیے وُدّ پیدا الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ پیدا کریگا

۹۱و۹۲ عقیدۂ کفارہ سے کہ جس کے لیے خدا کا بیٹا قرار دیا گیا ہے لازماً خدا اور فرشتے ناراض ہوں گے۔ (یعنی آسمان پھٹے گا) کیونکہ اس میں خدا کے رحم اور عفو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور عام انسان بھی ناپسند کریں گے (یعنی زمین پھٹے گی)۔ اور جبال یعنی اہلِ ولیا بھی اسے ناپسند کریں گے کیونکہ وہ عفو اور رحیم الٰہی کے نظارے خود دیکھ چکے ہوں گے۔

۹۳ عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت خدا تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کے خلاف ہے اگر یہ درست ہے کہ خدا تعالےٰ لوگوں کے گناہ نہیں بخش سکتا اور اس نے اپنے بیٹے کو قربان کر کے لوگوں کو بچا لیا تو اس کی رحمانیت کہاں گئی یہ کام تو اس کی رحمانیت نے کرنا تھا اسی لیے فرماتا ہے کہ انسانوں کی ہدایت کیلئے نزولِ کلام صفتِ رحمانیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۹۴و۹۵ جب وہ تمام اُمور خود ہی سرانجام دے سکتا ہے اور دیتا ہے تو پھر اسے بیٹے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

۹۶ یعنی یہ غلط ہے کہ ان کا بوجھ مسیح نے اٹھا لیا ہے۔ حساب کے دن ہر شخص اکیلا اکیلا جوابدہ ہوگا۔ مسیح نے خود بھی کہا ہے کہ "جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"۔ (لوقا ۱۴/۲۷)

۹۷ وُدّ ایسی محبت کا نام ہے جو محب اور محبوب کو اس طرح جوڑ دیتی ہے جیسے جانور کو کیلا گاڑ کر اس سے

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (۹۸) پس ہم نے تو اس (قرآن) کو تیری زبان میں آسان کر کے اُتارا ہے تاکہ تو اس کے ذریعہ سے متقیوں کو بشارت دے اور اور اس کے ذریعہ سے جھگڑالو قوم کو ہوشیار کرے

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝ (۹۹) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو ان سے پہلے گذری ہیں (کہ ہم ان کو ہلاک کر چکے ہیں)، کیا تو ان میں سے کسی کو بھی کسی حس کے ذریعہ سے محسوس کرتا ہے یا ان کی بھنک سنتا ہے؟

رکوع ۶
التصف

باندھ دیا جاتا ہے۔

عربی کے لحاظ سے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ (۱) مومنوں کے دلوں میں اپنی وُدّ پیدا کرے گا اور یہ اس کی رحمانیت کے وسیع فیضان کو دیکھنے اور اس پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہے (۲) وہ اپنے دل میں مومنوں اور اعمال صالحہ بجالانے والوں کے لیے وُدّ پیدا کرے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں سے خدا تعالیٰ نے محبت کا بے نظیر سلوک کیا ہے۔ (۳) خدا تعالیٰ مومنوں کے دل میں بنی نوع کے لیے وُدّ پیدا کرے گا کیونکہ جب اعمال صالحہ کے نتیجہ میں انسان خدا تعالیٰ سے ایسا وابستہ ہو جائیگا جیسا کیلے سے بندھا ہوا جانور زمین سے وابستہ ہوتا ہے تو لازماً اس کی مخلوق سے بھی محبت کرے گا۔ (۴) خدا تعالیٰ بندوں کے دل میں ایسے شخص کے لیے وُدّ پیدا کرے گا کیونکہ جو لوگوں سے محبت کریگا لازماً لوگ اس سے محبت کریں گے۔

۹۸ اس میں بتایا ہے کہ قرآن صحیح الفطرت انسان کے نزدیک آسان اور قابل عمل ہے اور رحمت اور بشارت ہے لعنت نہیں۔

۹۹ یعنی ان کا شریعت کو لعنت قرار دینا اپنی طاقتوں پر گھمنڈ کی وجہ سے ہے کیونکہ انہیں خیال ہے کہ ان پر زوال نہیں آسکتا۔ مگر انہیں مغرور نہیں ہونا چاہیئے ان سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے تباہ ہو چکی ہیں اور ان کے آثار تک مٹ چکے ہیں۔

آیاتہا ١٣٦	سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ	رکوعاتہا ٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (١) (میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰهٰ (٢) اے کامل قوتوں والے مرد۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ بلا اختلاف مکّی ہے سورۃ مریم میں اصولی طور پر مسیحیت کا ذکر تھا جس کا ایک نقطہ مرکزی یہ ہے کہ شریعت لعنت ہے سورۃ مریم کے آخر میں فرمایا تھا کہ یہ کلام تجھ پر تیری زبان میں نازل کیا گیا ہے تا کہ تو آسانی سے تبلیغ کر سکے اب اس سورۃ کے شروع میں فرمایا کہ قرآن تجھے دکھ میں ڈالنے کے لیے نازل نہیں کیا گیا یعنی شریعت لعنت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ مریم میں بتایا تھا کہ مسیح کی آمد قیام توحید کے لئے تھی مگر مسیحیوں نے اسے شرک کا ذریعہ بنا لیا اور شریعت کو لعنت قرار دے دیا اس سورۃ میں بتایا ہے کہ خود موسوی سلسلہ جس کی مسیحیت شاخ ہے شریعت اور توحید پر قائم تھا بلکہ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کبھی وحی کے بغیر نہیں رہا۔

طٰہٰ: طٰہٰ کے معنے قبائل عرب میں اے مرد کامل القویٰ کے ہیں۔ اس میں بتایا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں تمام اعلیٰ مردانہ صفات شجاعت، سخاوت۔ احسان، وفاداری، تحمل، رحم، حلم، ایثار، دیانتداری اخوت، تواضع، غیرت، شکر، استقلال، وقار، بلند ہمتی، صبر، رافت، بدی کے مقابلہ کی طاقت، قوت برداشت، جفاکشی، سادگی، صلہ رحمی، سچائی سے محبت، خدا پر توکل، اور مخلوق سے ہمدردی، غربا پروری خاص مہمان نوازی مصیبت زدوں کی مدد۔ بزرگوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت وغیرہ بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں۔

مثلاً حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد، عیسائی، یہودی، اور بت پرست سب شرک میں مبتلا تھے اس کے باوجود آپؐ اس سے متنفر تھے اور خدائے واحد کی تلاش میں ایک غار میں دنوں عبادت میں مصروف رہتے تھے اور اس قدر ذوق و شوق تھا کہ خدا تعالےٰ نے آپؐ کو آخری شریعت سے نوازا اور پہلی ہی وحی میں فرمایا کہ تجھے وہ کچھ سکھایا جائے گا جو پہلے کسی کو نہیں سکھایا گیا (علّم الانسان ما لم یعلم) پھر جب آپؐ پر رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو آپ نے موسیٰؑ کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہجعل لی وزیرا من اھلی (طٰہٰ ع۲) بلکہ اکیلے ہی اس بوجھ کو اٹھا لیا۔ جب آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا۔ کہ مجھ پر خدا تعالےٰ نے بڑی ذمہ داری ڈالی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میں اسے ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں تو انہوں نے کہا آپ ہمیشہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کے بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ اخلاق فاضلہ دنیا میں قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مٹ چکے ہیں۔ ہمیشہ مہمان نوازی کرتے ہیں اور بغیر شرارت کے مصیبت میں گرفتار ہونے والوں کی مدد کرتے ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان اوصاف والے شخص کو خدا چھوڑ دے"۔ یہ بیوی کی رائے تھی جو ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہتی تھیں۔ پھر آپؐ یتیم تھے اور چچا کے گھر پلے تھے مگر اس کے باوجود ایسے باوقار اور سعید تھے کہ

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ	(۳) ہم نے تجھ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تُو دُکھ میں پڑ جائے۔
اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ	(۴) (یہ تو) صرف (خدا سے) ڈرنے والے انسان کے لیے راہ نمائی اور ہدایت (کے لیے) ہے۔
تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۙ	(۵) (قرآن) اس کی طرف سے اُتارا ہوا ہے جس نے زمین اور اُونچے آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔

دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ جوان ہوئے تو امین و صدوق کہلائے اور النظر بن الحارث جیسے دشمنوں نے بھی کہا کہ یہ شخص جھوٹا نہیں۔ مصیبت زدوں کی مدد کے لیے آپؐ نے حلف الفضول میں حصّہ لیا اور ابوجہل جیسے دشمن سے لوگوں کو حق دلایا) دولت مند نہ ہونے کے باوجود اتنی سیر چشمی تھی کہ امین کہلائے اور دیانت کا یہ حال تھا کہ تجارت کرتے تو لوگ آپؐ کو تلاش کر کر کے آپؐ سے چیزیں خریدتے۔ حضرت خدیجہؓ کے ایک غلام کہتے ہیں ایسا دیانتدار میں نے نہیں دیکھا۔ جب حضرت خدیجہؓ نے ساری دولت آپ کو دے دی پھر بھی وہی غریبی رہی اور آپؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سب غلاموں کو آزاد کر دیا۔ برداشت، رحم اور درگذر کا یہ حال تھا کہ جب طائف میں دشمنوں نے آپ کو سر سے پاؤں تک زخمی کر دیا تو اس وقت ایک فرشتہ نے آکر کہا کہ اگر چاہو تو ابھی ان کو سزا دی جائے۔ مگر آپؐ نے فرمایا نہیں یہ نادانی کر رہے ہیں۔ اہلِ مکّہ کے مظالم کس قدر تھے مگر مکّہ فتح کیا تو سب کو لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر چھوڑ دیا۔

شجاعت ایسی تھی کہ جب مکّہ کے مخالفوں نے ابوطالب کو دھمکی دی تو آپؐ نے فرمایا میں ساری تکالیف برداشت کر لوں گا لیکن وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لا کر رکھ دیں پھر بھی میں اشاعتِ توحید سے نہیں رُک سکتا۔

۳؎ شقاوۃ کے معنے حصُول مقصد کیلئے خُدا تعالےٰ کے پیدا کردہ سامانوں سے محروم رہنے کے" اور "تھکان اور تکلیف کے ہیں اس میں بتلایا ہے کہ قرآنی تعلیم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خلافِ فطرت ہو اور اس طرح دکھ میں ڈالنے والی ہو یا حصُولِ مقصد کے لیے الٰہی امداد سے محروم کرنے والی ہو۔ یعنی قرآن رحمت ہے لعنت نہیں یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب تو طٰہٰ یعنی کامل القویٰ انسان ہے اور اپنے فرائض بخوبی ادا کر رہا ہے تو ہم ویسا کلام کیسے اتار سکتے ہیں جو تجھے تباہ کر دے۔

۴؎ یعنی نزولِ قرآن کا مقصد خدا تعالےٰ سے ڈرانا ہی نہیں بلکہ ڈرنے والوں کو مقرب الٰہی بنانا بھی ہے جیسا کہ $\frac{۲}{۲}$ میں تصریح ہے۔

۵؎ یعنی جس نے دنیا کی خدمت کے لیے مادی آسمان بنایا ہے ضرور تھا کہ اس کی رُوحانی خدمت کے لیے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (۶) (وہ) رحمٰن (ہے جو) عرش پر مستحکم طور پر قائم ہو گیا ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۷) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور وہ بھی جو ان دونوں کے درمیان وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ ہے اسی کا ہے نیز (وہ بھی) جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ (۸) اگر تو اونچی آواز سے بولے تو خدا اسکو بھی سنتا ہے اور اگر آہستہ آواز سے بولے تو السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ اسکو بھی سنتا ہے کیونکہ وہ پوشیدہ بات کو بھی جانتا ہے اور جو بہت ہی پوشیدہ ہوتی ہے (اسے بھی جانتا ہے)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ (۹) اللہ (وہ ذات ہے کہ اس) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی الْحُسْنٰى ۝ بہت سی اچھی صفات ہیں۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ (۱۰) اور (اس کے ثبوت میں ہم کہتے ہیں کہ) کیا تیرے پاس موسیٰؑ مُوْسٰى ۝ کا واقعہ پہنچا ہے؟ (یا نہیں)

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا (۱۱) (یعنی) جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اس نے اپنے اہل سے کہا۔ اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ (اپنی جگہ) ٹھہرے رہو میں نے ایک آگ دیکھی ہے ممکن ہے کہ میں مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى وہاں جا کر اس آگ میں سے کوئی انگارہ تمہارے لیے بھی لے آؤں النَّارِ هُدًى ۝ یا آگ پر (اپنے لیے کوئی رُوحانی) ہدایت حاصل کروں۔

رُوحانی آسمان یعنی بلند روحانی مقام کے لوگ پیدا کرتا جس کی مدد سے لوگ بلند سے بلند تر ہوتے جاتے۔

۶ فرمایا جیسے ہم نے بغیر استحقاق صفت رحمانیت کے ماتحت دنیا کو مادی نعمتیں دی ہیں۔ اسی طرح قرآن نازل کیا ہے اور گو اس کا نزول صفت رحمانیت کے ماتحت ہے مگر خدا نے عرش پر سے یعنی تختِ شاہی سے اس کا اعلان کیا ہے اس لیے اس کا انکار الٰہی حکومت کا انکار ہے۔ رحمٰن کے معنے بغیر سابقہ کام کے رحم کرنے کے ہیں۔ اس میں کفارہ کا ردّ بھی ہے جس کی بنیاد اس پر ہے کہ بغیر کام کے کسی پر رحم نہیں ہو سکتا۔ "عرش" کے لیے دیکھیں یونس نوٹ ۴ اور فرقان نوٹ ۶۰۔

۷ اس میں یہ اشارہ ہے کہ عام تخت نشینوں کی طرح اس کی حکومت محدود نہیں بلکہ سب کچھ خدا کا ہے اس لیے وہ آسمان سے زمین کے نیچے تک تمام چیزوں کو مومنوں کی تائید میں اور کفار کے خلاف لگا دے گا۔

۸ چونکہ اس کی حکومت آسمانوں پر بھی ہے اور زمین پر بھی اس لیے وہ اونچی اور آہستہ دونوں باتوں کو سن لیتا ہے

۹ جب وہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے تو پھر کسی اور معبود کا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ اور کونسی جگہ رہ جائیگی جو اس کی ملکیت ہوگی۔

۱۱ یہاں "النَّارُ" کی جگہ "نَارًا" یعنی ایک آگ" کہنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ روحانی نظارہ تھا۔ بعض روحانی جلوے صرف دیکھنے والے کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ولایت کا جلوہ اور بعض دوسروں سے بھی تعلق رکھتے ہیں

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ (۱۲) پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اسے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ!

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (۱۳) میں تیرا رب ہوں۔ پس تو اپنی دونوں جوتیاں اتار دے کیونکہ تو اس پاک وادی طوٰی میں ہے۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ (۱۴) اور میں نے تجھے (اپنے لئے) چن لیا ہے پس تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کو تو سن (اور اس پر عمل کر)

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ (۱۵) میں یقیناً اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تو میری ہی عبادت کر۔ اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ (۱۶) قیامت یقیناً آنے والی ہے۔ قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کر دوں تاکہ ہر نفس کو اپنے اعمال کے مطابق جزا دی جائے۔

جیسے نبوت کا جلوہ۔ جیسی حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ کہ اگر وہ جلوہ نبوت ہوا تو میں اس میں سے کوئی انگارہ یعنی تعلیم تمہارے لیے بھی لے آؤں گا ورنہ اگر وہ جلوہ ولایت ہوا تو کم از کم اپنی ذات کے لیے ہی ہدایت حاصل کروں گا۔ دس سال مدین میں قیام کے بعد مصر کی طرف مع اہل و عیال واپسی پہ راستہ میں حضرت موسیٰؑ نے یہ نظارہ دیکھا تھا۔ خروج ۳/۲ اور ۴/۱۲-۱۸ کی رو سے جب موسیٰؑ مدین سے حورب بکریاں چرانے گئے ہوئے تھے وہاں انہیں جلوہ دکھائی دیا۔ پھر وہ مدین آکر اپنے خسر سے اجازت لے کر بیوی بچوں کو ساتھ لے گئے۔ لیکن بکریاں چرانے سینکڑوں میل جانا اور بچوں کو لینے واپس آنا حالانکہ انہیں ساتھ ہی لے جایا جا سکتا تھا خلافِ عقل ہے اور بائیبل کا بیان غلط۔

۱۲ آگ تو بولا نہیں کرتی مگر وہ بولی اور اس نے کہا میں "رب" ہوں اس سے ظاہر ہے کہ جلوہ کو ظاہر کرنے والا خدا تعالیٰ تھا۔

۱۳ علم تعبیر الرؤیاء کی رو سے رؤیا میں جوتی دیکھنے سے مراد دنیوی تعلقات ہوتے ہیں وہی یہاں مراد ہیں۔ دنیوی تعلقات رشتہ داری کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں اور قوم کی وجہ سے بھی۔ پس تعلقات دو قسم کے ہیں جن کو نعلیں کی تثنیہ سے ادا کیا۔

۱۴ یہاں خدا تعالیٰ نے وضاحتاً فرما دیا کہ اے موسیٰ انا اخترتک جس سے ظاہر ہے کہ آگ نہیں خدا بولا تھا۔

۱۵ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہیں خود بھی نماز پڑھ اور دوسروں کو بھی پڑھا گویا اقامت صلوٰۃ کے معنے باجماعت نماد کے ہیں لِذِكْرِيْ یعنی نماز صرف میرے لیے ہو دکھاوے کی نہ ہو۔

۱۶ خفاء کے معنے ظاہر کرنے کے بھی ہیں اور چھپانے کے بھی اس لیے اَكَادُ اُخْفِيْهَا سے مراد یہ ہے کہ

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝

(۱۷) پس جو شخص قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے تجھے قیامت پر ایمان لانے سے روک نہ دے جس کے نتیجہ میں تو ہلاک ہوجائے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝

(۱۸) اور (ہم نے اس وقت موسٰی سے کہا کہ) اے موسٰیؑ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝

(۱۹) (اس نے) کہا یہ میرا سونٹا ہے میں اس پر سہارا لیتا ہوں۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اسکے سوا بھی اس میں میرے لیے اور کئی فائدے پوشیدہ ہیں۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝

(۲۰) اسپر اس (یعنی خدا تعالیٰ) نے فرمایا اے موسٰی! اس عصا کو زمین پر پھینک دے

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝

(۲۱) سو اس نے اسے زمین پر پھینک دیا جس کے بعد اس نے اچانک دیکھا کہ وہ سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ وقفہ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝

(۲۲) اس پر اس (یعنی اللہ تعالیٰ) نے فرمایا۔ اس کو پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت کی طرف لوٹا دیں گے۔

---

(۱) قریب ہے کہ میں تیری فتح اور ان کی تباہی کے آثار ظاہر کردوں یا (۲) میں وقت تباہی کو چھپا کے رکھوں تاکہ وہ ان پر اچانک آئے اس میں اشارہ یہ ہے کہ آثار تباہی تو شروع ہوجائیں گے مگر وقت تباہی مخفی رکھا جائے گا۔

۱۷ اس میں بتایا ہے کہ تباہی تورات پر عمل سے نہیں آئیگی بلکہ اس کو چھوڑنے سے آئیگی گویا یہاں آیت ۳ کے مضمون کی تصدیق کی گئی ہے استثنا باب ۲۸ آیات ۲۰ کا بھی یہی مضمون ہے استثناء میں کہا گیا ہے کہ تورات پر عمل کریگا تو تو اندر آتے وقت بھی مبارک ہوگا اور باہر جاتے وقت بھی۔" آنحضرتؐ کو بھی اسی مضمون کی دعا سکھلائی گئی ہے (۱۷/۸۱) اس سے بھی آپ کا مثیل موسٰی ہونا

۱۸-۱۹ عصا کے معنے جماعت کے بھی ہیں کشف میں موسٰی نے کہا یہ میرا عصا یعنی میری جماعت ہے اتوکؤا علیھا میں اسپر سہارا لیتا ہوں یعنی اشاعت دین میں امداد لیتا ہوں۔ واھش بھا علٰی غنمی اور اس کی مدد سے غنم یعنی غیراز قوم لوگوں کے فوائد کی بھی نگرانی کرتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی طرح موسٰیؑ کو بھی حکم تھا کہ اپنی قوم سے زکوٰۃ لو مگر فائدہ غیروں کو بھی پہنچاؤ۔

۲۰ یعنی اس کی نگرانی چھوڑ کر دیکھ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۲۱ یعنی موسٰیؑ نے دیکھ لیا کہ آپ چند دن کے لیے باہر گئے تو پیچھے قوم سانپ کی طرح زہریلی بن گئی۔

۲۲ یعنی تیری قوم تیری زندگی میں مستقل طور پر خراب نہیں ہوگی بلکہ تو جب بھی اس کی طرف توجہ کریگا ہم اسکی اصلاح کرکے اسے پہلی حالت کی طرف لوٹا دینگے چنانچہ موسٰی کی پہاڑ سے واپسی کے بعد قوم پھر درست ہوگئی۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ
(۲۳) اور اپنے ہاتھ کو بغل میں دبا لے جب تو اُسے نکالے گا تو وہ سفید ہوگا۔ مگر بغیر کسی بیماری کے۔ یہ ایک اور نشان ہوگا۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۚ
(۲۴) (اور ہم یہ اسلیے کرینگے) تاکہ اسکے نتیجہ میں ہم تجھ کو اپنے بڑے بڑے نشانات دکھائیں

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۠
(۲۵) تو فرعون کی طرف جا کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کی ہے۔

ع ۱

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ
(۲۶) اس پر موسیٰ نے کہا۔ اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے۔

وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ
(۲۷) اور جو فرض مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کو پورا کرنا میرے لیے آسان کر دے

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۙ
(۲۸) اور اگر میری زبان میں کوئی گرہ ہو تو اسے بھی کھول دے۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۠
(۲۹) (حتیٰ کہ) لوگ میری بات آسانی سے سمجھنے لگیں۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۙ
(۳۰) اور میرے اہل میں سے میرا ایک نائب تجویز کر۔

۲۳ے ید کے معنے قوم کے بھی ہیں اور کشف میں ہاتھ دیکھنے سے مراد، لڑکا، بھائی، مال۔ بیوی، شریک اور دوست ہوتا ہے۔ یہ ایک کشفی نظارہ تھا جس میں خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کو کہا کہ اپنی قوم کے کارآمد لوگوں کو اپنے ساتھ ملاؤ۔ اس کے نتیجہ میں وہ بغیر سوء نورانی بن جائیں گے۔ یعنی ان کی نیکی میں خرابی نہیں ہوگی یہ نہ ہوگا کہ ظاہر اچھا ہو اور باطن خراب۔ اس کے برخلاف بائیبل نے لکھا ہے کہ موسیٰؑ کا ہاتھ کوڑھ کی وجہ سے سفید ہو گیا تھا جو نبی کی شان کے بھی خلاف ہے اور اس میں کوئی نشان بھی نہیں (دیکھیں خروج ۴/۶)

۲۴ے قرآن نے نو آیات بیان کی ہیں عصا اور ید بیضاء کا نشان جو اس سورۃ میں مذکور ہیں طوفانوں، ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کا نشان (اعراف ۱۳۴) قحط کا نشان (اعراف ۱۳۱) اور سمندر پار گزرنے کا نشان (یونس ۹۱)، بائیبل میں بھی یہ نشان مذکور ہیں۔ خروج ۴/۲ میں عصا کا۔ ۴/۶ میں ید بیضاء کا۔ ۷/۲۰-۲۲ میں دریا کے لہو ہو جانے کا۔ ۸/۵-۷ میں مینڈکوں کا اور ۸/۱۶-۱۸ میں جوؤں کا۔ ۸/۲۴ میں مچھروں کا۔ ۹/۵-۶ میں مری کا۔ ۹/۸-۱۱ میں پھوڑے پھنسیوں کا ۹/۲۲-۲۴ میں اولوں کا۔ ۱۰/۱۲-۱۶ میں ٹڈیوں کا۔ ۱۰/۲۱-۲۳ میں تاریکی کا۔ ۱۲/۲۹-۳۰ میں پہلوٹھوں کی موت کا۔ اور ۱۴/۲۱-۲۲ میں سمندر سے پار گزرنے کا نشان لکھا ہے۔ بائیبل نے ۹ کی بجائے ۱۳ نشان بیان کئے ہیں مگر حقیقت میں وہ نو ہی ہیں۔ طوفان میں اولوں اور تاریکی کا نشان۔ "خون" میں دریا کا لہو ہونا اور پھوڑے پھنسیوں اور پہلوٹھوں کی موت کا نشان۔ اور "قمل" میں مچھروں کا نشان شامل ہیں۔

۲۵-۳۰ے اس دعا سے ظاہر ہے کہ ہدایت خدا ہی کی طرف سے آتی ہے جبھی موسیٰؑ نے دعا کی کہ جو تعلیم میں دوں اس پر خود بھی عمل کروں اور لوگ بھی میری بات کو آسانی سے مان لیں۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ تبلیغ کے لیے دعا مانگتے رہنا کامیابی کا گر ہے۔

هٰرُوْنَ اَخِیْ ۙ — (٣١) (یعنی) ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۙ — (٣٢) اس کے ذریعہ سے میری طاقت کو مضبوط کر۔

وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۙ — (٣٣) اور اس کو میرے کام میں شریک کر۔

كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۙ — (٣٤) تاکہ ہم (دونوں) کثرت سے تیری تسبیح کریں۔

وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ؕ — (٣٥) اور کثرت سے تیرا ذکر کریں۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا — (٣٦) تو ہمیں خوب دیکھ رہا ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی (٣٧) (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ اے موسیٰ! جو تو نے مانگا۔ تجھے دیا گیا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓی ۙ (٣٨) اور ہم (اس سے پہلے) ایک بار اور بھی تجھ پر احسان کر چکے ہیں۔

اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ مَا یُوْحٰٓی ۙ — (٣٩) جب ہم نے تیری ماں پر وحی کے ذریعہ وہ سب کچھ نازل کر دیا جو ایسے موقعہ پر نازل کرنا ضروری تھا۔

اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ ۘ — (٤٠) (جسکی تفصیل یہ ہے) کہ اس (یعنی موسیٰؑ) کو تابوت میں رکھ دے پھر اس (تابوت) کو دریا میں رکھدے پھر اسکے بعد یوں ہوگا) دریا ہمارے حکم سے اس (تابوت) کو ساحل تک پہنچا دے (تاکہ) اسکو وہ شخص لے جائے جو میرا بھی اور اس (یعنی موسیٰ) کا بھی دشمن ہے اور تجھ پر میں نے اپنی طرف سے محبت نازل کی (یعنی تیرے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کی) اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے پالا گیا۔

اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ — (٤١) (یہ اسوقت ہوا) جب تیری بہن (ساتھ ساتھ چلتی) جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی کہ اے لوگو! کیا میں تمہیں اس عورت کا پتہ بتاؤں جو اس کو پال لے گی۔ اور اس طرح ہم نے تجھ کو تیری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اسکی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ اور وہ غم نہ کرے اور

---

٣١ تا ٣٣ جب موسیٰؑ کو منصب نبوت ملا تو انہوں نے فوراً مددگار کا مطالبہ کیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم نے گو انکسار ظاہر کیا مگر اکیلے ہی دشمن کے مقابل پر ڈٹ گئے جیسے ~~~ میں اشارہ ہے۔ اُحد میں کسی مخالف نے حضورؐ سے مقابلہ چاہا تو باوجود اس کے کہ صحابہؓ اس سے لڑنا چاہتے تھے حضورؐ نے خود اس کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔ حنین میں باوجود اکیلے رہ جانے کے آپؐ نے مسلمانوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار نہیں کیا بلکہ تیروں کی بارش میں آگے بڑھتے گئے۔

٣٤-٣٥ موسیٰؑ تو کثرت سے تسبیح کرنے کے لیے ساتھی مانگا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لیے بھی ساتھی نہیں مانگا اکیلے ہی یہ کام کیا (٣١/٢٠)

نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝

(اے موسیٰ!) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا پھر ہم نے تجھ کو اس غم سے نجات بخشی اور ہم نے تجھ کو اور کئی امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح آزمایا (جس کے بعد) تو کئی سال مدین کے لوگوں میں رہا۔ پھر اے موسیٰ (بہتے ہوتے) تو اس عمر کو پہنچ گیا۔ جو ہمارے کام کے قابل ہوتی ہے۔

(۴۲) اور میں نے تجھ کو اپنی ذات کیلئے (روحانی ترقی دیتے دیتے) تیار کیا۔

(۴۳) (پس جب تو اس عمر کو پہنچ گیا تو میں نے تجھے کہا کہ) تو اور تیرا بھائی میرے نشان لیکر جاؤ اور میرے ذکر میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔

(۴۴) تم دونوں ہی فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

(۴۵) اور تم دونوں اس سے نرم نرم کلام کرو۔ شاید کہ وہ سمجھ جائے یا (ہم سے) ڈرنے لگے۔

(۴۶) دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی (کرے یا ہم پر حد سے زیادہ سختی نہ کرے۔

---

٣٤٢ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى میں یہ اشارہ تھا کہ نبی کریم صلعم کو بھی وہ سب کچھ ملیگا جو آپ مانگیں گے (کیونکہ آپ مثیل موسیٰ ہیں) واقعہ پرورش میں موسیٰ اور نبی کریم صلعم میں مشابہت ہے موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے ان کی بہن نے کوشش کی۔ لیکن نبی کریم صلعم کو دودھ پلوانے کے لیے خدا تعالیٰ حلیمہ کو مجبور کرکے لے آیا۔ خدا تعالیٰ نے یہ تدبیر کی کہ ایک طرف ساری دائیوں نے آپؐ کو رد کر دیا دوسری طرف حلیمہ کو سب لوگوں نے بچہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ خود آپؐ کے پاس آکر آپ کو لے گئیں اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کا پتھر ہوگیا" (متی ٢١/٤٢)

٣٤٣ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ میں بھی موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت ہے چنانچہ آپؐ کو بھی فرعون کی مشابہ قوم کی طرف بھیجا گیا انا ارسلنا الیکم شاھدًا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا (مزمل ٣٤٣/١٦) مگر فرق یہ ہے کہ گو فرعون کی طرح آپؐ کی قوم نے بھی آپؐ کو قتل کی دھمکی دی مگر آپؐ ڈرے نہیں۔ جرأت سے اپنے کام میں لگے رہے۔ چنانچہ جب ابو طالب کے پاس اہل مکہ نے شکایت کی تو آپؐ نے ان کے سمجھانے پر فرمایا اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ اور چاند کو بائیں ہاتھ کھڑا کر دیں پھر بھی میں اشاعت توحید سے رک نہیں سکتا۔ اسی طرح جنگ اُحد میں جب ابو سفیان نے آنحضرتؐ کا حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لیکر کہا کہ وہ مارے گئے ہیں تو آپؐ نے جواب دینے سے منع کر دیا۔ لیکن جب اس نے کہا کہ اُعْلُ هُبَل تو آپؐ نے کسی خطرہ کی پرواہ نہ کی اور فرمایا کہتے کیوں نہیں اللہ اعلیٰ و اجلّ۔

قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ۝

(۴۷) (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا تم دونوں بالکل نہ ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں (تمہاری دعائیں بھی) سنتا ہوں اور (تمہاری حالت بھی) دیکھتا ہوں

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۵ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۝

(۴۸) پس دونوں اس کے پاس چلے جاؤ اور اسے کہو ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے اور ان کو تکلیفیں مت دے ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک بڑا نشان لیکر آئے ہیں اور (تجھے بتاتے ہیں کہ) جو (شخص ہماری لائی ہوئی) ہدایت کے پیچھے چلیگا (خدا کی طرف سے) اس پر سلامتی نازل ہوگی۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝

(۴۹) ہم پر یہ وحی نازل کی گئی ہے کہ جو کوئی (خدا کے نشان کو) جھٹلائیگا اور پیٹھ پھیرے گا۔ اس پر عذاب نازل ہوگا۔

قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ ۝

(۵۰) (اس پر فرعون نے) کہا۔ اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ۝

(۵۱) (موسیٰ نے) کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو (اسکی ضرورت کے مطابق) اعضاء عطا کیے ہیں اور پھر ان (اعضاء) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ۝

(۵۲) (فرعون نے) کہا (اگر یہ بات ہے) تو پہلے لوگوں کا کیا حال تھا (یعنی وہ تو ان باتوں کو نہیں مانتے تھے ان سے کیا سلوک ہوگا)

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ۝

(۵۳) (موسیٰ نے) کہا ان (پہلے لوگوں) کا علم تو میرے رب کو ہے (ان کے حالات اس کی) کتاب میں محفوظ (ہیں) میرا رب بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ

(۵۴) (وہی ہے) جس نے تمہارے لیے اس زمین کو فرش کے طور پر بنایا۔

۴۵-۴۹ موسیٰ کو قول لین کا حکم تھا پھر بھی وہ ڈرے لیکن نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے نڈر ہوکر تبلیغ کی جیسا کہ القلم ۶۸/۱۰ اور الفتح ۴۸/۳۰ سے ظاہر ہے۔

لعلہ یتذکر میں لعلّ الٰہی شک کا اظہار نہیں کرتا بلکہ لعلّ میں امید کے معنے پائے جاتے ہیں اور یہ امید کبھی قائل کی طرف سے ہوتی ہے کبھی سامع کی طرف سے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اے موسیٰ تم اسے اس امید کے ساتھ تبلیغ کرنا کہ شاید وہ ہدایت پا جائے۔

۵۰-۵۳ فرعون نے حسب عادت کفار یہ کہہ کر کہ تیرے پیغام کے مطابق تو ہمارے آباء کا انجام بد ہوا قوم کو اکسانا چاہا۔ مگر موسیٰؑ نے جواباً فرمایا کہ جزا سزا تو اتمام حجت کے بعد ہوتی ہے مجھے کیا علم کہ ان پر اتمام حجت ہوا تھا یا نہیں یہ خدا ہی جانتا ہے۔

۵۴-۵۵ یعنی جس طرح مادی پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اسی طرح روحانی پانی یعنی الہام بھی آسمان سے

مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝

اور اس میں تمہارے لیے راستے بھی نکالے ہیں اور آسمان سے پانی اُتارا ہے۔ پھر (تو ان سے یہ بھی کہہ دے کہ) ہم نے اس پانی کے ذریعے سے مختلف قسم کی روئیدگیوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝

(۵۵) (پس) تم بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ اس میں عقل والے لوگوں کے لیے بہت سے نشان ہیں۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝

(۵۶) ہم نے اسی (زمین) سے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹا دیں گے اور اسی میں سے تم کو دوسری دفعہ نکالیں گے۔

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝

(۵۷) اور ہم نے اس (یعنی فرعون) کو ہر قسم کے نشان دکھائے مگر باوجود اس کے، وہ جھٹلانے پر مُصر رہا اور انکار کرتا چلا گیا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝

(۵۸) اور کہنے لگا (اے موسیٰ!) کیا تو اس لیے ہمارے پاس آیا ہے کہ تا کہ اپنی سحر بیانی کے ذریعہ سے ہم کو ہماری زمین سے نکال دے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝

(۵۹) (اگر یہ بات ہے) تو ہم بھی تیرے مقابلہ میں ویسا ہی جادو لائیں گے پس ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک (وقت اور) مقام موعود مقرر کر۔ نہ اس سے ہم پیچھے ہٹیں اور نہ تو ہٹے وہ (ایک ایسا مکان ہو) جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہو۔

ع ۲ / ۱۱

نازل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ بھی آدمیوں اور جانوروں کی غذا مہیا کی جاتی ہے یعنی ان لوگوں کی غذا بھی جو اعلیٰ درجہ کے ہیں اور ان کی بھی جو ادنیٰ حالت میں ہیں۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى سے معلوم ہوتا ہے کہ نبات کے بھی جوڑے ہیں۔ یہ بات سائنسدانوں کو آج معلوم ہوئی ہے حالانکہ قرآن میں سینکڑوں سال سے درج ہے۔

۵۶ قوم فرعون جو ستارہ پرست تھی) کا عقیدہ تھا کہ روحیں ستاروں سے اترتی جنم لیتی اور پھر وہیں واپس چلی جاتی ہیں۔ فرماتا ہے یہ غلط ہے پیدائش اور موت اور دوبارہ بعث سب ہم ہی کرتے ہیں اور یہ امور اسی زمین سے وابستہ ہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح آسمان پر نہیں گئے۔

۵۸ فرعون کی مصر پر حکومت انگریز کی ہند پر حکومت کی طرح تھی اس لیے اس نے لوگوں کو بھڑکانے کے لئے "مجھے" کی بجائے "ہمیں" نکالنا چاہتے ہو۔ کہا

۵۹ فرعون نے مقابلہ میں انصاف کا خیال رکھا اور ایسی جگہ مقرر کی جہاں فتنہ و فساد کا خطرہ ہی نہیں تھا۔ مگر آجکل لوگ یہ امر ملحوظ نہیں رکھتے۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۞

(٦٠) (اس پر موسیٰ نے) کہا کہ تمہارے (ہمارے) اکٹھے ہونیکا دن (تمہاری) عید کا دن ہو اور نیزہ بھر سورج چڑھے سب لوگوں کو جمع کیا جائے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۞

(٦١) اس پر فرعون پیٹھ پھیر کر چلا گیا اور جو تدبیریں اس سے ممکن ہو سکتی تھیں ان کو مہیا کیا اور پھر (موسیٰ کی طرف) لوٹا۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۞

(٦٢) (تب) موسیٰ نے ان سے کہا۔ اے لوگو! تم پر ہلاکت ہو۔ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو عذاب کے ذریعہ سے پیس ڈالے اور جو کوئی (خدا پر) افترا کرتا ہے، وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۞

(٦٣) یہ سنکر (فرعون اور اس کے ساتھی) آپس میں جھگڑنے لگے اور خفیہ منصوبے کرنے لگے۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۞

(٦٤) (اور) انہوں نے کہا۔ یہ دونوں (یعنی موسیٰ و ہارون) اور کچھ بھی نہیں صرف جادوگر ہیں (جو) یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہاری زمین سے اپنے جادو کے زور سے نکال دیں۔ اور تمہارے اعلیٰ درجہ کے مذہب کو تباہ کر دیں۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۞

(٦٥) پس چاہیے کہ تم بھی اپنی تدبیریں سوچ لو۔ پھر سب کے سب ایک جماعت کی شکل میں آؤ۔ اور جو (شخص) آج جیتے گا وہ ضرور بامراد ہوگا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ

(٦٦) (اس پر) ان لوگوں نے جن کو موسیٰ کے مقابلہ کیلئے فرعون نے جمع کیا تھا) کہا کہ اے موسیٰ! یا تو (اپنی تدبیر) پھینک (یعنی

---

٦٠ یوم الزینۃ سے مراد عید کا دن ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے وہ دن اس لیے پسند کیا کہ وہ مقدس دن تھا فساد کا دن نہیں تھا۔ اور صبح کا وقت اس لیے پسند کیا کہ لوگ تازہ دم ہوں اور بات سمجھ سکیں۔

٦١ تا ٦٤ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ۔ یہ فرعون کے ساتھیوں کا قول ہے جنہوں نے ایسا کہکر دنیوی اور مذہبی دونوں طریقوں سے لوگوں کو اشتعال دلانا چاہا۔

٦٥ لوگ سمجھتے ہیں کہ جائز مقصد کے لیے ناجائز ذرائع کا استعمال جائز ہے حالانکہ ناجائز ذرائع کا استعمال بتاتا ہے کہ اس چیز کا صداقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ فرعون نے بھی لوگوں کو اس بات پر اکسایا کہ جو دھوکہ فریب ممکن ہے کرو کیونکہ تمہارا مقصد موسیٰؑ پر غلبہ پانا ہے یہ نہ دیکھو کہ تمہاری تدابیر کیسی ہیں۔

اَلْقٰى ٥

ظاہر کر، یا ہم تجھ سے پہلے پھینکیں۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ٥

(۶۷) (تب موسیٰ نے) کہا (بہتر یہ ہے) کہ تم اپنی تدبیر پھینکو (یعنی ظاہر کرو)، پس انہوں نے جو تدبیر کی اسکے نتیجہ میں انکی رسیاں اور انکے سونٹے موسیٰؑ کو (انکے فریب کی وجہ سے) یوں نظر آئے گویا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ٥

(۶۸) اور موسیٰ اپنے نفس میں پوشیدہ طور پر ڈرا۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ٥

(۶۹) (تب) ہم نے وحی کی (اے موسیٰ!) مت ڈر۔ کیونکہ تو ہی غالب آئیگا۔

وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ٥

(۷۰) اور جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اس کو زمین پر ڈال دے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس سب کو وہ نگل جائیگا (یعنی اس کا بھانڈا پھوڑ دیگا)، انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ تو فریبکاروں کا ایک فریب ہے، اور فریبکار جس طرف سے بھی آئے (خدا کے مقابلہ میں) کامیاب نہیں ہو سکتا۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ٥

(۷۱) پس (جب موسیٰ کے سونٹا ڈالنے کے بعد فرعون کے لائے ہوئے جادوگر اپنی کمزوری سمجھ گئے تو وہ اپنی ضمیر کی آواز سے) سجدہ میں گرائے گئے اور کہنے لگے ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ

(۷۲) (اس پر فرعون نے) کیا تم میرے حکم سے پہلے ہی اس پر ایمان لاتے ہو (معلوم ہو گیا کہ) وہ تمہارا سردار ہے جس نے تم کو یہ چالاکیاں سکھائی ہیں۔ پس (اس فریب کی جزا میں) میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں (اپنی) خلاف ورزی کی وجہ سے کاٹ دوں گا۔ اور (میں تم کو) کھجور کے تنوں سے باندھ کر

---

۶۶ ساحروں نے تکبر نہیں کیا اور ادب سے پوچھا کہ آپ ابتدا کریں گے یا ہم۔ اسی ادب کی وجہ سے نکتہ نواز خدا نے انہیں ایمان نصیب کر دیا۔

۶۷ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحروں کی سونٹیوں میں پارہ یا لچکدار پیچ وغیرہ تھے جن کے دبانے سے وہ ہلنے لگ جاتی تھیں۔

۶۸ یہاں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الہاماً موسیٰؑ کو بتا دیا۔ کہ ان کے اندر پیچ وغیرہ ہیں اور کچھ نہیں ان پر سونٹا مار یہ چیزیں نکل جائیں گی اور ان کی حرکت بند ہو جائے گی اسی طرح معنوی طور پر تیرا سونٹا ان کو نگل جائے گا۔

۷۱ اپنی شکست سے ساحروں کو موسیٰؑ کی سچائی کا یقین ہو گیا اس لیے وہ ایمان لے آئے۔

جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۡ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبۡقٰی ۝ | صلیب دیدوں گا۔ اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔

قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالَّذِیۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ؕ | (۷۳) (اس پر) انہوں نے (یعنی فرعون کے پہلے ساتھیوں یا ساحروں نے کہا ہم تجھ کو ان نشانات پر فوقیت نہیں دے سکتے جو خدا کی طرف سے) ہمارے پاس آئے ہیں اور نہ اس (خدا) پر جس نے ہم کو پیدا کیا پس جو تیرا زور لگتا ہے لگا لے تو صرف اس دنیا کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔

اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ۝ | (۷۴) ہم (اب) اپنے رب پر ایمان لاچکے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور اس دھوکا بازی (کے مقابلہ) کو بھی معاف کر دے جس کے لیے تو نے ہم کو مجبور کیا تھا۔ اور اللہ سب سے بہتر ہے اور سب سے زیادہ قائم رہنے والا ہے۔

اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَلَا یَحۡیٰی ۝ | (۷۵) حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے رب کے پاس مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوتا ہے اُسے یقیناً جہنم ملتی ہے نہ وہ اس میں مرتا ہے اور نہ زندہ رہتا ہے۔

وَمَنۡ یَّاۡتِہٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَہُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی ۝ | (۷۶) اور جو شخص مومن ہونے کی حالت میں جبکہ وہ ساتھ ساتھ مناسب حال عمل بھی کرتا اس (یعنی خدا تعالیٰ) کے پاس آئیگا تو ایسا ہر شخص اعلیٰ درجہ پائے گا۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی ۝ | (۷۷) (وہ درجے) ہمیشہ رہنے والے باغات (ہوں گے) جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ (اور) وہ ان میں رہتے چلے جائیں گے اور یہ اس شخص کا مناسب بدلہ ہے جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے۔

ع ۳

وَلَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۬ۙ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ | (۷۸) اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی تھی کہ میرے بندوں (یعنی اپنی قوم کو) رات کے اندھیرے میں نکال کر لے جا۔ پھر ان کو سمندر میں ایک

۷۲؎ من خلاف کے یہ معنے ہیں کہ خلاف ورزی کی وجہ سے۔ یا یہ کہ ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹوں گا۔

۷۳؎ جب ایمان کامل ہو جائے تو پھر ہر چیز ہیچ ہو جاتی ہے تبھی ایمان لاتے ہی ساحروں نے فرعون کی پرواہ چھوڑ دی حدیث میں بھی ہے کہ ایمان کے بعد انسان آگ کو اس سے زیادہ پسند کرتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو چھوڑ دے صحابہ کی زندگیوں میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝

راستہ بنا جو خشک ہو نہ تم کو یہ ڈر ہوگا کہ کوئی (شخص) اگر پیچھے سے پکڑ لے اور نہ تم (سمندر کی تباہی سے) ڈروگے ۔ (اسپر موسیٰ اپنی قوم کو لیکر سمندر کی طرف گئے)۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝

(۷۹) اور فرعون اپنے لشکر لیکر ان کے پیچھے پیچھے چلا اور سمندر نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو بالکل ڈھانپ لیا۔

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝

(۸۰) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا ۔ اور ہدایت کا طریق نہ بتایا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝

(۸۱) اے بنی اسرائیل! ہم تم کو تمہارے دشمن سے نجات دے چکے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم تم سے طور کے دائیں طرف ایک بالمقابل وعدہ کر چکے ہیں اور ہم نے تم پر ترنجبین اور بٹیر بھی اتارے تھے۔ (تاکہ تمہارے لیے خوراک مہیا کریں)

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝

(۸۲) (اور کہا تھا کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک چیزیں کھاؤ اور اس (رزق) کے بارے میں ظلم سے کام نہ لینا۔ تا ایسا نہ ہو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہو وہ (بلندی سے) گر جاتا ہے۔

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

(۸۳) اور جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے پھر مناسب حال عمل (بھی) کرے اور ہدایت پا جائے تو میں اس کے (بڑے سے بڑے) گناہ معاف کر دیا کرتا ہوں۔

ف ۷۸-۸۰ قرآن میں اس واقعہ کے متعلق فرق اور انفلق (جدا ہو جانا) کے الفاظ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کے وقت جوار بھاٹا کے اصول کے مطابق سمندر کنارہ سے ہٹ گیا تھا۔ اور فرعون کے گذرنے کے وقت پانی واپس آگیا تھا۔ اس میں معجزہ یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو خدا نے جزر کے وقت سمندر پر پہنچایا۔ اور مصریوں کو ایسے وقت جب پانی لوٹنے والا تھا۔ بحیرہ احمر کے اس کنارہ پر جس پر سے موسیٰؑ گذرے تھے یہ نظارہ عموماً نظر آتا رہتا ہے۔

ف ۸۱-۸۳ دشت سینا سے گذرنا تک خطرناک ہے پھر اس میں سالہا سال بنی اسرائیل کیسے رہے؟ اس کا جواب بائیبل نے من کے نزول اور جواب کے چشموں سے دیا ہے۔ بائیبل کی رو سے من شبنم کے ساتھ ظاہر ہونے والی سفید شے تھی جو دھوپ کی گرمی سے پگھل جاتی ہے اور تیل کا سا مزہ رکھتی ہے (خروج ۱۶/۱۴ و گنتی ۱۱/۷)، ایسی ایک چیز سینا میں فی الواقعہ پائی جاتی ہے یہ ایک گوند ہے جس کی ایک قسم کو شیر خشت اور دوسری کو ترنجبین کہتے ہیں مگر یہ مسہل ہے اس پر چالیس سال گذارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب بعض عیسائی محققین بھی کہنے لگے ہیں کہ من پجن کے

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ (۸۴) اور ہم نے کہا اے موسیٰ! تم اپنی قوم کو چھوڑ کر کس لیے جلدی جلدی آ گئے ہو؟
قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ (۸۵) (موسیٰ نے جواب میں) کہا کہ وہ (لوگ) میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور اے میرے رب!
اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ میں اسلیے تیرے پاس جلدی سے آیا ہوں تاکہ تو (میرے اس فعل پر) خوش ہو جائے۔

دالوں کا نام ہے جو علماء نباتات کے نزدیک کھمب کی قسم ہے مگر بائیبل کی بیان کردہ ماہیت سے اس بوٹی کو کوئی نسبت نہیں گنتی باب سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارھویں قبیلہ کو چھوڑ کر ۶ لاکھ سے اوپر تھی اس کے مطابق ان کی مجموعی تعداد ۲۰ لاکھ ہونی چاہیے اسکے لیے قریبًا کروڑ من سالانہ مَنّ چاہیے تھا مگر وہاں مَنّ ہوتا اڑھائی تین سو سیر ہے پھر حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش اور یعقوبؑ کے مصر میں داخلہ تک ۲۰۰ سال کا عرصہ گذرا ہے اس عرصہ میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل ۱۲-۱۳ افراد تک پہنچی تھی یہی اندازہ یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی اولاد کا لگا لیں تو ۲۰۰ سال میں وہ چھ سات سو ہو گئے ہوں گے۔ اور اگر وہ شادیاں بہت کرتے ہوں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس ہزار ہو گئے ہوں گے اس لیے بائیبل کی بیان کردہ تعداد صحیح نہیں۔ قرآنی آیت الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت فقال لھم موتوا ثم احیاھم (بقرہ ع) سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں نہیں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

قرآن میں مَنّ کا ذکر سورۃ بقرہ $\frac{2}{58}$ اعراف اور طٰہٰ میں ہے اور ہر جگہ اس کے بعد کلوا من طیبٰت کا فقرہ ہے (بقرہ $\frac{20}{82}$) جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کھانا غذائیت کے لحاظ سے اعلیٰ تھا اور صرف ایک قسم کا نہیں تھا۔ حدیث میں ہے کہ کھمب بھی مَنّ کی اقسام میں سے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں سے ایک کھمب بھی تھی۔ علاوہ ازیں ان کو تیتر وغیرہ جو ٹڈی کھاتے ہیں بکثرت مل گئے اس طرح تازہ گوشت اور سبزی میسر آ گئے اور چونکہ یہ چیزیں بغیر محنت ملتی تھیں ان کا نام مَنّ یعنی احسان الٰہی سے ملنے والی غذا رکھا گیا پس مَنّ کا ان دنوں سینا میں بکثرت پیدا ہونا واقعی معجزہ تھا۔ مگر خود اس کا وجود ایسی چیزوں سے ہے کہ اس غذا کو بکثرت پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اس تشریح سے یہ سب سوال حل ہو جاتے ہیں کہ مَنّ کو لوگ دیر تک کس طرح کھاتے رہے اور یہ بھی کہ وہ سال بھر کس طرح ملتی رہی۔ سلویٰ میں پرندے شہد اور تمام ایسی غذائیں جو دل کو تسکین دیں شامل ہیں۔ ولا تطغوا میں بتایا کہ ضرورت سے زیادہ رزق جمع کر کے دوسروں کو محروم نہ کرنا اور زیادہ کھا کر جنگل کی رہائش کا مقصد بھی ختم نہ کر لینا

ف ۸۴-۸۵ حضرت موسیٰ کا قوم سے پہلے ہی جائے وعدہ پر پہنچ جانا ان کا قرب الٰہی کے لیے شدت اشتیاق ظاہر کرتا ہے۔

وَهُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ کا مطلب یہ ہے کہ میری قوم تو میرے نقش قدم پر ہی چل رہی ہے اس لیے میرا ساتھ رہنا ضروری نہیں تھا۔

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝

(٨٦) (اسپر خدا تعالیٰ نے) کہا۔ ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا ہے۔

فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ۝

(٨٧) اس پر موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غصّے سے بھرے ہوئے افسردہ لوٹ گئے (اور اپنی قوم سے) کہا۔ اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا اُس وعدہ کے پورا ہونے میں کوئی دیر ہو گئی تھی؟ یا تم چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی غضب نازل ہو۔ سو تم نے میرے وعدے کو ردّ کر دیا۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝

(٨٨) انہوں نے کہا ہم نے تیرے وعدہ کو اپنی مرضی سے ردّ نہیں کیا بلکہ (فرعون کی) قوم کے زیورات کا جو بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا اس کو ہم نے پھینک دیا۔ اور اسی طرح سامری نے بھی اس کو پھینک دیا۔

فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ۝

(٨٩) پھر اس نے ان کے لیے (یعنی ہمارے لیے) ایک بچھڑا تیار کیا جو محض جسم ہی تھا۔ اس سے ایک بے معنیٰ آواز نکلتی تھی (یعنی حقیقی بچھڑا نہیں تھا) پھر (اس نے اور اس کے ساتھیوں نے) کہا کہ تمہارا بھی اور موسیٰ کا بھی خدا ہے اور وہ اسے بھول (کر پیچھے چھوڑ) گیا ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝

(٩٠) (جب سامری اور اس کے ساتھیوں نے ایسا کیا) مگر کیا وہ خود نہیں دیکھتے تھے کہ وہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ انکو کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے۔

---

٨٦ یعنی تجھے تو ہماری ملاقات کا اتنا شوق ہے اور تیری قوم کا یہ حال ہے کہ ادھر تم ہماری طرف آئے ادھر وہ بہک گئی۔

٨٧ یہاں اَلْعَهْدُ سے مراد خدا کے ہمکلام ہونے کا عہد ہے۔

٨٨ خروج $\frac{١٢}{٣٥-٣٦}$ کے مطابق بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کے کہنے پر مصریوں سے سونا چاندی لوٹا تھا مگر حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات مصریوں نے خود دیئے تھے۔ اور یہی بات عقل کے مطابق ہے کیونکہ نبی ڈاکو نہیں ہوتے۔ بائبل کی ایک اندرونی شہادت بھی اس کی تائید کرتی ہے جب مصر میں بکثرت پہلوٹھے مر گئے تو فرعون نے موسیٰؑ کو کہا کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لیجاؤ اور خروج $\frac{١٢}{٣٣}$ سے ظاہر ہے کہ مصری بھی یہی چاہتے تھے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ انہوں نے خود زیورات دیئے تاکہ وہ عبادت کے لیے باہر چلے جائیں اور ان کا عذاب ٹل جائے۔

٨٩-٩٠ بنی اسرائیل کہتے ہیں فَقَذَفْنَاهَا ہم نے تو زیورات کو پھینک دیا تھا مگر سامری نے اس سونے سے ایک بچھڑا ڈھالا

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِىْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِىْ ۝

(۹۱) اور ہارون نے (موسیٰ کے واپس آنے سے بھی) پہلے ان سے کہدیا تھا کہ اے قوم! تم کو اس (بچھڑے) کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن (خدا) ہے۔ پس میری اتباع کرو۔ اور میرے حکم کو مانو۔ (اور شرک نہ کرو)

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝

(۹۲) (مگر اس ضدی قوم نے) کہا جب تک موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اس کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِىْ ۝

(۹۳) (جب موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے ہارون سے) کہا۔ اے ہارون! جب تو نے اپنی قوم کو گمراہ ہوتے دیکھا تھا تو تجھے کس نے منع کیا تھا؟

(۹۴) تو میرے نقش قدم پہ نہ چلے۔ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟

بچھڑا بنا دیا پھر ہم کیا کر سکتے تھے مجبور تھے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی مولوی نے کسی کا نکاح پڑھ دیا تھا اور کہا تھا میں کیا کرتا انہوں نے چڑھے جتنا روپیہ مجھے دکھایا تھا۔ سامری کا واقعہ ساحروں کے واقعہ کی بھی حقیقت کھولتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں ایسی کرتب بازی کا رواج تھا اور مکینکل کھلونے بنایا کرتے تھے قوم فرعون میں بیل کی پوجا عام تھی۔ بنی اسرائیل انہی میں سے آئے تھے۔ اور محکوم ہونے کی وجہ سے مشرکانہ خیالات ان میں بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے جب سامری نے ایک ایسا بچھڑا بنایا جس میں ہوا داخل ہو کر نکلنے سے سیٹی کے طریق پہ آواز نکلتی تھی تو وہ ٹھوکر کھا گئے۔

۹۱-۹۲ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارونؑ نے شرک نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے قوم کو شرک سے روکا تھا مگر خروج ۳۲ (۱-۶) سے مطابق انہوں نے ہی بچھڑا بنایا تھا۔ اور باب ۳۲ (۵-۶) کے مطابق ان کی قربان گاہ بھی بنائی تھی۔ مگر جو خدا سے ہمکلام ہو رہا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ اس نے خود ساختہ بچھڑے کو معبود بنا لیا ہو گا خلاف عقل ہے نیز خروج ۳۲ (۲۰) اور ۲۷-۲۸ کے مطابق جو شرک کے مرتکب ہوئے ان کو سخت سزائیں دی گئیں لیکن باوجود اس کے کہ خداوند نے موسیٰؑ سے کہا "کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤنگا" (خروج ۳۲ (۲۱)) ہارونؑ کو نہ صرف یہ کہ سزا نہیں دی گئی۔ بلکہ خروج ۴۰ (۱۲-۱۴) اور گنتی باب ۳ کے مطابق ان کو مقدس لباس پہنا کر اور عبادتگاہوں کی نگرانی سپرد کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی اس لیے قرآنی بیان ہی صحیح ہے۔

خروج ۲۴ (۱۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ نے پہاڑ پہ جاتے ہوئے وقت کی تعیین نہیں کی تھی۔ اعراف ۱۴۲ کے مطابق پہلے ان کو ۳۰ رات کا وعدہ دیا گیا پھر خدا تعالیٰ نے ۱۰ رات اور ہمکلامی کا شرف بخشا۔ بنی اسرائیل ایک تو اس طرح دیر ہونے سے گھبرا گئے اور دوسرے سامری نے ان کو بہکا دیا۔ یا قوم انما فتنتم کہکر حضرت ہارونؑ نے قوم کو توجہ دلائی کہ فرعون کی بیرونی آزمائش اس اندرونی آزمائش کے مقابلہ پر ہیچ ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ج اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ج وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰـهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝

(۹۵) (ہارونؑ نے) کہا۔ اے میری ماں کے بیٹے! نہ میری داڑھی (کے بال) پکڑ۔ اور نہ میرے سر کے بال) پکڑ۔ میں تو اس بات سے ڈر گیا تھا کہ تو یہ نہ کہے کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا ہے اور میری بات کا خیال نہیں رکھا (کہ قوم کی تنظیم قائم رہے)

(۹۶) (اس پر موسیٰ سامری سے مخاطب ہوئے اور) کہا۔ اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے؟

(۹۷) اس نے کہا میں نے وہ کچھ دیکھا جو ان لوگوں نے نہیں دیکھا تھا اور میں نے اس رسول (یعنی موسیٰ) کی باتوں میں سے کچھ اختیار کر لیں (اور کچھ اختیار نہ کیں) پھر (جب موقعہ آیا تو) میں نے ان (اختیار کی ہوئی باتوں) کو بھی پھینک دیا۔ اور میرے دل نے یہی چیز مجھے اچھی کر کے دکھائی تھی۔

(۹۸) (موسیٰ نے) کہا اچھا تو جا۔ تیری اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو اس (دنیا) میں ہر ایک سے یہ کہتا رہے کہ (مجھے) چھوؤ نہیں (یعنی مجھ کو موسیٰ نے گندہ قرار دے دیا ہے) اور (موسیٰ نے سامری سے یہ بھی کہا کہ) تیرے لیے ایک وقت مقرر ہے (یعنی سزا کا) جس کو تو ٹال نہیں سکیگا اور تو اپنے معبود کی طرف دیکھ جس کے سامنے سامنے بیٹھ کر تو اس کی پرستش کیا کرتا تھا۔ ہم اس کو جلا دیں گے اور پھر اس کو سمندر میں پھینک دینگے

پس تمہاری اصل آزمائش کا وقت اب آیا ہے

سامری ایک صفاتی نام ہے لوہار۔ ترکھان۔ سنار۔ معمار وغیرہ سامر کہلاتے ہیں اس زمانہ میں یہ سب پیشے بعض اوقات ایک ہی قبیلہ میں اکٹھے ہو جاتے تھے کسی ایسے ہی قبیلہ کے ایک فرد نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا تھا۔

۹۵ حضرت ہارونؑ کہتے ہیں میں نے شرک سے ان کو روکا تو تھا مگر سختی اس لیے نہیں کی کہ وہ مقابلہ پر کھڑے نہ ہو جائیں اور آپ یہ نہ کہیں کہ میں نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے' میرا انتظار نہیں کیا۔ اور امن قائم نہیں رکھا (رقب کے معنے انتظار کرنے اور نگہبانی کرنے کے ہیں) ایک طرف حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم سے کہا فاتبعونی واطیعوا امری اور دوسری طرف موسیٰؑ ہارونؑ کو کہتے ہیں فعصیت امری اس سے ظاہر ہے کہ ہارونؑ اپنی قوم کے تو مطاع تھے مگر موسیٰؑ کے مطیع۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک نبی دوسرے کا مطیع ہو سکتا ہے۔

۹۶، ۹۷ سامری نے کہا میں تیرے متعلق وہ کچھ جانتا تھا جو تیری قوم نہیں جانتی تھی اس لئے میں نے اندھا دھند تیری تقلید نہیں کی صرف چند باتیں (لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے) اختیار کر لی تھیں اور وقت آنے پر انہیں بھی ترک کر دیا۔

۹۸ موسیٰؑ نے کہا تیری دنیوی سزا یہ ہے کہ قوم کو تجھ سے قطع تعلق کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ کہ ہر جگہ اس حکم کا

إِنَّمَآ إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

(٩٩) تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ أٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚ

(١٠٠) اسی طرح ہم تیرے سامنے پہلے لوگوں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ اور ہم نے تجھے اپنے پاس سے ذکر (یعنی قرآن) عطا فرمایا ہے۔

مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝

(١٠١) جو اس سے منہ پھیر لے گا۔ وہ قیامت کے دن ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے گا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۖ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝

(١٠٢) (ایسے لوگ) اس حالت میں بڑی دیر تک رہیں گے۔ اور قیامت کے دن یہ (بوجھ) اور بھی تکلیف دہ ہوگا۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۚ

(١٠٣) جس دن بگل میں پھونکا جائیگا۔ اور اس دن مجرموں کو ہم اس حالت میں اٹھائیں گے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ۝

(١٠٤) وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے کہ تم تو صرف دس (صدیاں اس دنیا میں حاکم) رہے ہو۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ إِذْ يَقُوْلُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً إِنْ

(١٠٥) ہم خوب جانتے ہیں اس کو جو وہ کہیں گے جب ان میں سے سب سے زیادہ ان کے مذہب پر چلنے والا کہے گا کہ تم صرف

اعلان بھی تو خود کر۔ یہ حکم بائیکاٹ نہیں بلکہ غیرتِ ایمانی ہے۔

لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔ نسفا کے معنے کاٹنے کے اور چھلنی میں چھاننے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم بت کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرینگے پھر جلا دیں گے۔ اس طرح آواز پیدا کرنے والا (لکڑی وغیرہ کا) حصہ راکھ ہو جائے گا۔ اس راکھ کو چھلنی سے الگ کر کے سمندر میں پھینک دینگے (اور سونا قومی استعمال میں لے آئیں گے)

٩٩-١٠٠ یہاں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کو خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور چونکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اس لیے اصل واقعہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔

١٠١-١٠٢ ان آیات میں پہلے یوم القیامۃ سے مراد انسانی موت کا دن ہے جیسے حدیث میں ہے من مات فقد قامت قیامۃ اور دوسرے القیمۃ سے مراد تمام قوموں کے زندہ ہو کر اٹھائے جانے کا دن ہے جب مشرکین کا انجام سب اقوام کو معلوم ہو جائے گا اور وہ شرک سے نفرت کرنے لگیں گی

١٠٣ یعنی اس دن شرک زیادہ تر نیلی آنکھوں والی یعنی یورپین اور امریکن قوموں میں ہوگا۔

١٠٤ یعنی طاقت کے گھمنڈ میں پہلے تو وہ تباہی کو غیر ممکن سمجھتے ہونگے مگر اُس دن وہ کہنے لگیں گے کہ تمہاری ترقی کی عمر صرف دس ہی

یعنی دس صدیاں

لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝	ایک تھوڑی سی مدت ٹھہرے ہو۔
وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝	(۱۰۶) اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہدے کہ انکو میرا رب اکھاڑ کر پھینک دے گا۔
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝	(۱۰۷) اور انکو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت میں چھوڑ دیگا۔
لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝	(۱۰۸) کہ نہ تو تُو اس میں کوئی موڑ دیکھے گا۔ اور نہ کوئی اونچائی۔
يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝	(۱۰۹) اُسدن لوگ پکارنے والے کے پیچھے چل پڑینگے جسکی تعلیم میں کوئی کجی نہ ہوگی۔ اور رحمٰن (خدا) کی آواز کے مقابلہ میں انسانوں کی آوازیں دب جائینگی پس تو سوائے کھسر پھسر کے کچھ نہ سنیگا۔
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۝	(۱۱۰) اس دن شفاعت سوائے اسکے جس کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت رحمٰن (خدا) دے گا اور جس کے حق میں بات کہنے کو وہ پسند کرے گا کسی کو نفع نہ دے گی۔
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝	(۱۱۱) وہ جو کچھ ان کے آگے آنیوالا ہے اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گذر چکا ہے اس کو بھی جانتا ہے اور وہ اپنے علم کے ذریعہ سے اس (یعنی خدا) کا احاطہ نہیں کرسکتے۔
وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝	(۱۱۲) اور اُسدن (زندہ اور قائم بنے اور قائم رکھنے والے (خدا) کے سامنے سب بڑے لوگ (اد بسے) جھک جائینگے اور جو ظلم کریگا وہ ناکام رہے گا۔

ع ۵ / ۱۴

---

۱۰۵ طریقہ کے معنے شریف القوم کے بھی ہیں ان لبثتم الا یوما تم یوم خدا وندی یعنی دس صدیاں رہے ہو رجع ۲۲/۸۸) یا یہ کہ تھوڑا ہی عرصہ رہے ہو کیونکہ عذاب آنے پر ترقی کا وقت تھوڑا ہی معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۶-۱۱۰ اوپر کی پیشگوئی سے لوگ حیران ہوں گے کہ جبال یعنی بڑے بڑے حاکم کس طرح تباہ ہوں گے فرمایا یہ اس طرح ہوگا کہ لوگوں کی توجہ خود بخود سچے داعی کی طرف پھر جائے گی اور جہاں ترقی کے لیے عیسائی ہونا بڑی سفارش سمجھی جاتی تھی وہاں مسلمان ہونا سمجھی جائے گی۔ یہ نتیجہ اس سے نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق آیا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اور یہاں فرمایا کہ شفاعت اس کو فائدہ دے گی جو رضی لہ قولا کا مصداق ہوگا یعنی سچا مسلمان ہوگا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب بڑے بڑے دشمن تباہ ہو جائیں گے تو لوگوں کی توجہ خود بخود اسلام کی طرف پھرنے لگے گی۔

۱۱۱ فرمایا یہ پیشگوئی ضرور پوری ہوگی۔ کیونکہ خدائے علیم کی طرف سے ہے۔

۱۱۲ اس دن الوجوہ یعنی بڑے بڑے لوگ، قومیں اور حکومتیں اسلام لے آئیں گی۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ۝

(١١٣) اور جس نے وقت کی ضرورت کے مطابق عمل کیے ہوں گے اور وہ مومن بھی ہوگا وہ نہ تو کسی قسم کے ظلم سے ڈرے گا اور نہ کسی قسم کی حق تلفی سے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝

(١١٤) اور اسی طرح ہم نے اس (کتاب) کو عربی زبان کے قرآن کی صورت میں اتارا ہے اور اس میں ہر قسم کے انذار کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ یا (یہ قرآن) ان کے لیے (خدا کی) یاد کا سامان (نئے سرے سے) پیدا کرے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝

(١١٥) پس اللہ تعالیٰ جو بادشاہ ہے بڑی شان والا ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اور تو قرآن (کی وحی) اُترنے سے پہلے اس کے بارے میں جلدی سے کام نہ لے اور (ہمیشہ یہ) کہتا رہ کہ اے میرے رب! میرے علم کو بڑھا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝

(١١٦) اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو (ایک امر کی) تاکید کی تھی مگر وہ بھول گیا اور ہم نے خوب جانچ لیا کہ اس کے دل میں ہمارا حکم توڑنے کے متعلق کوئی پختہ ارادہ نہیں تھا۔

ع ٦ / ١٥

---

١١٣ اس دن سچے مسلمان ظلم اور حق تلفی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

١١٤ یعنی ان کو اسلام کی طرف لانے کے لیے ہم نے قرآنی بیان کو مدلل بنایا ہے۔ تا لوگ آسانی سے سمجھ جائیں۔ ضدی لوگوں کیلئے سزا کا طریق ہے اور باقیوں کے لیے قرآن نئے نئے مضامین پیش کرے گا تاکہ وہ اس طرح مان لیں۔

١١٥ یعنی جو احکام سمجھ آجائیں ان پر عمل کرو جو نہ آئیں ان پر خود غور کرو اور خدا سے زیادتی علم کی دعا مانگتے رہو۔ کبھی یہ نہ سمجھو کہ اب ہم کیا علم سیکھیں گے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ٥٥ سال میں قل رب زدنی علمًا کا حکم ہوا۔ اور ابراہیمؑ نے بھی رب ارنی کیف تحی الموتٰی کہہ کر زیادتی علم کی دعا کی۔ پھر آدمؑ کی اجتہادی غلطی کے ذکر میں بھی اشارہ ہے کہ ہر انسان محتاج دعا ہے۔

١١٦ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا میں بتایا کہ جب شیطان نے ان کے سامنے قسمیں کھائیں کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں (اعراف ٢٢/٣) اور منافقوں کا یہی طریق ہے (منافقون ٦٣/٣) تو آدمؑ نے یہ اجتہاد کیا کہ گو پہلے اس میں ابلیسی روح تھی، مگر اب اصلاح ہو چکی ہے۔ اس لیے اس سے تعلق میں حرج نہیں (یعنی آدمؑ نے بالارادہ حکم عدولی نہیں کی)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى ○

(۱۱۷) اور (یہ بھی یاد کرو کہ) جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم (کی پیدائش کے شکریہ میں) (خدا کو) سجدہ کرو۔ تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ○

(۱۱۸) اس پر ہم نے (آدم سے) کہا۔ اے آدمؑ! یہ (ابلیس) یقیناً تیرا اور تیرے ساتھیوں کا دشمن ہے پس تم دونوں (گروہوں) کو جنت سے نہ نکال دے کہ اسکے نتیجہ میں تُو (اور تیرا ہر ساتھی) مصیبت میں پڑ جائے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ○

(۱۱۹) یقیناً اس (جنت) میں تیرے لیے یہ (مقدر) ہے کہ تُو بھوکا نہ رہے (اور نہ تیرے ساتھی) اور تو ننگا نہ رہے۔

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ○

(۱۲۰) اور نہ تو پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں جلے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○

(۱۲۱) اس پر شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا (اور) کہا اے آدمؑ! کیا میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ دوں۔ جو سدا بہار ہے۔ اور ایسی بادشاہی (کا پتہ دوں) جو کبھی فنا نہ ہوگی۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ز وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ○ صلے

(۱۲۲) پس ان دونوں نے (یعنی آدمؑ اور اسکے ساتھیوں نے) اس (جنت کے) درخت میں سے کچھ کھایا (یعنی اسکا مزہ چکھا) جس پر ان دونوں کی کمزوریاں ان پر کھل گئیں اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کی زینت کے سامان (یعنی اعمال نیک) لپیٹنے لگ گئے اور آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس وہ صحیح راستہ سے بھٹک گیا۔

---

۱۱۷ حدیث میں آتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ جبریل کو کہتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی کرو تو وہ یہ حکم آگے تمام مخلوق کو پہنچا دیتا ہے (مفہوم) اسطرح مقبولین کی اطاعت کا جو حکم اللہ فرشتوں کو دے اس میں اہل زمین بھی شامل ہوتے ہیں اسی طرح ملائکہ کے حکم میں ابلیس شامل تھا گو وہ فرشتہ نہیں تھا

۱۱۸ یہاں جنت سے مراد دنیوی جنت ہے نہ کہ اُخروی جنت کیونکہ اُخروی جنت کے مکین کو شیطان کے وعدہ جنت سے دھوکا نہیں لگ سکتا تھا۔

۱۱۹-۱۲۰ یہاں اس تمدنی نظام کا ڈھانچہ بتلایا گیا ہے جو آدمؑ نے قائم کیا اور جس کے ذریعہ کھانا، پانی کپڑا اور رہائش کا انتظام حکومت کے ذمہ ٹھہرا۔ یہ مراد نہیں کہ وہاں بھوک پیاس نہ لگتی تھی ورنہ دوسری جگہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا (بقرہ ع۴) نہ فرماتا

۱۲۱-۱۲۳ جب شیطان نے کہا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے دائمی حیات اور دائمی حکومت ملے گی تو آدمؑ دھوکا

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ○ (۱۲۳) اس کے بعد اس کے رب نے اس کو چن لیا۔ اور اس پر رحم کی نظر ڈالی اور اُسے صحیح طریق کا رتبادیا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ○ (۱۲۴) اور خدا تعالیٰ نے) کہا تم دونوں (گروہ) اس میں سے سارے کے سارے نکل جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی اتباع کریگا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا۔ اور نہ کبھی ہلاکت میں پڑے گا۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (۱۲۵) اور جو شخص میرے یاد دلانے کے باوجود اعراض سے کام لیگا اسے تکلیف والی زندگی ملے گی۔ اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ○ (۱۲۶) (جس پر وہ کہیگا۔ اے میرے رب! تو نے مجھے کیوں اندھا اٹھایا حالانکہ میں تو خوب دیکھ سکتا تھا۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○ (۱۲۷) (اس پر خدا تعالیٰ فرمائیگا۔ تیرے پاس بھی تو ہماری آیات آئی تھیں جنکو تو نے بھلا دیا تھا۔ سو آج تجھ کو بھی (خدا کی رحمت کی تقسیم کے وقت) ترک کردیا جائے گا۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ○ (۱۲۸) اور جو خدائی قانون سے باہر چلا جاتا ہے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لاتا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ تو صرف دنیوی سلوک ہے) آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت اور بہت مدت تک جانیوالا ہے۔

کھا گئے اور وہ پھل کھا لیا یعنی کار ممنوع کر لیا۔ فبدت لہما سوا تہما تو اس کے بد نتائج ظاہر ہونے لگ گئے اس لیے انہوں نے ورقۃ الجنۃ یعنی جنت کی پاکیزہ نسل کے ذریعہ شیطانی فریب کو ناکام کر دیا۔ پیدائش ۳ میں ورق الجنۃ کی بجائے انجیر کے پتوں کا ذکر ہے مگر کشف میں انجیر سے مراد صالح نسل ہوتی ہے اس لیے بات ایک ہی ہے۔

۱۲۴ جمیعًا اور کُم کے الفاظ سے جو دو سے زیادہ پر بولے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ حکم آدم وحوا کو نہ تھا بلکہ آدم کے گروہ اور شیطان کے گروہ کو تھا بعضکم لبعض عدو میں بتایا کہ اب تم دونوں گروہ ہمیشہ دشمن رہوگے۔

۱۲۵ تا ۱۲۸ آیت ۱۲۵ میں دنیوی عذاب کا ذکر ہے اور ۱۲۶ میں اُخروی سزا کا۔ مجرم کہتا ہے دنیا میں تو میں اچھا بھلا

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ؏	(۱۲۹) کیا ان لوگوں کو (اس بات سے) ہدایت حاصل نہ ہوئی کہ ان سے پہلی گذری ہوئی قوموں میں سے بہتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ یہ (لوگ) ان کے گھروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس میں عقل والے لوگوں کے لیے بڑے نشان ہیں۔
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ؕ	(۱۳۰) اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ گذر چکی ہوتی تو مدت بھی مقرر نہ ہوتی تو عذاب (ان قوموں کے لیے) دائمی بن جاتا اور ایک لمبے عرصہ تک جاری رہتا)
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى	(۱۳۱) پس جو کچھ یہ (لوگ) کہتے ہیں تو اس پر صبر کر (کیونکہ تیرے رب کی سنت یہی ہے کہ رحم سے کام لیا جائے) اور سورج کے چڑھنے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بھی کیا کر اور رات کے مختلف حصوں (اور اسی طرح) دن کے سب حصوں میں بھی اس کی تسبیح کیا کر (تاکہ اس کے فضل کو حاصل کر کے) تو خوش ہو جائے

تھا یہاں تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے فرماتا ہے اس لیے کہ وہاں (بھی) تو ہمارے نشانوں کی طرف سے اندھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُخروی نابینائی درحقیقت روحانی ہوگی۔ اصل میں محدود مطمح نظر والوں کا دائرہ عمل بھی محدود ہوتا ہے جیسے جہاں نبی کریم صلعم تمام اخلاق فاضلہ کے جامع تھے وہاں فلاسفر ایک دو اخلاق ہی ظاہر کر سکتے ہیں۔ چونکہ دنیا میں انہوں نے صفات اللہ کا نظارہ نہیں کیا ہوتا اس لیے آخرت میں بھی صفات اللہ کو پہچان نہیں سکیں گے معیشت سے مراد وہ چیز ہے جس سے انسانی زندگی قائم رہے اور گو مال و دولت کفار کے پاس بہت ہوتا ہے۔ مگر روحانی زندگی کو سنوارنے والی چیزوں سے وہ محروم ہوتے ہیں

یوم آخرت ایک لمبا وقت ہے۔ پہلی آیات میں کفار کی ابتدائی حالت کا ذکر تھا جب ان کو معبودانِ باطلہ کی سچائی جو دنیا میں نظر آتی تھی نظر نہیں آئے گی اور اس وجہ سے وہ اپنے تئیں اندھا سمجھیں گے اور یہ ضمیر کا عذاب بھی بڑا عذاب ہوگا۔ مگر اب ولعذاب الاٰخرۃ اشدّ وابقٰی میں بعد کی حالت کا ذکر ہے اور بتایا کہ اصل عذاب تو وہ ہے جو بعد میں آئے گا۔

ف ۱۲۹ فرمایا پہلے مشرکین کی تباہی سے انہیں عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

ف ۱۳۰ لولا کلمۃ سے مراد رحمتی وسعت کل شیٔ (اعراف ۱۹ع) والا قانون ہے۔

ف ۱۳۱ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا سے فجر اور عصر کی اناءی الیل سے مغرب اور عشاء کی اور اطراف النہار سے ظہر اور ضحٰی کی نمازیں مراد ہیں۔ کہ ان میں سے ایک زوال سے پہلے ہوتی ہے اور ایک بعد۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝

(۱۳۲) اور ہم نے جو کچھ ان میں سے بعض لوگوں کو دنیوی زندگی کی زیبائش کے سامان دے رکھے ہیں تو اس کی طرف دونوں آنکھوں کی نظر کو پھیلا پھیلا کر مت دیکھ (کیونکہ یہ سامان انکو اس لیے دیا گیا ہے) کہ ہم اس کے ذریعہ سے ان کی آزمائش کریں۔ اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝

(۱۳۳) اور تو اپنے اہل کو نماز کی تاکید کرتا رہ۔ اور تو خود بھی اس حکم (یعنی نماز) پر قائم رہ۔ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے۔ بلکہ ہم تجھے رزق دے رہے ہیں اور انجام تقوٰی ہی کا بہتر ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝

(۱۳۴) اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں وہ ہمارے پاس اپنے رب کی طرف سے کوئی نشان نہیں لاتا۔ کیا ان کے پاس ویسا نشان نہیں آیا جیسا کہ پہلی کتابوں میں بیان ہو چکا ہے۔

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ۝

(۱۳۵) اور اگر ہم ان کو اس (رسول) سے پہلے کسی عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیتے۔ تو وہ کہتے۔ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا (اگر تو ایسا کرتا۔ تو) ہم تیرے نشانوں کے پیچھے چل پڑتے قبل اس کے کہ ہم ذلیل و رسوا ہو جاتے۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا

(۱۳۶) تو کہدے ہر ایک شخص اپنے انجام کی انتظار میں ہے

۱۳۲؎ فرمایا عیسائی قوموں کی دولت دیکھ کر لالچ نہ کرنا یہ تو آزمائش ہے اور ان کی تباہی کا موجب ہوگی۔

۱۳۳؎ یعنی چاہیئے کہ عیسائیوں کی ترقی کے وقت ہر مسلمان خود بھی پابند نماز رہے اور اپنی اولاد کو بھی نماز کی پابندی کی تلقین کرتا رہے کیونکہ عبادت پر قائم رہنے والے کو اللہ تعالیٰ رزق حلال سے نوازتا ہے۔ اگر سوال ہو کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لا نسئلک رزقا پھر چندے کیوں مانگے جاتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ چندے مال بڑھاتے ہیں (روم ۳۰) اور ان کے دینے میں خود انسان کا فائدہ ہے نہ کہ خدا کا۔

۱۳۴؎ یہاں بتلایا ہے کہ نشان جادوگری کا نام نہیں بلکہ پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں بھی نشان ہی ہوتی ہیں۔

۱۳۵؎ فرماتا ہے اگر ہم مامور نہ بھیجیں تو لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب تو نے سامانِ ہدایت ہی نہیں بھیجا تو پھر عذاب کیوں دیتا ہے۔ پس اس زمانہ میں مسلمانوں کا یہ کہنا کہ مامور نہیں آئیں گے اپنے عمل سے اس اعتراض کو تقویت دینا ہے۔

فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهۡتَدٰى ۠

پس تم بھی (اپنے انجام کی) انتظار کرتے رہو - اور تم جلدی ہی معلوم کر لوگے کہ کون شخص سیدھے راستہ پر چلنے والا اور ہدایت پانیوالوں میں سے ہے (اور کون نہیں)

رکوع ۸

ف ۱۳۶ الصراط السوی یعنی تمہیں علم ہو جائے گا کہ محمدی تعلیم افراط و تفریط سے پاک اور مضبوط یعنی غیر متزلزل ہے؛

آیاتہا ۱۱۲	سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاءِ مَكِّيَّةٌ	رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ تعالےٰ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے پڑھتا ہوں

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۲) لوگوں سے حساب لینے کا وقت قریب پہنچ چکا ہے مگر وہ پھر بھی غفلت میں (پڑے ہوئے ہیں) اور اعراض کرتے جا رہے ہیں۔

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ (۳) ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کبھی کوئی نئی یاددہانی نہیں آتی مگر وہ اسے سنتے بھی جاتے ہیں اور اس سے ہنسی مذاق بھی کرتے جاتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ (۴) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا چپکے چپکے مشورے کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ (دیکھتے نہیں) یہ شخص تم جیسا ہی ایک بشر ہے۔ پھر

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور ۵ھ دعوئ نبوت سے پہلے کی ہے۔

سورۃ طٰہٰ کے آخر میں بتایا تھا کہ کفار پر عذاب تو آئے گا مگر اتمام حجت کے بعد۔ سورۃ انبیاء کے شروع میں بتایا ہے کہ (اس) عذاب کا وقت آگیا ہے مگر لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور برابر انکار کئے جاتے ہیں سورۃ طٰہٰ میں بتایا تھا کہ موسیٰؑ حامل شریعت تھا اور مسیحیت موسوی سلسلہ کی شاخ ہے اس لیے شریعت لعنت نہیں ہو سکتی۔ پھر بتایا تھا کہ آدمؑ نے گناہ ہی نہیں کیا اس لیے ورثہ کے گناہ کا سوال ہی نہیں۔
پھر بتایا کہ نبی تو امکانِ سزا کو کم کرنے آتا ہے اگر شریعت لعنت ہے تو نبی امکانِ سزا کو بڑھاتا ہے کم نہیں کرتا۔ اب اس سورۃ میں بتایا ہے کہ سزا ہمیشہ صرف انبیاء کے دشمنوں ہی کو ملتی رہی ہے۔ اگر گناہ ورثہ میں آیا ہے تو صرف دشمنوں کو سزا کیوں ملی۔

۲ مغربی مصنفین کے خیال میں یہ سورۃ نویں سال نبوت کی ہے۔ یہ درست سمجھا جائے تو یہاں یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی مکہ سے ہجرت کا وقت قریب آ رہا ہے جس کے نتیجہ میں مکہ والوں کی تباہی کے سامان ہو جائیں گے دوسرے اس میں مدینہ میں اسلام پھیلنے کا بھی اشارہ ہے۔ اقترب کے لفظ سے بتایا کہ آثارِ عذاب ظاہر ہو رہے ہیں مگر پھر بھی وہ سوچتے نہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے۔

۳ یعنی مکہ والوں کا رویہ کوئی نیا نہیں کفار ہمیشہ الہام کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

۴:۔ نجویٰ خود مخفی ہوتا ہے اس کے ساتھ اسرّوا مبالغہ کے لیے لگایا گیا ہے یعنی وہ ایسے پوشیدہ مشورے کرتے ہیں جن کا لوگوں کو علم تک نہ ہو۔ پھر پبلک میں کہتے ہیں یہ تو تمہارے جیسا انسان ہے

أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝

کیا تم اس کی فریبانہ باتوں میں آتے ہو۔ حالانکہ تم خوب سمجھتے ہو۔

(۵) قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

(۵) (ان باتوں کو سنکر محمد رسول اللہ نے) کہا میرا رب جانتا ہے اُن باتوں کو جو آسمان میں (کہی جاتی ہیں) اور (ان کو بھی) جو زمین میں کہی جاتی) ہیں۔ اور وہ بڑا سننے والا اور) بڑا جاننے والا ہے۔

(۶) بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۝

(۶) بلکہ انہوں (یعنی مخالفین) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ (کلام) تو پریشان خوابیں ہیں (بلکہ) پریشان خوابیں بھی نہیں) اس نے دیدہ و دانستہ یہ باتیں اپنے پاس سے بنالی ہیں۔ بلکہ وہ ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والا آدمی ہے (جس کے دماغ میں طرح طرح کے خیال اُٹھتے رہتے ہیں) پس چاہیئے کہ ہمارے پاس کوئی نشان لے آئے جس طرح کہ پہلے رسول نشانوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔

(۷) مَا آمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ ۝

(۷) ان سے پہلی بستیوں میں سے بھی جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تھا کوئی ایمان نہیں لایا تھا۔ تو پھر کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟

(۸) وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

(۸) اور تجھ سے پہلے بھی ہم نے صرف بعض مردوں کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ اگر تم (یہ بات) نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ کر دیکھ لو۔

پھر تم اس کے کلام کو جو سحر ہے کیوں سنتے ہو۔

۵ یعنی گو وہ پوشیدہ مشورہ کرتے ہیں لیکن خدائے علیم ان کو جانتا ہے۔ اور وہ سمیع ہے اپنے نبیؐ کی دعائیں سنکر انہیں ناکام کر دے گا۔

۶ یعنی وہ کہتے ہیں کہ خوابیں سب کو آتی ہیں اس نے بھی چند پریشان خوابیں دیکھ لی ہوں گی۔ پھر اس سے بھی ڈرتے ہیں کہ کم از کم اس کو سچا تو مانا۔ اس لیے کہتے ہیں خواب بھی نہیں آئی اس نے افترا کیا ہے۔ پھر ڈرتے ہیں کہ ایسے صادق کے متعلق لوگ یہ بات کیسے مانیں گے تو کہنے لگتے ہیں یہ تو شاعر ہے یونہی تمسخر کرتا ہے۔ قرآن میں کوئی شعر نہیں اس لیے یہاں شاعر سے مراد جذبات سے کھیلنے والے کے ہیں۔ فلیاتنا بایة کما ارسل الاولون:- یہ مان کر کہ پہلے انبیاء کو آیات دی گئی تھیں۔ کفار نے اپنے آباء کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

۷ $\frac{۱۰}{۹۹}$ کے مطابق صرف قوم یونس تھی جو آثار عذاب دیکھ کر ایمان لے آئی اور کسی قوم نے فائدہ نہیں اٹھایا چونکہ ظلم کرنے کے بعد کوئی قوم مغلوب ہو تو اس کے مردوں کو قتل کر دیا جاتا ہے جیسے موسےؑ نے کنعانیوں کو کیا۔ (استثناء $\frac{۲۰}{۱۴}$) اس لیے یہاں یہ جو فرمایا کہ جب پہلے ایمان نہیں لائے تو کیا یہ لے آئیں گے اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ اس میں انکے خیالات کا رد ہے ورنہ فتح مکہ کے بعد نبی پاکؐ کے عفو کی برکت سے یہ قوم ایمان لے آئی۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝

(۹) اور ہم نے ان رسولوں کو ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر معمولی عمر پانے والے لوگ تھے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

(۱۰) اور ہم نے جو وعدہ ان سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ اور ان کو اور ان کے سوا جن کو چاہا (دشمنوں سے) نجات دی اور جو حد سے بڑھنے والے تھے ان کو ہلاک کر دیا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(۱۱) ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری بزرگی کے سامان ہیں۔ کیا تم عقل نہیں کرتے۔

ع ۱

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝

(۱۲) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظلم کیا کرتی تھیں۔ کہ ہم نے ان کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور ان کے بعد ایک اور قوم کو پیدا کر دیا۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝

(۱۳) پس جب ہلاک ہونے والے لوگوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو لگے (اس سے بچنے کے لیے) دوڑنے۔

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝

(۱۴) (تب ہم نے کہا) دوڑو نہیں۔ اور ان چیزوں کی طرف جن کے ذریعہ سے تم آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے گھروں کی طرف واپس جاؤ۔ تاکہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(۱۵) اس کا انہوں نے یہ جواب دیا۔ کہ اے افسوس! ہم تو (عمر بھر) ظلم ہی کرتے رہے۔

۸-۹ھ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے جواب میں فرمایا۔ پہلے رسول بھی گو کامل القویٰ ہوتے تھے مگر ہوتے انسان ہی تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح کھانا بھی کھاتے تھے اور فانی بھی تھے۔

۱۰ھ فرمایا گو وہ انسان ہی تھے ہم نے اپنے وعدہ کی بناء پر ان سے غیر معمولی سلوک کیا انہیں بچایا اور ان کے دشمنوں کو تباہ کیا۔

۱۱ھ فرمایا الہام الٰہی رحمت کے طور پر آتا ہے لعنت کے طور پر نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن میں تمہارے شرف کے سامان ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شریعت رحمت ہے۔

۱۲-۱۵ھ فرمایا نیکی اور بدی کی لہریں چلتی رہتی ہیں جب انسان ایک عرصہ کے بعد بگڑ جاتا ہے پھر خدا تعالیٰ اس کی اصلاح کے سامان کرتا ہے مگر مفسد پہلے تو مصلح کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر بھاگ جاتے ہیں اس جگہ ظالم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طاقتوں کو بے محل استعمال کرے، غلط بات کسی کی طرف منسوب کرے اور جو منسوب کرنی چاہیے وہ نہ کرے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝ (۱۶) اور وہ یہی بات کہتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایک کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا۔ جس کی سب رونق برباد ہو چکی تھی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (۱۷) اور ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ (بلکہ ان کی پیدائش میں حکمت تھی)

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (۱۸) اگر ہم نے کوئی دل بہلاوا ہی تجویز کرنا ہوتا تو اس کو اپنے قرب میں تجویز کرتے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝ (۱۹) لیکن ہم (حق کو اصل پر امثا) مارتے ہیں اور وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ (باطل) فوراً ہی بھاگ جاتا ہے اور تم پر تمہاری باتوں کی وجہ سے افسوس ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ (۲۰) اور جو وجود بھی آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں سب اسی کے ہیں۔ اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے۔ اور نہ (اس سے) تھکتے ہیں۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ (۲۱) وہ رات کو بھی اور دن کو بھی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اس سے رُکتے نہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ (۲۲) کیا ان لوگوں نے زمین میں سے معبود بنا لیے ہیں؟ اور وہ (مخلوقات) پیدا کرتے ہیں۔

۱۵-۱۶ اس میں بتایا ہے کہ مجرم بالآخر اپنی غلطی مان لیتے ہیں مگر ان کی اصلاح زمانہ سزا تک رہتی ہے اس کے بعد پھر بگاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ خامدین کے معنے ہیں وہ ایسے ہو گئے کہ ان کی کوئی حس باقی نہ رہی۔ یا یہ کہ وہ بجھی ہوئی آگ کی طرح ہو گئے۔

۱۷-۱۹ فرمایا پیدائش زمین و آسمان بلا حکمت نہیں۔ اگر ہمیں کھلونے ہی سے کھیلنا ہوتا۔ تو اسے اپنے پاس رکھتے۔ تمہیں کیوں دیتے اور باطل کو حق (یعنی الہام) کے ساتھ کیوں مٹاتے رہتے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ پیدائش زمین و آسمان بلا حکمت یعنی بطور تمسخر نہیں کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی ہی ذات سے تمسخر کرتے۔

۲۰-۲۲ فرمایا زمین و آسمان کا سب کچھ خدا تعالےٰ کا ہے اور کوئی اپنی چیز کو تباہ نہیں کرتا پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بندوں کی اصلاح کا خیال نہ کرے اور مامور نہ بھیجے۔ اور جو لوگ خدا رسیدہ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تھکتے نہیں

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝

(۲۳) اگر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے پس اللہ (تعالیٰ) جو عرش کا بھی رب ہے تمام نقائص سے پاک ہے اور ان (باتوں) سے بھی جو وہ کہتے ہیں۔

لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ۝

(۲۴) جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے متعلق وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ (لوگ) جواب دہ ہوتے ہیں۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۖ هَٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ ۖ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝

(۲۵) کیا انہوں نے اس کے سوا معبود بنا لئے ہیں؟ تو کہدے اپنی دلیل لاؤ۔ یہ (قرآن) تو ان کے لیے بھی جو میرے ساتھ ہیں شرف کا موجب ہے۔ اور جو مجھ سے پہلے گذر چکے ہیں ان کے لیے بھی شرف کا موجب ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر حق کو پہچانتے نہیں۔ اس لئے اس سے اعراض کرتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ

(۲۶) اور ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں ہم ان میں سے ہر ایک کی طرف یہ وحی کرتے تھے۔ کہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک ہی

پھر یہ سمجھنا کیسی حماقت ہے کہ اس مخلوق کو جسے خدا نے خود پیدا کیا ہے اور جو اس کی عبادت میں لگی رہتی ہے اس نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔

۲۳ فرمایا کئی خدا ہوتے تو قانونِ نیچر بھی کئی ہوتے اس لیے دنیا تباہ ہو جاتی۔ چونکہ ایک ہی قانون سے ثابت ہوا کہ خدا ایک ہے اگر کوئی کہے کہ الٰہ تو کہتے ہی کامل القویٰ ہستی کو ہیں۔ پھر ایک سے زیادہ الٰہ ہونے سے فساد کیوں ہونے لگا؟ تو جواب یہ ہے کہ اگر کامل القویٰ ہستیاں موجود ہیں تو وہ اکیلی ہی نظامِ دنیا کو چلا سکتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے کی مدد لینا پاگل پن ہے۔ اور اگر پاگل مل کر کام کریں گے تو یقیناً فساد ہوگا۔

۲۴-۲۵ یعنی خدا واحد مالک ہے کوئی دوسرا اس سے جواب طلبی نہیں کر سکتا۔ لیکن باقی سب کسی نہ کسی کو جواب دہ ہوتے ہیں جس سے ان کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ ایسے ناقص القویٰ وجودوں کو خدا کے سوا معبود قرار دینا بیوقوفی کی بات ہے۔ یہ تو اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب خدا اس کا گواہ ہو مگر وہ خدا تعالےٰ کی گواہی کبھی نہیں لا سکتے۔ پھر فرماتا ہے قرآن کو دیکھ لو یہ محمد رسول اللہ صلعم کے زمانہ کے لوگوں کا بھی شرف ظاہر کرتا ہے اور آپؐ سے پہلوں کا بھی اور پہلوں کو چور اور ڈاکو ٹھہرا کر (یوحنا ۱۰:۸) ان پر آپ کی فضیلت بیان نہیں کرتا بلکہ انہیں برگزیدہ قرار دے کر پھر ان پر آپؐ کی فضیلت ظاہر کرتا ہے۔

۲۶ اس آیت سے ثابت ہے کہ تمام انبیاء کا مشترکہ مشن قیامِ توحید تھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم نے جس رنگ میں شرک کی بیخ کنی کی پہلے کسی نبی نے نہیں کی۔ آپؐ نے نہایت خراب زمانہ میں مشرکوں کے اندر پیدا ہو کر توحید کو

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝

خدا ہوں پس (صرف) میری عبادت کرو۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝

(٢٧) اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ رحمٰن (خدا) نے بیٹا بنا لیا ہے (انکی بات درست نہیں) وہ تو ہر کمزوری سے پاک ہے حقیقت یہ ہے کہ (جنکو یہ بیٹا کہتے ہیں) وہ خدا کے کچھ بندے ہیں جن کو خدا کی طرف سے عزت ملی ہے

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝

(٢٨) وہ خدا کی بات سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں کہتے۔ اور وہ اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝

(٢٩) وہ (یعنی خدا) اس کو بھی جانتا ہے جو انہیں آئندہ پیش آئیگا ہے اور جو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اور وہ سوائے اس کے جس کیلئے خدا نے یہ بات پسند کی ہو کسی کے لیے شفاعت نہیں کرینگے (یعنی معبودانِ باطلہ) اور وہ اس کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

(٣٠) اور جو بھی ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا کے سوا معبود ہوں ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے۔ اور ہم ظالموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ع ٢

دلائل سے ثابت کیا، اور شرک کو دلائل سے رد کیا۔ دیکھیں نوٹ ٣٥٦/٣ ۔ اور آپ کا ہر لمحہ زندگی اشاعت توحید میں گذرا۔ مثلاً اپنے چچا ابی طالب کے سمجھانے پر کہ قوم کے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دو آپ نے فرمایا اگر وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لاکھڑا کریں۔ پھر بھی میں اشاعت توحید سے رک نہیں سکتا۔ اُحد کے موقعہ پر ابوسفیان نے یہ سمجھکر کہ آپ قتل ہوگئے ہیں اعلُ ھبل کا نعرہ لگایا تو آپ نے شدید خطرے کے باوجود اللہ عزوجلّ کا نعرہ لگوایا۔ قربِ وفات کے وقت بھی آپ کی زبانِ مبارک پر یہ نصیحت تھی کہ شرک نہ کرنا اور غرغرہ موت کے وقت بھی یہ الفاظ وردِ زبان تھے کہ الی الرفیق الاعلیٰ الی الرفیق اعلیٰ۔

ف ٢٧ فرمایا تمام نبی عبدیت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اگر کسی نبی کو خدا نے بیٹا بنا لیا ہوتا تو وہ اپنے تئیں غیر کی طرف منسوب کیوں کرتا۔

ف ٢٨ فرمایا وہ تو خدا کے کامل سے تابعدار ہیں خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔

ف ٢٩ جب شفاعت اذنِ الٰہی سے ہوئی تو ثابت ہوا کہ بخشش اسی کے ہاتھ میں ہے سورۂ یونس ٢/٢٥ اور یسعیاہ ٢/١٦ سے بھی یہی ثابت ہے۔

ف ٣٠ جہاں سچے نبی کے مکذب اور جھوٹے مدعی نبوت کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے۔ (الحاقہ ٢٩/٥ تا ٧) وہاں مدعی الوہیت کو سزا صرف آخرت میں ملتی ہے۔ وجہ یہ کہ جھوٹے نبی بھی سچے کی طرح انسان ہوتے ہیں اس لیے لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں مگر کھانے پینے والے انسان کو خدا سمجھنے کا دھوکا احمق ہی کھا سکتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۚ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝

(٣١) کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے۔ پس ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔ پس کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝

(٣٢) اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تا ایسا نہ ہو کہ وہ (یعنی زمین) ان (یعنی اہلِ زمین) سمیت شدید زلزلہ میں مبتلا ہو جائے۔ اور ہم نے زمین میں کھلے کھلے راستے بھی بنائے تاکہ یہ لوگ ان کے ذریعے سے (مختلف مقامات تک) پہنچیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيٰتِهَا مُعْرِضُونَ ۝

(٣٣) اور ہم نے آسمان کو ایک مضبوط چھت (یعنی حفاظت کا ذریعہ) بنایا ہے اور پھر بھی وہ اس کے نشانوں (یعنی آسمان سے ظاہر ہونے والے نشانوں) سے (جو انکے فائدہ کیلئے ہیں) اعراض کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

(٣٤) اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب (آسمانی سیارے) اپنے اپنے محور میں بے روک چل رہے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ

(٣٥) اور ہم نے کسی انسان کو تجھ سے پہلے غیر طبعی عمر نہیں بخشی۔ کیا اگر تو مر جائے تو وہ غیر طبعی عمر تک

---

۳۱ سورج اور زمین وغیرہ پہلے اکٹھے تھے پھر ہم نے ان کو الگ کر دیا۔ اور زمین پر زندگی کے قیام کے لیے پانی اتارا۔ یہ فرما کر اشارہ کیا کہ پیدائش عالم کا کوئی خاص مقصد ہے اسی مقصد کے لیے روحانی پانی کا اترتے رہنا ضروری ہے۔

۳۲ ابتداءً زمین کے نیچے بہت گرمی تھی جس نے زمین کے نیچے کی چٹانوں کو پگھلا دیا اور گیس پیدا ہوئی جب اس گیس نے باہر نکلنا چاہا تو آتش فشاں پہاڑ پیدا ہوئے۔ پہاڑوں کے عالمِ وجود میں آنے میں زمین کے اندرونی حصہ کی سطح پر قشری حصوں کے توازن کو بھی دخل ہے اس لحاظ سے پہاڑ گویا سطح زمین کے توازن کا ذریعہ بھی ہیں اس میں یہ اشارہ ہے کہ روحانی زمین کو بھی روحانی پہاڑوں یعنی انبیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر فرماتا ہے جس طرح مادی پہاڑوں کے درمیانی رستے آسانی سے پہچانے جاتے ہیں روحانی پہاڑوں کی ہدایت سے روحانی سفر آسان ہو جاتے ہیں۔

۳۳ یعنی جیسے آسمانی کرّے نظامِ شمسی کے محافظ ہیں اسی طرح روحانی لوگ نظامِ روحانی کے محافظ ہوتے ہیں۔

الْخٰلِدُوْنَ ۝ — زندہ رہیں گے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ — (۳۶) ہر جان موت چکھنے والی ہے۔ اور ہم تمہاری بُرے اور اچھے حالات سے آزمائش کریں گے۔ اور آخر تمہاری طرف ہی تم کو لوٹا کر لایا جائے گا۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ — (۳۷) اور جب تجھے کفار دیکھتے ہیں۔ تو تجھ کو صرف ایک حقیر چیز سمجھتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا یہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کی کمزوریاں گنتا ہے؟ حالانکہ وہ خود رحمٰن (خدا) کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝ — (۳۸) انسان کے اندر جلد بازی کا مادہ رکھا گیا ہے۔ سو (یاد رکھو) میں تم کو اپنے نشان دکھاؤں گا۔ پس تم جلد بازی سے کام نہ لو۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ — (۳۹) اور (یہ منکر) وہ کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ (یعنی مسلمان) سچے ہو تو یہ وعدہ کب پُورا ہوگا؟

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا — (۴۰) اگر کفار اس گھڑی کو جان لیتے جبکہ وہ نہ اپنے مونہوں سے

نوٹ ۳۵۔ فرماتا ہے جیسے مادی دنیا میں رات دن کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ سورج ڈوبتا ہے تو چاند نکل آتا ہے اسی طرح روحانی دُنیا میں ہوتا ہے اس لیے اے محمد اگر تو مر جائے گا تو کیا انہوں نے زندہ رہنا ہے مرنا سب نے ہے مگر تیرے بعد ایک روحانی چاند پیدا ہو جائے گا اس لیے اسلام کے لیے مایوسی کی کونسی بات ہے۔

نوٹ ۳۶۔ فرمایا مرنا تو ہر ایک نے ہے ہم کبھی شر سے یعنی نبوت سے بُعد پیدا کر کے لوگوں کو آزماتے ہیں کہ وہ عقل سے کہاں تک کام لیتے ہیں اور کبھی خیر سے یعنی نبی بھیج کر آزماتے ہیں کہ وہ کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں

نوٹ ۳۷۔ یعنی خود تو رحمٰن کے بھی منکر ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، پر اس لیے ہنستے ہیں کہ وہ جھوٹے معبودوں کو حقیر جانتے ہیں۔

نوٹ ۳۸۔ خلق الانسان من عجل اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں جلد بازی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا خلقکم من ضعف (روم ع) حالانکہ ضعف کوئی مادہ نہیں۔ فرمایا تم ہمارے رسول کی تکذیب بوجہ جلد بازی کرتے ہو۔ جلدی نہ کرو وقت آنے پر ہم تمہیں ضرور نشان دکھائیں گے۔

نوٹ ۳۹۔ یعنی ہم انہیں جلدی نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں پھر بھی وہ یہی کہتے کہ عذاب کا وعدہ جلدی پورا کرو۔

حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

اور نہ اپنی پیٹھوں سے آگ کو ہٹا سکیں گے۔ اور نہ کسی کی طرف سے ان کی مدد کی جائے گی۔ (تو وہ اتنی تسلّی نہ کرتے)

بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝

(۴۱) لیکن وہ عذاب ان کے پاس اچانک آ جائے گا۔ اور ان کو حیران کر دے گا۔ پس وہ اس کو ردّ کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ اور نہ ان کو (کوئی) مہلت دی جائے گی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ۧ

(۴۲) اور تجھ سے پہلے جو رسول گذرے ہیں اُن سے بھی ہنسی کی گئی تھی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جنہوں نے ان رسولوں سے ہنسی کی تھی ان کو انہی باتوں نے آکر گھیر لیا جن کے ذریعہ سے وہ نبیوں کی ہنسی اُڑاتے تھے۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

(۴۳) تو کہدے رات یا دن کے وقت رحمٰن (خدا) کی گرفت سے تم کو کون بچا سکتا ہے۔ (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کر رہے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝

(۴۴) کیا ان کی تائید میں کوئی (سچے) معبود ہیں جو ان کو ہمارے عذاب سے بچا لیں گے؟ وہ (معبود) تو اپنی جانوں کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔

۴۰-۴۱ منہ کی طرف سے آنے والے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جس کے آثار ظاہر ہو جائیں اور پیچھے سے آنیوالے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو اچانک آجاتا ہے۔ بل تاتیھم بغتۃ میں بتایا کہ ان کے لیے اچانک آنے والا عذاب مقدر ہے۔

۴۲ فرمایا تجھ سے پہلے انبیاء سے بھی استہزا کیا گیا مگر آخر مخالفوں کا انجام تباہی ہی ہوا ہے۔

۴۳ فرماتا ہے ان کے لیے دن رات خطرات ہوتے ہیں ان سے انہیں خدائے رحمٰن کے سوا کون بچاتا ہے پھر بھی وہ سمجھتے نہیں اور صداقتوں کا مقابلہ کرنے چلے جاتے ہیں۔ اور گو وہ کہتے تو یہ ہیں کہ یہ مدعی نبوت جھوٹا ہے اس لیے ہم مخالفت کرتے ہیں لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے گھبراتے ہیں اور وہ ان ذمہ واریوں سے بچنا چاہتے ہیں جو مومنوں پر ڈالی جاتی ہیں۔

۴۴ فرمایا وہ عبادت الٰہی سے بچنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اسکے نتیجہ میں جو عذاب آئیگا اس سے کوئی جھوٹا معبود انہیں بچا ہی نہیں سکیگا۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

(۴۵) حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کو بھی اور ان کے باپ دادوں کو بھی بہت سا مال و متاع دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان پر ایک لمبا زمانہ گذر گیا۔ پس کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم ان کے ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کناروں کی طرف سے اس کو چھوٹا کرتے جا رہے ہیں تو کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ غالب آئینگے؟

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝

(۴۶) تو ان سے کہدے کہ میں تو تم کو وحی کے ذریعہ ہوشیار کر رہا ہوں اور (خوب سمجھتا ہوں کہ) جب (روحانی) بہروں کو ہوشیار کیا جائے تو وہ آواز نہیں سُن سکتے۔

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(۴۷) اور اگر ان کو عذاب کی گرمی کا کوئی جھونکا لگ جائے۔ تو وہ ضرور کہیں گے۔ ہم پر افسوس! ہم تو ظلم ہی کرتے رہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

(۴۸) اور ہم قیامت کے دن ایسے تول کے سامان (یعنی پورا پورا تولنے والے سامان) پیدا کرینگے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا اور (اگر ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی (کوئی عمل) ہوگا۔ تو ہم (اس کو) موجود کردینگے۔ اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔

۴۵؎ جب کسی قوم کا زمانہ ترقی لمبا ہو جاتا ہے تو وہ ترقی کو دائمی سمجھنے لگتی ہے مگر کافروں کو دیکھنا چاہیئے کہ ان کا اثر کم ہو رہا ہے اور محمد رسول اللہ کا بڑھ رہا ہے پھر وہ کیونکر خیال کر سکتے ہیں کہ وہ غالب آجائیں گے۔

۴۶؎ یعنی میں کسی طاقت کا مدعی نہیں وحی الٰہی کی بنا پر تمہیں ڈراتا ہوں۔

۴۷؎ فرماتا ہے جب عذاب آئے گا اس وقت یہ لوگ کہیں گے افسوس ہم تو ظالم تھے۔ مگر مقدرتِ ظلم کے چھن جانے پر افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟

۴۸؎ فرمایا اگر کسی نے رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی تو اس کا بدلہ اسے ملیگا اس میں یہ نکتہ ہے۔ کہ ان کی نیکی دوسروں کو تو نظر نہیں آتی مگر خدا اسے ضائع نہیں کرتا۔ ابوجہل اور ابوسفیان اسلام کے ایسے شدید دشمن تھے کہ بظاہر انہیں اور ان کے خاندان کو ہمیشہ سزا ملنی چاہیئے تھی مگر ان کی پوشیدہ نیکیوں کی وجہ سے ان کے بیٹوں کو ایمان نصیب ہوا۔ اور وہ بڑے بڑے فضلوں کے وارث ہوئے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(۴۹) اور ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو امتیازی نشان بخشا تھا اور روشنی بخشی تھی - اور متقیوں کے لیے ایک یاددہانی کی تعلیم بخشی تھی -

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝

(۵۰) وہ (متقی) جو اپنے رب سے (غیب میں بھی) ڈرتے ہیں اور جو جزا سزا کے وقت مقررہ سے بھی ڈرتے رہتے ہیں-

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝

(۵۱) اور یہ (قرآن) ایک ایسی یاددہانی کرنیوالی کتاب ہے جس میں تمام آسمانی کتابوں کی خوبیاں یکجا آگئی ہیں اسکو ہم نے اتارا ہے پس کیا تم ایسی کتاب کے منکر ہو؟

ع

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝

(۵۲) اور ہم نے اس سے پہلے ابراہیمؑ کو اس کی صلاحیت، اور قابلیت عطا کی تھی - اور ہم اس کے اندرونہ سے خوب واقف تھے-

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝

(۵۳) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا - یہ کیا مجسمے ہیں جن کے آگے تم بیٹھے رہتے ہو-

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝

(۵۴) انہوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا تھا کہ وہ ان کی عبادت کرتے تھے-

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۵۵) اس نے کہا تب تم بھی اور تمہارے باپ دادے بھی ایک کھلی گمراہی میں مبتلا تھے-

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝

(۵۶) انہوں نے کہا - کیا تو ہمارے پاس ایک حقیقت لے کر آیا ہے - یا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے -

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

(۵۷) اس (یعنی ابراہیمؑ) نے کہا حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب آسمانوں کا بھی رب ہے، اور زمین کا بھی رب ہے، (وہی ہے) جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں اس بات پر تمہارے سامنے گواہ ہوں-

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝

(۵۸) اور اس نے کہا خدا کی قسم جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے - تو میں تمہارے بتوں کے خلاف ایک پکی تدبیر کروں گا-

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا

(۵۹) پھر اس نے ان (یعنی بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - سوائے

جہنم عارضی ہے مستحقین سزا کو تو پہلے مل جائیگی پھر ختم ہوگا جو دائمی ہوگا - ورنہ اگر جہنم دائمی ہو تو نیک عملوں کی جزا کب ملیگی-

۴۹-۵۱ مبارک برکۃ سے ہے جس کے معنی ایسے گڑھے کے ہیں جس میں ادھر ادھر کا تمام پانی جمع ہو جاتا ہے- قرآن کو "مبارک" اس لیے کہا کہ اس میں گذشتہ تمام صداقتیں جمع ہیں-

لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ۝

اُن میں سے بڑے کے تاکہ وہ ایک دفعہ پھر اس کے پاس آئیں۔

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِآلِهَتِنَآ إِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(۶۰) اس پر انہوں نے کہا۔ کہ ہمارے معبودوں سے یہ کام کس نے کیا ہے ایسا کرنے والا یقیناً ظالموں میں سے ہے۔

قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ إِبْرٰهِيْمُ ۝

(۶۱) (تب کچھ دوسرے لوگوں نے) کہا۔ ہم نے ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیمؑ ہے ان کی کمزوریاں بیان کرتے سنا ہے۔

قَالُوا فَأْتُوا بِهٖ عَلٰٓى أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝

(۶۲) (تب قوم کے سرداروں نے) کہا (اگر بات یوں ہے تو) اس شخص کو سب لوگوں کے سامنے لاؤ شاید وہ (اس کے متعلق) کوئی فیصلہ کریں۔

قَالُوٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا يٰٓإِبْرٰهِيْمُ ۝

(۶۳) (پھر) انہوں نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا یہ کام تو نے ہمارے معبودوں سے کیا ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ إِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝

(۶۴) (ابراہیمؑ نے کہا کہ (آخر) کسی کرنے والے نے تو یہ کام ضرور کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا بت سامنے کھڑا ہے۔ اگر وہ بول سکتے ہیں تو ان سے (یعنی اس بت سے بھی اور دوسرے بتوں سے بھی) پوچھ کر دیکھو۔

فَرَجَعُوٓا إِلٰٓى أَنْفُسِهِمْ فَقَالُوٓا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(۶۵) اس پر وہ اپنے سرداروں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے کہا۔ سچی بات تو یہی ہے کہ ظالم تم ہی ہو۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝

(۶۶) اور وہ لوگ اپنے سروں کے بل گرائے گئے (یعنی لاجواب کئے گئے) تو انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ یہ تو بولا نہیں کرتے۔

قَالَ أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝

(۶۷) (ابراہیمؑ نے کہا۔ تو کیا تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا ایسی شے کی پرستش کرتے ہو۔ جو نہ تمہیں نفع دیتی ہے نہ نقصان پہنچاتی ہے۔

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(۶۸) ہم تم پر افسوس کرتے ہیں اور اس پر بھی جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

۵۲-۶۸ اس جگہ اب سے مراد چچا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد فوت ہو چکے تھے۔ اور حضرت نبی کریم صلعم کی طرح ان کو بھی ان کے چچا نے پالا تھا۔ اور دونوں کے پالنے والے مشرک تھے۔ دونوں نے اپنے پالنے والوں کو توحید کی تبلیغ کی۔ مگر انہوں نے انکار کیا۔ دونوں مضبوطی سے توحید پر قائم تھے۔ دونوں نے بت توڑے مگر ابراہیمؑ نے اس وقت جب بت پرست پاس نہیں تھے۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سامنے اہل مکہ کے سامنے توڑے

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۶۹) (اس پر وہ غصے میں آ کر) کہنے لگے - اس شخص کو جلا دو - اور اپنے معبودوں کی مدد کرو - اگر تم نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے -

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ (۷۰) تب ہم نے کہا اے اے آگ! تو ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی بھی ہو جا اور اس کے لیے سلامتی کا باعث بھی بن جا۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ (۷۱) اور انہوں نے اس سے کچھ بُرا سلوک کرنا چاہا مگر ہم نے ان کو ناکام بنا دیا۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷۲) اور ہم نے اسے بھی اور لوطؑ کو بھی اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے تمام جہانوں کیلئے برکتیں رکھی تھیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ (۷۳) اور ہم نے اسے اسحٰقؑ بھی بخشا اور یعقوبؑ بھی بطور پوتے کے (دیا) اور ہم نے سب کو نیک بنایا۔

مگر کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی - مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ کے الفاظ بتوں کی تحقیر کے لیے ہیں - ورنہ حضرت ابراہیمؑ تو خوب جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہیں - بَلْ فَعَلَهٗ سے مراد بل فعله فاعلٌ ہے یعنی یہ کام کسی نے ضرور کیا ہو گا اور وقف سے ثابت ہوتا ہے کہ اگلا حصہ الگ ہے اور اس میں سوال ہے کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اس بڑے بُت سے پوچھ لیتے یا یہ کلام تعریضاً ہے اور مراد یہ ہے کہ یہ کام میں نہ کرتا تو کیا اس بُت نے کرنا تھا؟

ت ۶۹ ابراہیمؑ کی قوم نے بتوں کی مدد کے لیے ابراہیمؑ کو جلانے کا فیصلہ کیا - کیونکہ ان کے ہاں بتوں کی ہتک کی یہی سزا تھی اور محمد رسول اللہ کی قوم نے آپؐ کے متعلق قید - قتل یا جلا وطنی کا فیصلہ کیا۔ (انفال ۳۰) چنانچہ انہوں نے دس سال لڑائی کی آگ جلائی مگر ناکام رہے اور ان کی تدبیریں آپؐ کی فتح کا پیش خیمہ بنیں - اور ان کو ماننا پڑا کہ محمد رسول اللہ صلعم جیت گئے اور وہ اور ان کے بُت ہار گئے - ابراہیمؑ نے وہ بُت خانہ توڑا جو ورثہ میں ان کی مِلک بنا تھا - مگر محمد رسول اللہ صلعم نے جو بتخانے توڑے وہ آپؐ کی مِلک نہیں تھے بلکہ ان پر غیروں کا قبضہ تھا - فرمایا "اے آگ ٹھنڈی ہو جا" یہ نہیں فرمایا کہ "جلا نہیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا آندھی وغیرہ سے آگ بجھا دی گئی تھی - اور مشرک چونکہ وہمی ہوتے ہیں انہوں نے اسے بری فال سمجھ کر ابراہیمؑ کو چھوڑ دیا۔

ت ۷۲ ان آیات سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور لوطؑ دونوں کو نجات دی اور کامیاب کر کے فلسطین لے گیا - بعینہٖ اسی طرح خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دشمنوں سے نجات دی اور آپؐ کے غلام حضرت عمرؓ کو بطور فاتح بیت المقدس میں لے گیا۔

ت ۷۳ نافلۃً کے معنے بڑھنے کے بھی ہیں اور واجب اور ضرورت سے زیادہ دینے کے بھی مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بطور انعام دیئے - ایسا ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ ہے

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۚۙ

(۷۴) اور ہم نے ان کو لوگوں کا امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے ان کو ہدایت دیتے تھے۔ اور ہم نے ان کی طرف نیک کام کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔ اور وہ سب ہمارے عبادت گذار بندے تھے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ

(۷۵) اور ہم نے اُسے (لُوط) بھی بخشا جب ہم نے حکم بھی عطا کیا اور علم بھی۔ اور اس کو اس بستی سے نجات دی جو کہ نہایت گندے کام کرتی تھی۔ وہ (یعنی لُوط کے شہر کے رہنے والے) ایک بہت بری قوم یعنی نافرمان تھے۔

وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۠

(۷۶) ہم نے اسے (یعنی لوطؑ) کو اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ ہمارے نیک بندوں میں سے تھا۔

ع ۵

چنانچہ مسلمانوں کو درود سکھلایا گیا جس میں ہر مسلمان یہ دعا کرتا ہے۔ کہ الٰہی تو نے جس قسم کے انعام ابراہیمؑ پر کئے تھے اسی قسم کے (نہ کہ من بعید) انعام محمد رسُول اللہ پر بھی فرما۔ پھر ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ ربنا واجعلنا مُسلمین لک ومن ذریتنا امۃً مسلمۃً لک (۱۲۸/۲) یعنی دعا امت صالح ملنے کی تھی۔ مگر خدا نے ان کی نسل میں نبوت رکھدی وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتٰب (عنکبوت ۲۹/۲۸) گویا جو مانگا تھا اس سے زیادہ دے دیا یہی دعا مسلمان مانگتے ہیں۔ کہ خدایا جس طرح ابراہیمؑ نے جو مانگا تو نے اس سے زیادہ ان کو دیا حتیٰ کہ ان میں سے محمد رسول اللہ صلعم کو پیدا کیا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں تجھ سے کی ہیں تو اس سے بھی زیادہ ان کو دے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عرفان چونکہ ابراہیمؑ سے زیادہ تھا۔ آپ کی دعائیں بھی ابراہیمؑ سے بڑھی ہوئی تھیں اس لیے آپؐ پر انعام بھی زیادہ ہوگا۔

۷۴ فرمایا وہ سب اپنے اپنے زمانہ کے امام تھے۔ اور خدا تعالےٰ کے حکم کو دنیا میں پھیلاتے تھے۔ اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان اللّٰہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۴۱) یہی مضمون انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون (حجر ۱۵/۱۰) میں بیان ہوا ہے آنحضرتؐ نے یہی مضمون دوسرے پیرایہ میں بیان فرما کر بتایا ہے کہ اس آیت قرآنی میں صرف لفظی حفاظت کا وعدہ نہیں بلکہ معنوی حفاظت کا بھی وعدہ ہے اور ہر سو سال کے بعد مجدد آئیں گے جو اسلام کی پیروی سے الہام ملنے کا تازہ بتازہ ثبوت دینگے۔

۷۵-۷۶ بعثت انبیاء کی اصل غرض لوگوں کا خدا تعالےٰ سے پیوند قائم کرنا ہوتی ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کی معرفت تامہ اور علوم روحانیہ حاصل ہوں اس لیے اللہ تعالیٰ ماموروں کو علمی معجزات دیتا ہے۔ چنانچہ

وَنُوحًا إِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَأَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ

(۷۶) اور (یاد کر) نوح کو جب اس نے اس (یعنی ابراہیم کے واقعہ) سے پہلے (ہمکو) پکارا۔ اور ہم نے اس کی دعا سنی پس ہم نے اس کو بھی اور اس کے اہل کو بھی ایک بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

(۷۷) اور ہم نے اس کی اس قوم کے مقابلہ میں مدد کی جس نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ وہ بہت بُری قوم تھی۔ پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ

(۷۸) اور (یاد کر) داؤدؑ کو بھی اور سلیمان کو بھی جبکہ وہ دونوں ایک کھیتی کے جھگڑے میں فیصلہ کر رہے تھے اس وقت جبکہ ایک قوم کے عامی لوگ اس کو کھا گئے تھے (یعنی تباہ کر گئے تھے) اور ہم ان کے فیصلہ کے گواہ تھے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ○

(۸۰) ہم نے اصل معاملہ سلیمان کو سمجھا دیا۔ اور سب کو ہی ہم نے حکم اور علم عطا فرمایا تھا۔ اور ہم نے داؤدؑ کے ساتھ اہل جبال کو بھی اور پرندوں کو بھی کام پر لگا دیا تھا۔ وہ سب خدا کی تسبیح کرتے تھے اور ہم یہ سب کچھ کرنے پر قادر تھے۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سب انبیاء سے بڑا علمی معجزہ قرآن کی شکل میں دیا گیا جس کے مقابلہ سے باوجود چیلنج کے ساری دنیا عاجز ہے۔

۷۶-۷۷ نوحؑ آدمؑ کے پوتے اور پہلے شارع نبی تھے جیسا کہ حدیث میں آپؑ کے متعلق آتا ہے اول نبی شرعت علی لسانہ الشرائع اور نساء ۱۶۳/۴ میں بھی ادھر اشارہ ہے۔ حضرت ابراہیم نوحؑ کے تابع تھے وان من شیعتہ لابراہیم (صافات ۸۴/۳۷) یہاں نوحؑ کے ذکر سے یہ اشارہ فرمایا کہ شریعت لعنت نہیں کیونکہ نوحؑ (جن کے ذریعہ نسل انسانی کے لیے شریعت کا آغاز ہوا) کے دشمن ہی ہلاک ہوئے تھے اور اب بھی محمد رسول اللہ کے دشمن ہی تباہ ہوں گے۔

ف ۷۹-۸۰ یہاں حرث سے مراد دین کی کھیتی ہے جسے چار یا یہ مزاج لوگ چرنے لگ جاتے ہیں۔ فرماتا ہے اس کا علاج ہم نے سلیمانؑ کو سکھایا تھا جس سے اس نے ہمسایہ قوموں کے حملوں سے اپنی مملکت کو بچالیا۔ حضرت داؤدؑ نے مفسدوں کو سخت سزائیں دی تھیں حضرت سلیمانؑ نے زیادہ تر معاہدات سے کام لیا۔ جسے بعض نے کمزوری قرار دیا ہے ففھمنا سلیمٰن میں بتایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا طریق صحیح تھا۔ اور وکلا اٰتینا حکما وعلما میں بتایا کہ ففھمنا سلیمٰن سے یہ مطلب نہیں کہ داؤدؑ کا طریق غلط تھا بلکہ صرف سلیمانؑ

پر غلط گروہ الزام کا ازالہ مقصود ہے۔ وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر وکنا فٰعلین۔ اسی مضمون سے ملتا جلتا مضمون (۳۴ ، ۳۸ ، ۳۸) میں ہے۔ ان آیات سے لوگوں نے یہ قصے گھڑے ہیں کہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے قبضہ میں پہاڑ، جن اور پرندے تھے جو ان کے ساتھ رکوع و سجود کرتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ چلتے تھے مگر قرآن میں لکھا ہے کہ سمندر اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے مومنوں کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے (جاثیہ ۱۳) مگر یہ چیزیں نہ مومنوں کے ساتھ چلتی ہیں نہ رکوع و سجود کرتی ہیں۔ اس لیے یہ معنے غلط ہیں اگر کہو کہ پھر داؤدؑ و سلیمانؑ کی خصوصیت کیا ہوئی تو جواب ہے کہ گو تسخیر بعینہٖ وہی ہے جو ہر انسان کے لیے ہے مگر وہ چونکہ بادشاہ تھے اس تسخیر کی عظمت میں فرق ہے۔

جبل کے لغوی معنے سید القوم کے ہیں۔ اور حضرت داؤدؑ یہود کے پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے اردگرد کے قبائل پر فتح پائی تھی اس لیے سخرنا مع داؤد الجبال میں سرداروں کے مطیع ہونے کا ذکر ہے۔ جبال چونکہ مؤنث ہے اس لیے یسبحن کا لفظ آیا ہے ورنہ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ قومیں آپ کی مطیع ہو گئی تھیں۔

اگر کوئی کہے کہ کیا داؤدؑ کے ساتھ پہاڑ اور پرندے تسبیح کرتے تھے کیا اب بھی یہ چیزیں تسبیح کرتی ہیں تو جاننا چاہیے کہ جمعہ کے مطابق ہر چیز خدا تعالےٰ کی تسبیح کر رہی ہے یعنی اس کا بے عیب ہونا ثابت کر رہی ہے۔ پھر داؤدؑ کے متعلق خاص معنی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسلام چونکہ دنیا بھر کے لیے ہے اس لیے مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ ہر چیز تسبیح کر رہی ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جعلت لی الارض مسجدًا مگر حضرت داؤدؑ چونکہ چند اہلِ جبال کیلئے نبی تھے ان کے لیے صرف جبال تسبیح کی۔ باقی رہے طیور تو طیور کے متعلق قرآن میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ وہ داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ آیت میں طیر منصوب ہے اور زیر دیۓ والا سخر کا لفظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے داؤدؑ کے لیے پہاڑ مسخر کر دیئے اور طیر بھی۔ ص ۳۸ میں بھی طیر کا ناصب سخر ہے۔ سبا ۳۴ میں سخر کا ناصب اٰتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے داؤدؑ کو پرندے دیئے تھے لیکن اگر تسبیح کے معنے ہی لیے جائیں تو جب ہر چیز تسبیح کر رہی ہے تو پرندوں کی تسبیح میں کونسی بڑی بات ہے۔

دراصل طیر کی کئی قسمیں ہیں انعام ۶ میں پرندوں کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ یطیر بجناحیہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرندہ ایسا بھی ہوتا ہے جو پروں سے نہیں اڑتا۔ پھر فرمایا الم تر ان اللہ یسبح لہٗ من فی السمٰوٰت والارض والطیر صٰٓفٰت کل قد علم صلاتہٗ وتسبیحہٗ واللہ علیم بما یفعلون (نور ۲۴) یہاں طیر سے مراد پرندے نہیں کیونکہ مَن ہمیشہ ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ نیز یہاں طیر کا ذکر باقی مخلوق سے الگ کرنے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی الگ چیز ہے تسبیح کے ساتھ صلوٰۃ کا بھی لفظ ہے چنانچہ صافات میں باجماعت نماز کا ذکر ہے

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝

(٨١) اور ہم نے اس کو ایک لباس کا بنانا سکھایا تھا، تاکہ وہ تمہاری جان لڑائی میں بچائے۔ پس کیا تم شکرگذار بنو گے؟

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً (٨٢) اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز ہوا کو بھی مسخر کر چھوڑا تھا

اور پرندے نماز نہیں پڑھا کرتے۔ پھر یفعلون بھی ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ دراصل فطرتی طاقت کے اور انسانی اعمال کے نتیجہ کو عربی میں طائر کہتے ہیں (۷/۱۳)، ۲۷/۴۸، اور ۳۵/۲۰ میں طائر عمل اور نتیجہ عمل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ وکلّ انسان الزمنٰہ طائرہٗ فی عنقہٖ ونخرج لہ یوم القیٰمۃ کتابًا یلقٰہُ منشورًا۔ (۱۷/۱۳) اب کسی کی گردن سے ساتھ کوئی پرندہ تو لٹکا ہوا نہیں ہوتا اس لیے اس سے کوئی اور چیز مراد ہے جو بجز عمل یا نتیجہ کے کچھ نہیں ہو سکتی۔ اچھا عمل ہو تو انسان کو اوپر لے جائے گا برا ہو تو نیچے گرا دے گا۔ حدیث کلّ مولودٍ یولد علی الفطرۃ فأبواہ یھوّدانہٖ او ینصّرانہٖ او یمجسانہٖ میں بھی اشارہ ہے کہ ہر انسان میں اڑنے کی طاقت ہے، سورۂ فاطر آیت ۲ میں فرمایا کہ ترقی کے لیے فرشتوں کے پَر ہوتے ہیں پھر آیت ۱۱ میں فرمایا الیہ یَصْعَدُ الکَلِمُ الطیّب والعملُ الصالحُ یرفعُہ یعنی اس کی طرف پاکیزہ روحیں صعود کرتی ہیں مگر اکیلی نہیں اس کے لیے عمل صالح کے سہارا کی ضرورت ہے۔

پھر پرندوں میں دو خاصیتیں ہوتی ہیں جو مومنوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک اوپر اڑنا ہے جس کا آیت یرفع اللّٰہ الَّذِیْنَ اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت (۵۸/۱۲) میں ذکر ہے۔ دوسرا اونچا آشیانہ بنانا ہے۔ اس کا ذکر ۲۴/۳۷ میں ہے فرمایا فی بیوتٍ اذن اللّٰہ ان ترفع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رجال لا تلھیھم تجارۃٌ ولا بیعٌ عن ذکر اللّٰہ (نور ۲۴/۳۸) پہلے فرمایا۔ کہ جن گھروں میں تسبیح ہوتی ہے ان کو اونچا کرنے کا ہم نے حکم دیا ہے۔ پھر فرمایا۔ رجال یعنی ہماری مراد گھر والوں کو اونچا کرنا ہے گھروں کو نہیں۔

غرض طیور سے مراد اعلیٰ قسم کی روحیں ہیں۔ جو دین کے لیے ہر قسم قربانی کر کے بلندیوں پر چڑھنے کو تیار رہتی ہیں۔ اور طیر کہہ کر اللہ تعالےٰ نے مومنوں کی اس صفت کا ذکر کیا ہے کہ وہ بجائے سفلی زندگی کے علوی زندگی اختیار کرتے ہیں اور بجائے نیچے جھکنے کے اوپر اڑتے ہیں۔

۸۱ یعنی داؤدؑ کو زرہیں بنانا بھی سکھایا گیا تھا۔ تاکہ جنگوں میں قوم کی حفاظت کر سکیں۔

۸۲ تجری بامرہٖ میں امر کی ضمیر خدا تعالےٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ اور سلیمانؑ کی طرف بھی، حضرت سلیمانؑ کی صورت میں ان کا حکم نہیں کام مراد ہو گا۔

تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝

جو اس کے حکم کے مطابق چلتی تھی۔ اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور ہم سب کچھ جانتے ہیں۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝

(٨٣) اور کچھ سرکش لوگ ایسے تھے جو اس کے لئے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا بھی اور کام کرتے تھے اور ہم اُن کی نگرانی کا کام کرتے تھے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

(٨٤) اور (تو) ایوب کو بھی یاد کر، جب اس نے اپنے ربّ کو پکار کر کہا کہ میری حالت یہ ہے کہ مجھے تکلیف نے آ پکڑا ہے اور اے خدا! تُو تو سب رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝

(٨٥) پس ہم نے اس کی دُعا سُنی اور جو تکلیف اس کو پہنچی ہوئی تھی اس کو دور کر دیا۔ اور اس کو اس کے اہل (و عیال) بھی دیئے۔ اور انکے سوا اپنی طرف سے رحم کرتے ہوئے اور بھی دیئے۔ اور ہم نے اس واقعہ کو عبادت گذاروں کیلئے ایک نصیحت کا موجب بنایا ہے۔

---

٨٣ ان آیات میں پہلے داؤدؑ کا اور پھر سلیمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآنی زمانہ میں حقیقی داؤدؑ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے جنہوں نے داؤدؑ کی طرح عملاً جنگیں کیں پھر عہد سلیمان کے مشابہ بنو عباس اور بنو امیہ کی حکومتیں ہوئیں جن کے پاس بے پناہ دولت و ثروت تھی۔

٨٤-٨٥ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایوبؑ بہت مالدار تھے۔ ان کا بڑا خاندان تھا۔ وہ مشرک ملک میں رہتے تھے جس کا بادشاہ ظالم تھا۔ اس کی تعذیب سے بچنے کے لیے خدا تعالےٰ کے حکم سے انہوں نے ایک پہاڑی اور چشموں والے علاقہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ظالم ملک کے متعلق یہ آیت شاہد ہے۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (ص ٣٨/٤١) شیطان کے معنے سرکش کے ہوتے ہیں پس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک سرکش بادشاہ مجھے تکلیف دیتا ہے اس کا ثبوت کہ وہ بادشاہ کے حکم سے جگہ چھوڑنے پر مجبور تھے یہ آیت ہے اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ (٣٨/٤٣) اور یہ آیت بھی کہ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص ٣٨/٤٥) یعنی اپنی سواری کو ایڑی مار اور ساتھ ہی درخت کی ایک ٹہنی سے بھی مارتا جا۔ تاکہ سفر جلدی طے ہو۔ جب تُو ایسا کرے گا تو سامنے تجھے ایک چشمہ نظر آئے گا۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت ایوبؑ کسی پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے حنث کے ایک معنے قسم توڑنے کے ہیں۔ اور مفسرین نے یہ معنے لے کر عجیب نامعقول قصے گھڑے ہیں مگر حنث کے معنے مَالَ اِلَى الْبَاطِلِ

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۸۵) اور اسمٰعیل کو بھی (یاد کر) اور ادریس کو بھی اور ذوالکفل کو بھی یہ سب کے سب صبر کرنے والے تھے۔

بھی ہیں اس سے یہ مراد نہیں کہ دل سے باطل کی طرف مائل نہ ہو بلکہ یہاں جسمانی میلان مراد ہے اور یہ حکم ہے کہ جلد مشرکوں کی ہمسائیگی سے نکل جا اور ان کا علاقہ چھوڑ دے اور اس ملک سے ہجرت پر افسوس نہ کر دوسرے علاقہ میں بھی ہم تیرے خیر خواہ پیدا کر دیں گے۔ حضرت ایوبؑ کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ سے ہجرت کرتے وقت اپنے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو چھوڑنا پڑا۔ مگر مدینہ میں اللہ تعالےٰ نے اس کمی کو بھی پورا فرما دیا۔

بائیبل میں حضرت ایوب کی ایک مستقل کتاب ہے اور اس میں لکھا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی زندگی بہت مصائب میں سے گذری تھی، وہ ۱۴۰۰ سال قبل از موسیٰؑ ہوئے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایسے مالدار تھے کہ اہل مشرق میں سے کوئی ایسا مالدار نہ تھا۔ چونکہ باقی باتیں جو بائیبل نے لکھی ہیں قریباً وہی باتیں ہند کی روایات میں ہرش چندر کے نام پر مشہور ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ مشرق سے یعنی ہندوستان سے گیا ہے اور لفظ "ایوبؑ" غالباً اس نام کا ترجمہ ہے یا یہ نام استعارۃً رکھا گیا ہے۔ مغربی محققین کے نزدیک ایوبؑ غیر اسرائیلی نبی تھے کیونکہ وہ اسرائیل کے بڑے بھائی عیسو کی نسل میں سے تھے اور عوص کے رہنے والے تھے جو دور آخر کے ۔۔۔ کا شہر تھا اور شام اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع تھا مگر یہ درست نہیں اس ملک کے لوگوں کی بنی اسرائیل سے سخت عداوت تھی کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو کنعان نہیں جانے دیا تھا۔ ایسے دشمن قبیلہ کے بزرگ کا واقعہ سب دنیا کے واقعات کو چھوڑ کر بائیبل میں درج کرنا خلاف قیاس ہے۔

اسلامی روایات کے مطابق ایوبؑ اسوص بن تارح بن روم بن عیص بن اسحٰقؑ بن ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔

۸۶ حضرت اسمٰعیلؑ ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت ادریسؑ کے حالات سورۂ مریم میں آ چکے ہیں۔ ذوالکفل کا ذکر قرآن میں دو جگہ ہے۔ یہاں اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ کے ساتھ اور سورۂ ص میں "اسمٰعیل اور الیسعؑ" کے ساتھ۔ حدیث میں ایک ذوالکفل کا ذکر آتا ہے جس نے کسی عورت کو کچھ رقم دے کر بدکاری پر مائل کرنا چاہا تھا، وہ غربت کی وجہ سے مجبور ہو گئی مگر رو پڑی۔ اس نے خدا سے ڈر کر اسے چھوڑ دیا ظاہر ہے کہ اس حدیث سے قرآن والا ذوالکفل مراد نہیں کیونکہ ایسے واقعہ کے مرتکب کو انبیاء کے ساتھ نہیں گنا جا سکتا۔ نیز اسی حدیثوں میں اس کا نام الکفل بھی آیا ہے۔ در اصل ذوالکفل حزقیل کا معرب ہے۔ "یا" واؤ سے بدلتی ہے اور واؤ فاء سے بدل جاتی ہے۔ پس حزقیل سے حزکفل اور اس سے ذوالکفل ہو جانا بعید نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حزقیل کا عربی میں ترجمہ کر کے اسے ذوالکفل کہہ دیا گیا ہو۔ کیونکہ حزقیل کے معنے ہیں جسے خدا کی طرف سے طاقت ملی ہو۔ اور کفل کے معنے بھی حصہ

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

(۸۷) اور ہم نے اُن سب کو اپنی رحمت میں داخل کیا تھا۔ اور وہ سب نیکوکار تھے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

(۸۸) اور ذوالنون (یعنی یونسؑ) کو بھی یاد کر) جب وہ غصہ کی حالت میں چلا گیا۔ اور دل میں پُر یقین تھا کہ ہم اس کو تنگ نہیں کریں گے۔ پس مصائب میں اس نے ہم کو پکارا (اور کہا) کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے۔ میں یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔

کے ہیں۔ پس ذوالکفل کے معنے ہیں جسے بڑا حصّہ ملا ہو۔ یسعیاہ کے ساتھ اس کے نام کا آنا مزید ثبوت ہے کہ یہ نبی حزقیلؑ ہی ہیں کیونکہ یسعیاہؑ کی پیشگوئیاں حزقیل ہی کے زمانہ میں پوری ہوئی تھیں۔

حزقیلؑ کی پیدائش ۶۲۲ قبل مسیحؑ کی ہے۔ انہوں نے قریباً ۲۲ برس نبوت کی اور ۵۰ سال عمر پائی۔ ان کے بعد یہود نے ظاہری بُت پرستی ترک کر دی۔ وہ اپنے آپ کو آدم زاد کہتے تھے۔ اس طرح انہیں ادریسؑ اور مسیحؑ سے مشابہت ہے وہ کچھ عرصہ خاموش بھی رہے اس میں زکریاؑ سے مشابہت ہے بائیبل میں صرف حزقیل کی کتاب ایسی ہے جس کا کچھ حصّہ خدا کے نبی نے لکھا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا صفحہ ۱۴۵۶ تا ۱۴۵۸) انہوں نے فرشتوں کا اشارۃً (روح کے لفظ سے) ذکر کیا ہے آپ کی تعلیم تھی کہ انسان نیکی بدی پر مقدرت رکھتا ہے (حزقیل $\frac{18}{19-21}$)۔ آپؑ نے توبہ پر زور دیا ہے ($\frac{18}{21-24}$) علماء یہود کے نزدیک وہ مردے زندہ کیا کرتے تھے۔ (اس میں بھی انہیں مسیحؑ سے مشابہت ہے) قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اور اس سے پتہ لگتا ہے۔ کہ یہ رؤیا تھی (بقرہ ع ۳۵) آپ جلا وطنی میں بابل میں فوت ہوئے اور کفل جگہ پر آپ کا مزار بنایا جاتا ہے (اس جگہ کا نام کفل ہونا صاف بتاتا ہے کہ ذوالکفل حزقیلؑ ہی کا عربی نام تھا) (جیوش انسائیکلوپیڈیا) باب ۷ میں آپ نے یہود کی تباہی کی خبر دی باب ۸ میں بتایا کہ جب خدا کی جماعت بگڑ جائے تو اس پر غیروں کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ کیسے ہی خراب ہوں تاکہ ان کو توبہ کا موقعہ ملے۔ باب ۹ میں بتایا کہ جو سچے دین سے تعلق رکھ کر بگڑ جائیں۔ ان کی شفاعت نہیں ہوتی۔ باب ۱۲ کی آیت ۲ سورۃ اعراف $\frac{6}{180}$ سے مشابہ ہے بائیبل $\frac{37}{1-14}$ میں حزقیلؑ اپنی ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں۔ جو انہوں نے بنی اسرائیل کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارہ میں دیکھی۔ اس کا ذکر بقرہ ع ۳۵ میں بھی آتا ہے۔ باب $\frac{38}{39}$ یاجوج ماجوج کے دنیا پر چھا جانے کی اور بالآخر تباہ ہونے کی خبر دیتا ہے۔ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِيْنَ میں بتایا کہ یہ بھی ایوبؑ کی طرح صابر تھے۔

۸۷ یعنی گو ان پر بڑے بڑے مصائب بھی آئے جن پر انہوں نے صبر کیا مگر ان پر خدا کے فضل بھی بہت تھے۔

۸۸-۸۹ مذکورہ بالا انبیاء کی طرح یونسؑ کو بھی ایک وقت بہت تکالیف پہنچیں مگر پھر انہیں عزت بخشی گئی۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ۙ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذَٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۸۹) پس ہم نے اس کی دعا کو سنا۔ اور غم سے اسے نجات دی۔ اور ہم اسی طرح مومنوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ۝

(۹۰) اور زکریا کو بھی (یاد کر) جب اس نے اپنے رب کو پکارا تھا اور کہا تھا کہ اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔ اور تو وارث ہونیوالوں میں سے سب سے بہتر ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝

(۹۱) اور ہم نے اس کی دعا کو سنا اور اس کو یحیٰؑ عطا کیا۔ اور اس کی بیوی کو اس کی خاطر تندرست کر دیا۔ وہ سب لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے۔ اور ہم کو محبت اور خوف سے پکارتے تھے۔ اور ہماری خاطر عجز کی زندگی بسر کرتے تھے۔

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝

(۹۲) اور اس عورت کو بھی (یاد کر) جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی۔ پس ہم نے اس پر اپنا کچھ کلام نازل کیا۔ اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا کے لیے ایک نشان بنایا۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝

(۹۳) یہ تمہاری امت (یعنی تمہارے ابدی دشمن) ایک ہی راہ پر چلنے والے تھے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ۝ ع

(۹۴) اور انہوں نے (یعنی انبیاء کے مخالفوں نے) شریعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنا اندر تقسیم کر لیے تھے۔ (حالانکہ) وہ سب ہماری طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں۔

یونسؑ کو حکم ہوا کہ نینواہ والوں کے خلاف پیشگوئی کر۔ مگر وہ ڈرے کہ وہ توبہ کر لیں گے۔ اور عذاب ٹل جائیگا اس لئے بجائے نینواہ کے یافا جا کر ترشیش جانیوالے جہاز پر بیٹھ گئے۔ راستہ میں طوفان آگیا۔ قرعہ ڈالنے پر معلوم ہوا کہ طوفان ان کی وجہ سے ہے اس لئے انہیں سمندر میں پھینک دیا گیا۔ جہاں ایک مچھلی کے پیٹ میں وہ تین دن رات رہے آخر اُن کی دعا کو خدا نے سنا اور مچھلی کو حکم دیا کہ ان کو اگل دے (بائیبل کتاب یوناہ) اس دعا کا یہاں ذکر ہے۔ یونسؑ نے پہلے تسبیح و تحمید کی پھر اپنا مدعا عرض کیا۔ یہ مؤثر دعا کا ایک گُر ہے۔

ف ۹۱ یہاں بتایا ہے کہ ہم نے ان کی تنگیوں کو اس لیے بدل دیا کہ یہ سب لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمارے انعام کی رغبت سے اور ہماری سزا کے خوف سے ہمیں پکارتے رہتے تھے۔

ف ۹۳ امتکم امۃ واحدۃ میں بتلایا کہ یہ ساری جماعت ایک ہی قسم کی جماعت ہے۔

ف ۹۴ یہاں ان انبیاء کے مخالفوں کا ذکر ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝ (۹۵) پس جو کوئی مناسب حال عمل کرے گا۔ اور ساتھ ہی مومن بھی ہوگا۔ تو اس کی کوشش کو رد نہ کیا جائے گا۔ اور ہم اس کے نیک اعمال کو لکھ رکھیں گے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (۹۶) اور ہر ایک بستی جسے ہم نے ہلاک کیا ہے اس کیلئے یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اس کے بسنے والے لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آئیں گے۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ (۹۷) یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کے لیے دروازہ کھول دیا جائیگا اور وہ ہر پہاڑی اور ہر سمندر کی لہر پر سے پھلانگتے ہوئے دنیا میں پھیل جائیں گے۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (۹۸) اور (خدا کا) سچا وعدہ قریب آجائے گا۔ تو اس وقت کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اور وہ کہیں گے۔ ہم پر افسوس! ہم تو اسی دن کے متعلق سخت غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم لوگ تو ظالم تھے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا (۹۹) (اس وقت کہا جائیگا) تم بھی اور جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے سب کی سب جہنم کا ایندھن بنیں گی۔

---

۹۵ یعنی عمل صالح کے ساتھ ایمان بھی ضروری ہے۔

۹۶-۹۷ فرمایا کہ جب کوئی قوم ہلاک ہوجائے تو اسے اُٹھنے کا موقعہ نہیں ملتا لیکن مسلمانوں کے متعلق ہمارا فیصلہ ہے کہ یاجوج ماجوج یعنی روسی اور یوروپین قوموں کے دنیا میں چھا جانے کے بعد ان کو اٹھایا جائے گا۔ مومنون ۲۳/۱۰۱ سے ثابت ہے کہ مُردے اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتے۔ اس لیے یہاں یرجعون سے مراد بظاہر مردہ نظر آنے والے مسلمانوں کا اٹھایا جانا ہے نہ کہ اصل مردوں کا یاجوج و ماجوج میں سے ایک کا اصول یہ ہے کہ افراد کی طاقت کو بڑھا کر دنیا میں غلبہ حاصل کیا جائے اور دوسرے کا یہ کہ قابلیت (والوں) کو ابھار کر غلبہ حاصل کیا جائے۔ مگر اسلام ان دونوں پر حاوی ہے۔ اور درمیانی راہ اختیار کرتا ہے وہ حریت افراد کو بھی نہیں کچلتا اور چنیدہ افراد کی قابلیت سے دنیا کو محروم بھی نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف تو وہ افراد کی مجموعی رائے کو قیمت دیتا ہے۔ اور دوسری طرف اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام لوگ ایک جیسی قابلیت کے نہیں ہوتے اس لیے قابلوں کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔

۹۸-۱۰۰ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں تو یہ قومیں بڑا فخر کریں گی مگر سزا کا وقت آنے پر

وٰرِدُوْنَ ٥

تم سب اس میں داخل ہوگے۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

(۱۰۰) اگر وہ ہستیاں جن کو یہ لوگ معبود بناتے ہیں واقعہ میں معبود ہوتیں تو پھر وہ کبھی جہنم میں نہ جاتیں۔ اور یہ ہستیاں تو مدّتوں اس میں پڑی رہیں گی۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ٥

(۱۰۱) وہ اس میں چیخیں گے اور وہ اس میں (جلنے والوں میں کسی کی) بات نہیں سنیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۙ

(۱۰۲) یقیناً وہ لوگ جن کے متعلق ہماری طرف سے نیک سلوک کا وعدہ ہو چکا ہے۔ وہ اس دوزخ سے دُور رکھے جائیں گے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ

(۱۰۳) وہ اس کی آواز تک نہیں سنیں گے۔ اور وہ اس (حالت) میں جسے ان کے دل چاہتے ہیں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥

(۱۰۴) بڑی پریشانی کا وقت بھی ان کو غمگین نہیں کرے گا۔ اور فرشتے ان سے ملیں گے۔ اور کہیں گے یہ وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ٥

(۱۰۵) جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح بہیاں تحریر کو لپیٹ لیتی ہیں۔ جس طرح ہم نے تمہاری پیدائش کو پہلی دفعہ شروع کیا تھا اسی طرح پھر اس کو دُہرائیں گے یہ ہم نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے ہم ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ٥

(۱۰۶) اور ہم نے زبور میں کچھ نصیحتیں کرنے کے بعد یہ لکھ چھوڑا ہے کہ ارضِ (مقدّس) کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

چلانے لگیں گی اور ایک دوسرے کا تعاون چھوڑ دیں گی۔

۱۰۲-۱۰۴ یعنی جن کے لئے بشارتیں ہوں گی وہ اس عذاب سے اتنی دُور رکھے جائیں گے کہ اس کی بھنک تک نہ سنیں گے۔ جو کچھ ان کے دل چاہیں گے انہیں ملے گا اور ایک لمبے عرصہ تک یہی سلوک ان سے ہوتا رہے گا۔

۱۰۵ یہاں آسمان سے مراد اس وقت کی حکومتیں ہیں۔

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٧﴾ اس (مضمون) میں ایک پیغام ہے اس قوم کے لئے جو عبادت گذار ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿١٠٨﴾ اور ہم نے تجھے دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تفسیر ۱۰۷-۱۰۸ مطلب یہ ہے کہ بائیبل میں جو یہ پیشگوئی تھی کہ صرف خدا کے نیک بندے ارضِ مقدس میں رہیں گے اس سے کوئی اس وقت دھوکا نہ کھائے جبکہ بنی اسرائیل اس ملک پر غالب آجائیں گے کیونکہ اس پیشگوئی میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر کوئی دفعہ پڑا تو خدا کے بندے دوبارہ اس ملک پر غالب آجائیں گے۔ یہاں عابدین کا لفظ داؤد کی پیشگوئی کے یاد دلانے کے لیے ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر کسی وقت تم نے میرے عباد بننے میں کمزوری دکھائی تو پھر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو اس ملک میں واپس لے آئیگا۔ لیکن مسلمانوں کو چاہیے کہ پھر عبادت گذار بن جائیں اس کے نتیجہ میں وہ پھر غالب آجائیں گے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد رسول اللہ صلعم سب زمانوں کے لیے رحمت ہیں اس لیے یہود کے فلسطین پر قبضہ سے آپؐ کا زمانہ ختم نہیں ہو جاتا۔ جب دوبارہ رحمتِ الٰہی جوش میں آئے گی مسلمان دوبارہ فلسطین میں غالب آجائیں گے۔ زبور باب ۳۷/۲۹ میں وعدہ تھا کہ "صادق زمین (ارضِ مقدس) کے وارث ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے"۔ ایسا ہی وعدہ ۳۷/۱-۱۱ میں تھا۔ یہ وعدہ نیکی سے مشروط تھا ورنہ سرکشی کی حالت میں یہ وعدہ تھا کہ "تم کو فنا کرانے اور ہلاک کر ڈالنے سے خدا خوشنود ہوگا۔ اور تم اس ملک میں اکھاڑے جاؤ گے"۔ (استثناء ۲۸/۶۳-۶۴) مگر ساتھ ہی یہ وعدہ بھی تھا کہ اس عذاب کے بعد اصلاح کی صورت میں ان پر رحم کر کے انہیں واپس لایا جائے گا۔ (استثناء ۳۵/۳-۴) لکھا ہے "خدا تیری اسیری کو پلٹ کر تجھ پر رحم کرے گا۔ اگر تیرے آوارہ گردہ دنیا کے انتہائی حصوں میں بھی ہوں تو وہاں سے بھی خداوند تیرا خدا تجھ کو جمع کر کے لے آئیگا"۔ (استثناء ۳۰/۳-۴) مگر اس کے بعد پھر یہود کے سرکش ہونے اور سزا پانے کی خبر تھی (استثناء ۳۲/۱۶-۲۰) بنی اسرائیل ع میں ذکر ہے کہ فلسطین یہود سے چھین کر ایک اور قوم کو دے دیا جائے گا۔ کچھ عرصہ بعد پھر یہود کو واپس ملے گا۔ اس کے بعد پھر ان سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے بعد پھر واپس کیا جائے گا۔ مگر یہود کی بجائے موسوی سلسلہ کے ماننے والے عیسائیوں میں چلا جائے گا۔ اگر پھر انہوں نے شرارت کی تو چونکہ اس میں عیسائی بھی شامل ہوں گے یہ زمین ایک اور قوم یعنی مسلمانوں کو دیدی جائے گی۔ اس کے بعد فرمایا فاذا جاء وعد الآخرۃ جئنا بکم لفیفا (بنی اسرائیل ع ۱۲)۔ وعد الآخرۃ سے مراد مسلمانوں کے دوسرے عذاب کا وعدہ ہے اور بتایا ہے کہ اس وقت یہود کو پھر ارضِ مقدس میں لایا جائے گا۔ یہود کا اس طرح بیت المقدس میں واپس آنا اسلام کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ قرآنی پیشگوئیوں کے مطابق ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ سے

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(۱۰۹) تو کہدے کہ مجھ پر تو صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔ پس کیا تم اس بات کو مانو گے (کہ نہیں؟)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝

(۱۱۰) پس اگر وہ پیٹھ پھیرلیں، تو تو ان سے کہدے کہ میں نے تم (میں سے مومن و کافر) کو برابر خبر دے دی ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ وہ امر جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، قریب ہے یا بعید؟

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝

(۱۱۱) خدا (تعالیٰ) ظاہر بات کو بھی جانتا ہے۔ اور جو تم چھپاتے ہو، اسے بھی جانتا ہے۔

وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

(۱۱۲) اور میں نہیں جانتا کہ وہ (بات جو اوپر بیان ہوئی ہے) شاید تمہارے لیے ایک آزمائش ہے۔ اور (اس سے) ایک عرصہ تک تمہیں فائدہ پہنچانا مدنظر ہے۔ (یا ہمیشہ ہمیش کے لئے)

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝

(۱۱۳) (اس وحی کے آنے پر محمد رسول اللہ صلعم نے) فرمایا۔ اے میرے رب! (حق کے مطابق فیصلہ کردے اور ہمارا رب تو رحمٰن ہے اور (اے کافرو) جو تم باتیں کرتے ہو ان کے خلاف اسی سے مدد مانگی جاتی ہے

قبضہ نکل گیا تو پھر ارض مقدس کا قبضہ عبادی الصالحین کے ہاتھ میں کیسے رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عارضی طور پر قبضہ پہلے بھی دو دفعہ نکل چکا ہے اور اب بھی عارضی طور پر ہی نکلا ہے اور مسلمان یقیناً ایک دن واپس اس پر قابض ہونگے۔ جب فلسطین میں یہود کا نام و نشان نہ تھا اس وقت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ فلسطین میں اسلامی لشکر آئیگا اور جب کوئی مسلمان سپاہی کسی پتھر کے پاس سے گذرے گا۔ تو وہ پتھر کہیگا اے خدا کے سپاہی میرے پیچھے ایک یہودی کافر چھپا ہوا ہے اس کو مار۔ اس میں صاف پیشگوئی تھی کہ مسلمان وہاں سے نکلیں گے۔ اور اس کے بعد پھر اس جگہ قابض ہو جائیں گے۔

۱۰۹-۱۱۰ فرمایا انہیں کہدے کہ میری وحی تو توحید پر مشتمل ہے۔ مانو گے تو تمہارا فائدہ ہے نہ مانو گے تو سُن لو کہ دُگو تمہاری تباہی کے وقت کا مجھے علم نہیں لیکن وہ آکر رہے گا۔

۱۱۱-۱۱۲ یعنی میں نہیں جانتا کہ اس کلام کا انکار تمہیں لمبی تباہی میں مبتلا کردیگا یا کچھ عرصہ کے لیے تم ترقیات حاصل کرلوگے

۱۱۳ جب یہود ارض مقدس میں غالب آجائیں اس وقت کے لیے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے لیے دعا سکھلائی گئی ہے اور چونکہ خدا تعالےٰ نے یہ دعا سکھلائی ہے اس لیے ضرور ہے کہ پوری ہو پس مسلمانوں کو ایک طرف اپنی اصلاح کرنی چاہیئے کیونکہ قرآن نے ان کو تنبیہ کی ہے اور دوسری طرف مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ دعا پوری ہو کر رہے گی۔

النصف

رکوعاتها ۱۰	سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ	آیاتها ۷۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بےحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ○ (۲) اے لوگو! تم اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ کیونکہ فیصلہ والا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ○ (۳) جس دن تم اس کو دیکھو گے۔ ہر دودھ پلانے والی عورت جس کو دودھ پلا رہی ہوگی۔ اس کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ عورت اپنے حمل کو گرا دے گی۔ اور تو لوگوں کو دیکھیگا کہ وہ بدمستوں کی طرح ہیں حالانکہ وہ بدمست نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ بعض کے نزدیک کچھ مکی ہے کچھ مدنی۔ بعض کے نزدیک ساری مدنی ہے سورۃ انبیاء کی آخری آیت وربنا الرحمٰن المستعان علیٰ ما تصفون میں منکرین کے لیے عذاب کی دعا تھی۔ اس سورۃ کی پہلی آیت میں اس کا جواب ہے کہ یا تقویٰ اختیار کرو یا سخت عذاب آئے گا۔ سورۃ مریم میں مسیحؑ کو دوسرے انبیاء جیسا ثابت کر کے مسیحیت کے اصولوں کا ردّ کیا گیا تھا اور سورۃ طٰہٰ میں اس کا رد تھا کہ شریعت لعنت ہے نیز سورۃ انبیاء میں بتایا تھا کہ اگر ورثہ میں گناہ آنا لازمی ہے تو اتنے نبی کیوں آئے؟ اب اس سورۃ میں بتایا ہے کہ اگر مسیح روحانیت کا آخری نقطہ تھا تو اس کے بعد نبی نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود اس دعویٰ کو باطل کرتا ہے اور آپ کی صداقت کے یہ دلائل موجود ہیں کہ (۱) سابق انبیاء کی طرح آپ کے دشمن ہلاک ہوں گے۔ (۲) آپ کی تعلیم ضروری اور پُرحکمت ہے (۳) آپؐ کے ماننے والے روحانی اور مادی طور پر ترقی کریں گے۔ (۴) آپ کو آسمان سے غیر معمولی برکات ملیں گی (۵) تمام مذاہب کے پیرو آپ سے شکست کھائیں گے۔

۲-۳ ضروری نہیں کہ اس آیت کو آخرت پر چسپاں کیا جائے۔ شدید زلزلہ میں اور جنگوں میں لوگ اسی طرح حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں لفظ ساعۃ مومنوں کی ترقی اور ان کے دشمنوں کی تباہی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً بقرہ ۲/۲۱۴ میں بتایا ہے کہ **اصل چیز انجام ہے**۔ اور انجام مسلمانوں کا اچھا ہوگا اگر یہاں یہ مراد لیں کہ مسلمان مرنے کے بعد غالب آجائیں گے تو یہ کفار کے لیے ثبوت نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے زبانی دعویٰ قرار دیں گے۔ اس لیے یہاں یوم القیمۃ سے فتح مکہ وغیرہ مراد ہیں۔ اس سورۃ کا نام بھی سورۃ الحج ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ ایک عظیم الشان جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لیے حج ممکن ہو جائے گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ

(۴) اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو اللہ (تعالیٰ) کے بارہ میں بغیر علم کے بحث کرتے ہیں (اور) ہر حق سے دور اور سرکش کی اتباع کرتے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

(۵) (حالانکہ) ان (سرکشوں اور حق سے دور لوگوں) کے متعلق فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ جو (شخص) بھی ایسے آدمیوں میں سے کسی کے ساتھ دوستی کریگا وہ (سرکش اور حق سے دور شخص) اسکو بھی گمراہ کردیگا اور دوزخ کے عذاب کیطرف [illegible]

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۤءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ

(۶) اے لوگو! اگر تم دوبارہ اٹھائے جانے کے متعلق شبہ میں ہو تو (یاد رکھو) ہم نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا تھا پھر نطفہ سے پھر ترقی دیکر ایک ایسی حالت سے جو کہ چمٹ جانیکی خاصیت رکھتی تھی۔ پھر ایسی حالت سے کہ وہ ایک بوٹی کے مشابہ تھی کچھ عرصہ تک تو وہ ایک کامل بوٹی کی شکل رہی اور کچھ عرصہ تک ناقص بوٹی کی شکل رہی تاکہ ہم تم پر (حقیقت حال) ظاہر کردیں اور ہم جس چیز کو چاہتے ہیں رحموں میں ایک مدت تک قائم کردیتے ہیں۔ پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں نکالتے ہیں۔

۴-۵ ان آیات سے ظاہر ہے کہ بار بار شیطان کی بات ماننے سے انسان کا اس سے دوستانہ ہو جاتا ہے جو بالآخر اسے جہنم میں پہنچا دیتا ہے۔ اور ایسا انسان بجائے خدا کے شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ ..... (مائدہ ۵/۶۱) لیکن شیطان بڑا باغی ہے (۴/۳۹)۔ شیطان کے معنے حق سے دور یا بدی میں ترقی کرنے والے کے ہیں ابلیس سے مراد ایسا وجود ہے جو مایوس ہو جائے۔ شیطان اور ابلیس ایک ایسے وجود کا نام بھی ہے جسے خدا نے انسانوں کے امتحان کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔ اور اس کو اس کا کام پورا ہونے تک موت نہیں۔ حضرت آدمؑ کا مخالف یہ شیطان اور اس کے اظلال تھے۔ اس کے اظلال تو مرتے رہتے ہیں مگر شیطان جو محرک بدی ہے نسل انسانی کے قیام تک زندہ رہے گا۔ چونکہ اس کا کام ہی یہ مقرر ہے اس لیے اسے ثواب و عذاب ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سزا تو خلاف قانون طبعی کاموں کی ملتی ہے انسان عبودیت کو ترک کرکے سزا اسی لیے پاتا ہے کہ وہ پیدا عبادت کے لیے کیا گیا ہے (ذاریات ۵۱/۵۷)۔ شیطان آگ میں جائے گا مگر بوجہ ناری ہونے کے آگ سے دکھ نہیں پائیگا اور نہ بطور سزا جائے گا جیسے ملائکہ جنت میں بطور انعام نہیں جائیں گے۔ لیکن اظلال شیطان حسب مراتب سزا پائیں گے۔ بایں ہمہ چونکہ شیطان بیماری اور گناہ کا نمائندہ ہے اسے لازماً برا کہیں گے جیسے گندگی کو باہر اس لیے پھینکا جاتا ہے کہ وہ مضر صحت ہوتی ہے نہ کہ بطور سزا۔

طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝

(پھر بڑھاتے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تم اپنی مضبوطی (کی عمر) کو پہنچ جاتے ہو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنی طبعی عمر کو پہنچ کے) فوت ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تم میں سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی انتہائی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تا کہ بہت کچھ علم حاصل کرنے کے بعد بالکل علم سے کورے ہو جائیں اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ وہ (کبھی کبھی) اپنی سب طاقت کھو بیٹھتی ہے۔ پھر جب ہم اس کے اوپر پانی نازل کرتے ہیں تو وہ جوش میں آجاتی ہے اور بڑھنے لگتی ہے اور ہر قسم کی خوبصورت کھیتیاں اُگانے لگتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(۷) یہ اس لیے ہوتا ہے (کہ ظاہر کیا جائے کہ) اللہ (تعالیٰ) ہی قائم رہنے والی اور قائم رکھنے والی ہستی ہے۔ اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

(۸) اور ہر چیز کے لیے جو وقت مقرر ہے۔ وہ ضرور آکر رہے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً ان کو جو قبروں میں ہیں دوبارہ اُٹھائے گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ

(۹) اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کے متعلق بغیر علم بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اس حالت میں بحث کرتے ہیں کہ

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

(۱۰) اپنے پہلو موڑے ہوئے (ہوتے) ہیں (یعنی اظہار تکبر کرتے ہیں) تا کہ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کریں ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن بھی ہم ان کو جلانے والا عذاب (پہنچائیں) گے۔

ف ۶-۸ فرمایا جسم کی طرح روح کی پیدائش بھی تدریجاً ہوئی ہے اس لیے تم بعث یعنی مسلمانوں کی ترقی کے متعلق اس وجہ سے کہ وہ دعویٰ کے ساتھ ہی ان کو مل نہیں گئی شبہ نہ کرو۔ وہ آہستہ آہستہ ترقی کریں گے اور جیسے جسم کچھ عرصہ کے بعد بیکار ہو جاتا ہے تم بھی کچھ عرصہ کے بعد تباہ ہو جاؤ گے۔ گو اپنا وقت لیتی ہیں لیکن خدا کی باتیں پوری ضرور ہوتی ہیں۔ آسمانی پانی سے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور جن کے لیے زندگی مقدر ہے وہ خواہ قبروں میں پڑے ہوں ضرور زندہ ہو جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

(۱۱) تمہارے ہاتھوں نے جو کچھ پہلے کیا تھا اسکے نتیجہ میں یہ بات ظاہر ہوگی اور (اس سے معلوم ہوگا) کہ اللہ (تعالیٰ) اپنے بندوں پر ہرگز کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔

ع ۸

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ج فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ١طْمَاَنَّ بِهٖ ج وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ١نْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ج خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۝ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝

(۱۲) اور لوگوں میں سے (بعض) ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کی عبادت صرف بددلی سے کرتے ہیں۔ پس اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچ جائے۔ تو وہ اس (عبادت) پر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہونچ جائے تو اپنے منہ کی سیدھ لوٹ جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں بھی گھاٹے میں پڑ جاتے ہیں اور آخرت میں بھی اور یہی کھلا کھلا گھاٹا ہے۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۝ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝

(۱۳) وہ اللہ کے سوا اس چیز کو بلاتے ہیں۔ جو نہ ان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اور نہ نفع دیتی ہے۔ اور یہی انتہائی درجہ کی گمراہی ہے۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۝ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝

(۱۴) وہ اس (شخص) کو بلاتے ہیں جس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ ایسا آقا بھی بہت برا ہے اور ایسے ساتھی بھی بہت برے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

(۱۵) اللہ (تعالیٰ) یقیناً مومنوں کو جو مناسب حال عمل بھی کرتے ہیں۔ ایسے باغات میں داخل کرے گا۔ جن (کے سایہ) میں نہریں بہتی ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جو چاہے کرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝

(۱۶) جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ (تعالیٰ) اس کی (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد کبھی نہیں کرے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں تو اسے چاہیئے۔ کہ وہ ایک رسّی آسمان پر لے جائے (اور اس پر چڑھ جائے) پھر اسے کاٹ ڈالے پھر وہ دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس بات کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصہ دلا رہی ہے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہونے والی کامیابی اور فتوحات)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝

(۱۷) اور ہم نے اسی طرح اس (یعنی قرآن) کو کھلے کھلے نشانات بنا کر نازل کیا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً جس کے متعلق ارادہ کرتا ہے اسے صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔

ف ۱۰-۱۷ فرمایا خدا کی طرف سے آنیوالا عذاب بلاوجہ نہیں ہوتا۔ انسان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ہوتا ہے بے دلی سے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

(۱۸) یقیناً جو لوگ (محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی بن گئے۔ اور صابی اور نصرانی اور مجوسی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے شرک کیا۔ اللہ تعالےٰ، یقیناً ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کردے گا۔ اللہ تعالےٰ، یقیناً ہر ایک چیز کا نگران ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ السجدة

(۱۹) (اے اسلام کے مخالف!) کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو کوئی بھی آسمان میں ہے وہ اللہ (تعالےٰ) کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اور اسی طرح جو کوئی زمین میں ہے۔ اور سورج بھی اور چاند بھی اور ستارے بھی اور پہاڑ بھی اور درخت بھی اور چارپائے بھی اور لوگوں میں سے بھی بہت سے۔ لیکن لوگوں میں سے ایک گروہ کثیر ایسا ہے جس کے متعلق عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور جس کو خدا ذلیل کرے۔ اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ تعالےٰ، جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

کی ہوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی خوشی اور رنج دونوں میں وفاداری ہو پھر فائدہ ہوتا ہے ورنہ جیسے وہ کشتیوں کا سوار ڈوبتا ہے خدا تعالیٰ بھی ان سے تعلق نہیں رکھتا جو منہ سے تو اس کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور عملاً ہر وقت دنیا پر منہ مارتے ہیں بغداد کی تباہی کے وقت ایک بزرگ جب بھی مسلمانوں کے لیے دعا کرتے تھے تو انہیں الہام ہوتا تھا اَيُّهَا الْكُفَّار اقتلوا الفجّار یہ اسلیے تھا کہ مسلمان کہلانیوالوں نے اسلام کو صرف نام کے طور پر قبول کیا تھا عمل سے خالی تھے۔ منافقوں کے متعلق فرماتا ہے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (بقرہ ۲/۲۱) ایسا ایمان بے سود ہوتا ہے اور پھر یہ تو اور بھی حماقت ہے کہ خدا کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کرنے لگیں۔

۱۸؎ فرمایا۔ گو مختلف مذاہب کے پیرو مدعی ایمان بالتوحید ہیں لیکن توحید پرستوں کے مختلف مدارج ہیں۔ ہر درجہ کے حق و باطل پر ہونے کا فیصلہ آخری دن ہوگا۔ سچے غالب آجائیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کا غلبہ اور مشرکین کی تباہی صداقت اسلام کا ثبوت ہے۔ پھر اس میں معیار صداقت کا ذکر ہے جو مذہب بھی اس پر پورا اُترے گا سچا ہوگا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ تو ہیں سچا ہیں۔

۱۹؎ یہاں بتایا ہے کہ گو بعض باتوں میں انسان آزاد ہے۔ مثلاً چاہے تو زبان سے خدا کو بھی گالی دے لے لیکن قانونِ قدرت کے ہر انسان تابع ہے۔ مثلاً یہی زبان کڑوے کو کڑوا اور میٹھے کو میٹھا محسوس کرنے پر

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ز فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ط يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝	(۲۰) یہ دو باہم مخالفت کرنے والے گروہ ایسے ہیں جو اپنے رب کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں۔ پس جو اللہ (تعالیٰ) کی مذکورہ بالا صفات کے کافر ہوئے ان کے لئے آگ کے کپڑے بنائے جائیں گے۔ اور ان کے سروں پر گرم گرم پانی ڈالا جائے گا۔
يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝	(۲۱) (حتیٰ کہ) اس گرم پانی کی وجہ سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے وہ بھی گل جائیگا۔ اور ان کے چمڑے بھی (گل جائیں گے)
وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝	(۲۲) اور ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے (تیار کئے جائیں گے)
كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ق وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝	(۲۳) جب وہ غم اور فکر کی وجہ سے اس عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو پھر اسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔ (اور کہا جائیگا) جلانے والا عذاب بھگتتے چلے جاؤ۔
اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ط وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝	(۲۴) اللہ (تعالیٰ) یقیناً مومنوں کو جو مناسب حال عمل بھی کرتے ہیں۔ ایسے باغات میں رکھے گا۔ جن (کے سایہ) میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان کو اس میں سونے اور موتیوں کے جڑاؤ والے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا لباس اس میں ریشم کا ہوگا۔

ع ۲

مجبور ہے۔ اسی طرح باقی تمام کائنات قانونِ قدرت کے تابع ہے۔ پھر یہ چیزیں خدا کیسے ہو سکتی ہیں۔ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ سے یہ مراد نہیں کہ بعض انسان قانون قدرت سے آزاد ہیں بلکہ یہ ہے کہ بعض اسے توڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۲۰ تا ۲۳ قانونِ قدرت کے تابع اور اس سے آزادی چاہنے والے دو گروہ رب کے بارہ میں جھگڑتے ہیں لیکن نتیجہ ثابت کر دیتا ہے کہ حق پر کون ہے چنانچہ مؤخرالذکر ہمیشہ روحانی طور پر آگ میں پڑتے رہتے ہیں اور ان کے سروں پر گرم پانی پڑتا ہے یعنی ان کے دماغوں میں وحشیانہ خیال پیدا ہوتے ہیں جو انہیں سیاہ باطن بنا کر ان کا باطنی امن بھی برباد کر دیتے ہیں اور انہیں خارجی سزا کا بھی مستحق بنا دیتے ہیں۔

۲۴ کنگن سے مراد سامانِ زینت ہے اور سونے کو چونکہ زنگ نہیں لگتا اس میں اشارہ ہے کہ وہ تباہ نہیں ہوگا۔ اور موتی سے یہ مراد ہے کہ وہ سامان انسان کی طبیعت میں ایک چمک اور ملائمت پیدا کریگا۔ تقویٰ کو بھی لباس کہا گیا ہے (اعراف ۲۷) اس لیے لباسهم فیها حریر میں یہ اشارہ ہے کہ

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ (۲۵) اور ان کی پاک باتوں کی طرف راہنمائی کی جائیگی اور قابل تعریف طریق کار کی ہدایت کی جائے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (۲۶) (لیکن) وہ لوگ جو کافر ہیں اور اللہ کے راستہ سے اور بیت اللہ کی طرف جانے سے جس کو ہم نے تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے بنایا ہے۔ روکتے ہیں (حالانکہ وہ بیت اللہ ایسا ہے جسکو ہم نے تمام انسانوں کے لئے بنایا ہے) ان کے لیے بھی جو اس میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو جنگلوں میں رہتے ہیں اور جو کوئی شخص اس (دنیا) میں ظلم کی راہ سے کوئی بھی پیدا کرنا چاہیگا اسکو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (۲۷) اور (یاد کر) جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کی جگہ پر رہائش کا موقعہ دیا (اور کہا) کہ کسی چیز کو ہمارا شریک نہ بناؤ اور میرے گھر کو طواف کرنیوالوں کیلئے اور کھڑے ہو کر عبادت کرنیوالوں کیلئے اور رکوع کرنیوالوں کیلئے اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر۔

ع ۳

اگلے جہان میں تقوی کا لباس اختیار کرنے میں تکلیف نہیں اٹھانی پڑیگی۔ بلکہ طبیعت خود اس کی طرف رغبت کریگی۔

۲۵ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت مقام عمل ہے جبھی وہاں مومنوں کی تعریف ہوگی۔ اور وہاں روحانی تنزل سے انسان محفوظ رہے گا کیونکہ وہ صرف قابل تعریف فعل کرے گا۔

۲۶ سواء العاکف فیہ والباد میں بتایا کہ یہ مسجد (اور اس کے تابع مسجدیں) بلا امتیاز تمام بنی نوع کے لیے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کو بیت اللہ میں عبادت کی اجازت دی تھی۔ یہ مساوات کا سبق ہے۔ اسلام میں امامت نماز کے لیے بھی کسی خاندان یا قوم کی خصوصیت نہیں اور مقتدی بھی بلا لحاظ امیر و غریب پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے ہیں

۲۷ یہاں حکم ہے کہ بیت اللہ کو ان لوگوں کے لیے پاک کرو جو یہاں طواف اور قیام کے لیے آئیں گے حضرت اسمٰعیل کے زمانہ میں طواف کے لیے تو کچھ لوگ آتے تھے مگر قیام کے لیے آنے والے کتنے تھے؟ نبی کریم صلعم سے قبل وہاں بت پرستی ہی بت پرستی تھی۔ خدا کے لیے اعتکاف۔ قیام، رکوع وسجود کرنے والے کوئی نہیں تھے یہ باتیں آنحضرتؐ ہی کے زمانہ میں ہونے والی تھیں اور ابراہیمی قربانی (جس کے نتیجہ میں وہ اسمٰعیلؑ کو بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ گئے تھے) کا بھی یہی مقصد تھا کہ اسمٰعیلؑ کی نسل سے وہ وجود پیدا ہو جس کے ذریعہ دین کے آخری دور کا قیام مقدر تھا۔ اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھ سے یہ کام ہوئے کہ انہوں نے ظاہری خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ انہی کے ذریعہ خدا تعالےٰ نے زمزم نکلوایا اور گو ان کی نسل میں سے بہت سے مشرک بھی

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

(۲۸) اور تمام لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی نیت سے تیرے پاس آیا کریں پیدل بھی اور ہر ایسی سواری پر بھی جو لمبے سفر کی وجہ سے دبلی ہو گئی ہو (ایسی سواریاں) دور دور سے گہرے راستوں پر سے ہوتی ہوئی آئیں گی۔ (۲۹) تاکہ وہ (یعنی آنیوالے) ان منافع کو دیکھیں جو ان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اور کچھ مقرر دنوں میں اللہ (تعالیٰ) کو ان نعمتوں کی وجہ سے یاد کریں جو ہم نے ان کو دی ہیں (یعنی) بڑے جانوروں کی قسم سے (جیسے گائے۔ اونٹ وغیرہ) پس چاہیے کہ وہ ان کے گوشت کھائیں اور تکلیف میں پڑے ہوئے اور نادار کو کھلائیں۔ (۳۰) پھر اپنی میل دور کریں۔ اور اپنی نذریں پوری کریں۔ اور پرانے گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔

ہو گئے۔ مگر پوشیدہ کمالات بھی ان میں تھے۔ چنانچہ وہ کمالات نبی کریم صلعم کے فیض سے اُجاگر ہو گئے۔ وہ بن تراشے ہیرے تھے جو آپ کی قوتِ قدسیہ سے تراشے جانے کے بعد دنیا کی بہترین متاع ثابت ہوئے۔ جیسے ابوجہل عکرمہ کی اور ولید خالد کی صورت میں۔

ان آیات سے مساجد کی یہ اغراض ثابت ہیں، کہ مسافر، مقیم اور رکوع وسجود کرنے والے ان سے فائدہ اٹھائیں۔ مساجد صرف اللہ اللہ کرنے کے لیے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ دوسرے قومی کام بھی ان میں ہو سکتے ہیں کیونکہ اسلام میں ایسے تمام کام عبادت شمار ہوتے ہیں لیکن فساد کی باتیں خواہ ان کا کچھ نام رکھا جائے مسجد میں ناجائز ہیں۔

۲۸-۳۰ طواف کعبہ کے حکم سے بے جان چیز کو خدا کا مرتبہ نہیں دیا گیا بلکہ طواف ایک رسم قدیم تھی جو قربانی دینے کی علامت تھی۔ یہاں یہی اشارہ ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو عظمت کعبہ اور عبادت الٰہی کے قیام کے لیے قربانیاں کریں۔

اسلامی توحید نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسا متحد کر دیا ہے کہ مختلف قوموں زبانوں اور ملکوں کے لوگ باوجود اختلاف رنگ ونسل وعقائد خدا کی آواز پر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور عملاً یہ اظہار کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے لیے وہ ہر قربانی کرنے کو تیار رہیں۔

یہ دیکھو ابتداءً کیسی کمزوری اور بے مائیگی کی حالت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیغام الٰہی سنایا اور وہ پھر تائید الٰہی سے ایسا مؤثر ثابت ہوا کہ اب تک اس کی تائید کے لیے لاکھوں لاکھ انسان

دنیا کے گوشوں سے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ایمانوں میں ایک تازگی پیدا ہوتی ہے۔ حج ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی رگوں میں اب بھی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ بے شک حج کی اصل غرض روحانی طور پر یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے تعلقات توڑ کر دل سے خدا تعالےٰ کا ہو جائے۔ مگر اسلام جسم و روح دونوں کی اہمیت مانتا ہے چونکہ روح بغیر جسم کے نہیں رہ سکتی اسلام نے گھر بار عزیزوں اور اقرباء کی جسمانی قربانی بھی حج کے ساتھ رکھ دی ہے۔

کوئی خواب میں دیکھے کہ اس نے حج کیا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو پالے گا۔ چونکہ پیدائش انسانی کا مقصد حصول قرب الٰہی ہے (ذاریات ۵۱/۵۷) اس لیے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کا مقرب بن جائے گا۔ گویا حج رویت الٰہی ہے مگر اس کے لیے ظاہری جسم بھی رکھ دیا گیا ہے۔

جب ابراہیمؑ نے حکم الٰہی سے بے آب و گیاہ وادی میں اپنی جوان بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا اور حضرت ہاجرہ نے بھی یہ معلوم ہونے پر کہ اذن الٰہی ہے کہا کہ "ایسا ہے تو خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا"۔ تو خدا تعالیٰ نے اس وفا کا بدلہ اس طرح دیا کہ جب اسمٰعیلؑ پیاس سے بیتاب ہوئے اور حضرت ہاجرہ اس خیال سے کہ کوئی قافلہ نظر آوے تو پانی لیں کبھی صفا اور کبھی مروہ پر چڑھنے لگیں۔ تو خدا تعالےٰ نے اسمٰعیل کے پاؤں تلے سے چشمۂ زمزم نکال دیا۔ اور ایسا کیا کہ آج تک حاجی اس واقعہ کی یاد میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں۔ اور بزبانِ حال یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم بھی خدا کے لیے عزیزوں کو چھوڑنے کو تیار ہیں۔ حج اس واقعہ کو یاد دلا کر توجہ دلاتا ہے کہ کس طرح خدا تعالےٰ کے لیے قربانی کرنے والے ہمیشہ کے لیے زندہ رکھے جاتے ہیں۔

حج سے مرکزیت کی روح بھی پیدا ہوتی ہے۔ باہمی محبت و اخوت ترقی کرتی ہے اور مسلمانوں کو باہمی ضروریات پر غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے صحت مند اور مال و دولت رکھنے والوں کے لیے حج (عمر میں ایک دفعہ) ضروری ہے مگر حج بھی خوف، اخلاص اور محبت الٰہی کے ماتحت ہو تب فائدہ دیتا ہے ورنہ انسان پہلا ایمان بھی کھو بیٹھتا ہے۔

البیت العتیق کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے موجود تھا۔ انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ اس کی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کی تھی۔ سورۃ ابراہیم ۱۴/۳۸ اور آل عمران ۳/۹۷ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے روحانی فائدہ کے لیے بیت اللہ پہلا گھر ہے۔

وضع للناس میں اشارہ تھا کہ ساری دنیا کو جمع کرنے کا یہ گھر ایک ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ ایسا کر دیا گیا۔ یسعیاہ ۴۵/۱۳-۱۴ میں پیشگوئی تھی۔ کہ "وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور معاوضہ لیے آزاد کر دے گا ۔۔۔ مصر کی دولت اور کوش کی تجارت اور سبا کے قد آور درخت تیرے پاس آئیں گے"۔ دنیا میں صرف بلد الحرام خدا کا شہر کہلاتا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا، اور روحانی قیدیوں

ذٰلِكَ ۝ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

(۳۱) بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ عزت والی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ اس کے رب کے نزدیک اس کے لیے اچھا ہوتا ہے اور اے مومنو! تمہارے لیے (سب) چوپائے حلال کئے گئے ہیں سوائے ان کے جن کی حرمت قرآن میں بیان ہو چکی ہے پس چاہیئے کہ تم بت پرستی کے شرک سے بچو اور (اسی طرح) اپنی عبادت اور فرمانبرداری صرف اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہوئے جھوٹ بولنے سے بچو۔ (۳۲) اور تم خدا کا شریک کسی کو نہ بناؤ۔ اور جو اللہ کا شریک کسی کو بناتا ہے وہ آسمان سے گر جاتا ہے

سے بھی فرمایا لا اسئلکم علیہ اجرًا (انعام آیت ۹۱) اور حضورؐ ہی کے پاس مصر کی دولت کوش کا منافع اور سبا کے قد آور لوگ آئے۔

کوش یعنی ایلام اور میڈیا کے درمیانی علاقہ کے لوگوں نے مسیحیت قبول نہیں کی۔ اور سبا کے لوگ عیسائی مقامات پر سجدہ کے لیے نہیں آئے۔ اب آئیں بھی تو تثلیث کے قائل ہو کر آئیں گے۔ مگر پیشگوئی کے مصداق صرف موحد ہو سکتے ہیں اس لیے یہ خبر مسیحؑ کے متعلق نہیں ہو سکتی محمد رسول اللہ صلعم کے متعلق ہی ہے۔

دیباچہ لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور میں لکھا ہے کہ قدیم تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا کہ کعبہ کب بنا ہے یعنی اس کے وجود کا تو ذکر آتا ہے مگر بناء کا پتہ نہیں چلتا یہ بالکل البیت العتیق کا مفہوم ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عمالقہ نے موسیٰؑ کے زمانہ میں اسے دوبارہ بنایا تھا۔ حضرت محی الدین ابن عربی کے ایک کشف سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیت اللہ بہت قدیم زمانہ سے دنیا کا مرکز رہا ہے اور نیز یہ کہ دنیا لاکھوں سال سے ہے۔

۳۱ فرمایا۔ خدا کے حضور عزت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ محرمات الٰہیہ کی عزت کی جائے ۔ کعبہ کا مقصد چونکہ لوگوں کو توحید پر جمع کرنا ہے اس لیے مشرکانہ طور پر وہاں جانور قربان کرنے منع کیے گئے ہیں۔ دراصل مادی چیزوں کی قدر سمجھنے والا کبھی ایک سے ڈرے گا کبھی دوسری سے اور اس کا امن جاتا رہے گا۔ مگر انسانیت کے بالغ ہوتے ہی خدا تعالیٰ نے یہ بتا کر کہ میں تیرا خدا ہوں اور یہ سب چیزیں تیری خدمت پر لگائی گئی ہیں انسان کو اس ذہنی کشمکش سے آزاد کر دیا۔

فاجتنبوا الرجس من الاوثان۔ فرمایا ذہنی کشمکش سے بچنا چاہتے ہو تو کامل موحد بن جاؤ شرک کو اس لیے جھوٹ قرار دیا۔ کہ مشرک غیر اللہ کی طرف وہ صفات منسوب کرتے ہیں جو صرف خدا کا حصہ ہیں جھوٹ بولنے والا لوگوں کو دھوکا دیتا ہے اور وہ صرف اخلاقی مجرم نہیں بلکہ لوگوں کو تباہ کرنے والا بھی بنتا ہے۔

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝

اور پرندے اس کو اُچک کر لے جاتے ہیں۔ اور ہَوا اس کو کسی دوسری جگہ پر پھینک دیتی ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝

(۳۳) حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ (تعالیٰ) کی مقرر کردہ نشانیوں کی عزت کریگا اس (کے اس فعل) کو دلوں کا تقوٰی قرار دیا جائیگا

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ع

(۳۴) (یاد رکھو کہ) ان قربانیوں سے ایک مدت تک تم کو نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ پھر خدا کے پُرانے گھر تک ان کو پہنچانا ضروری ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝

(۳۵) اور ہر ایک قوم کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریق مقرر کیا ہے تاکہ وہ ان چارپایوں پر جو اللہ (تعالیٰ) نے ان کو بخشے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) کا نام لیں۔ (پس یاد رکھو کہ) تمہارا خدا ایک خدا ہے پس تم اسی کی فرمانبرداری کرو۔ اور جو (خدا کے سامنے) عاجزی کرنے والے ہیں۔ ان کو خوشخبری دیدے۔

---

۳۲ شرک کی قسمیں کئی ہیں (۱) یہ سمجھنا کہ ایک سے زیادہ ہستیاں یکساں طاقت رکھنے والی ہیں جو سب کی سب دنیا کی حاکم ہیں (۲) یہ خیال کرنا کہ دنیا کی مدبر ہستیاں کئی ہیں جن میں کمالات تقسیم ہیں۔ (۳) انتہائی عاجزی کے اعمال مثلاً سجدہ وغیرہ کو ماسوا اللہ کے لیے اختیار کرنا۔ (۴) یہ خیال کہ بغیر تصرف و منشاء الٰہی صرف مادی اسباب ہی ضرورت پوری کرنے والے ہیں (۵) خدا کی مخصوص صفات میں کسی غیر کو شریک کرنا (۶) یہ خیال کرنا کہ خدا تعالیٰ کے کسی کام کے لیے پیدا کردہ اسباب کے بغیر بھی کوئی ہستی وہ کام کر سکتی ہے۔ (۷) یہ سمجھنا کہ کسی بندہ کی خدا ہو بات مانتا ہے۔ (۸) کسی ایسی چیز کے متعلق جسے خدا تعالےٰ کے قانونِ قدرت نے کسی کام کرنے کی کوئی طاقت نہیں دی یہ خیال کر لینا کہ وہ فلاں کام کرلے گی۔ مثلاً السمیع خدا تعالےٰ ہے۔ اگر کوئی اس کی بجائے مُردوں سے مرادیں مانگنے لگ جائے تو یہ شرک ہے۔ (۹) ایسے اعمال کرنا جو مشرکانہ رسوم کا بقیہ ہیں۔ مثلاً بلا ضرورت قبروں پر دیئے جلانا۔ (۱۰) خواہ عمل نہ ہو مگر محبت، ادب خوف، اور امید کے جذبات غیر اللہ کے متعلق اللہ تعالیٰ سے زیادہ یا اس کے برابر رکھنا۔

۳۳-۳۴ یعنی عظمت شعائر سے خدا کو نہیں خود انسان کو فائدہ پہنچتا ہے اور تقوٰی میں ترقی ہوتی ہے نیز یہ کہ متقی بننے کے لئے شعائر اللہ کی توقیر ضروری ہے۔

۳۵ اس آیت سے ایک تو یہ پتہ لگتا ہے کہ سب مذاہب میں قربانی کا وجود پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

(۳۶) ایسے لوگوں کو کہ جب اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جائے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی (خوشخبری) دیدے جو اپنے پر نازل ہونے والی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے (ہماری خوشنودی کیلئے) اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں)

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ

(۳۷) اور ہم نے قربانی کے اونٹوں کو بھی قابلِ عزت بنایا ہے۔ ان میں تمہارے لیے بہت بھلائی ہے پس انہیں صفوں میں کھڑا کرکے ان پر خدا کا نام لو۔ اور جب ان کے پہلو زمین پر لگ جائیں۔ تو تم ان (کے گوشت) میں سے خود بھی کھاؤ

خدا تعالٰے نے اپنی رضا کے لیے ہمیشہ جانوروں کی قربانی کا حکم دیا ہے پس انسانی قربانی درحقیقت مذاہب کے بگاڑ کا نتیجہ تھا۔ یہ خرابی بنی اسرائیل میں بھی واقع ہو گئی تھی (دیکھیں سلاطین ۲ باب ۱۶ آیت ۳-۲ اور ۱۷/۱۷، ۱۲/۶ زبور ۱۰۶/۳۷-۳۸)۔ موسیٰ کے زمانہ میں بھی اس کا رواج تھا جس سے شریعت موسویہ نے منع کیا ہے۔ استثناء ۱۸/۹-۱۱ احبار ۱۸/۲۱ اور ۲۰/۱-۶ باوجود اس کے کہ بائیبل انسانی قربانی کو بُرا کہتی ہے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کرنے کا حکم ملا تھا۔ گو جب وہ تعمیل کرنے لگے تو خدا تعالےٰ نے روک دیا (پیدائش ۲۲/۱-۳ اور ۹ تا ۱۳) لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بیٹے کو قربان کرنا الٰہی منشاء نہیں تھا تو حکم کیوں دیا گیا؟ قرآن کی رو سے ابراہیمؑ نے یہ رؤیا میں دیکھا تھا کہ وہ بیٹے کو قربان کر رہے ہیں۔ رؤیا تعبیر طلب ہوتی ہے۔ چنانچہ اس رؤیا کی تعبیر یہ تھی کہ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو ایک ایسی جگہ چھوڑ کر آئینگے جہاں بظاہر موت یقینی ہو گی اور ایسا کرنا قتل کرنے سے کم نہیں تھا۔ اس رؤیا کے ذریعہ یہ سبق دیا گیا تھا کہ اصل قربانی وہ ہے جس سے دنیا کو فائدہ پہنچے۔

مَنْسَکٌ سے مراد نفسِ قربانی اور جائے قربانی ہے اور نسک لِلّٰہِ کے معنے ہوتے ہیں تطوّع بقربۃٍ وذبح لوجھہ گویا نسیکہ کے لیے ضروری ہے کہ بلا جبر طبعی رغبت کے ماتحت ہو اور خالصۃً لِلّٰہ ہو۔ نسک الثوب کے معنے ہیں اس نے کپڑے کو دھو کر میل نکال دی۔ اس لئے مقبول قربانی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ دنیا کی ملونی نہ ہو۔

۳۶ مما رزقنھم ینفقون میں یہ حکم ہے کہ جس قدر طاقتیں اور انعام مثلاً علم، دولت، قوت، مختلف اعضاءِ جسم وغیرہ خدا کی طرف سے ملے ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک حصہ خرچ کرے۔

۳۷ بعض کا خیال ہے کہ قربانیوں پر جو روپیہ ضائع ہوتا ہے اسے قومی کاموں پر خرچ کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے

جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝

اور ان کو بھی کھلاؤ جو اپنی غربت سے پریشان ہیں۔ اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے فائدہ کے لئے بنایا ہے تاکہ تم شکر گزار بنو۔

(۳۸) (یاد رکھو) کہ ان قربانیوں کے گوشت اور خون ہرگز اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتے لیکن تمہارے دل کا تقویٰ اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ (درحقیقت) اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان قربانیوں کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کیوجہ سے اسکی بڑائی بیان کرو اور تو اسلام کے احکام کو پوری طرح ادا کرنیوالوں کو بشارت دے۔

(۳۹) اللہ تعالیٰ یقیناً ان لوگوں کی طرف سے جو کہ ایمان لائے ہیں دفاع کرتا رہیگا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر خیانت کرنے والے (اور) انکار کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ع ۵ / ۱۲ الثلثة

کہ بعض دفعہ قوموں کو بظاہر بے فائدہ نظر آنے والی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً ابتداءِ اسلام میں صحابہ جو قربانیاں پیش کر رہے تھے وہ بظاہر کتنی بے فائدہ نظر آتی تھیں۔ مگر انہیں کے نتیجہ میں ایک دن اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ حج کی قربانی ایسی قربانیوں کا سبق دینے کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت خانہ کعبہ پہنچے بغیر حضرت نبی کریم صلعم نے قربانی کا حکم دے کر بتا دیا کہ کوئی قربانی بظاہر کتنی بے مصرف نظر آئے مسلمان کا کام یہ ہے کہ جرنیل کی اطاعت میں وہ قربانی پیش کر دے۔

۳۸ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی روح نتیجہ خیز ہوتی ہے نہ کہ ظاہر۔ یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ قربانی کرنے والوں کو کتنی کتنی ضرورتیں تھیں اور ان کے ہوتے ہوئے انہوں نے کتنی کتنی قربانی کی یا ان کی قربانی کا محرک کیا چیز ہوئی۔ ہر مغز کے لئے ایک قشر ہوتا ہے۔ مثلاً نماز کے لیے قیام و قعود بطور قشر ہیں۔ اس لیے گو مغز تو وہ اخلاص ہے جو قربانی کا محرک ہوتا ہے مگر اس کے لیے ظاہری قربانی بھی رکھ دی گئی ہے۔

قربانی کا اثر طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ اور یہی اثر پیدا کرنا مقصود قربانی ہے اس کے ذریعہ انسان اقرار کرتا ہے کہ جیسے مجھ سے ادنیٰ میرے لیے قربان ہوا۔ اسی طرح میں بھی اپنے سے اعلیٰ چیزوں کے لیے ہر قربانی دے دُونگا۔ یہ تو پہلا قدم ہے۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ وہ فی الواقعہ ایسی قربانی پیش بھی کر دیے۔ قربانی کا یہ بھی فائدہ ہے کہ غرباء کو گوشت مہیا ہو جاتا ہے۔

۳۹ یعنی خدا مومنوں کی مدد کرے گا مگر خائن اور کفور جو اس کی دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ نہیں کرتے۔ اس کی مدد کے مستحق نہیں ہوں گے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ

(۳۹) وہ لوگ جن سے (بلا وجہ) جنگ کی جارہی ہے ان کو بھی (جنگ کرنے کی) اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ (تعالیٰ) ان کی مدد پر قادر ہے۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ

(۴۰) (یہ وہ لوگ ہیں) جن کو اُن کے گھروں سے صرف اِن کے اتنا کہنے پر کہ اللہ ہمارا رب ہے بغیر کسی جائز وجہ کے نکالا گیا اور اگر اللہ (تعالیٰ) اُن (یعنی کفار) میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے (شرارت سے) باز نہ رکھتا۔ تو گرجے اور یہودیوں کی عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ (تعالیٰ) کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے۔ برباد کر دیئے جاتے اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ جو اس (کے دین) کی مدد کریگا اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت طاقتور (اور) غالب ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(۴۱) یہ (یعنی مہاجر مسلمان) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو دُنیا میں طاقت بخشیں۔ تو وہ نمازوں کو قائم کریں گے۔ اور زکوٰتیں دیں گے۔ اور نیک باتوں کا حکم دیں گے۔ اور بُری باتوں سے روکیں گے۔ اور سب کاموں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔

وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ

(۴۲) اور اگر (یہ دشمن) تجھے جھٹلاتے ہیں۔ تو ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے بھی اور عاد و ثمود نے بھی

وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ

(۴۳) اور ابراہیمؑ کی قوم نے بھی اور لوطؑ کی قوم نے بھی۔

وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَأَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ

(۴۴) اور مدین کے اصحاب نے بھی (اپنے نبیوں کو) جھٹلایا تھا اور موسیٰؑ کی تکذیب بھی کی گئی تھی۔ پس میں نے انکار کرنے والوں کو کچھ ڈھیل دی۔ پھر ان کو پکڑ لیا۔ پس (سوچو کہ) میرا انکار کیسا خطرناک تھا۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ

(۴۵) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے اس حالت میں ہلاک کیا تھا کہ وہ ظلم کر رہی تھیں۔ وہ آج اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ اور کتنے کنوئیں ہیں جو بالکل متروک ہیں اور کتنے

وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ — اونچے اونچے قلعے ہیں جو بالکل تباہ ہو چکے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝

(۴۷) کیا وہ زمین میں چل کر نہیں دیکھتے۔ تاکہ ان کو ایسے دل حاصل ہو جائیں۔ جو (ان باتوں کو) سمجھنے والے ہوں یا کان حاصل ہو جائیں۔ جو (ان باتوں کو) سننے والے ہوں۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہوتے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

(۴۸) یہ لوگ عذاب مانگنے میں جلدی کرتے ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) کبھی اپنا وعدہ جھوٹا نہیں کرتا۔ اور (کوئی کوئی) دن خدا کے نزدیک تمہاری گنتی کے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝

(۴۹) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو پہلے، تو میں نے مہلت دی۔ حالانکہ وہ ظلم کر رہی تھیں۔ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ اور میری ہی طرف سب نے لوٹ کر آنا ہے۔

ع ۲

نوٹ ۴۰-۴۷ یعنی اسلام عیسائیت کی طرح ہر جگہ بے محل یہ نہیں کہتا کہ ایک گال پر تھپڑ لگے تو دوسرا بھی آگے کر دیا جائے بلکہ اگر کوئی دین میں مداخلت کرے اور حق کہنے سے روکے تو جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں ایسی صورت کے علاوہ جہاد جائز نہیں۔ اگر ہوگی تو حب الوطنی کی جنگ ہوگی جو دو مسلمان حکومتوں میں بھی ہو سکتی ہے اور حدیث "حب الوطن من الایمان" کے مطابق متعلقہ حکومت کے افراد اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لیے اس میں حصہ لینا ضروری نہیں۔ چونکہ ایسی مظلوم قوم پر فرض ہے کہ طاقت ملنے پر سب مذاہب کے مقدسات کی حفاظت کرے اور رضاء الٰہی کے کام کرے۔ (آیت ۴۲) اسے آیت ولینصرن اللّٰہ من ینصرہ کے مطابق کمزوری کے باوجود فتح نصیب کی جاتی ہے۔ ہر زمانہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں (آیت ۴۳-۴۶) مگر لوگ پھر بھی فائدہ سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ نشان نظر نہیں آتے۔ بلکہ اس لئے کہ دلوں کی آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ (آیت ۴۷) آیت ۳۹ — ۴۰ پر اعتراض پڑتا تھا کہ جب لڑیں گے مومن تو پھر خدا تعالیٰ نے کس طرح دفاع کیا؟ اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ اللّٰہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ یعنی مومن صرف ہتھیار ہوں گے ورنہ اصل لڑائی خدا کی طرف سے ہوگی۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ

(۵۰) تو کہدے۔ اے لوگو! میں تمہاری طرف صرف ایک ہوشیار کرنے والے کی حیثیت سے آیا ہوں۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

(۵۱) پس جو ایمان لائیں گے اور (اس کے) مناسب حال عمل کریں گے۔ انہیں (خدا تعالیٰ کی) بخشش اور معزز رزق حاصل ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

(۵۲) اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے نشانوں کے متعلق اس غرض سے، جد و جہد کی۔ کہ (وہ ہم کو) عاجز کر دیں۔ وہ لوگ جہنم میں پڑنے والے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(۵۳) اور ہم نے تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا نہ نبی۔ مگر جب بھی اس نے کوئی خواہش کی۔ شیطان نے اس کی خواہش کے رستہ میں مشکلات ڈال دیں۔ پھر اللہ (تعالیٰ) اس کو جو شیطان ڈالتا ہے۔ مٹا دیتا ہے۔ اور جو اس کے اپنے نشان ہوتے ہیں۔ ان کو مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا حکمت والا ہے۔

۴۸-۵۲ فرمایا کفار ہمیشہ عذاب مانگنے میں جلدی کرتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ ہمیشہ آہستہ آہستہ عذاب لاتا ہے تاکہ ایمان لانے والے ایمان لے آئیں (آیت ۵۱) فرمایا ان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون۔ یعنی جلدی نہ کرو خدا تعالیٰ تمہیں ہزار سال کی ڈھیل دے گا۔ پھر جب عذاب آئیگا تو تمہیں اس کی ایک گھڑی ہزار سال کی معلوم ہوگی اور گو اب کفار کا خیال ہے کہ وما اظن الساعة قائمة (کہف ۱۸/۳۶) لیکن عذاب آنے پر وہ خود کہیں گے کہ ان کی ترقی صرف دس صدیاں رہی (طٰہٰ ۲۰/۱۰۴) نیز دیکھیں آیت یدبر الامر..... تعدون (سجدہ آیت ۶)

۵۳ مفسرین کہتے ہیں اور ابن حجر جیسے محدث نے اس روایت کی تائید کی ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحن کعبہ میں آیت اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (نجم ۲۰) تلاوت فرمائی اور اس کے ساتھ (نعوذ باللہ) یہ فرمایا وتلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى۔

آخر سورۃ میں جب آپؐ نے یہ پڑھا فاسجدوا لله واعبدوا تو چونکہ آپ (نعوذ باللہ) شرک کی تائید فرما چکے تھے کفار نے آپؐ کے ساتھ سجدہ کر دیا جس کی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا کہ مکہ مسلمان ہو گیا ہے اس لیے حبشہ کے بعض مسلمان مہاجر واپس آ گئے (ابن خلدون اور سیرۃ الحلبیہ) لیکن مہاجرین حبشہ اس وقت

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ

(۵۴) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو (مشکلات) شیطان ڈالتا ہے۔ وہ اُن لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے۔ اور جن کے دل سخت ہوتے ہیں۔ اور ظالم لوگ (ہر خدائی بات کی) شدید مخالفت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(۵۵) اور (یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے) تا کہ وہ لوگ جو علم والے ہوتے ہیں جان لیں کہ وہ (یعنی قرآن) تیرے رب کی طرف سے مجسم سچائی ہے اور اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) مومنوں کو ضرور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت بخشنے والا ہے۔

سے بہت پہلے مکہ واپس پہنچ گئے تھے جو یہ خبر پہنچنے کے بعد ان کے واپس پہنچنے پر لگنا چاہیئے تھا اس لیے اگر یہ روایت صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے مہاجرین حبشہ کو واپس بلوانے کے لیے ان کو یہ کہلوا دیا کہ مکہ مسلمان ہو گیا ہے لیکن جب وہ واپس آنے والے تھے تو انہوں نے جھوٹ کھلنے کے ڈر سے ایسا کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے دوران میں آپ کے پیچھے سے وتلک الغرانیق کے الفاظ کہہ دیے ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگ آواز پہچان نہیں سکے کہ کس کی ہے اس لیے یہ الفاظ آنحضرت صلعم کی طرف منسوب ہو گئے اور کفار نے مسلمانوں کو کہہ دیا۔ کہ ہم تو اس واقعہ کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے جب تمہارے رسول نے اس بات کو منسوخ کر دیا تو ہم نے بھی اسلام سے رجوع کر لیا۔ سورۃ نجم کی مذکورہ آیت سے پہلے اور پیچھے توحید کی تائید میں آیتیں ہیں جو اس جھوٹ کو رد کرتی ہیں۔ اس لیے اس واقعہ کی بناء پر مفسرین کا آیت زیر بحث کے متعلق یہ استدلال کہ شیطان ہر نبی کی تلاوت وحی کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے ملا دیتا ہے صریحًا غلط ہے۔

اصل میں تمنّٰی کے معنے پڑھنے ہی کے نہیں ارادہ کرنے کے بھی ہیں اور امنیۃ کے معنے تلاوت ہی کے نہیں مطلوب کے بھی ہیں اسی لیے اس آیت کے اصل معنے یہ ہوں گے کہ جب بھی کسی نبی نے (قیام توحید کے لیے) کوئی ارادہ کیا۔ شیطان اس کے مقصود کی راہ میں روکیں ڈال دیتا ہے۔ (القا کے معنے ڈالنے کے ہیں اور ظاہر ہے شیطان نبی کی راہ میں روک ہی ڈالے گا)، آخر اللہ تعالیٰ نے ان رکاوٹوں کو ہٹا کر نبی کو کامیاب کر دیتا ہے۔

۵۴-۵۵ یہاں بتلایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو نبی کے راستہ میں روکیں کیوں ڈالنے دیتا ہے۔ فرماتا ہے

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ۝

(۵۶) اور کافر اس (قرآن) کے متعلق اس وقت تک کہ تباہی کی گھڑی اچانک آجائے۔ یا ان کے پاس اس دن کا عذاب آجائے جو اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑتا۔ شبہ میں پڑے رہیں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۝

(۵۷) اس دن سب بادشاہت اللہ ہی کی ہوگی۔ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ پس مومن جو ایمان کے مناسب حال عمل بھی کرتے ہوں گے۔ وہ نعمت والی جنتوں میں رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝ ع ۱۴

(۵۸) اور کافر اور ہماری آیتوں کے منکر تو وہ ہیں جن کے لیے رسوائی کا عذاب (مقدر) ہے۔

ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس طرح کمزوروں کی کمزوری دشمنوں کی دشمنی اور مومنوں کا صدق ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کو مضبوط کر دیتا ہے۔ گویا شیطان انبیاء پر تصرف پانے کی بجائے ان سے ماریں کھاتا پھرتا ہے۔

لفظ کثیرًا سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ تھوڑا اختلاف موجود ہے کیونکہ کثیرًا کے معنے عظیم الشان کے بھی ہوتے ہیں اور بنی اسرائیل ع۱ کی رُو سے تو عام مومنوں پر بھی تصرف شیطان نہیں ہو سکتا۔ اگر نبی پر تلاوت وحی کے وقت تصرف شیطانی مان لیا جائے تو ان آیتوں میں عظیم الشان اختلاف ہو جاتا ہے مگر قرآن میں اختلاف نہیں۔ (نساء ع۱۱)

۵۶ اس میں پیشگوئی تھی کہ جیسا ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ عذاب آنے تک کافر آنحضرت صلعم کی صداقت میں شبہ ہی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ فتح مکہ بھی ایک ساعت تھی جو بغتۃً یعنی اچانک آئی اور جس نے کفار کے کس بل نکال دیئے۔

۵۷-۵۸ الملک یومئذٍ للہ کا نظارہ فتح مکہ کے دن دیکھا گیا۔ جب آنحضرت ؐ نے جاء الحق وزھق الباطل فرماتے ہوئے سوٹی سے ان ۳۶۰ بتوں کو توڑ ڈالا جن پر مشرکین کو ناز تھا۔ فالذین .... عذاب مھین یعنی شیطان کی روکاوٹوں کے باوجود آخر نبی جیتتے اور کافر رسوا ہوتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ میں خدا تعالیٰ کے لیے مالک (یعنی قابض) کا لفظ ہے لیکن اس آیت میں ملک یعنی بادشاہ کا ہے۔ مالک یوم الدین میں خدا تعالیٰ کی ملکیت کی نفی نہیں بلکہ اس کی قسم کا ذکر ہے اور بتلایا ہے کہ وہ مالک بادشاہ ہے یعنی اسے تصرف میں پوری آزادی حاصل ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(۵۹) اور وہ لوگ جو اللہ کے راستہ میں ہجرت کرتے ہیں پھر مارے جاتے ہیں یا طبعی موت مرجاتے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) ان کو نہایت اعلیٰ انعام بخشیگا اور اللہ (تعالیٰ) انعام بخشنے والوں میں سب سے اچھا ہے۔

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝

(۶۰) وہ ضرور ان کو ایسی جگہ میں داخل کرے گا۔ جسے وہ پسند کریں گے۔ اور اللہ تعالےٰ بہت جاننے والا (اور) بہت سمجھ رکھنے والا ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝

(۶۱) یہ بات اسی طرح ہے اور جو شخص اتنی ہی سزا دے جتنی اُسے تکلیف دی گئی تھی مگر باوجود اس کے (اسکا دشمن) اُلٹا اس پر چڑھ آئے تو اللہ (تعالیٰ) ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت معاف کرنیوالا (اور) بہت بخشنے والا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝

(۶۲) یہ (سزا و جزا کا سلسلہ) اسلئے چلتا ہے کہ ثابت ہو کہ اللہ (تعالیٰ) رات کو دن میں داخل کردیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کردیتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت دعائیں سننے والا (اور) بہت حالات دیکھنے والا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝

(۶۳) یہ (دعائیں سننا اور حالات سے واقف رہنا) اسلئے ہے کہ اللہ (تعالیٰ) اپنی ذات میں قائم ہے اور دوسری چیزوں کو قائم رکھتا ہے اور اس لئے کہ جس چیز کو وہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ تباہ ہونیوالی ہے اور اس لئے کہ اللہ ہی سب سے اوپر ہے اور سب سے بڑا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ

(۶۴) کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالےٰ) نے آسمان سے پانی اُتارا

۵۹-۶۰ یعنی ایک تو خود شہداء کو آخرت میں رزق ملے گا۔ دوسرے ان کی قربانیوں کے نتیجہ میں ان کی قوم کو دنیا میں بھی نعمتیں ملیں گی۔ اور ایمان میں زیادتی ہونے کی وجہ سے اُخروی نعماء بھی ملیں گی۔

۶۱ اوپر جنگ کا ذکر تھا اور بتایا تھا کہ مومن خواہ کم ہوں جیتیں گے۔ یہاں یہ بتلایا ہے کہ اگر جنگ کے نتیجہ میں دشمن کا جوش اور بڑھ گیا۔ تو خدا مومنوں کی مدد کرے گا۔ اس لیے انہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔

۶۲ یعنی قانونِ الٰہی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ مظلوم قوموں کو زندگی دیتا اور ظالم قوموں کو تباہ کر دیتا ہے وہ دعائیں سنتا اور حالات دیکھتا ہے اس لیے تم اس کی مدد سے مایوس نہ ہو۔

۶۳-۶۴ یہاں نظامِ عالم میں خدا تعالےٰ کے دخل دینے کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ قائم رہنے والا اور باطل مٹنے والا ہے

السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۚ

ہے جس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ اللہ (تعالےٰ) یقیناً (اپنے بندوں سے) مہربانی کا سلوک کرنے والا ہے اور ان کے حالات سے بہت باخبر ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۠

(۶۵) اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اس کا ہے اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً اپنے سوا سب وجودوں کی مدد سے بے نیاز (اور) تعریفوں کا مالک ہے۔

ع ۱۵

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۶۶) کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالےٰ) نے تمہارے کام پر جو کچھ بھی زمین میں ہے اُسے بغیر مزدوری کے لگا رکھا ہے اور کشتیاں بھی سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہیں اور اس نے آسمان کو روک رکھا ہے کہ کہیں زمین پر سوائے اس کے حکم گر نہ جائے۔ اللہ (تعالےٰ) یقیناً لوگوں سے بہت شفقت کرنیوالا (اور ان پر) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اگر وہ اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو کامیاب نہ کرے تو اس سے اس کے عَلِیٌّ اور کبیرٌ ہونے پر حرف آتا ہے جب مادی زمین مادی پانی سے شاداب ہو جاتی ہے تو ضرور ہے کہ روحانی پانی سے روحانی زمین بھی شاداب ہو۔

۶۵ یعنی خدا تعالےٰ کو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں وہ جو قربانی چاہتا ہے تمہارے فائدہ کے لیے چاہتا ہے مثلاً نماز ہے یہ فحشاء سے روکتی ہے (عنکبوت $\frac{۲۹}{۴۶}$) اور اس سے قومی اتحاد کا خیال رہتا ہے۔ کیونکہ مسجد میں جانے سے ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح روزہ سے مشقت برداشت کرنے کی عادت اور غرباء کی خبر گیری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ زکوٰۃ سے قوم میں ضعف پیدا نہیں ہوتا اور حج بھی مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

۶۶ یعنی اگر خدا تعالےٰ انسانی قربانیوں کا محتاج ہو تو ہر چیز اس کی خدمت میں کیوں لگا دے۔ سائنس سے ثابت ہے کہ زہر تک انسان کے فائدہ ہی کے لیے ہیں اور اگر کسی چیز کا فائدہ معلوم نہیں تو کوتاہی علم کی وجہ سے ہے مگر افسوس کہ انسان اپنی خادم اشیاء کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔

ویمسک ..... الا باذنہ۔ ایک عذاب شرعی ہوتا ہے جو نبی کی تکذیب کی وجہ سے آتا ہے (بنی اسرائیل $\frac{۲}{۱۶}$) ایسے عذاب کی علامتیں یہ ہوتی ہیں کہ اس کے متعلق پہلے پیشگوئیاں ہوتی ہیں۔ غیر معمولی آفات بیک وقت جمع ہو جاتی ہیں اور ایسے عذاب قوموں پر آتے ہیں (یونس $\frac{۱۱}{۴۴}$) دوسرا عذاب طبعی ہوتا ہے اس کا باعث نبی کی تکذیب نہیں بلکہ عام قانون کی خلاف ورزی ہوتا ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝

(۶۷) اور وہی ہے جس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر تم کو مارے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا۔ انسان یقیناً بڑا ناشکرا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(۶۸) ہم نے ہر امت کے لیے ایک عبادت کا طریق مقرر کیا ہے۔ جس کے مطابق وہ چلتی ہے پس اس طریق (یعنی اسلام) کے متعلق وہ تجھ سے بحث نہ کریں (کیونکہ یہ خدا کا مقرر کردہ ہے) اور تو (انہیں) اپنے رب کی طرف بلا کیونکہ تو سیدھے راستہ پر ہے۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(۶۹) اور اگر وہ تجھ سے بحث کریں تو کہہ دے کہ اللہ (تعالیٰ) تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

(۷۰) اللہ (تمہارے اور میرے درمیان) قیامت کے دن اُن امور میں فیصلہ کریگا جن میں تم اختلاف رکھتے ہو۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

(۷۱) (اے محمد رسول اللہ!) کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو جو آسمان اور زمین ہے جانتا ہے یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے اور اس طرح (کسی قانون کو محفوظ) کر دینا اللہ (تعالیٰ) کے لیے آسان ہے۔

حتٰی یغیروا ما بانفسھم (رعد $\frac{۱۳}{۱۲}$) یعنی قومی اعمال بدلنے پر ہی اس سے خدا کا سلوک بدلتا ہے اگر اعمال اچھے رہیں تو عذاب نہیں آتا ورنہ آجاتا ہے۔

۶۷ یعنی خدا تعالیٰ ترقی دیتا ہے اور اس کے بعد نافرمانی کی صورت میں تباہی لاتا ہے "تاکہ دل صاف ہو جائیں۔ دل صاف ہو جانے پر پھر زندہ کر دیتا ہے گویا وہ ایک ہی وقت میں ممیت اور محیی ہوتا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس پر موت آئے مگر وہ حیات پیدا نہ کرے۔ مثلاً اسلامی جنگوں میں مسلمان مرے مگر اس کے نتیجہ میں عرب کی اصلاح ہو کر اس میں زندگی کی روح پڑ گئی۔

۶۸ یعنی ہر ایک کو کوئی دین چاہیئے۔ جب تیرا دین صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ (سورۃ فاتحہ) اور فالٰھکم الٰہٌ واحد فلہٗ اسلموا ($\frac{۲۲}{۳۵}$) سکھاتا ہے تو اس پر اعتراض بے معنی ہے انک لعلٰی ھدًی مستقیم میں آنحضرتؐ کی صداقت کا ثبوت بیان فرمایا ہے کہ دنیا ہزار انکار کرے آخر اسے آنحضرت صلعم کی تعلیم کی طرف آنا پڑے گا۔ کیونکہ آپؐ سیدھے راستہ پر قائم ہیں چنانچہ پردہ اور تعدد ازدواج کی اسلامی تعلیم کو اب مخالف بھی پسند کرنے لگے ہیں۔

۶۹-۷۱ یعنی اگر اس کے بعد بھی وہ جھگڑیں تو کہو انتظار کر کے دیکھو خدا کس کی مدد کرتا ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝

(۷۲) اور وہ لوگ اللہ (تعالیٰ) کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لئے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اور جن کے متعلق ان کو کسی قسم کا کوئی علم حاصل نہیں۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

(۷۳) اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو تو منکروں کے چہروں میں (صاف صاف ناپسندیدگی کے آثار) دیکھتا ہے۔ قریب ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں۔ جو اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سُنا رہے ہوتے ہیں۔ تو کہہ دے۔ کیا میں تم کو اس حالت سے بھی ایک بُری حالت کی خبر دوں؟ (اور وہ) جہنم (میں پڑنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ منکروں سے کیا ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ع ۹ / ۱۶

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

(۷۴) اے لوگو! ایک بات تمہیں بتائی جاتی ہے تم اسے غور سے سُنو۔ تم جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکیں گے۔ خواہ سب کے سب جمع ہو جائیں۔ بلکہ اگر ایک مکھی ان کے آگے سے کوئی چیز اُچک کر لے جائے تو وہ اس چیز کو (بھی) چھڑا نہیں سکتے۔ یہ دعائیں مانگنے والا (بھی) اور جس سے دعائیں مانگی جاتی ہیں (وہ بھی) کتنے کمزور ہیں۔

---

۷۲ ما لم ینزل بہ سلطانا یعنی مشرکوں کے پاس سابق الہامی کتب کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ و مالیس بہ علم اور نہ ذاتی تحقیق اور علم کی دلیل ہوتی ہے۔ وما للظلمین من نصیر اور موحدین سے مقابلہ میں ہار کر مشرک ہمیشہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ غلطی پر تھے۔

۷۳ شرارتی لوگ مومنوں کی بات ماننے کی بجائے ان پر حملہ کرنے لگ جاتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ حق کو ماننا ان کے لیے مفید اور نہ ماننا نقصان دہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے یہ فرمانے پر کہ مسیح فوت ہو گئے ہیں، خدا نے ہر ملک میں نبی بھیجے ہیں، اور قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں، علماء نے آپ کو ہر طرح کی تکلیفیں دیں۔ مگر اب وہ خود ان عقائد کی صحت کو تسلیم کر رہے ہیں۔

۷۴ اس آیت کی موجودگی میں جو مشرکوں کے معبودوں کی کمزوری ظاہر کرتی ہے مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح پرندے پیدا کرتے تھے تعجب انگیز ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۵﴾	(۷۵) ان لوگوں نے اللہ (تعالیٰ) کی صفات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اللہ (تعالیٰ) تو یقیناً بڑی طاقت والا (اور) بڑا غالب ہے۔
اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۷۶﴾	(۷۶) اللہ (تعالیٰ) فرشتوں میں سے اپنے رسول منتخب کرتا ہے اور (اسی طرح) انسانوں میں سے (بھی)۔ اللہ (تعالیٰ) بہت (دعائیں) سننے والا اور (حالات کو) بہت دیکھنے والا ہے۔
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۷﴾	(۷۷) جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ وہ پیچھے کر آئے ہیں اسے بھی جانتا ہے۔ اور سب معاملے اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۩ السجدۃ ﴿۷۸﴾	(۷۸) اے مومنو! رکوع کرو۔ اور سجدہ کرو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور نیک کام کرو۔ تاکہ تم اپنے مقصود کو پا لو۔

السجدۃ عند الشافعی

۷۵ یعنی شرک کی وجہ یہ ہے۔ کہ لوگ خدا کی صفات کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور الٰہی طاقتوں کا قیاس اپنی طاقت پر کر کے انہیں محدود اور درمیانی واسطہ کا محتاج خیال کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان سے وائرلیس اور ٹیلیویژن ایجاد کروا کے بتا دیا کہ جب ایک کمزور انسان گھر بیٹھے دنیا کے گوشوں تک کے انسانوں کی بات سن سکتا اور شکل دیکھ سکتا ہے تو خدا تعالیٰ کیوں ہر چیز کو دیکھ اور ہر آواز کو سن نہیں سکتا۔

۷۶ یعنی جب بھی پیاسی روحیں آسمانی پانی مانگتی ہیں یا خدا دیکھتا ہے کہ دنیا گمراہ ہو رہی ہے تو وہ سمیع و بصیر ان کی سنتا ہے۔ پاکوں پر فرشتے اتارتا اور ہدایت کے لیے انبیاء بھیجتا ہے۔ یہاں فعل مضارع کا استعمال بتاتا ہے کہ امت محمدیہ میں نبوت جاری ہے کیونکہ اس کے معنے ہیں کہ خدا انسانوں میں سے رسول چنتا ہے اور چنتا رہے گا۔

۷۷ یہاں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو انسان نے کیا اور اسے بھی جو وہ نہیں کر سکا پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت ہدایت نہ بھیجتا۔ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا انحصار صرف ماضی پر نہیں آئندہ کی قابلیتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر رسولوں کے انتخاب کے ساتھ ملا کر کیا گیا ہے۔

۷۸ یہاں الٰہی جماعتوں کی ترقی کے گر بتلائے ہیں جو دنیوی جماعتوں کے طریق کار سے الگ ہیں۔ نماز کے علاوہ رکوع اسلام میں نہیں اس لیے یہاں ماسواء اللہ کا خیال دل سے نکال کر کامل توحید پر ایمان رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا نام رکوع رکھا گیا ہے۔ یعنی رکوع ممنوعات کا قائم مقام ہے اور اس کے

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ج وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط هُوَ مَوْلٰكُمْ ج فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ع

(۷۹) اور اللہ (تعالیٰ) کے راستہ میں ایسی کوشش کرو۔ جو مکمل ہو۔ کیونکہ اسی نے تم کو بزرگی بخشی ہے۔ اور دین (کی تعلیم) میں تم پر کوئی تنگی کا پہلو اختیار نہیں کیا (اے مومنو!) اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین (کو اختیار کرو کیونکہ) اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ اس کتاب میں بھی اور اس سے پہلی کتب میں بھی۔ تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو۔ اور تم باقی دنیا پر گواہ رہو۔ پس نماز کو قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ اور اللہ (تعالیٰ) کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہ تمہارا آقا ہے۔ پس کیا ہی اچھا آقا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

معنے جھوٹ فریب وغیرہ دنیوی سہاروں کو چھوڑ کر خدا کا سہارا لینے کے ہیں۔ گویا ارکعوا توکل علی اللہ پر دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ سبق ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ترقی کے ناجائز طریقوں سے روکتا ہے تو وہ خود ہمارا ذمہ دار ہو جاتا ہے اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔

واسجدوا:۔ آگے واعبدوا ربکم کے الفاظ ہیں اس لیے یہاں واسجدوا کے معنے ظاہری سجدہ کے نہیں بلکہ کامل فرمانبرداری کے ہیں اور حکم یہ ہے کہ احکام الٰہی کی پوری اتباع کی جائے خواہ ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ رحلت آنحضرت صلعم کے بعد اکثر حصہ عرب مرتد ہو گیا تھا۔ اس وقت اکابر صحابہؓ اسامہؓ کا لشکر روانہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔ مگر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا سارا عرب مخالف ہوتا ہے تو ہو جائے آنحضرت صلعم نے جس لشکر کو بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا وہ بہرحال جائے گا خواہ دشمن مدینہ میں مسلمان عورتوں کی لاشیں گھسیٹتا پھرے۔ یہ جرأت ارکعوا واسجدوا والے حکم کی تعمیل کا نتیجہ تھا۔ جیسے بجلی کے ساتھ مل کر معمولی تار میں طاقت آجاتی ہے ایسے ہی خدا سے تعلق بھی ایک طاقت پیدا کر دیتا ہے۔

وافعلوا الخیر:۔ توکل۔ اطاعت اور شب و روز عبادت کے بعد بنی نوع کی بھلائی کی کوشش کرنا کامیابی کا چوتھا گر ہے۔

۷۹ جاھدوا فی اللہ حق جھادہ:۔ صرف منہ کے ایمان پر کفایت نہ کرو۔ بلکہ راہ خدا میں پوری کوشش کرتے رہو۔

وما جعل .... من حرج:۔ یہاں من حرج فرمایا ہے۔ اس میں کسی خاص تنگی کی طرف اشارہ نہیں بلکہ یہ بتلایا ہے کہ اس نے دین میں کسی قسم کی بھی تنگی نہیں رکھی۔ یعنی شریعت لعنت نہیں اس کے

حکم انسان کے فائدہ کے لیے ہیں ۔ دیکھیں نساء ۴/۲۷ اور ۴/۲۹

ملّۃ ابیکم ابرٰهیم ۔ میں بتایا کہ یہ تمہارے دادا کا دین ہے نیا دین نہیں ۔

ھو سمّٰکم المسلمین من قبل میں یسعیاہ ۶۲/۲ اور ۶۵/۱۵ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے ۔ اور فی ھٰذا میں قرآنی دعا ربّنا وجعلنا مسلمین لک ومن ذرّیّتنا امّۃ مسلمۃ لک (البقرہ ۲/۱۲۹) کی طرف اشارہ ہے ۔

عربی میں اشیاء کے نام ان کی علامت کے علاوہ ان کے کسی خاص امتیاز پر بھی دلالت کرتے ہیں چنانچہ س ، لام ، م جہاں بھی اکٹھے ہوں گے ان کے معنوں میں حفاظت کے معنے ضرور پائے جائیں گے ۔ مثلاً اسلام کے معنے فرمانبرداری کے ہیں اور کسی کی فرمانبرداری سے انسان اس کی حفاظت میں آجاتا ہے ۔ پھر سلم ہے اس کے معنے آفات سے بچنے کے ہیں ۔ پس اسلام کے معنے ہوئے ایسے افعال بجالانا جن سے انسان ہلاکت سے محفوظ ہوجائے ۔ گویا اس نام میں ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض بیان ہوگئی ہے جو یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرکے اس کے عذاب سے محفوظ ہوجائے اور لوگوں سے حسن سلوک کرکے فتنہ وفساد سے بچ جائے ؂

آیاتها ۱۱۹	سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ مَكِّيَّةٌ	رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ (۲) (کامل) مومن اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (۳) وہ (مومن) جو اپنی نمازوں میں عاجزانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ (۴) اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ (۵) اور جو زکوٰۃ (باقاعدہ) دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ (۶) اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ (۷) سوائے اپنی بیویوں کے یا جن کے مالک ان کے داہنے ہاتھ ہوئے ہیں پس ایسے لوگوں کو کسی قسم کی ملامت نہیں کی جائے گی۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (۸) اور جو اس کے سوا کسی اور بات کی خواہش کریں تو وہ لوگ زیادتی کرنے والے ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ (۹) اور وہ لوگ (یعنی کامل مومن) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ (۱۰) اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے۔ اور زمانہ ہجرت کے قریب کی ہے کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ قریب ہے اور زکوٰۃ اور نماز باجماعت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یہ تینوں مضمون مدنی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان پر زور دینا بتاتا ہے کہ ان کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے)

سورۃ حج کے آخر میں مشروط طور پر بتایا تھا کہ ان ان احکامِ خداوندی کی پابندی کروگے۔ تو کامیاب ہوجاؤ گے۔ سورۃ مومنون میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ فی الواقع ان احکام پر عمل کرنے والی ایک جماعت پیدا ہوجائے گی اور وہ جماعت ضرور کامیاب ہوگی۔ پہلی سورتوں میں مسیحی تعلیم کی غلطیوں اور ان کی اصلاح کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں بتایا ہے کہ مسیحیت جادہ توحید سے ہٹ جانے کی وجہ سے آسمانی ثمرات نہیں کھلاسکے گی اس لیے اب اس کی جگہ اسلام نے لے لی ہے۔

مطلب یہاں فرمایا ہے کہ جن مومنوں میں ان آیات میں مذکور صفات پائی جائیں گی وہ کامیاب ہوجائیں گے مسیحؑ نے بھی فرمایا ہے کہ "اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا"۔ (متی ۷/۱۷) اس لیے یہ کیسے

ہی نہیں کہ مامور من اللہ ناکام ہو۔ اور اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ اس کی صحبت یافتہ جماعت کا بیشتر حصہ اس کے اثر سے متاثر ہو۔ اس لیے شیعوں کا یہ کہنا کہ صحابہ میں صرف ۲ یا ۲ مومن تھے آنحضرت صلعم کی قوت قدسیہ پر حرف لاتا ہے آپ تو نبیوں کے سوا تھے قرآن نے تو مسیح کے حواریوں کی بھی تعریف کی ہے (صف $\frac{15}{61}$) پھر یہ مومنون کا لفظ بھی سالم ہے جو تین یا تین سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور ان سات اقسام کے مدنظر جو اگلی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔ ایسے مومن کم از کم ۲۱ ہونے چاہئیں۔ دوسرے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو سچے مومن ہیں وہ کامیاب ہونگے اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کامیاب ہوئے اس لیے وہ سچے تھے۔ تیسرے صحابہ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ($\frac{9}{100}$) پھر لکھا ہے منھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر (احزاب $\frac{33}{24}$) اور جو صحابی اس آیت کے مطابق شہید ہوئے درجنوں سے زیادہ ہیں۔ پھر شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت کا حق حضرت علیؓ کا تھا جو دوسروں نے غصب کر لیا۔ مگر اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ حضرت علیؓ ایسے بزدل تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے باوجود اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے سامنے چپ رہے چپ ہی نہیں رہے ان کی بیعت کی اور اس قدر اپنے خیال کو چھپایا کہ حضرت عمرؓ نے ایران کی سرحد کے سفر اور بیت المقدس کی طرف جاتے ہوئے ان کو مدینہ کا گورنر بنایا اور بغاوت سے نہ ڈرے۔ گویا شیعہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا کہتے ہوئے دراصل یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ۔

مومنوں کے متعلق لفظ فلاح کا استعمال بتاتا ہے کہ مومن کا اصل مقصد فلاح حاصل کرنا ہے نہ کہ نجات۔ نجات کے معنے دکھوں سے بچنے کے ہیں اور یہ بھی ایک خوبی ہے مگر اس سے زیادہ خوبی کامیابی حاصل کرنا ہے۔ جو کامیاب ہو جائے گا دکھوں سے نجات بھی پا لے گا۔ اس لیے فلاح میں نجات بھی شامل ہے $\frac{51}{57}$ کے مطابق انسان رضاء الٰہی اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے فلاح کے معنے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے ہیں اور یہاں حصول فلاح کے ذرائع بیان ہوتے ہیں۔

یہاں روحانی و جسمانی پیدائش کا بالمقابل ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وہ مومن کامیاب ہو گئے جو اول وہ نمازوں میں خشوع و خضوع اختیار کرتے ہیں۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ ترقی کر کے لغویات یعنی فضول اور بے فائدہ باتوں اور خیالات سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ لغویات میں وہ اشیاء بھی آ جاتی ہیں جو صرف تفاخر اور زینت کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ کسریٰ کے دربار میں مسلمان افسر گئے تو اس کے قالینوں پر نیزے مارتے ہوئے گذر گئے۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ تم لوگوں میں تمیز نہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بادشاہ ہو کر بھی قالینوں کی عزت کرتا تھا اور مسلمان غریب ہو کر بھی صرف خدا کی عزت کرتے تھے۔ اگر ان اسلامی احکام پر عمل کیا جائے تو افراد کی ظاہری حالت ایک حد تک مساوات کی طرف لوٹ آئے۔

تیسرا درجہ الذین ھم للزکٰوۃ فٰعلون کا ہے۔ اسلامی نظریہ کے ماتحت دولتمند جب چیز سے

دولت کماتا ہے وہ چیز سب انسانوں کے مشترکہ فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہوتی ہے۔ اور سب کا اس میں حق ملکیت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی نہ کسی رنگ میں اس دولت کمانے میں سب انسانوں کا ہاتھ ہوتا ہے اس لیے مزدور کی مزدوری ادا ہونے کے بعد بھی اس کا ، مالک کے اموال پر ایک حق رہ جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ تجارتی اموال پر بھی لگتی ہے۔ کوئی نئی کان دریافت ہو تو اس کا بھی ⅕ حکومت کو جاتا ہے تاکہ لوگوں پر خرچ ہو۔

ایک دفعہ حضرت سعد (بوجہ دولت) دوسروں پر فضیلت کا اظہار کر رہے تھے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مال تمہیں زور بازو سے نہیں ملا تمہاری دولت کا اصل ذریعہ غرباء ہی ہیں اس لیے فخر نہ کرو۔ آنحضرتؐ کو غرباء کا اتنا خیال رہتا تھا کہ عام دنوں میں اور بالخصوص رمضان میں جو صدقہ فرماتے تھے اسے تیز آندھی سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ آپؐ صدقہ کے ایک دینار کا بھی گھر میں رہ جانا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک ایک دفعہ بچپن میں حضرت حسنؓ نے صدقہ کی ایک کھجور منہ میں ڈال لی تو آپؐ نے ان کے منہ سے نکال کر پھینک دی اور فرمایا یہ غرباء کا حق ہے۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قومی ترقی کا ایک اہم اصل یہ ہے کہ غرباء کے حقوق کا خیال رکھا جائے ورنہ وہ کام صحیح رنگ میں نہیں کریں گے۔ اس طرح کام پر لگانے والوں کو بھی نقصان ہوگا اور خود ان میں بھی نکمے پن کی عادت پیدا ہوگی۔

چوتھا درجہ روحانی ترقی کا یہ ہے کہ مومن اپنے سب سوراخوں یعنی کانوں، آنکھوں، منہ اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں نہ غیبت سنتے ہیں نہ دوسروں کے اموال کو لالچ سے دیکھتے ہیں (نہ غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں)، اور نہ بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

او ماملکت ایمانھم۔ قرآن کریم میں نوکروں اور غلاموں کا الگ الگ ذکر ہے اس لیے یہاں نوکر مراد نہیں۔ اور غلاموں کے متعلق صاف لکھا ہے کہ (۱) بجز خونریز جنگ کسی قوم کے قیدی پکڑنے جائز نہیں (انفال ۶۸) (۲) ایسے جنگی قیدیوں کے متعلق بھی حکم ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ (۳) اگر اسے یا اس کی قوم کو اس کی طاقت نہ ہو تو بطور احسان چھوڑ دو (محمد ۴⁄۵) (۴) یہ بھی نہ ہو سکے تو زکوٰۃ کے روپیہ سے فدیہ ادا کر کے چھوڑ دینا چاہیے۔ (توبہ ۶۰) (۵) اس میں بھی مشکل ہو تو قیدی کو مکاتبت (یعنی محنت کر کے فدیہ ادا کرنے) کا اختیار دینے کا حکم ہے (نور ۳۳⁄۳۴)۔ جو عورت ان سہولتوں کے باوجود آزاد نہ ہو تو اس کی جبراً شادی بدی کو روکنے کے لیے ضروری ہے۔ مگر اس کے بعد بچہ پیدا ہو جائے تو وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ ایسی عورتیں قیدی ہوئیں یا آزاد؟

روحانی ترقی کا پانچواں درجہ یہ ہے کہ مومن اپنی امانتوں اور عہدوں کا خواہ دشمن سے ہوں خیال رکھتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو امانت و دیانت کا اتنا خیال رہتا تھا کہ ایک دفعہ ایک یہودی رئیس کا گلہ بان مسلمان

ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عین میدان جنگ میں اسے حکم دیا کہ اس کے پاس اپنے آقا کی جو بکریاں بطور امانت ہیں وہ واپس کردے۔ حالانکہ بکریاں واپس ہونے سے دشمن کو کئی دن کی خوراک مہیا ہوتی تھی۔

صحابہؓ نے کتنا شاندار نمونہ دکھایا کہ حمص سے نکلتے ہوئے عیسائیوں سے وصول شدہ ٹیکس یہ کہہ کر واپس کردیئے کہ ہم نے تمہاری حفاظت کرنے کے لیے ٹیکس لیا تھا۔ اب جب حالات مخدوش ہیں ہم ٹیکس رکھنا جائز نہیں سمجھتے۔

اسلام نے حکومت کو بھی امانت قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اسے اس کے اہل کے سپرد کیا جائے۔ گبن نے روم کی تاریخ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ملک شاہ کے والد کی وفات پر اس کے چچا اور بھائی نے بالمقابل حکومت کا دعویٰ کردیا۔ اس وقت ملک شاہ نے دعا کی کہ الٰہی اگر میں حکومت کا زیادہ اہل ہوں تو مجھے فتح دے ورنہ میرے بھائی کو فتح دے۔ اور میری جان اور مال مجھ سے واپس لے لے۔ گبن لکھتا ہے کہ اس نوجوان مسلمان شہزادہ کے قول سے زیادہ پاکیزہ قول اور نظریہ تاریخ میں تلاش کرنا ناممکن ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے قبل کچھ نوجوانوں نے مظلوموں کی داد رسی کرنے کی حلف اٹھائی تھی آنحضرت صلعم بھی اس میں شامل تھے۔ دعویٰ نبوت کے بعد جب آپؐ کے لیے آزادی سے پھرنا بھی مشکل تھا ایک شخص نے عرض کیا کہ ابوجہل نے میرا روپیہ دینا ہے۔ وہ آپ دلوا دیں۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کر اس جانی دشمن کے گھر تشریف لے گئے اور اس شخص کو اس کا حق دلوا دیا اور اپنے عہد کا پاس رکھا۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر معاہدہ ہوا تھا کہ مکہ کا کوئی جوان مسلمان ہو جائے تو اسے اس کے رشتہ داروں کی طرف واپس کردیا جائے گا۔ ابھی معاہدہ کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ مکہ کی طرف سے معاہدہ کرنے والے سہیل کا بیٹا ابوجندل زخموں سے چور وہاں پہنچ گیا اور عرض کیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ سہیل نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ابوجندل نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپؐ مجھے واپس کردیں گے تا یہ لوگ مجھے پہلے سے بھی زیادہ تکلیفیں دیں۔ آپؐ نے فرمایا خدا کے رسول معاہدہ نہیں توڑا کرتے تمہیں بہرحال واپس جانا ہوگا۔ تم صبر اور توکل کرو۔

ایک دفعہ کسی حکومت کا ایلچی آنحضرت صلعم کے پاس آیا۔ اور آپؐ کی صحبت میں رہ کر صداقت اسلام کا قائل ہو گیا۔ اور اس کا اظہار کرنا چاہا مگر آپؐ نے فرمایا تم اپنی حکومت کی طرف سے ایک امتیازی عہدہ پر مامور ہو اس وقت مناسب نہیں اگر واپس جاکر بھی تمہارے دل میں اسلام کی محبت رہے تو آکر اسلام قبول کرلینا۔

چھٹا درجہ یہ بتلایا کہ مومن نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ صلوٰتھم میں جمع کا صیغہ اس لیے استعمال فرمایا کہ فرائض اور نوافل سب اسی میں آجائیں۔ دوسرے اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں سے ہر ایک کی جسمانی عبادت کی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ جب تک ساری قوم کے اعمال درست نہ ہوں

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۙ
(۱۰) یہی لوگ اصل وارث ہیں۔

الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○
(۱۱) جو فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۚ
(۱۲) اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۖ
(۱۳) پھر اس کو ایک ٹھہرنے والی جگہ میں نطفہ کے طور پر رکھا۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا
(۱۴) پھر نطفہ کو ترقی دے کر ایسی شکل دی کہ وہ چمٹنے والا وجود بن گیا۔ پھر اس چمٹنے والے وجود کو ایک بوٹی بنا دیا۔ پھر اس بوٹی کو ہم نے ہڈیوں کی

اس وقت تک انسان کا اپنا عمل بھی خطرہ سے باہر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے فرماتا ہے۔ قوا انفسکم واھلیکم نارًا۔ یعنی اپنے ساتھ اپنے اہل کو بھی آگ سے بچاؤ۔

پابندی نماز کے بھی کئی درجے ہیں (۱) سب سے چھوٹا درجہ یہ ہے کہ بالالتزام پانچوں وقت نماز پڑھی جائے (۲) اس سے بڑھ کر یہ کہ پانچوں نمازیں وقت پر پڑھی جائیں۔ (۳) نماز باجماعت ادا کی جائے (۴) نماز سمجھ کر پڑھی جائے۔ (۵) حدیث میں آتا ہے کہ نماز پڑھتے وقت مومن کو ان دو میں سے ایک مقام ضرور حاصل ہونا چاہیئے۔ اوّل یہ کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہو۔ ویسا نہیں تو کم از کم اسے یقین ہو کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ یہاں فرائض پورے ہو گئے مگر یہاں تک مومن کو پہنچنا چاہیئے۔ نہیں پہنچا۔ اس لیے چھٹا درجہ نوافل کا ہے ساتواں درجہ یہ ہے کہ رات کو بھی تہجد پڑھے نماز کے ان سات درجوں کو حاصل کرنے والوں کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ خدا تعالےٰ رات کو عرش سے اتر آتا اور فرشتے پکارتے ہیں کہ خدا تعالےٰ تمہیں ملنے آیا ہے اٹھو اور اس سے مل لو۔

۱۱-۱۲ یہ روحانی ترقی کا ساتواں درجہ ہے فردوس کے معنی ایسے باغ کے ہیں جو سب باغوں کا مجموعہ ہو مطلب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ ان کو ایسی جنت دیتا ہے جو سب جنتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ھُم فیھا خالدون جیسے مومن ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی عبادت کی حفاظت کرتے رہتے خدا تعالےٰ ان کے انعامات کی حفاظت کرے گا اس لیے ان پر تنزل نہیں آئے گا۔

۱۲-۱۷ فرماتا ہے جس طرح روحانی پیدائش کے سات مدارج ہیں اسی طرح تمہاری جسمانی پیدائش کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ اور ہر جسمانی درجہ کے مقابل پر ایک روحانی درجہ ہے اوّل انسان خلاصہ مٹی یعنی اس

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۞ شکل میں تبدیل کر دیا ۔ پھر ان ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا ۔ پھر اس کو ایک اور شکل میں تبدیل کر دیا ۔ پس بہت برکت والا ہے وہ خدا جو سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے ۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۞ (۱۶) پھر تم لوگ اس کے بعد مرنے والے ہو ۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۞ (۱۷) پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جانے والے ہو ۔

غذا اسے جو مٹی سے نکلتی ہے ۔ پیدا ہوتا ہے (آیت ۱۳) اسی طرح پہلا روحانی درجہ خشوع و خضوع اور فروتنی سے پیدا ہوتا ہے (آیت ۳) دوسرا درجہ پیدائش کا یہ ہے کہ نطفہ ایک ٹھہرنے والی جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے (آیت ۱۴) اور جیسے اس کی حفاظت کے لئے کئی تدابیر کی جاتی ہیں ۔ اسی طرح روحانیت کا بیج بھی محفوظ رکھنے کے لیے مومن لغویات سے پرہیز کرنے لگتا ہے (آیت ۴) تیسرے درجہ پر نطفہ علقہ بن جاتا ہے (آیت ۱۵) اور رحم سے چمٹ جاتا ہے ۔ اسی طرح روحانیت کے تیسرے درجہ پر انسان کے دل میں انسانوں کی محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور وہ ان کے لیے اپنے اموال خرچ کرنے لگتا ہے (آیت ۵) چوتھے درجہ پر علقہ مضغہ بن جاتا ہے اور علقہ میں جو گندگی ہوتی ہے اس سے بچ جاتا ہے (آیت ۱۵) اس کے مقابل روحانی پیدائش کا درجہ لفروجهم حافظون میں بیان ہوا ہے (آیت ۶) پانچویں جیسے بوٹی کے بعد جسم میں ہڈی بننے لگتی ہے ۔ (آیت ۱۵) اسی طرح پانچویں درجہ پر ایسی روحانی سختی پیدا ہو جاتی ہے کہ مومن دشمن سے بھی وفا سے عہد کرتا ہے (آیت ۹) چھٹے درجے پر جیسے ہڈیوں پر گوشت چڑھ جاتا ہے اور بچہ ضائع ہونے سے بہت حد تک بچ جاتا ہے (آیت ۱۵) اسی طرح جو لوگ قوم میں عبادات الٰہی قائم رکھتے ہیں (آیت ۱۰) وہ بہت حد تک محفوظ ہو جاتے ہیں ساتویں درجہ پر جب گوشت ہڈیوں پر چڑھ جاتا ہے ۔ تو ان کو دوسری پیدائش دے کر بچہ بنا دیا جاتا ہے (آیت ۱۵) اس کے مقابل روحانی کمال کا یہ درجہ ہے کہ مومن تمام نعمتوں کے مجموعہ کو حاصل کر لیتے ہیں (آیت ۲-۹) جسمانی خلق کے آخر میں فتبارک اللہ احسن الخالقین فرمایا ۔ یہی آیت روحانی پیدائش پر لگتی ہے یعنی اس مقام پر انسان کو ایسی پیدائش عطا ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر ہر انسان خدا تعالیٰ کی حمد پر مجبور ہوتا ہے ۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبِ وحی عبد اللہ بن ابی سرح کو یہی آیتیں لکھواتے ہوئے ثم انشانٰہ خلقا اخر پر پہنچے تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا فتبارک اللہ احسن الخالقین آپ نے فرمایا یہی وحی ہے لکھ لو ۔ اس پر اس نے سمجھا کہ آنحضرت صلعم کی وحی آپ کے اپنے ہی خیالات ہوتے ہیں اور مرتد ہو گیا حالانکہ پچھلی آیات کے نتیجہ میں یہ آیت خود بخود بن جاتی ہے ۔ آخر فتح مکہ کے بعد وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝

(۱۸) اور ہم نے تمہارے اُوپر (کے درجات کے لئے) سات (رُوحانی) راستے بنائے ہیں۔ اور ہم (اپنی) مخلوق سے غافل نہیں رہے۔

احسن الخالقین سے یہ نہیں نکلتا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے بلکہ اس جگہ احسن الخالقین کے معنے اندازہ کرنے کے ہیں (جو مفردات سے ثابت ہیں) اور مراد یہ ہے کہ وہ سب سے بڑا اندازہ کرنے والا ہے۔ یا پھر یہ بات اس رنگ میں کہی گئی ہے جیسے خدا تعالیٰ سمیع و بصیر ہے مگر مجازاً انسان کے لیے بھی فجعلنٰہ سمیعاً بصیراً (دہر ۷۶/۳) کے الفاظ آتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں ہونے کہ وہ خدا کا شریک ہو گیا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ السمیع اور البصیر ہے اور سننے اور دیکھنے کے جتنے کمال ہیں سب اس میں موجود ہیں۔ لیکن انسان کی سماعت و بصارت ناقص ہے۔ پھر انسان جو کچھ کرتا ہے خداداد طاقتوں ہی سے کرتا ہے اس لیے احسن الخالقین خدا تعالیٰ ہی ہوا۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ میں جس روحانی مقام کا ذکر ہے وہ لمبے مجاہدات کے بعد ملتا ہے لیکن بعض تغیرات آناً فاناً انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیتے ہیں۔ ان کی ایک مثال حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ چند منٹ میں شدید دشمن سے اعلیٰ درجہ کے مومن بن گئے۔ ایسا انقلاب کم لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور باہر سے آتا ہے۔ لیکن انتقال عن الحال الی الحال آہستہ آہستہ اور محنت سے ہوتا ہے (اور اس کے درجات آیت ۲ تا ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں)

۱۸ عرب ہر اس چیز کو جو دوسری کے اوپر رکھی ہوئی ہو طریقہ کہتے ہیں۔ اس لیے ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی پیدائش کی طرح روحانی پیدائش کے بھی سات درجات ہیں۔ پہلا درجہ جمادات کے مشابہ ہے۔ فرمایا ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (بقرہ ۲/۷۵) گویا جیسے جمادات میں حس نہیں ہوتی اس درجہ میں دلوں کو خشیت الٰہی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

دوسرا درجہ نباتات کے مشابہ ہے فرمایا وان تدعوھم الی الھدیٰ لا یسمعوا وتراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون (اعراف ۷/۱۹۸) جیسے نباتات میں حس ہوتی ہے مگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں اسی طرح اس درجہ پر انسان جمادات سے تو بہتر ہوتا ہے دیکھتا تو ہے مگر ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

تیسرا درجہ:۔ حیوانی زندگی سے مشابہ ہے اس درجہ پر انسان حیوانوں کی طرح سُن تو لیتا ہے مگر سمجھتا نہیں۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اٰذان لا یسمعون بھا اولٰٓئک کالانعام بل ھم اضل (اعراف ۷/۱۸۰)

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ (۱۹) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے مطابق پانی اُتارا
فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا اور پھر اُس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اُس کے
عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فنا کرنے پر قادر ہیں۔
فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ (۲۰) پھر ہم نے تمہارے لیے اس سے باغات بنائے کھجور
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ کے (بھی) اور انگوروں کے (بھی) ان میں تمہارے
فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ لیے بہت سے پھل (پیدا کئے گئے) ہیں۔ اور
مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ان سے تم کھاتے ہو۔

چوتھے درجہ پر انسان ہر کام میں تقویٰ کا خیال رکھنے لگتا ہے گو کبھی کبھی اس پر شیطان بھی غالب آجاتا ہے مگر وہ جھٹ ہوشیار ہو جاتا ہے۔ فرمایا اِنّ الذین اتقوا اذا مسّھم طٰئف من الشیطٰن تذکروا فاذا ھم مبصرون (اعراف ۷/۲۰۲)

پانچویں درجہ پر انسان ملائکہ کی طرح یفعلون ما یومرون (۶۶/۷) کا مصداق ہو جاتا ہے اور وہ تمام الٰہی حکموں کو پورا کرتا ہے اور چونکہ وہ آنکھ کان وغیرہ بدی کے تمام راستوں کی حفاظت کرتا ہے اس لیے ہر دروازہ کا فرشتہ اسے مبارکباد دے گا (الرعد ۱۳/۲۴-۲۵)

چھٹے درجہ پر انسان اپنے آپ کو بے جان ہتھیار کی طرح خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے آیت بلٰی مَنْ اسلم وجھہٗ للّٰہِ وھو محسنٌ فلہٗ اجرہٗ عند ربّہٖ (بقرہ ۲/۱۱۳) میں اسی مقام کی طرف اشارہ ہے حدیث میں اسی مقام کے لوگوں کے متعلق آتا ہے کہ خدا ان کی آنکھیں اور کان اور ہاتھ پاؤں بنجاتا ہے

ساتویں درجہ کا ذکر ثمّ انشاْنٰہُ خلقًا اٰخر میں کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ پہلے تو وہ خدا کے بلائے بولتا تھا مگر اس مقام پر جو کچھ وہ کہتا ہے خدا تعالےٰ بھی اس کے مطابق اپنے احکام جاری کر دیتا ہے۔ اور اسی کی زبان خدا کی زبان ہو جاتی ہے وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحیٌ یوحٰی (نجم ۵۳/۴-۵)

۱۹ یہ وہی خبر ہے جو قرآن میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے مثلاً سورہ سجدہ ۳۲/۶ میں تبلایا ہے کہ اسلام مخالفت کے باوجود قائم ہو جائے گا۔ اور پھر لوگوں کے بگڑنے (یعنی تین صدیوں کے بعد) ایک ہزار سال میں دنیا سے اٹھ جائے گا۔ اس نزول کی خبر کے ساتھ یہ بھی خبر تھی کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا گیا تو ایک فارسی الاصل اسے دنیا میں واپس لائے گا۔ یہ زمانہ مسیح موعود کی پیشگوئی تھی جس کی علامات قرآن و حدیث میں مذکور ہیں (دیکھیں نوٹ سورہ تکویر آیت ۲)

۲۰-۲۱ جیسے مادی پانی سے باغ تیار ہوتے ہیں جو ہمیشہ مختلف قسم کے تازہ پھل دیتے رہتے ہیں اسی طرح

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ۝	(۲۱) اور ہم نے تمہارے لیے) وہ درخت بھی پیدا کیا ہے) جو طور سینا سے نکلتا ہے۔ جو اپنے اندر تیل لے کر اگتا ہے۔ اور کھانے والوں کے لیئے سالن لیکر بھی۔
وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۝ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝	(۲۲) اور تمہارے لیے چارپایوں میں بڑی عبرت ہے۔ ہم تم کو اس چیز سے جو ان کے پیٹ میں ہوتی ہے پلاتے ہیں۔ اور ان چارپایوں میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے نفعے ہیں اور تم ان میں سے بعض کو کھاتے ہو۔
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ ع	(۲۳) اور ان پر اور کشتیوں پر اٹھائے جاتے ہو۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝	(۲۴) اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف مبعوث کیا۔ پس اس نے کہا۔ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا اور کوئی تمہارا معبود نہیں۔ کیا تم اس کا تقوےٰ اختیار نہیں کرتے؟
فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	(۲۵) اس پر اس کی قوم کے کافروں کے سرداروں نے کہا۔

روحانی پانی سے جو (اسلام کا) باغ لگایا گیا ہے وہ ہمیشہ تازہ پھل دیتا رہے گا اور ہر زمانہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی غلام پیدا ہو کر معجزات دکھاتا رہے گا۔ اور مسلمانوں میں پیدا شدہ خرابیوں کو دور کرتا رہیگا۔ زیتون کا تیل اچار کو محفوظ کرتا ہے اس کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ اسلامی تعلیم خراب ہونے سے محفوظ رہے گی

۲۳ لوگوں کا اسم اعظم اور عمل تسخیر وغیرہ کی دریافت کے لیے مارے مارے پھرنا اور باوجود سائنس میں کمال حاصل کرنے کے غیب معلوم کرنے کے لیے جوتشیوں کو ہاتھ دکھانا ظاہر کرتا ہے کہ مادی علوم ان کی پیاس بجھا نہیں سکتے۔ اور وہ فطرتی طور پر ایک بالا طاقت کا احساس رکھتے ہیں۔ یہاں تمثیلاً اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ جیسے تم خود گھاس سے دودھ نہیں بنا سکتے۔ خدا تعالےٰ جانور کی مشین میں ڈال کر بناتا ہے اسی طرح خالی عقل گھاس کی طرح ہے (اور موجب تسلی نہیں ہو سکتی) جب اس پر الہام نازل ہوتا ہے تو اس سے دودھ جیسی قیمتی تعلیم دنیا کے سامنے آجاتی ہے جس کے ذریعہ انسان مورد وحی ہو جاتا ہے اور روح تسکین پالیتی ہے

۲۵ ۔ یہاں بتایا ہے کہ انبیاء کے دشمن ہمیشہ حریت کے نام پر ان کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے ہم غلامی کیسے کر سکتے ہیں۔ ابلیس نے بھی یہی کہا تھا۔ کہ میرے اندر حریت کی آگ پائی جاتی ہے میں آدم کی غلامی کیسے کروں (ص ۲۹/۸) ابولہب نے بھی اسی لیے آنحضرت صلعم کی غلامی قبول نہیں کی تھی کہ وہ ناری طبیعت رکھنے والوں کا سردار تھا (جبھی ابولہب کہلایا) ولو شاء اللہ لانزل ملٰئکۃ۔

مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ

یہ شخص تو فقط تمہارے جیسا ایک انسان ہے۔ (اور) چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت اختیار کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ پیغمبر ا بھیجنا چاہتا۔ تو فرشتوں کو اتارتا۔ ہم نے اپنے پہلے باپ داوؤں میں تو کوئی اس قسم کا واقعہ ہوتا سنا نہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝

(۲۶) یہ تو فقط ایک انسان ہے جس کو جنون ہوگیا ہے پس اس کے انجام کا کچھ دیر انتظار کرو۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝

(۲۷) (اس پر نوحؑ نے کہا) اے میرے رب! میری مدد کر۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے جھٹلاتے ہیں۔

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

(۲۸) پس ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ (جس کشتی کا ہم نے حکم دیا ہے اس) کو ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق بنا۔ پس جب ہمارا حکم آجائے اور زمین کا سوتا پھوٹ پڑے۔ تو اس (کشتی) میں ہر ایک جانور میں سے (جس کا ہم حکم دیں) ایک ایک جوڑا رکھ لے اور اپنے رشتہ داروں کو بھی ان کے سوا جن کے خلاف ہمارا حکم پہلے سے اتر چکا ہے سوار کر دے اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کر کیونکہ وہ تو ضرور غرق کیے جائیں گے۔

یعنی انسان کو تو ہم پر فضیلت نہیں اس لیے ہم اس کی غلامی نہیں کر سکتے۔ اطاعت کر دانی غنی تو خدا تعالیٰ فرشتوں کو عالم بنا کر بھیجتا۔ یا پھر اس کے ساتھ (نظر آنے والے) فرشتے بھیجتا تاکہ ہم سمجھ لیتے کہ وہ سچا ہے۔

۲۶ چونکہ مخالفت کے باوجود انبیاء کامیاب ہو جاتے ہیں اس لیے دشمن کہنے لگتا ہے کہ یہ کامیابی جنون کی مدد سے ہے خدائی نصرت سے نہیں اس لیے دیرپا نہیں ہوگی۔

عیسائی کہتے ہیں آنحضرتؐ کو مخالف مجنون کہتے تھے اس لئے آپؐ میں ضرور کوئی دماغی نقص ہوگا مگر مسیح کو بھی ایسا کہا گیا ہے (دیکھیں یوحنا $\frac{۱۰}{۱۹-۲۰}$ اور اعمال $\frac{۲۶}{۲۴}$) اس لیے اگر لوگوں کے کہنے کی وجہ سے کوئی مجنون ہو سکتا ہے تو پہلے مسیح مجنون تھا اس لیے وہ نجات دہندہ نہیں ہو سکتا۔ در اصل انبیاء کی تعلیم زمانہ کی رو کے خلاف ہوتی ہے اور باوجود مخالفت کے وہ گھبراتے نہیں اسلئے لوگ انہیں مجنون کہنے لگ جاتے ہیں

۲۷-۲۸ ۔ عین کے معنے حفاظت کے بھی ہیں میری حفاظت میں کشتی بناؤ کہنے میں یہ اشارہ تھا کہ کامیابی ہوگی

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥

(۲۹) پس جب تُو اور تیرے ساتھی کشتی میں اچھی طرح بیٹھ جائیں۔ تو تم میں سے ہر ایک کہے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ جس نے ہمیں ظالموں کی قوم سے نجات دی۔

وَوَحْيِنَا:۔ میں یہ اشارہ ہے کہ ایک کشتی (یعنی تقوٰی) وحیِ الٰہی کی اتباع سے تیار ہوتی ہے۔ عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے یہ کشتی بھی تیار کرو۔ "فُلک" سے مراد ظاہری کشتی کے علاوہ جماعت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ نبی کی جماعت میں شامل ہونے سے بھی لوگوں کو نجات ملتی ہے۔

تنّور کے معنے ہیں سطحِ زمین، چشمہ، ایسی پہاڑی وادی جس میں پانی جمع ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ عذاب کے وقت چشموں سے پھوٹ کر سطحِ زمین پر چاروں طرف پانی پھیل گیا۔ مجازاً فارَ التنّور کے یہ معنے بھی ہیں کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذاب آسمانی اور زمینی پانیوں کے ملنے سے آیا تھا یعنی اصل وجہ تو کثرتِ بارش تھی لیکن اس کے ساتھ چشموں سے بھی پانی پھوٹ کر سطحِ زمین پر پھیل گیا تھا۔ اور وادیوں میں چڑھ گیا تھا۔ (ہود $\frac{11}{44}$) سے ظاہر ہے کہ نوحؑ پہاڑی وادی میں رہتے تھے۔ ایسی جگہ پر پانی کا یک دم اونچا ہو جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔

مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ:۔ یہاں کُل سے مراد سب کچھ کے نہیں بلکہ ہر ضروری چیز کے ہیں کیونکہ دنیا کے سب جانوروں کا کشتی میں سمانا ناممکن ہے۔ ملکۂ سبا کے متعلق آیت اُوتیت من کُلِّ شیءٍ (نمل $\frac{27}{24}$) میں بھی کُل انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کشتی سے جماعت مراد لی جائے تو اس میں ہر قسم کے جانور رکھنے کے حکم کے یہ معنے ہوں گے کہ جماعت کو پھیلانے کے لیے ہر طبقہ اور ہر قسم کے ایسے لوگوں کو اکٹھا کرو جو جوڑوں کی مانند ہوں یعنی آپس میں تعاون کی رُوح رکھتے ہوں۔ جیسے آنحضرت صلعم نے مہاجرین و انصار کو بھائی بھائی بنا دیا تھا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ:۔ میں اشارہ ہے کہ جب عذاب کا قطعی فیصلہ ہو جائے تو دعا کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ جیسے قوم لوطؑ کے لیے دعا سے حضرت ابراہیمؑ کو منع کیا گیا تھا۔ (ہود $\frac{11}{47}$) ظلموہم کہہ کر بتایا کہ ان کی ہلاکت ان کے متواتر ظلموں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۲۹ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ ...... مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥ یعنی قوم کے مظالم سے بچ جانا فضلِ الٰہی ہے اس لیے کشتی یا جماعت تیار ہونے پر خدا تعالیٰ کی حمد کرو۔

حضرت نوحؑ کو یہ علم کہ پانی کم ہو گیا ہے (اور دشمن مغلوب ہو گیا ہے) ایک کبوتری کے منہ میں زیتون کی پتّی

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝	(۳۰) اور تو (کشتی سے اترتے وقت) کہہ کہ اے میرے رب تو مجھے (اس کشتی سے) ایسی حالت میں اُتار کہ مجھ پر کثرت سے برکتیں نازل ہو رہی ہوں اور مجھے اس دعا کی بھی کیا ضرورت ہے جبکہ تمام اُتارنے والوں سے بڑا وجود بہتر ہے۔
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ۝	(۳۱) اس میں بہت سے نشان ہیں۔ اور ہم یقیناً بندوں کا امتحان لینے والے ہیں۔
ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ۝	(۳۲) پھر ہم نے اُن کے بعد کئی قومیں پیدا کیں۔

دیکھ کر حاصل ہوا تھا ۔ یہی زیتون کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے ثبوت میں بھی پیش کیا گیا ہے (تفصیل دیکھیں سورۃ التین کے نیچے) زیتون کی پتی دیکھنے سے مراد عروۃ وثقی کو پکڑنا ہوتی ہے (تعطیر الانام) اس لیے زیتون کے ذریعہ آنحضرت صلعم کو بھی اور نوحؑ کو بھی مضبوط جماعت ملنے کی خبر دی گئی تھی۔

۳۰ ظاہری کشتی میں یہاں مبارک جگہ ٹھہرنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اور جماعت کی صورت میں یہ کہ جماعت اپنے مقصد کو پالے اور ایسی ترقی حاصل کرلے جو مبارک ہو۔

جس مقام پر نوحؑ کی کشتی ٹھہری اس کا نام قرآن نے جودی رکھا ہے (ہود ۱۱/۴۴) اور بائیبل نے ارارات رکھا ہے (پیدائش ۸/۴) جُود کے معنے رحمت و احسان کے ہیں اور ارارات کے معنے ہیں میں رحمت کی جگہ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں"۔ اس لیے ان ناموں میں کوئی اختلاف نہیں۔

۳۱ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ۔ یعنی یہ واقعہ بطور قصہ بیان نہیں کیا گیا بلکہ محمد رسول اللہ اور آپؐ کی قوم کو بھی اسی طرح آزمایا جانے والا ہے اور اسے بھی ایسے ہی حالات پیش آنے والے ہیں۔ چنانچہ نوحؑ کی طرح آنحضرتؐ کو بھی ہجرت کرنی پڑی۔ نوحؑ کی کشتی جودی پر ٹھہری تھی۔ اسی طرح مدینہ بھی وہ جودی تھا جس پر آنحضرت صلعم اور آپؐ کی جماعت لنگر انداز ہوئی۔ نوحؑ کو زیتون کی پتی کے ذریعہ جماعت کی آئندہ ترقی کی خبر دی گئی تھی۔ یہی معاملہ آنحضرت صلعم سے ہوا۔ چنانچہ دیکھ لو موسیٰؑ کو تو اس کی قوم نے کہا کہ جا تو اور تیرا رب دونوں دشمنوں سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ کو ایسی مضبوط ایمان والی جماعت ملی جس نے کہا کہ ہم آپؐ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی اور دشمن ہماری لاشوں کو روندے بغیر آپؐ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اسنے عملاً ایسا کر بھی دکھایا۔

۳۲ قرآن کریم کا (اعراف ۹ میں) بتانا کہ قوم نوحؑ کی ہلاکت کے بعد عاد کو ہم نے اس کا جانشین بنایا تھا اور پھر انہی اعتراضات کا ذکر کرنا جو عاد نے کئے تھے (دیکھو اعراف ۶۵/۷۱-۷۲) بتاتا ہے کہ اس جگہ قرناً اخرین میں عاد ہی کا ذکر ہے۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(۳۴) اور ہم نے ان میں انہی میں سے رسول بھیجا۔ (یہ پیغام دیتے ہوئے) کہ اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ کیا تم اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچاتے نہیں؟

ع ۲

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝

(۳۴) اور اس (نئے رسول) کی قوم میں سے جنہوں نے کفر کیا تھا اور بعد الموت (خدا سے ملنے) کا انکار کیا تھا۔ اور جن کو ہم نے اس دنیا کی زندگی میں مالدار بنایا۔ ان کے سرداروں نے کہا۔ یہ تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہے۔ انہی (کھانوں) میں سے کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ اور انہی (پانیوں) میں سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

(۳۵) اور اگر تم اپنے جیسے ایک آدمی کی بات مانو گے۔ تو تم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝

(۳۶) کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم (پھر زندہ کرکے) نکالے جاؤ گے۔

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝

(۳۷) جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ عقل سے بہت ہی دور ہے۔ اور ماننے کی بات نہیں۔

اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝

(۳۸) زندگی تو صرف ہماری اسی دنیا کی زندگی ہے ہم کبھی مُردہ حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی زندہ حالت میں۔ اور ہم کبھی مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۳۹) یہ تو (صرف) ایک اکیلا شخص ہے جو اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹا افتراء کرتا ہے۔ اور ہم اس (کی باتوں) کو کبھی نہیں مانیں گے۔

---

۳۴ :- مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ :- یہ اعتراض کہ انسان کیوں نبی بنا کر بھیجا گیا۔ مخالف ہمیشہ ہی کرتے رہے ہیں اسکی ایک وجہ مخفی کبر ہے دوسرے ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان خود اپنی عقل سے نجات کی راہ معلوم کر سکتا ہے اس لیے نبی کی ضرورت ہی نہیں۔ تیسرے ان کا یہ خیال کہ نبی ما فوق الانسانیت طاقتوں والا وجود ہونا چاہیے لیکن خدا تعالیٰ ہمیشہ انسان کو ہی نبی بنا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ نمونہ بن سکیں۔

۳۷-۳۹ :- ان هی الا حیاتنا الدنیا میں بتایا کہ انکار انبیاء کی ایک وجہ مخالفوں کا یہ خیال ہے کہ

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ (۴۰) (اس پر) اس نے کہا۔ اے میرے رب! ان لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ ۝ (۴۱) تب خدا تعالیٰ نے) فرمایا۔ یہ لوگ تھوڑے ہی عرصہ میں شرمندہ ہو جائیں گے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۴۲) اور ان کو ایک عذاب نے پکڑ لیا۔ جس کی پختہ خبر دی گئی تھی۔ اور ہم نے ان کو کوڑا کرکٹ بنا دیا۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ) ظالموں کیلئے خدا کی لعنت (مقدر کر دو)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ۝ (۴۳) پھر ان کے بعد ہم نے کئی اور قومیں پیدا کیں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ (۴۴) کوئی قوم اپنی مدت سے آگے نہیں گذرتی۔ اور نہ ہی اس سے پیچھے رہ (کر بچ) سکتی ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۵) پھر ہم نے اپنے رسول متواتر بھیجے جب کبھی کسی قوم کے پاس اس کا رسول آتا تھا وہ اسکو جھٹلاتے تھے۔ پس ہم ان میں بعض کو بعض کے پیچھے بھیجے چلے جاتے تھے (یعنی ہلاک کرتے جاتے تھے) اور ہم نے ان سب کو گذشتہ افسانے کر کے رکھ دیا (یعنی دنیا میں ان کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اور ان کے متعلق فرشتوں کو حکم دیا کہ) جو لوگ ایمان نہیں لائے ان کے لئے خدا (کی لعنت مقدر کر دو)

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ (۴۶-۴۷) اس کے بعد ہم نے موسٰے اور اس کے بھائی ہارون کو اپنے نشان اور کھلی کھلی غلبہ دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ پس

سب اعمال اسی زندگی کے لیے ہیں کوئی حیات بعد الموت نہیں ہوگی اس لیے اس کی تیاری کی ضرورت نہیں لیکن اس قدر وسیع کائنات کا پیدا کرنا اور انسان کو اس پر حکومت بخشنا بتاتا ہے۔ کہ اس کی پیدائش کا کوئی بلند مقصد ہے جو اسلام کے نزدیک بلند روحانی ترقیات کا حاصل کرنا ہے۔

۴۲ الحاقہ ۶۹/۷ کی رو سے عذاب تیز ہوا کی صورت میں آیا تھا۔ فجعلنٰھم غثآءً کی صداقت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوگا کہ بعض یورپین محققین کو عاد کا وجود ماننے میں ہی مشکل پیش آگئی ہے۔ حالانکہ ان کا ذکر یونان میں لکھے گئے جغرافیہ میں موجود ہے۔

۴۵ قرآن کی رو سے حضرت نوحؑ کے بعد متواتر رسول آتے رہے۔ اور ان کی قومیں بوجہ نافرمانی کے

وَمَلَائِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۚ — انہوں نے تکبر کیا۔ اور وہ سرکش لوگوں میں سے بن گئے۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ — (۴۸) پھر انہوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں؛ حالانکہ ان دونوں کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے۔

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝ — (۴۹) پس انہوں نے ان دونوں (یعنی موسیٰؑ اور ہارونؑ) کو جھٹلا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ہلاک ہونے والے لوگوں میں سے بن گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ — (۵۰) اور ہم نے موسیٰؑ کو (وہ) کتاب دی (جس کو سب جانتے ہیں) تاکہ وہ (اور اس کی قوم) ہدایت پائیں۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۚ — (۵۱) اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا اور ہم نے ان دونوں کو ایک اونچی جگہ پر پناہ دی۔ جو ٹھہرنے کے قابل اور بہتے ہوئے پانیوں والی تھی۔

ع ۳

ہلاک ہوتی رہیں۔ مگر بائیبل کہتی ہے قوم نوحؑ کی ہلاکت کے بعد خدا تعالیٰ نے عہد کیا تھا کہ آئندہ لوگوں کو کبھی ہلاک نہیں کرے گا۔ (پیدائش ۸/۲۱) لیکن خود بائیبل کی رُو سے سدوم پر آگ برسائی گئی۔ فرعونیوں پر جوؤں، مینڈکوں، مچھروں اور ٹڈیوں کا عذاب نازل کیا گیا۔ (خروج ۸/۱۰-۸، ۱۰/۱۴-۱۲، ۹/۲۴) اور اولے اور آگ برسائی گئی (خروج ۹/۲۴-۲۲) اس لیے قرآنی بیان صحیح اور بائیبل کا غلط ہے۔ ورنہ اگر خدا کا عذاب نازل نہ کرنے کا وعدہ ہوتا۔ تو وہ یہ کیوں کہتا کہ خدا وند تیرا خدا بھسم کرنے والی آگ ہے (استثناء ۴/۲۴)

۵۱ عربی میں اٰوٰی کا لفظ ہمیشہ ایسی جگہ بولا جاتا ہے جہاں احسان کے طور پر کسی مصیبت سے بچائے جانے کا ذکر ہو۔ (مثال کے لیے دیکھیں الضحیٰ ۹۳/۷، انفال ۸/۲۷، ہود ۱۱/۴۴، یوسف ۱۲/۷۰)۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب سے پہلے حضرت مسیحؑ پر بڑی مصیبت کا کوئی زمانہ نہیں گذرا۔ ہاں واقعہ صلیب واقعی ایک مصیبت تھی؛ اور گو مسیحؑ صلیب سے زندہ اُتر آئے تھے مگر وہ قیصر روم کے باغی قرار پا چکے تھے۔ شام میں رہتے تو دوبارہ گرفتار ہو جاتے اس لیے خدا تعالیٰ نے انہیں دشمنوں کی دست درازی سے محفوظ کر کے یعنی **کشمیر میں پناہ دے دی**۔ کشمیری اب تک کشمیر کو کشیر کہتے ہیں۔ اصل میں یہ عبرانی لفظ کاشیر ہے جس کے معنے ملک شام کی مانند ہیں۔ الف کثرت استعمال سے ساقط ہو کر کاشیر رہ گیا۔ یہ لفظ خود حضرت مسیحؑ کے سفر کشمیر کی طرف صریح اشارہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ سے ثابت ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا جو شہزادہ نبی کہلاتا تھا محلہ خانیار

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

(۵۲) (اور ہم نے کہا) اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ۔ اور مناسب حال عمل کرو۔ (اور) میں اس کو جو تم کرتے ہو جانتا ہوں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝

(۵۳) اور یہ تمہاری جماعت (یعنی نبیوں کی) ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس مجھے ہلاکت سے بچنے کیلئے اپنی ڈھال بناؤ۔

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝

(۵۴) جس پر انہوں (یعنی کفار) نے شریعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور جو ٹکڑا اپنے لئے اختیار کیا اس پر فخر کرنے لگ گئے۔

فَذَرْهُمْ فِىْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (۵۵) پس تو ان کو ایک مدت تک اپنی غفلت میں پڑا رہنے دے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ (۵۶) کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا ان کو مال اور بیٹوں سے

میں اس کی قبر "یوز آسف" کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لفظ "یسوع آصف" کا بگڑا ہوا ہے۔ آصف عبرانی میں اسے کہتے ہیں جو اپنی قوم کو تلاش کرنے والا ہو۔ یہ نام مسیحؑ کو اس لیے دیا گیا کہ وہ بنی اسرائیل کے ان دس قبائل کی تلاش میں نکلے تھے۔ جن کو بخت نصر غلام بنا کر کشمیر اور افغانستان لے آیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے خود اس مشن کا ذکر کیا ہے۔ دیکھو متی ۱۵/۲۴، یوحنا ۱۰/۱۶، متی ۱۰/۶۔

۵۲ یہاں خطاب رسولوں سے ہے مگر مراد ان کے متبع ہیں۔ جیسے بنی اسرائیل آیت ۲۴ میں مخاطب آنحضرت صلعم ہیں۔ مگر مراد مسلمان ہیں کیونکہ آپؐ کے والدین آپ کے بچپن ہی میں وفات پا چکے تھے۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ روح جسم کا اثر قبول کرتی ہے اور جسم غذا کا۔ اسی لیے حلال اور طیب اشیاء کھانے کا حکم ہے۔ اور جسمانی، اخلاقی یا روحانی طور پر ضرر رساں چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔ کیونکہ حرام خوری بیسیوں ایسے عیب پیدا کرتی ہے جو روحانی ترقی میں روک بن جاتے ہیں۔

۵۳ یعنی تمام انبیاء کا ایک ہی مشن ہوتا ہے۔ اور سب ہی نے توحید کی تعلیم دی ہے اس لیے ابن اللہ کا مسئلہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

۵۴-۵۵ یعنی نبوت سے بعد ہونے پر نبیوں کے پیروؤں نے ان کی تعلیم کو اور اور شکلیں دے دیں۔ چونکہ ہر فرقے نے سچے مذہب ہی کے ٹکڑے کئے تھے اس کے پاس کچھ نہ کچھ صداقت تھی جسے وہ اپنے حق پر ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے۔ مگر سچا صرف وہ ہو سکتا ہے جس کے پاس کامل تعلیم ہو۔

۵۶-۵۷ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کو ان کے بلند درجات کی وجہ سے ملی ہیں مگر حقیقت میں یہی ان کو تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۙ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ (۵۶) بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

وہ دینا ان کو نیکیوں میں جلد جلد بڑھانا ہے؟ (ایسا نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال کو) سمجھتے نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ (۵۸) رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۙ

وہ لوگ جو اپنے رب کے ڈر سے کانپتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ (۵۹) يُؤْمِنُوْنَ ۙ

اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۙ (۶۰)

اور جو اپنے رب کا شریک کسی کو نہیں بناتے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ (۶۱) قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ

اور جو خدا تعالےٰ کے بخشے ہوئے مال کو (آگے مستحقین کو) دیتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دل اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں ایک دن اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا۔

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (۶۲) وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝

یہی لوگ نیکیوں میں جلدی کرنے والے ہیں۔ اور وہ ان (نیکیوں) کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۶۳) وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

اور ہم کسی جان کے ذمہ کوئی کام نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور ہمارے پاس ایک اعمال نامہ ہے جو سچی بات کہتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ (۶۴) هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝

لیکن ان کے دل تو اس تعلیم کے متعلق غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور اس کے سوا ان کے اور بھی بہت سے (خوب نہیں) اعمال ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔

۵۸-۶۱ ان آیات میں اشارہ ہے کہ کفر و اسلام کے مقابلہ میں وہی فریق کامیاب ہوگا جس میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان نیکی کرے اور ساتھ ہی خدا سے ڈرتا بھی رہے (فتح البیان)

۶۲ یہاں توجہ دلائی ہے کہ مومن کا کام ہر میدان میں دوسروں سے آگے نکلنا ہے۔

۶۳ فرماتا ہے کہ ہم نے تو یہ کہا ہے کہ نیکیوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ لیکن ہم انسان سے اتنی ہی امید رکھتے ہیں جتنی اس میں طاقت ہو۔ اسلام طبائع کے اختلاف اور طاقتوں کی کمی بیشی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ مثلاً نساء ۹۶ میں فرماتا ہے۔ کہ بیٹھ رہنے والے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں

ہو سکتے ۔ سوائے ان کے جنہیں کوئی تکلیف لاحق ہو ۔ یعنی ان کی معذوری کو مدنظر رکھا جائے گا ۔ آیت
والوزن یومئذٍ الحق (اعراف ۷/۸) میں بھی اشارہ ہے کہ جزا سزا کے وقت دیکھا جائے گا ۔
کہ کون طبعی طور پر معذور تھا ۔ اور کس نے غفلت سے اعمال ترک کئے ۔ غرض اسلامی شریعت میں ایسی
لچک موجود ہے کہ ہر طبیعت کا انسان اس پر عمل کر سکتا ہے لیکن عیسائیت شریعت کو لعنت قرار دیتی ہے
(گلیتوں ۳/۱۳)۔

ولدینا کتاب ینطق بالحق وھم لا یظلمون :۔ حق کے معنے اس چیز کے بھی
ہیں جو حکمت کے مطابق ہو ۔ اور یہ لفظ اعمال شریعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ پہلے حصہ آیت
میں بتایا تھا کہ اسلامی شریعت پر ہر آدمی عمل کر سکتا ہے ۔ یہاں اس شریعت کی بعض اور خصوصیات
پر روشنی ڈالتا ہے ۔ اور بتاتا ہے کہ ینطق بالحق اس کے تمام احکام پر حکمت ہیں ۔ اور یہ تمام شریعتوں
پر بلحاظ کامل ہونے کے افضل ہے ۔ جہاں تک حکمت کا سوال ہے قرآن نے صرف مضر باتوں سے روکا ہے
اور صرف مفید کاموں کا حکم دیا ہے ۔ (مثلاً نماز کا حکم اس لیے ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن
الفحشاء والمنکر (عنکبوت ۲۹/۴۶) فحشاء نظر آجانے والے عیوب کو کہتے ہیں ۔ اور منکر ہر ایسے
قول و فعل کو جو اللہ تعالےٰ کو ناپسند ہو ۔ ظاہر ہے کہ جب دن بھر نمازوں میں ان منعمین میں شمولیت ۱
کی التجا کی جائے گی جن کا ذکر ۱/۷ میں ہے تو لازماً انسان فحشاء اور منکر سے بچ جائے گا (تفصیل
کے لیے دیکھیں تفسیر فاتحہ) پھر اھدنا الصراط المستقیم کہتے ہوئے مومن "ھم" کا لفظ استعمال
کر کے دوسروں کی ہدایت کی بھی دعا کرتا ہے ۔ چونکہ یہ دعا خدا تعالےٰ نے خود سکھلائی ہے ضرور ہے کہ
قبول ہو ۔ اور اگر قبول ہوگی تو موجب ہدایت بھی ہوگی ۔ صرف شرط یہ ہے کہ دعا حضور قلب سے خدا تعالےٰ
کی قدرتوں پر اور اس بات پر یقین رکھ کر کی جائے کہ خدا تعالےٰ التجاؤں کو سنتا ہے ۔

پھر روزہ ہے : جو شخص روزہ رکھ کے اپنی روٹی پانی بھی خدا کے حکم کے ماتحت چھوڑ دے گا ۔ وہ
دوسروں کی روٹی کیوں کھائے گا ۔ اسی طرح قربانی کے حکم میں حکمتیں ہیں ۔ (دیکھو ۲۲/۳۸)

پھر الحق کے معنے مضبوط اور قائم رہنے والی قطعی اور فیصلہ شدہ بات کے بھی ہیں ۔ فیصلہ
شدہ بات وہی ہوتی ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہو ۔ اور قائم بھی کامل چیز ہی کو رکھا جاتا ہے ۔ اس لیے و
لدینا کتاب ینطق بالحق میں قرآن کی اکملیت کا دعویٰ کیا گیا ہے ۔ مائدہ ۵/۴ میں بھی یہی
دعویٰ کیا گیا ہے اور ۵/۴۹-۵۲ میں بھی بتایا گیا ہے کہ چونکہ ایک کامل کتاب نازل کر دی گئی ہے ۔
تمہیں چاہیے کہ دوسروں کی اپنی نہ سنو ورنہ الٰہی باتوں کو چھوڑنا پڑے گا کیونکہ دو میں سے ایک ہی
کی بات ایک وقت میں مانی جا سکتی ہے ۔ ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ یعنی خدا
تعالیٰ چاہتا تو سب کو اس کامل شریعت پر عمل کرنے کے لیے مجبور کر سکتا تھا ۔ لیکن جبر سے انسان ثواب

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ؕ
(۶۵) یہاں تک کہ ہم ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ تو اچانک وہ فریادیں کرنے لگ جاتے ہیں۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝
(۶۶) (اس وقت ہم ان سے کہتے ہیں) آج فریادیں نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد نہ پہنچے گی۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۙ
(۶۷) میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں مگر تم ان آیات (یعنی مجموعہ قرآن) سے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے اور

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝
(۶۸) بیہودہ باتیں کرتے ہوئے اور اس سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جایا کرتے تھے۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۡ
(۶۹) کیا ان لوگوں نے اس قول (یعنی قرآن) پر غور نہیں کیا یا ان لوگوں کو وہ (وعدہ) ملا ہے جو ان کے پہلے باپ دادوں کو نہیں ملا تھا۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ
(۷۰) کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا جس کی

کا مستحق نہیں رہتا۔ اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور ساتمکسدانوں اور منافقوں کو زندہ رکھا لِيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰكُمْ تاکہ دیکھیں کہ کون خدا کی رضا کے اور کون ان لوگوں کے پیچھے چلتا ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی تمہیں چاہیے کہ ہم نے جو اعلیٰ سے اعلیٰ قرآنی سکیمیں پیش کی ہیں ان کے پیچھے چلو۔ کیونکہ انسان کا بنایا ہوا قانون الٰہی قانون کے برابر نہیں ہو سکتا۔ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا ۵/۵ پھر فرمایا۔ یہود، نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ کیونکہ یہ تمہارے دشمن ہیں اس بات کو برداشت ہی کب کر سکتے ہیں کہ تم ترقی کر جاؤ۔ یہ خواہ کچھ کہیں بات اپنے ہی فائدہ کی کریں گے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا میں بتایا کہ حق کو قبول نہ کرنا ایک تو اس کلام کی طرف صحیح توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اور دوسرے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے۔

ان آیات سے یہی پتہ لگتا ہے کہ قرآن جو حق کسی کا مقرر کر دے اسے ضرور دل کر دیتا ہے اس لیے یہ خیال کہ قرآن نے تو خلافت حضرت علیؓ کا حق بتایا تھا مگر دوسروں نے اسے غصب کر لیا۔ صرف احکام الٰہی سے غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

۶۵-۶۶ یعنی خدا کی منشاء کو پورا نہ کرنے والے بعض دفعہ دولت کو تو حاصل کر لیتے ہیں مگر دولتیں ان کو عذاب الٰہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اور عذاب آنے پر ان کا چلانا بے سود ہوتا ہے۔ کیونکہ الٰہی عذاب اتمام حجت کے بعد آیا کرتا ہے

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۚ — وجہ سے وہ اس کا انکار کر رہے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ — (۷۰) کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے۔ (مگر ایسی بات نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ۭ — (۷۱) اور اگر حق ان کی خواہشات کی اتباع کرتا۔ تو آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر بستے ہیں تباہ ہو جاتے حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس ان کی عزت کا سامان لے کر آئے ہیں۔ اور وہ اپنی عزت کے سامان سے اعراض کر رہے ہیں۔

---

۷۰ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ: یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے ۴۰ سال تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کو دیکھا۔ اور انہیں میں سے النضر بن حارث اور ابوجہل جیسے شدید مخالفوں نے بھی آپؐ کی راستبازی امانت و دیانت کو تسلیم کیا۔ اور امیہ بن خلف نے کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بات کرتا ہے تو سچی کرتا ہے۔ پھر بھی دشمنوں نے تکذیب کی۔

۷۱ جب مخالفوں نے دیکھا کہ آپؐ کو جھوٹا تو نہیں کہہ سکتے۔ تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ جھوٹا تو نہیں ہاں اس کا جنات سے تعلق ہے۔ فرماتا ہے یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ بل جآءھم بالحق ہمارا نبی تو ہر ضرورت پوری کرنے والی تعلیم لایا ہے۔ کیا جنات سے تعلق رکھنے والوں نے کبھی ایسی تعلیم پیش کی ہے۔ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۔ فرمایا۔ انکار کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے نبی میں کوئی عیب ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ حق پر عمل کرنے کے لیے جو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں ان کے لیے وہ تیار نہیں اس لیے مخالفت کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

۷۲ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ یعنی قرآنی تعلیم ہی تو ان کے لیے شرف اور بزرگی تھی ہے اسے چھوڑ کر وہ ترقی سے منہ موڑ رہے ہیں۔ آخر یہ قرآنی تعلیم ہی تھی جس کی وجہ سے عرب جنہیں کوئی سیاسی، تمدنی، اخلاقی، علمی امتیاز حاصل نہیں تھا۔ ایک دن دنیا کے معلم بن گئے۔ اور قیصر و کسریٰ کی حکومتیں بھی ان سے ٹکرائیں۔ تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی حیثیت صرف ایک شریف تاجر کی تھی۔ مگر آنحضرت صلعم کی پیروی سے ایسا مقام ملا کہ جب خلیفہ ہوئے تو آپؓ کے والد کو بھی یقین نہیں آتا تھا کہ ان کا بیٹا یہ مرتبہ پا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو دیکھ لو۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اکیلے اونٹ چرایا کرتے تھے — اور ایک دفعہ باپ نے اس لیے مارا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے سو کیوں گئے تھے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(۷۳) کیا تو اُن سے کوئی تاوان مانگتا ہے۔ (ایسا نہیں ہو سکتا) کیونکہ تیرے رب کا دیا ہوا مال بہت اچھا ہے۔ اور وہ (رب) بہترین رزق دینے والا ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(۷۴) اور تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝

(۷۵) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ (سچے) راستے سے ہٹنے والے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

(۷۶) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو ضرر ان کو پہنچ رہا ہے۔ اس کو دور کر دیں۔ تو وہ اپنی سرکشی میں اور بھی بڑھ جائیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝

(۷۷) اور ہم نے ان کو سخت عذاب میں جکڑ رکھا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے رب کے سامنے عاجزانہ طور پر نہیں جھکے۔ اور نہ اس کے سامنے گریہ وزاری کی۔

حَتّٰىٓ اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝

(۷۸) یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے۔

اور ایک وہ زمانہ آیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے جب مقام خلافت ملا تو آپ کے پسینہ پر لوگ خون بہاتے تھے۔

۷۳ یعنی اگر وہ ذاتی برتری کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے تو مکہ والوں سے کبھی تو کچھ مانگتے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ خود کفار کے لالچ دینے پر فرمایا کہ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کھڑا کریں پھر بھی میں اس پیغام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے مکہ والوں کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ وہ سب کچھ ان کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ پھر ان کو تائید الٰہی کا نشان دیکھنا چاہیئے تھا کہ آنحضرت کیسے بے یار و مددگار تھے۔ مگر خدا تعالےٰ نے کس طرح ہر طبقہ کے ہر قسم کی قربانی کرنے والے لوگ آپ کی غلامی میں شامل کر دیئے۔ اور آپ کو دولت و حکومت بخشی۔

۷۴-۷۵ فرمایا اگر تائید الٰہی کا نشان بھی کافی نہیں تھا تو وہ اتنا تو سوچتے۔ کہ تو انہیں صراط مستقیم کی طرف بلا رہا ہے۔ اسلام تیرہ سو برس سے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ صراط مستقیم وہی ہے جو آنحضرت نے دکھایا اسلئے دنیا اسے چھوڑ کر ہمیشہ تباہ ہوگی۔ اور واقعات نے ہمیشہ اس دعویٰ کو سچا ثابت کیا ہے چنانچہ یورپ نے اسلامی نظریات [illegible]

۷۶ فرماتا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان پر رحم کریں لیکن رحم کرنے پر وہ شرارتوں میں اور بھی بڑھ جاتے رہتا۔

۷۷-۷۸ فرماتا ہے ہماری غرض عذاب بھیجنے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ تضرع کریں اور ہماری طرف توجہ کریں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

(۷۹) اور وہ خدا ہی ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کیا ہے۔ لیکن تم بالکل شکر نہیں کرتے۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

(۸۰) اور وہی ہے جس نے زمین میں تم کو پھیلا دیا ہے۔ اور تم اسی کی طرف پھر اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(۸۱) اور وہی ہے جو تمہیں زندہ کرتا ہے۔ اور جو تمہیں مارے گا اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا اسی کے اختیار میں ہے کیا تم عقل نہیں کرتے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝

(۸۲) حقیقت یہ ہے کہ وہ وہی بات کہتے ہیں جو ان سے پہلوں نے کہی تھی۔

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝

(۸۳) انہوں نے کہا تھا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے؟

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

(۸۴) اس سے پہلے اسی بات کا وعدہ ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے کیا گیا تھا۔ (مگر ایسا نہیں ہوا) یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ

(۸۵) تو کہہ دے کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ تو سہی) یہ سب

تاکہ ہم قوم یونس کی طرح ان پر سے عذاب ہٹا لیں۔ مگر وہ عذاب آنے پر بھی اصلاح نہیں کرتے (۱۰/۹۸)

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) سزا اعمال کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر دی جاتی ہے دیکھیں ۷/۹ ، ۶/۱۶۴ ، ۲/۴۹ -- (۲) سزا جرم کے مطابق ہوتی ہے (۴۲/۴۱) (۳) اگر کسی کے نیک اعمال زیادہ ہوں تو سزا معاف کر دی جاتی ہے۔ (۷/۹) (۴) سزا کا فیصلہ ہو جائے تو کوئی سفارش قبول نہیں ہوتی (۲/۴۹)۔ (۵) سزا دینے میں بھی خدا تعالیٰ کے رحم کا پہلو غالب رہتا ہے (۶/۱۵۷)

ف ۷۹-۸۱ یہاں یہ اشارہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے بغیر کسی عمل کے اس زندگی کے لیے انسان کو آنکھ، کان دل وغیرہ دیئے ہیں۔ تو کیسے ممکن ہے کہ وہ روحانی زندگی کے لیے کوئی سامان نہ کرتا۔ پھر جیسے دنیا میں خدا تعالیٰ زندہ بھی کرتا ہے۔ اور مارتا بھی ہے۔ روحانی دنیا میں بھی انبیاء کے ذریعہ مردہ قوموں کو زندہ اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کرتا رہتا ہے۔ جیسے مادی دنیا میں رات آتی ہے۔ تو کئی آفات پیدا ہو جاتی ہیں مگر دن ان کو دور کر دیتا ہے۔ اسی طرح روحانی عالم میں دن رات کا آنا ضروری ہے۔

ف ۸۲-۸۴ مخالفین ہمیشہ کہتے ہیں۔ کہ مدتوں سے قیامت کا شور سن رہے ہیں مگر وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اس لیے

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہے؟
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا (۸۶) یقیناً وہ (اس کے جواب میں) کہیں گے اللہ کا۔ اس
تَذَكَّرُونَ ۝ پر تو کہدے۔ کیا تم سمجھ سے کام نہیں لیتے؟
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ (۸۷) (پھر) تو (ان سے) کہہ کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم
وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ کا ربّ کون ہے؟
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا (۸۸) وہ فوراً کہیں گے (یہ سب) اللہ کے ہیں۔ تو کہدے۔
تَتَّقُونَ ۝ کیا پھر تم (اس خدا کے ذریعہ سے تباہی) بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔
قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ (۸۹) (نیز) تو کہدے کہ کس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہت
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا ہے۔ اور وہ (سب کو) پناہ دیتا ہے۔ اُن اس کے
يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ عذاب کے خلاف کوئی دوسرا پناہ نہیں دے سکتا۔
تَعْلَمُونَ ۝ اگر تم جانتے ہو (تو اس کو سمجھ سکتے ہو)
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى (۹۰) وہ (اوپر کا سوال سُنکر) فوراً کہیں گے اللہ کے (قبضہ
تُسْحَرُونَ ۝ میں) اس پر تو کہدے کہ پھر تمہیں دھوکا دیکر کدھر لیجایا جارہا ہے؟
بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ (۹۱) حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور
لَكٰذِبُونَ ۝ وہ اس کے قطعی منکر ہیں۔
مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا (۹۲) اللہ (تعالیٰ) نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔ اور اسکے ساتھ
كَانَ مَعَهٗ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ کوئی معبود نہیں (اگر ایسا ہوتا) تو ہر معبود اپنی پیدا
كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا کی ہوئی اشیاء کو الگ کرکے لے جاتا۔ اور (ان معبودوں)
بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ سُبْحٰنَ میں سے بعض بعض پر ہلّہ بول دیتے۔ اللہ (تعالیٰ) پاک ہے،

یہ خیال ہی غلط ہے۔ حالانکہ اُخروی زندگی میں جو مجموعی طور پر جزا سزا دی جاتی ہے اس کا نام قیامت ہے۔ وہ نظر آہی کیسے سکتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی دن دنیا کا نظام ختم کرکے نئے سرے سے شروع کردیا جائے۔ لیکن قیامت اسی کا نام ہے۔ جو اوپر بیان ہوئی ہے در اصل یہ خیال کہ مرنے کے بعد انسان زندہ کیسے ہوسکتا ہے۔ خدائی طاقتوں کو اپنی طاقتوں پر قیاس کرنے کا نتیجہ ہے ورنہ جو ایک دفعہ پیدا کرسکتا ہے دوبارہ بھی کرسکتا ہے۔

تشریح ۸۹: یعنی جب سب بلندیاں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں۔ اور ہر چیز پر قبضہ بھی اسی کا ہے تو اعلیٰ روحانی تعلیم بھی صرف اسی کی طرف سے آسکتی ہے۔

اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ
اس سے جو یہ باتیں کرتے ہیں۔

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۠
(۹۳) وہ غیب کا بھی علم رکھتا ہے اور حاضر کا بھی (علم رکھتا ہے) پس جنکو وہ اس کا شریک بناتے ہیں اُن سے وہ بہت اونچا ہے

ع ۵ ۵

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ
(۹۴) تو کہدے اے میرے رب! اگر تو میری زندگی میں وہ کچھ دکھادے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝
(۹۵) تو اے میرے رب! تُو مجھے ظالم قوم میں سے نہ بنائیو (یعنی ان کے عذاب میں شریک نہ کیجیو)

وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝
(۹۶) اور ہم اس بات پر قادر ہیں۔ کہ جو ان سے وعدہ کرتے ہیں۔ تجھے دکھادیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝
(۹۷) تُو اُن کی بُری باتوں کو ایسی (رجوابی) باتوں سے دُور کر جو نہایت خوبصورت ہوں۔ ہم ان کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔

۹۱-۹۳ یعنی اگر کئی خدا ہوتے تو ہر ایک خدا کا الگ الگ نظام ہوتا۔ مگر اس صورت میں نظام عالم میں اختلاف ہونا چاہیئے تھا۔ چونکہ کروڑوں سال سے ایک ہی قانون نیچر چل رہا ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ خدا ایک ہے۔

۹۳ خدا کے لیے عالم الغیب والشہادہ ہونا ضروری ہے۔ مگر مسیح عالم الغیب نہیں تھے (مرقس ۱۳/۳۲) اس لیے وہ خدا نہیں ہو سکتے۔

۹۴-۹۵ آنحضرت ہی سے اختلاف کی وجہ سے تو کفار پر عذاب آنا تھا۔ اس لیے آپ کا اس میں شریک ہونا ناممکن تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ گو یہاں لفظ مفرد استعمال ہوا ہے مگر مراد ساری قوم ہے اور یہ دُعا سکھلائی گئی ہے کہ (۱) کفار پر عذاب آئے تو کسی کمزوری کی وجہ سے ہم بھی اس میں شریک نہ ہو جائیں (۲) جب کفار تباہ ہو جائیں اور حکومت ہمارے ہاتھ آجائے۔ تو اس وقت ہمیں عذاب کا مستحق بنانے والے اعمال سے بچانا۔

۹۶ عملاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی مکہ فتح ہو گیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دَور میں تو اسلامی حکومت نے اور بھی ترقی کی۔

۹۷ یعنی ظلم کا بدلہ بھی احسان اور عفو سے لینا چاہیئے۔ اور یہ ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ دشمن پھر شرارت نہ کرے۔ کیونکہ خدا ان کی تدابیر کو جانتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے عفو سے بعض خدا کے دشمن

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ

(۹۸) اور تو کہدے۔ اے میرے رب! میں سرکش لوگوں کی شرارتوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝

(۹۹) اور میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے (بھی) کہ وہ میرے سامنے آجائیں۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ

(۱۰۰) اور اس وقت جب ان میں سے کسی کی موت آجائیگی وہ کہیگا اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے۔ مجھے واپس لوٹا دے۔ مجھے واپس لوٹا دے۔

لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

(۱۰۱) تاکہ میں اس جگہ جس کو میں چھوڑ کر آگیا ہوں (یعنی دنیا میں) مناسب حال عمل کروں۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ یہ صرف ایک منہ کی بات ہے جسے وہ کہہ رہے ہیں اور انکے پیچھے ایک پردہ ہے اُس دن تک کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائینگے (لیکن دنیا کی طرف زندہ کرکے کبھی لوٹائے نہیں جائینگے)

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۝

(۱۰۲) پھر جب بگل میں پھونک ماری جائیگی تو اس دن ان کے درمیان کوئی قرابتیں باقی نہ رہیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(۱۰۳) پس جن کے وزن بھاری ہوجائیں گے وہ لوگ بامراد ہوں گے۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝

(۱۰۴) اور جن کے وزن ہلکے ہوجائیں گے۔ وہ لوگ گھاٹے میں پڑیں گے۔ (اور اپنی جانوں کو تباہ کردیں گے) اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوست بن جاتے ہیں (الم ۳۵)

۹۸-۹۹ همز کے معنے نچوڑنے یعنی تکلیف دینے کے بھی ہیں۔ یہاں یہی دعا سکھلائی ہے کہ الٰہی مجھے دشمن کے کچل دینے والے حملوں سے بچانا۔ بلکہ ایسا کرنا کہ وہ میرے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔

۱۰۰-۱۰۱ یہاں کافر کے مُنہ سے "رب" کا لفظ استعمال کراکے بتایا گیا ہے۔ کہ اس وقت وہ توحید الٰہی کا کھلے بندوں اقرار کرے گا۔ اور ارجعون جو جمع کا صیغہ ہے بتاتا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی عظمت و جامع کمالات ہونے کا اقرار کرے گا۔ مگر چونکہ یہ جمع کا صیغہ تکرار کے لیے بھی آتا ہے۔ اس لیے ارجعون میں کفار کی حیرت و گھبراہٹ کا بھی اظہار ہے کیونکہ اس کے معنے ہیں مجھے لوٹا دے۔ مجھے لوٹا دے۔

لعلی اعمل صالحًا یعنی میری بے حقیقتی مجھ پر کھل گئی ہے اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واپس جاکر نیک ہی عمل کرونگا۔ صرف امید کرتا ہوں۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ○ (۱۰۵) آگ ان کے موہنوں کو جھلسے گی۔ اور وہ اس میں روسیاہ ہو جائیں گے۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ○ (۱۰۶) (اور کہا جائیگا) کیا تمہارے سامنے میری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ اور تم ان کا انکار نہیں کرتے تھے؟

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ○ (۱۰۷) وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور ہم ایک گمراہ جماعت تھے۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ○ (۱۰۸) اے ہمارے رب! ہمیں اس (دوزخ) سے نکال۔ پس اگر ہم (ان گناہوں کی طرف) پھر لوٹیں تو ہم ظالم ہوں گے۔

قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ○ (۱۰۹) (خدا) فرمائیگا (دور ہو جاؤ اور) دوزخ میں چلے جاؤ اور مجھ سے کلام مت کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (۱۱۰) بات یہ ہے کہ میرے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو کہتا تھا کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں سو تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب رحم کرنیوالوں میں سے اچھا ہے۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ○ (۱۱۱) مگر تم نے ان کو ہنسی مذاق کا مورد بنا لیا۔ یہانتک کہ انہوں نے (تمہاری دلچسپی کا سامان بن کر) تم کو میری یاد بھلا دی اور تم ان سے ہمیشہ ہنسی کرتے رہے۔

اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (۱۱۲) ان کے صبر کرنے کی وجہ سے میں آج انکو مناسب حال، بدلہ دونگا۔ یقیناً وہ کامیاب ہوں گے۔

۱۰۲-۱۰۵ صور پھونکنے کے ایک معنے تو یہ ہیں۔ کہ اس دن کفار کو جواب دہی کے لیے جمع کیا جائیگا۔ دوسرے صور، صورۃ کی جمع بھی ہے۔ اس لیے یہ معنے بھی ہیں۔ کہ جب انسانی صورتوں میں روح پھونکی جائیگی وہ زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے اس سے ظاہر ہے کہ اگلے جہاں میں کوئی نہ کوئی جسم ضرور ملیگا۔ خواہ یہ مادی جسم نہ ہو۔ آگے فرمایا اس دن رشتہ داریاں کام نہیں آئیں گی صرف نیک اعمال کام آئیں گے فَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ: سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ اس لیے دوسرے کی طرف توجہ نہیں ہوگی۔ وجه کے معنے سوار کے بھی ہیں۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ ان کے سردار بھی عذاب پائیں گے اور اپنی کوتاہی پہ بے جا حسرت و افسوس کریں گے۔

۱۰۶-۱۱۲ یعنی عذاب آنے پر کافر کہیں گے کہ ہمیں واپس لوٹا دے۔ اگر پھر ہم نے وہی کام کئے تو بیشک سزا دے لینا۔ مگر خدا تعالیٰ کہے گا کہ دور ہو جاؤ جب مومن نیک عمل کرتے تھے تو تم ان پر ہنستے تھے۔ یہ غلبہ جو

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ٥ (۱۱۳) پھر وہ (یعنی خدا) فرمائے گا۔ کتنے سال تم زمین میں رہے ہو؟

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ ٥ (۱۱۴) وہ کہیں گے ہم ایک ہی دن یا دن کا کچھ حصہ زمین میں رہے ہیں۔ تو گننے والوں سے پوچھ لے۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ (۱۱۵) اس پر خدا تعالےٰ فرمائے گا۔ اگر تم سمجھ سے کام لو تو تم بہت تھوڑا عرصہ رہے ہو۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ٥ (۱۱۶) کیا تم یہ سمجھا کرتے تھے کہ ہم نے تم کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ٥ (۱۱۷) پس اللہ بڑی بلند شان والا۔ بادشاہ اور قائم رہنے والا۔ اور قائم رکھنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عرشِ کریم کا رب ہے۔

ہم نے ان کو بخشا ہے یہ تو ان کے صبر کی جزا ہے)

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں جس سے خفا ہوتا ہوں اس سے بات نہیں کرتا۔ مگر مسلمانوں کے نزدیک چونکہ یہ امت سب سے افضل ہے اس لیے اب خدا تعالےٰ اس کے کسی فرد سے کلام نہیں کرے گا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ٥

۱۱۳-۱۱۵ کفار چونکہ اپنی زندگی سب لہو ولعب میں گزار دیتے ہیں اس لیے یہ وقت ان کو تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ فرماتا ہے کہ کیا ہم نے تم کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا تھا۔ جو تم نے اپنی عمریں ضائع کر دیں (آیت ۱۱۴)

۱۱۶-۱۱۷ فرماتا ہے کیا دنیا بغیر مقصد کے کھیل کے طور پر بنائی گئی ہے؟ یہ خیال لغو ہے دنیا کے بنائے جانے کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی صفات الملک۔ الحق۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور رب العرش الکریم اپنا ظہور چاہتی تھیں۔ یہ صفات سورۃ فاتحہ میں مذکورہ صفاتِ الٰہیہ کے لیے بطور شرح ہیں۔ مگر فاتحہ میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ اس کے لحاظ سے موزوں تھی۔ اس جگہ جو ترتیب رکھی گئی ہے یہ پیدائش عالم کے لحاظ سے موزوں ہے۔

صفت ملک نے جلوہ گری چاہی تو صفت مالک یوم الدین ظاہر ہوئی۔ کیونکہ جزا سزا اس وقت تک مترتب نہیں ہو سکتی جب تک ملک کی طرف سے قانون نہ ہو۔ توحید کے ظہور کے لیے صفت رحمانیت ظاہر ہوئی جس نے تمام مخلوقات کو ان کی جائز ضروریات مہیا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ سوائے اللہ تعالےٰ کے کوئی خدا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توحید صفت رحمانیت کی قائل قوموں میں پائی جاتی ہے

ورنہ ہندوؤں نے اس صفت کا انکار کرکے تناسخ اور عیسائیوں نے کفارہ جیسے مشرکانہ عقائد ایجاد کر لیے ہیں۔ اَلْحَقّ کے معنے قائم رہنے والے۔ قائم رکھنے والے اور سچے وعدے کرنے والے کے ہیں اور چونکہ رحیم کے معنے کسی کے نیک کام کو ضائع نہ کرنے کے بھی ہیں۔ اس لیے الحق کا ظہور صفت رحیمیت کے ذریعہ ہوا۔

پھر رب العرش الکریم نے چاہا کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جس کی وہ ربوبیت کرے۔ تو وہ رب العالمین ہو کر ظاہر ہوا۔

یہ چاروں صفات ظلی طور پر ہر انسان میں پائی جاتی ہیں (اس میں ملک والی صفت بھی ہے جس کے ماتحت وہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا مظہر بنتا ہے۔ پھر ملکیت چونکہ نظام کامل پر دلالت کرتی ہے۔ انسان کو مدنی الطبع بنایا گیا ہے پھر صفت الحق کے ماتحت رحیمیت کی صفت ہے جو اخلاق فاضلہ اور درستی عمل پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے اخلاق فاضلہ فطرت انسانی میں داخل کیے گئے ہیں۔ پھر چونکہ الحق کے معنے سچا وعدہ کرنے والے کے بھی ہیں۔ خدا تعالےٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے۔ کہ وہ سچائی کو اس کی انتہائی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اس کے قیام کے لیے بے شمار قربانیاں پیش کرتا ہے جس کی مثالیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بے شمار ہیں۔ اسی طرح انسان صفت رحمانیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مثلاً والدین قطع نظر اس خیال کے کہ بچہ بڑا ہو کر انکے کام بھی آئے گا یا نہیں اس کی پرورش کرتے ہیں۔ پھر لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ کا مقام دیکھنے والا خود بھی توحید کے مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایسے مقام پر کہ خدا تعالےٰ اپنی توحید کی طرح اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اور اس کے مقابل ساری دنیا کی پروا نہیں کرتا۔ حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے کہ سید ولد آدم ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ آپؐ نے مقام توحید کے لیے ایسی کوشش کی کہ دنیا و ما فیہا آپؐ کی نظر سے غائب ہو گئی۔ اور اس وجہ سے کہ آپؐ کی نظر بجز خدا کے کسی طرف نہیں اٹھتی تھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو توحید کا مقام حاصل تھا۔ پھر صفت ربّ العٰلمین کے ماتحت سب ماں باپ اپنے بچہ کی تربیت کر رہے ہیں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس صفت کے ایسے کامل مظہر تھے کہ آپؐ نے آزاد و غلام مرد و عورت دوست و دشمن بلکہ حیوانوں تک کے حقوق محفوظ کرکے ان پر احسان کیا ہے)

دنیا میں صرف انہی چار صفات کے ماتحت امن قائم رہ سکتا ہے۔ اگر قانون اور اس کا نفاذ یا صحیح تربیت اور اہلی اور عائلی زندگی درست نہ ہو تو امن مفقود ہو جاتا ہے۔ قیام امن اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسلامی تعلیم اور رحمت الٰہی کے نظارے انسان کے سامنے رکھ کر اسے یقین دلایا جائے۔ کہ اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد ملے گی۔ ایسا یقین پیدا ہو جائے تو مومن موت آنے پر ڈرتا نہیں بلکہ خوش ہوتا ہے

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(۱۱۸) اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

(۱۱۹) اور تو کہدے۔ اے میرے رب! معاف کر۔ اور رحم کر۔ اور تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔

ع

کہ انعام ملنے کا وقت آگیا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ ایک مفرد شے نہیں بلکہ چار اعضاء، وعانی الملك الحق۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اور ربّ العرش الکریم کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس انسان صحیح رنگ میں اسی وقت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے والا سمجھا جا سکتا ہے۔ جب وہ ربّ العٰلمین، رحمٰن، رحیم اور مٰلِکِ یوم الدّین کی صفات کا مظہر ہو۔ ورنہ وہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی ایک حصّہ جسم کو پورا آدمی سمجھ لے۔

۱۱۸ یعنی غیر اللہ کو پکارنے والے کبھی اپنے مقصد کو نہیں پائیں گے۔ اور مسلمانوں پر کبھی غلبہ نہیں پا سکیں گے۔

۱۱۹ اس میں توجہ دلائی ہے کہ اشاعت اسلام کے لیے سب سے زیادہ کارگر حربہ دُعا ہے۔ اور یہ حربہ ہر مسلمان صحت و بیماری، قید و آزادی ہر حالت میں استعمال کر سکتا ہے ؏

اٰیاتہا ۶۵	سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِیَّۃٌ	رکوعاتہا ۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے پڑھتا ہوں

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰہَا وَ فَرَضْنٰہَا وَ اَنْزَلْنَا فِیْہَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (۲) (یہ) ایک ایسی سورۃ ہے جو ہم نے اُتاری ہے اور (جس پر عمل کرنا) ہم نے فرض کیا ہے۔ اور اس میں ہم نے اپنے روشن احکام بیان کئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْہُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّ لَا تَاْخُذْکُمْ بِہِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لْیَشْہَدْ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۳) زانیہ عورت اور زانی مرد (اگر ان پر الزام ثابت ہوجائے تو ان میں سے ہر ایک کو سَو کوڑے لگاؤ۔ اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہو۔ تو اللہ کے حکم کے بجا لانے میں ان دونوں قسم کے مجرموں کے متعلق تمہیں رحم نہ آئے۔ اور چاہیئے۔ کہ ان دونوں کی سزا کو مومنوں کی ایک جماعت مشاہدہ کرے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ بغیر اختلاف مدنی ہے اور آخر ۵ ھ کی ہے۔ سورۃ مؤمنون کے آخر میں بتایا گیا تھا۔ کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو روحانیت میں ترقی کرکے نصرت الٰہی حاصل کرسکیں گے اس سورۃ میں نصرت الٰہی حاصل کرنے کے طریق بتلائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں سورۃ مؤمنوں میں کامیاب ہونے والے مومنوں کے لیے جو امور بیان ہوئے تھے۔ اس سورۃ میں ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۲ھ قرآن کی تمام سورتوں میں سے صرف اس سورۃ کے ابتداء میں سورۃ کا لفظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ سورۃ کے تمام معانی اس پر چسپاں ہوتے ہیں۔ سورۃ کے معنے کسی چیز کے جزو، درجہ، شرف، نشان، نہایت بلند اور خوبصورت عمارت اور مکمل چیز کے ہیں۔ یہ قرآن کا اہم حصّہ ہے جس میں انسانی ترقی کے لیے مکمل بلند اور خوبصورت تعلیم دی گئی ہے۔ جس پر عمل سے انسان کو دین و دنیا میں شرف اور امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اخلاق اور روحانیت کی بلند سطح پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ قرآن سارا ہی فرض ہے (۲۸/۹۴) اس لیے یہاں فرضنٰہا کے معنے واجب کے نہیں تاکید کے ہیں۔

۳ھ مرد و عورت کا جائز تعلق تمدن کے لیے موجب ترقی ہوتا ہے لیکن ناجائز تعلق سے نسلیں مشکوک ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح جب لوگ ان سے روحانی تعلقات رکھتے ہیں جن سے نہیں رکھنے چاہئیں تو خوفناک نتائج نکلتے ہیں۔ پس ارواح کا بھی آپس میں تعلق ہوتا ہے۔ مگر یہ تعلق خدا تعالےٰ ہی پیدا کرتا ہے گو بعض دفعہ تو وہ خود اعلان فرما دیتا ہے کہ فلاں سے تعلق فائدہ دے گا مگر بعض دفعہ

انسان کو خود کوشش سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ پس روحانی تعلقات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس سورۃ کو مرد و عورت کے تعلقات سے شروع کیا گیا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سَو کوڑے ہیں۔ (۴/۴) کے مطابق یہ سزا ان کے لیے ہے جو آزاد ہوں۔ اور جو عورتیں آزاد نہ ہوں ان کی سزا نصف یعنی پچاس کوڑے ہے اب کوڑے تو نصف ہو سکتے ہیں مگر رجم کا نصف بعید از قیاس ہے اس لیے یہاں کوڑوں ہی کا حکم ہے۔ دوسری طرف احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے بدکاری کی سزا کے طور پر رجم کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یوحنا ۸/۵، حزقیل ۱۶/۴، احبار ۲۰/۱۰ اور استثناء ۲۲/۲۲ کے مطابق یہود میں رجم کا حکم موجود تھا۔ اس لیے مندرجہ بالا قرآنی حکم سے پہلے آنحضرتؐ نے بائبل کے مطابق مسلمانوں میں یہی طریق جاری کیا۔ جب قرآنی حکم آگیا تو پہلا غیر قرآنی حکم منسوخ ہو گیا۔ جیسے قبلہ بھی آپؐ نے پہلے یہود کے طریق کے مطابق بیت المقدس کو رکھا۔ لیکن بعد میں حکم ہوا تو خانہ کعبہ کو قبلہ بنا لیا۔ ایک دفعہ یہود نے آنحضرت صلعم کے سامنے اقرار کیا کہ "اصل میں ہمارے ہاں رجم ہی کا حکم ہے۔ مگر بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ہم نے یہ حکم ترک کر دیا ہے" یہ سُنکر آپؐ نے فرمایا۔ اس زمانہ میں میں پہلا شخص ہوں جس نے اس حکم کو زندہ کیا ہے (مسلم جلد ۲ کتاب الحدود)۔ اس روایت سے بھی ثابت ہے کہ آپؐ کا یہ حکم بائبل کی اتباع میں تھا۔

بعض روایتوں کے مطابق حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے نزدیک ابتداً قرآن میں رجم کا حکم تھا۔ مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۱۲۱ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خواہش کی تھی کہ یہ حکم حاشیہ قرآن پر لکھ دیں۔ جس سے ثابت ہے کہ آپؓ بھی اسے قرآن کا حصہ نہ سمجھتے تھے بطور تشریح لکھنا چاہتے تھے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت عمرؓ اسے قرآن کا حصہ سمجھتے تھے تو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے غلطی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کو قرآنی حکم سمجھ لیا تھا۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کا قرآن میں نہ لکھوانا ہی بتاتا ہے۔ کہ رجم کا حکم قرآن کا حصہ نہ تھا۔ بلکہ قرآن میں لکھنا تو الگ رہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی درخواست کے باوجود الگ طور پر بھی یہ حکم انہیں لکھ کر دینا پسند نہیں فرمایا۔ (محلّٰی ابن حزم جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۵)

آنحضرتؐ (قرآن میں خلط کے ڈر سے) حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۲) مگر قرآنی حکم کا چھپانا آپؐ کے لیے آیت بلغ ما انزل الیک من ربک (۵/۶۷) کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں تھا اس لیے ثابت ہوا کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم رجم اس لیے لکھ کر نہیں دیا کہ وہ حدیث تھی قرآنی حکم نہیں تھا۔

ایک جماعت علماء کا حیلہ ماشیۃ ہی کو اصل حکم سمجھتا تھا۔ دیکھیں محلّٰی ابن حزم جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۸-۲۳۱

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۘ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

(۴) اور ایک زانی زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی سے ہم صحبت نہیں ہوتا۔ اور نہ زانیہ زانی یا مشرک کے سوا کسی سے ہم صحبت ہوتی ہے۔ اور مومنوں پر یہ (بات) حرام کی گئی ہے۔

(۵) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں۔ پھر چار گواہ مہیا نہیں کرتے (تو ان کی سزا یہ ہے کہ) ان کو

معتزلین اور خوارج کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ رجم قرآن سے ثابت نہیں۔ (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۹۱)

چونکہ جَلَدَہٗ بِالسِّیَاطِ کے معنے ہوتے ہیں ضَرَبَہٗ بِھَا وَاَصَابَ جِلْدَہٗ (اقرب) یعنی کوڑے سے اس طرح مارا کہ جلد تک اس کا اثر پہنچا اس لیئے گو اس آیت سے زنا کی سزا کے طور پر لوگوں کے سامنے مارنے کا حکم ثابت ہے مگر اتنا ہی مارنے کی اجازت ہے جس سے صرف جلد کو نقصان پہنچے۔

یہاں الزانی اور الزانیہ میں الف لام استعمال ہوا ہے جو تخصیص کے لیے آتا ہے۔ اس سے کامل زانی مراد ہے جو یا تو زنا کا عادی ہو۔ یا کھلے بندوں زنا کرنے والا ہو۔ یا محصن یعنی شادی شدہ یا بڈھا ہوا ور پھر بھی زنا کرتا ہو۔ ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ میں بتایا کہ جو سزا انسان کو قانون نیچر کی خلاف ورزی کی وجہ سے ملتی ہے۔ اس پر رحم کرنا جائز ہوتا ہے لیکن شرعی سزا میں رحم جائز نہیں ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان الٰہی فیصلہ کو جھٹلانا چاہتا ہے۔ ہاں اگر یہ خواہش کی جائے کہ کاش یہ شخص ایسا فعل نہ کرتا کہ اس پر شرعی حد واجب ہوتی تو یہ جائز ہے۔

یہاں عورت کا ذکر مرد سے پہلے اس لیے کیا کہ (۱) عورتیں ہی مالی فائدہ کے لیے اس پیشہ کو اختیار کرتی ہیں دوسرے (۲) انسانوں حیوانوں۔ درختوں میں سے اثر ڈالنے والی چیز یعنی نر میں حیا کا مادہ کم ہوتا ہے اور اثر قبول کرنے والی یعنی مادہ میں زیادہ۔ اس لیے عورت میں طبعاً حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اگر اس کے باوجود وہ بے حیائی کی مرتکب ہو تو وہ زیادہ نفرین کی مستحق ہے۔

سے ۴ اس کے یہ معنے نہیں کہ زانی یا زانیہ کا مشرکہ یا مشرک کے ساتھ ہی نکاح جائز ہے۔ کیونکہ کسی کو زانی یا زانیہ کا علم کس طرح ہو سکتا ہے؟ اصل میں نکاح کے معنے اعلانِ ازدواج کے علاوہ مرد و عورت کے اجتماع کے بھی ہیں اور وہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ زانیہ یا زانی کا نام اس وقت ملتا ہے جبکہ بالمقابل شخص کو بھی یہی نام حاصل ہو اس لیے فرمایا وحرم ذٰلک علی المؤمنین یعنی مومنوں کے لیے اس لفظ کا استعمال جائز نہیں۔

سے ۵ آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے اقوال سے ثابت ہے کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی جگہ کے الزام لگانے والے

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ	اسّی کوڑے لگاؤ۔ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہ لوگ (اپنے اس فعل کی وجہ سے شریعت اسلامی کی) اطاعت سے خارج ہیں۔

کے علاوہ چار عینی شاہد تکمیل فعل کے ہونے چاہئیں۔ صرف قاضی کے علم سے حد لگانا جائز نہیں کیونکہ وہ ایک گواہ بنتا ہے۔ پھر گواہوں کا اقرار حلفیہ بغیر تشدد کے قاضی کے سامنے اور چار دفعہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسے اقرار کے بعد اگر کوئی شخص انکار کر دے تو اس پر حدِ زنا نہیں لگے گی۔ ہاں اگر اس نے کسی شادی شدہ عورت کا نام لیا ہو۔ تو حد قذف لگے گی جو آزاد کے لیے اسّی اور غلام کے لیے چالیس کوڑے ہے۔ غیر شادی شدہ پر الزام لگانے پر کوئی حد قرآن نے نہیں لگائی۔ ہاں قاضی مناسب حال سزا تجویز کر سکتا ہے۔ اگر کوئی غیر محصنہ پر جسے پہلے زنا کی سزا مل چکی ہو۔ الزام لگائے تو اسے تعزیر کی سزا ملیگی کیونکہ اس میں عزت کا سوال نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی مشہور بدنام پر جسے قاضی بھی آوارہ سمجھے۔ الزام لگایا جائے۔ تو صرف فتنہ پیدا کرنے کی سزا ملے گی۔

بعض کے نزدیک اگر چار گواہ تو ہوں لیکن وہ فاسق ہوں تو خود گواہوں پر حد لگے گی۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ فاسق قرار دینے کا فیصلہ قاضی نے کرنا ہے جس کا اس کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں قاضی کو تعزیر کا اختیار ہوگا۔ تاکہ آئندہ کے متعلق احتیاط رہے اور جس پر الزام لگایا گیا ہو اس کی براءت کی جائے۔

بغیر چار گواہوں کے الزام لگانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا زنا کی سزا کے قریب رکھی گئی ہے۔ پھر یہ بھی سزا ہے کہ اس کی گواہی بھی قبول نہ کرو۔ یہ جو فرمایا کہ ایسا شخص خدا کے نزدیک فاسق ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ خود اسی بدی میں مبتلا ہو جائے گا۔ یرمون المحصنٰت کے یہ معنی نہیں کہ صرف پاک دامن عورتوں پر الزام کی سزا ہے۔ کیونکہ پتہ کیسے لگ سکتا ہے کہ فلاں ناپاک ہے بلکہ یہ معنے ہیں کہ اگر کسی عورت پر الزام شہادت سے ثابت نہ ہو تو وہ شریعت کے نزدیک پاک دامن ہے۔ اور الزام لگانے والا کذاب ہے الزام کا ثبوت دینا مدعی پر ہے عورت کا کام نہیں کہ اپنی پاک دامنی کا ثبوت دے۔ زنا کے لیے چونکہ بیرونی علامات نہیں ہوتیں اس لیے شریعت نے جہاں چوری اور قتل کے لیے دو گواہوں کی گواہی تسلیم کی ہے۔ وہاں زنا کے لیے چار گواہوں کی شرط رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خدا تعالےٰ کے نزدیک ان معاملات میں جھوٹ بکثرت بولا جاتا ہے۔

مجرم ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان خود اقرار کرے۔ اس صورت میں بھی اُسے قاضی کے سامنے چار دفعہ اقرار جرم کرنا پڑے گا۔ مگر پھر بھی شریعت صرف اسی کو مجرم قرار دے گی عورت کو نہیں۔

إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(۶) سوائے ان کے جو بعد میں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں سو (ایسا کرنے پر) اللہ تعالےٰ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

(۷) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں۔ اور ان کے پاس سوائے اپنے وجود کے اور کوئی گواہ نہیں ہوتا تو ان میں سے ہر شخص کو ایسی گواہی دینی چاہیئے۔ جو اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھا کر چار گواہیوں پر مشتمل ہو۔ اور (ہر گواہی میں) وہ یہ کہے کہ وہ راستبازوں میں سے ہے۔

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○

(۸) اور پانچویں (گواہی) میں (کہے)، کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

اپنی نسبت الزام لگانا انسان کی بے حیائی اور بے شرمی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ تقویٰ پر۔ کیا عزیز مصر کی بیوی کا یوسفؑ پر اپنی نسبت الزام لگانا اس کے تقویٰ کا ثبوت تھا؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک شخص نے اقرار زنا کیا تھا مگر آپؐ نے اسے شاباش نہیں دی بلکہ منہ پھیر لیا۔ اور اسے دیوانہ قرار دیا۔ اگر اپنی نسبت الزام لگانے کی اجازت دیدی جاتی۔ تو کئی لوگ جن کی اپنی عزت ہوتی ہی نہیں دوسروں پر الزام لگانے لگ جاتے۔ چنانچہ عرب میں تشبیب کا عام رواج تھا مگر آنحضرتؐ نے تشبیب کرنے والوں کو واجب القتل قرار دیا ہے۔

ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا۔ کہ فلاں عورت کا بچہ میرے بھائی کا ہے کیونکہ میرے بھائی نے مجھے بتایا تھا۔ یہ سنکر آپؐ نے تعریف نہیں فرمائی بلکہ فرمایا اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وللعاھر الحَجَر یعنی بیٹا تو اسی کو ملے گا جس کی بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن جو کہتا ہے میں نے زنا کیا اس کی سزا سنگساری ہے۔

اگر کسی پر بغیر چار گواہوں کے اتہام لگایا جائے گا تو شریعت اسے قسم تک نہیں دے گی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں ولحدود لاتقام بالایمان (المبسوط جلد ۹ صفحہ ۵۰۲) یعنی قسموں کے ذریعہ حد قائم نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اگر اتہام لگانے والا تین گواہ بھی لائے تو اس کو بھی اور گواہوں کو بھی اسّی اسّی کوڑے کی سزا ملے گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایسی سزا دی ہے۔ (طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۲)

۶ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام تمدن کے لیے بعض گناہوں کی سزا یہاں ضروری ہوتی ہے اس لیے خدا تعالیٰ اس دنیا کی سزا تو معاف نہیں کرتا مگر توبہ و اصلاح کرنے پر اخروی سزا معاف کر دیتا ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ

(۹) اور وہ (مظلوم) بیوی (جس پر اس کا خاوند الزام لگائے) اپنے نفس پر سے چار ایسی گواہیوں کے ذریعہ سے جو قسم کھا کر دی گئی ہوں عذاب کو دور کرتے یہ کہتے ہوئے کہ وہ (یعنی خاوند) جھوٹا ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(۱۰) اور پانچویں (قسم) اس طرح (کھائے) کہ اللہ کا غضب اس (یعنی عورت) پر نازل ہو اگر وہ (یعنی اس کا الزام لگانیوالا خاوند) سچا ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝

(۱۱) اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی اور یہ نہ ہوتا کہ اللہ بڑا فضل کرنے والا اور) بڑی حکمتوں والا ہے (تو تم لوگ تباہی میں پڑ جاتے)

ع

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(۱۲) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایک بڑا اتہام باندھا تھا۔ تمہیں میں سے ایک گروہ ہے تم اس (فعل) کو اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لیے بہت اچھا تھا۔ (کیونکہ اس کی وجہ سے ایک پُر حکمت تعلیم تم کو مل گئی) ان میں سے ہر شخص کو اس نے جتنا گناہ کیا تھا۔ اس کی سزا مل جائیگی اور جو شخص اس گناہ کے بڑے حصے کا ذمہ دار تھا۔ اس کو بہت بڑا عذاب ملے گا۔

ف ۷-۱۱ جب دونوں طرف سے قسمیں کھالی جائیں تو خلع کا حکم دے دیا جائیگا۔ لیکن اگر خاوند بیوی پر قذف کرے مگر نہ گواہ لائے نہ لعان کرے تو اسے اسّی کوڑے لگیں گے۔ ہاں اگر وہ لعان کرے تو پھر وہ حد سے آزاد ہو جائے گا لیکن اگر بیوی بھی لعان کر دے تو اس پر زنا کا الزام صحیح شمار نہیں ہوگا۔ لعان کسی مقدس مقام پر مجمع میں خوب سمجھ کر ہونا چاہیئے۔

ف ۱۲ غزوہ بنو مصطلق کے موقعہ پر حضرت عائشہؓ قضاء حاجت کے لیے باہر گئیں تو آپ کا ہار وہاں رہ گیا اس لیے دوبارہ تلاش کے لیے واپس گئیں پیچھے منتظم قافلہ نے یہ سمجھ کر کہ آپؓ اپنے ہودج میں ہیں ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا۔ اور قافلہ روانہ ہوگیا۔ جب آپؓ ہار کی تلاش کے بعد واپس آئیں تو اس قیاس سے کہ قافلہ واپس آئے گا وہیں لیٹ گئیں اور آپؓ کو نیند آگئی صفوان بن معطل جن کو آنحضرت صلعم نے اس لیے پیچھے چھوڑا تھا۔ کہ کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہو۔ تو دیکھ لیں۔ صبح کے وقت انہوں نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تو ان کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر خود اس کی مہار پکڑ لی۔ اور مدینہ پہنچ گئے۔ اس واقعہ کی وجہ سے منافقوں نے مشہور کر دیا کہ حضرت عائشہؓ کا (نعوذ باللہ) صفوانؓ سے ناجائز

لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ إِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝

(۱۳) جب تم نے یہ بات سُنی تھی۔ تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنی قوم کے متعلق نیک گمان کیا۔ اور یہ کہہ دیا۔ کہ یہ تو ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَأُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝

(۱۴) اور کیوں نہ وہ لوگ (جنہوں نے یہ جھوٹ پھیلایا تھا) اس پر چار گواہ لائے۔ پس جبکہ وہ گواہ نہیں لائے۔ تو اللہ (تعالےٰ) کے فیصلہ کے مطابق وہ جھوٹے ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ أَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۚ

(۱۵) اور اگر اللہ (تعالےٰ) کا فضل اور رحمت تم پر دنیا اور آخرت میں نہ ہوتے تو تم کو اس کام (کی وجہ) سے جس میں تم پڑ گئے ہو۔ بہت بڑا عذاب پہنچتا۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝

(۱۶) اس وجہ سے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی زبان سے اس جھوٹ کو سیکھنے لگ گئے۔ اور اپنے موہنوں سے وہ بات کہنے لگ گئے جس کا تم کو کوئی علم نہیں تھا (خدا تم پر ناراض ہوا) اور تم اس بات کو معمولی سمجھتے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی تھی

وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ

(۱۷) اور کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس بات کو سُنا

تعلق ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ تو حضرت عمرؓ اور حضرت اسامہؓ بن زیدؓ نے اسے جھوٹ قرار دیا۔ مگر حضرت علیؓ نے کہا کہ خواہ جھوٹ ہو آپ ایسی عورت سے جس پر اتہام لگ چکا ہے تعلق نہ رکھیں۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو کہا کہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے اگر تم سے غلطی ہوگئی ہے تو توبہ کر لو۔ اور اگر غلطی نہیں ہوئی تو خدا تمہاری براءت کر دے گا۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا۔ کہ اگر میں کہوں کہ غلطی نہیں ہوئی تو یقین نہیں کیا جائیگا۔ اور اگر کہوں ہوئی ہے تو جھوٹ ہوگا۔ اس لیے میں یہی کہتی ہوں کہ فصبرٌ جمیلٌ واللہ المستعان۔ اس پر یہ وحی براءت نازل ہوئی۔

۱۳-۱۴ یعنی اگر بغیر چار گواہیوں کے کوئی شخص کسی پر بدکاری کا الزام لگائے۔ تو خدا تعالےٰ اسے کذاب قرار دیتا ہے۔ اس لیے مومن کا بھی کام ہے کہ ایسے شخص کی بات سن کر حسن ظن کرے اور الزام کو غلط قرار دے۔

مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝

تھا تو فوراً کہہ دیا کہ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم اس بات کو آگے دہرائیں۔ اے خدا تو پاک ہے۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(۱۸) اللہ (تعالیٰ) تم کو اس قسم کی بات کے دوبارہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے روکتا ہے۔ اگر تم مومن ہو۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(۱۹) اور اللہ (تعالیٰ) تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا حکمت والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(۲۰) یقیناً جو لوگ چاہتے ہیں۔ کہ مومنوں میں بدی پھیل جائے۔ ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ؑ

(۲۱) اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور رحم تم پر نہ ہوتا۔ اور اگر اللہ (تعالیٰ) بہت مہربان (اور) بار بار رحم کرنے والا نہ ہوتا (تو تم دکھ میں پڑ جاتے)

ع ۸

۱۵-۱۹ یہاں بتایا ہے کہ چار گواہوں کی عدم موجودگی میں ایسی بات پر یقین کرنا اور اس کا ذکر کرتے پھرنا جائز نہیں۔

۲۰-۲۱ ان آیات میں یہ نفسیاتی نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ فحش کی تشہیر نہیں کرنی چاہیئے۔ ورنہ لوگ فحش پر دلیر ہو جاتے ہیں۔ معاملہ اولی الامر تک پہنچانا چاہیئے۔ جو اصلاح کی تدابیر کر سکتا ہے۔ نیکی کی تشہیر سے قومیں بنتی اور بدی کی تشہیر سے بگڑتی ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من قال هلك القوم فهو اهلكهم یعنی جس نے یہ اعلان کرنا شروع کر دیا۔ کہ ہماری قوم تباہ ہو گئی۔ اس نے اس کو تباہ کر دیا۔ مسلمانوں میں جو قرآن کے نئے معارف سوچنے کی عادت نہیں رہی اور وہ خدا تعالےٰ سے ہمکلام ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ علماء نے کہنا شروع کر دیا۔ "هلك القوم" اس لیے لوگ خدا کا دروازہ چھوڑ کر پیروں فقیروں کے پیچھے چل پڑے۔ قرآن کریم ہر بدی کی جڑ کو کاٹتا ہے اسی لیے اس نے یہ حکم دیا ہے۔ کہ جس بدی کو روکنا ہو اس کی تشہیر کو روکو اور اس کے برعکس جس نیکی کو قائم کرنا چاہو اس کو پھیلاؤ لیکن یہ بھی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(۲۲) اے مومنو! شیطان کے قدموں پر مت چلو۔ اور جو کوئی شیطان کے قدموں پر چلتا ہے۔ تو وہ جان لے۔ کہ شیطان بدیوں اور ناپسندیدہ باتوں کا حکم دیتا ہے۔ اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور رحم تم پر نہ ہوتا تو کبھی بھی تم میں سے کوئی پاکباز نہ ہوتا۔ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاکباز بنا دیتا ہے۔ اور اللہ بہت دعائیں سننے والا بہت جاننے والا ہے۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ

(۲۳) اور تم میں سے (دین و دنیا میں) فضیلت رکھنے والے اور کشائش رکھنے والے لوگ قسم نہ کھائیں۔ کہ اپنے رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے اور چاہیئے۔ کہ وہ عفو سے کام لیں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کرے اور اللہ

یاد رکھو کہ فرائض کی ادائیگی پر کسی کو خاص اہمیت نہ دو۔ ورنہ جو فرائض ادا نہیں کرتا وہ کہنے لگے گا کہ میں ایسا نیک مسلمان نہ سہی معمولی مسلمان تو ہوں حالانکہ احساس یہ ہونا چاہیئے کہ فرائض کی ادائیگی کے بغیر انسان مسلمان ہی نہیں۔

۲۲ جھوٹے الزامات کے ذکر کے ساتھ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فرما کر یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کو ابتدا ہی میں کوئی خطرناک بات کرنے کی تحریک نہیں کرتا۔ کیونکہ فطرتِ انسانی میں حیا ہے وہ جس کام کو صریح طور پر برا سمجھے اسے کرنے کے لیے فوراً تیار نہیں ہوتی۔ اس لیے پہلے تو وہ یہی تحریک کرے گا کہ کسی کی بیان کی ہوئی بات آگے کہہ دو مگر پھر خود تمہارے منہ سے ایسی بات نکلوائے گا اور آخر خود تم سے ایسا فعل کروا دیگا۔ اس لیے تم شروع ہی میں اس کی ہر بات رد کر دو۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ سے یہ مراد نہیں کہ اندھا دھند کرتا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو اس کا پسندیدہ ہو جاتا ہے اسے خدا تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ اور پاک کر دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ فرمایا شیطان کا خطرہ انسان کو ہر حالت میں ہے اس لیے اسے چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی صفت سمیع سے فائدہ اٹھا کر دعاؤں کی عادت ڈالے۔ اگر انسان ایسا کرے گا تو خدا تعالیٰ

رَّحِيْمٌ ۝ — بہت معاف کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ

(۲۴) وہ لوگ جو کہ پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں۔ جو (شریروں کی شرارت سے) غافل ہیں۔ اور ایماندار ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جائے گی۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(۲۵) اس دن جبکہ ان کی زبانیں بھی اور ان کے ہاتھ بھی اور ان کے پاؤں بھی ان کے ان اعمال کے متعلق جو وہ کرتے تھے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝

(۲۶) اس دن (اللہ تعالیٰ) ان کو ان کا صحیح بدلہ دے گا۔ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی صدقِ مجسّم ہے۔ ایسا صدق جو اپنے آپ کو آپ ظاہر کر دیتا ہے۔

علیم جو انسانی کمزوریوں کو جانتا ہے اس کی قوتِ ایمان کو مضبوط کر کے اسے شیطان کے حملوں سے محفوظ کر دیگا۔

۲۳ یہاں ایک تو یہ بتلایا ہے۔ کہ لوگوں کی مدد صرف اس وقت کرنے کا حکم نہیں جب تم ان سے خوش ہو بلکہ ان سے قصور ہو جائے۔ پھر بھی (کچھ وقت کی تو اور بات ہے مگر) ان کی مدد نہ کرنے کی قسم ہی کھا لینا جائز نہیں۔ یہاں اپنے اموال خرچ کرنے کا ذکر ہے پبلک یا خدا تعالیٰ کے اموال خرچ کرنے میں پبلک کے مفاد یا حکم خدا وندی کو مقدم رکھنا پڑے گا۔

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا یہاں تو معاف کرنے بلکہ فائدہ پہنچانے کا حکم ہے مگر اوپر زانی کو سزا دینے کا حکم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سزا کے موقعہ پر سزا اور درگذر کے موقعہ پر درگذر کا حکم دیتا ہے: تاکہ نہ جرائم پر دلیری ہو اور اگر عفو و درگذر سے کسی کی اصلاح ممکن ہو۔ تو اس کا موقعہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

الشوریٰ ۴۲/۴۰ میں فرماتا ہے بدی کے مطابق اس کی سزا ہے لیکن اگر معافی سے اصلاح ہوتی ہو تو معاف کرنے کا اجر ہے۔ پھر فرماتا ہے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۳/۱۳۵) محسن تمام احکام شریعت پر عامل کو کہتے ہیں۔ اور اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مومن اسی وقت کظمِ غیظ اور عفو سے کام لیتا ہے۔ جب عفیٰ واصلح کا حکم پورا ہوتا ہے۔

۲۴ لعنت کے معنے دوری کے ہیں اور یہاں بتلایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں سے دنیا میں بھی شرفاء تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے اور آخرت میں خدا تعالیٰ بھی ان کو سزا دے گا۔

اَلۡخَبِيۡثٰتُ لِلۡخَبِيۡثِيۡنَ وَالۡخَبِيۡثُوۡنَ لِلۡخَبِيۡثٰتِ‌ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيۡنَ وَالطَّيِّبُوۡنَ لِلطَّيِّبٰتِ‌ۚ اُولٰٓـئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا يَقُوۡلُوۡنَ‌ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ؏

(۲۷) خبیث باتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں۔ اور خبیث مرد خبیث باتوں کے لئے ہیں۔ اور پاک باتیں پاک مردوں کے لئے ہیں۔ اور پاک مرد پاک باتوں کے لئے ہیں۔ یہ سب لوگ ان باتوں سے جو (دشمن) کہتے ہیں۔ پاک ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور معزز رزق (مقدر) ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ بُيُوۡتِكُمۡ حَتّٰى تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَتُسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَهۡلِهَا‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ‏ ○

(۲۸) اے مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو۔ جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔ اور داخل ہونے سے پہلے ان گھروں میں بسنے والوں کو سلام کرو۔ یہ تمہارے لئے اچھا ہوگا۔ اور اس (حکم) کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم (نیک باتوں کو ہمیشہ) یاد رکھو گے۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ

(۲۹) اور اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تب بھی ان میں داخل نہ ہو جبتک کہ تمہیں (گھر والوں کی طرف سے) اجازت

۲۵-۲۶ ؎ لوگ کہتے ہیں ہاتھ پاؤں کیسے گواہی دیں گے۔ اول تو ہر چیز کی زبان الگ الگ ہوتی ہے دوسرے موجودہ تحقیق یہ ہے کہ جس عضو سے کوئی کام کیا جائے اس پر ایک نشان پڑ جاتا ہے۔ اور جو پر بھی حرکات کا نشان پڑتا ہے۔ بے تار برقی ایجاد اسی اصول پر ہے۔ قیامت کے دن انسانی نظر اتنی تیز کر دی جائیگی کہ ان نشانات کو دیکھ لے گی مگر سچی توبہ کرنے والوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اس لیے ان کے نشان مٹا دیئے جائیں گے۔

یہاں دماغ کا ذکر اس لیے نہیں کہ دماغ میں ایک برائی کا خیال آئے۔ مگر اس پر عمل نہ ہو تو اسلامی اصول کے ماتحت وہ نیکی لکھی جائے گی کیونکہ ہاتھوں کا جو دماغ کے ماتحت ہیں با عمل نہ کرنا بتاتا ہے کہ دماغ نے اپنی رائے بدل لی تھی۔ اس لیے وہ نیکی کا مرتکب ہو گیا تھا۔

۲۷ ؎ قرآن نے حضرت نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو مجرم قرار دے کر بتا دیا ہے کہ اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ خبیث خبیثوں کے لیے ہیں۔ بلکہ یہ ہیں کہ بری باتیں بروں کے لیے ہیں اس لیے جو شخص عام طور پر نیک سمجھا جاتا ہو اگر اس پر الزام لگایا جائے تو بادی النظر میں الزام کو فوراً جھوٹا قرار دے دو اسی طرح یہ بھی دیکھ لو کہ گواہ عادل، راستباز اور صحیح الدماغ ہیں یا نہیں۔

لَكُمْ ۚ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝

نہ مل گئی ہو۔ اور اگر (کوئی گھر میں ہو اور) تم سے کہا جائے کہ اس وقت چلے جاؤ تو تم چلے آؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہوگا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ۝

(۳۰) تمہارے لیے ان گھروں میں داخل ہونا گناہ کا موجب نہیں جن میں کوئی رہتا نہیں۔ اور تمہارا سامان اس میں پڑا ہے اور اللہ (تعالیٰ) اسے بھی جانتا ہے جسے تم ظاہر کرتے ہو اور اسے بھی جسے تم چھپاتے ہو۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝

(۳۱) تو مومنوں سے کہدے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بہت پاکیزگی کا موجب ہوگا۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) اس سے اچھی طرح خبردار ہے۔

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ

(۳۲) اور مومن عورتوں سے کہدے کہ وہ بھی اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا

ف ۲۸-۲۹ گھروں میں اجازت لے کر جانے سے انسان پر بدکاری اور چوری کا الزام نہیں لگ سکتا۔ نہ اس کا موقعہ پیدا ہو سکتا ہے اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں نے یونہی فلاں کے گھر میں جھانکا تھا اور اسے بدکاری کرتے دیکھ لیا۔ تو اس کا یہ فعل چونکہ خلافِ شریعت ہے اس کی گواہی رد کردی جائے گی آنحضرت ؐ نے پہلے سلام کرنے پھر اجازت لینے کا حکم دیا ہے مگر یہاں تَسْتَأْنِسُوا پہلے آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے معنے استعلام (از الکشاف) کے یعنی (گھر والوں کی پسند) معلوم کرنے کے بھی ہیں۔ اور اس کے لیے گھر والوں سے تعارف کروانا ضروری ہے۔ اور یہ ان کی توجہ اپنی طرف پھیرنے یعنی سلام کرنے سے ہی ہو سکتا ہے استیناس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ غیر ضروری ملاقاتیوں کو جواب دیا جا سکتا ہے۔

ف ۳۰ یعنی غیر کا مکان کرایہ پر لیا ہوا ہو یا اس میں سامان رکھنے کی اجازت ہو۔ تو وہ عملاً تمہارا ہی ہے اس لیے اس میں جانے کی اجازت ہے۔

ف ۳۱ باوجود پردہ کے حکم کے بعض مواقع مرد عورت کے اکٹھے ہونے کے نکل سکتے ہیں۔ اس لیے غض بصر کا حکم دیا ہے۔ انجیل نے غیر عورتوں کو دیکھنے کی تو اجازت دی ہے مگر لکھا ہے "جس نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ ڈالی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا (متی ۲۸/۵) مگر اسلام کہتا ہے سرے سے نامحرم پر نگاہ ہی نہ ڈالی جائے۔ کیونکہ نظر بد تو دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى
جُيُوْبِهِنَّ ص وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ
اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ
غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا
عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ
بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ
مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى
اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥

کریں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کیا کریں۔ سوائے
اس کے جو آپ ہی آپ بے اختیار ظاہر ہوتی ہو اور
اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سینہ پر سے گذار کر اور اس
کو ڈھانک کر پہنا کریں۔ اور اپنی زینتوں کو صرف
اپنے خاوندوں یا اپنے باپوں یا اپنے خاوندوں
کے باپوں یا اپنے بیٹوں یا اپنے خاوندوں
کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کے
بیٹوں یا اپنی بہنوں کے بیٹوں یا اپنی (ہم کفو)
عورتوں یا جن کے مالک ان کے داہنے ہاتھ
ہوئے ہیں۔ ان کے سوا کسی پر نہ ظاہر کیا کریں۔
یا ایسے ماتحت مردوں پر جو ابھی جوان نہیں
ہوئے۔ یا ایسے بچوں پر جن کو ابھی عورتوں
کے خاص تعلقات کا علم نہیں ہوا۔ اور اپنے
پاؤں (زور سے زمین پر) اس لیئے نہ مارا کریں
کہ وہ چیز ظاہر ہو جائے جس کو وہ اپنی زینت سے
چھپا رہی ہیں۔ اور اے مومنو! سب کے
سب اللہ (تعالےٰ) کی طرف رجوع کرو تاکہ
تم کامیاب ہو جاؤ۔

۳۲؎ یہاں اصل حکم مرد و عورت کی نظریں ملنے سے بچانے کا ہے اور جسم کا وہ حصہ جس پر نگاہ ڈالتے
ہوئے آنکھیں ملنے سے نہیں رہ سکتیں۔ چہرہ ہی ہے بقیہ جسم کو جبکہ وہ مناسب کپڑوں سے ڈھکا ہوا ہو
نہ چھپانے کی ضرورت ہے نہ چھپایا جاسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ کسی عورت کو قید کر دیا جائے۔ یہ بدی
بطور پیشہ عورتوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے عورتوں کو مردوں سے الگ بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ
علم النفس کے مطابق ایک کی نظر نیچی ہو پھر بھی دوسرے کی نظر ڈالنے کا اس پر اثر پڑتا ہے۔ اس لئے دونوں کو
نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔
اِلَّا مَا ظَهَرَ سے مراد جسم اور قد وغیرہ ہیں۔ لیکن کام کے لحاظ سے یا مجبوریوں کے لحاظ سے جو چیز آپ
ہی آپ ظاہر ہو وہ پردے میں داخل نہیں کسی عورت کو ڈاکٹر منہ ننگا رکھنے کا حکم دے یا مجبوراً مرد ڈاکٹر سے بچہ

جنوانا پڑے تو یہ جائز ہے۔

وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوبِهِنَّ ۔ خمر سے مراد وہ رومال ہے جو عورتیں سر پر باندھ لیتی ہیں اور جیوب گریبان کو کہتے ہیں اس لیے آیت کے معنے یہ ہوئے کہ وہ سر پر سے کپڑا کھینچ کر اپنے گریبانوں تک لے آئیں تاکہ سامنے سے آنے والے کی نظر نہ پڑے۔ آنحضرتؐ نے ایک رشتہ کے سلسلہ میں ایک صحابیہ ام سلیمؓ کو بھیجا تھا کہ وہ جا کر دیکھ آئے کہ لڑکی کیسی ہے۔ اسی طرح آپؐ نے ایک لڑکے کو شادی کے لیے لڑکی دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے ایک شخص کا شبہ دور کرنے کے لیے اپنی زوجہ مبارکہ کے چہرہ سے نقاب ہٹا کر کہا تھا کہ دیکھ لو یہ میری بیوی ہے۔ اگر منہ کا پردہ نہ ہوتا تو ان تمام باتوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے منہ کا پردہ آنحضرتؐ کے عمل سے ثابت ہے۔

پھر قرآن تو کہتا ہے زینت چھپاؤ۔ اگر چہرہ چھپانے کا حکم نہیں تو زینت کیا چیز ہے ہاں آنکھ اور نتھنے ننگے رکھنا جائز ہے۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ سے یہی مراد ہے کہ گھروں میں آنے والی عورتیں ایسی دیکھی بھالی ہوں کہ گویا تمہاری اپنی ہی عزیز ہیں۔ یعنی ہر قسم کی اخلاق باختہ عورتیں گھروں میں نہ آئیں۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ ۔ جب اپنے مردوں سے پردہ کا حکم ہے تو غیر قوم کے غلاموں سے پردہ نہ کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے یہاں صرف قابل اعتماد لونڈیوں کا ذکر ہے نہ کہ غلاموں کا۔ یہاں مخنثوں کا ذکر بھی نہیں کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پردہ کا حکم دیا ہے دوسرے جو لوگ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں میں تبدیلی کرتے ہیں شیطان کی پیروی کر کے کرتے ہیں۔ (۱۲۰/۴) اس لیے مخنث بنانا ہی جائز نہیں ہو سکتا اور جو چیز جائز ہی نہ ہو اس کے لئے احکام کیسے دیئے جا سکتے ہیں۔ ہاں اس سے شہوات سے عاری بوڑھے مراد ہو سکتے ہیں۔

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ ...... پاؤں مارنے سے اس لیے روکا کہ ان کی جھنکار سے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ امیر عورت ہے اور اس سے تعلق ہمارے لیے مفید ہوگا۔ اس سے ناچ کی بھی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

ابتدا میں مسلمان عورتیں جنگوں میں شامل ہوتی تھیں۔ مردوں سے اسلام سیکھتی تھیں۔ آنحضرتؐ کا وعظ سنتی تھیں اس لیے یہ خیال کہ ان کو گھروں سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ ناجائز ہے۔ اسی طرح عورت ضرورت کے ماتحت مرد کے ساتھ بیٹھ سکتی ہے۔ جیسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان عورت کو جو پیدل چل رہی تھی اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھا لیا تھا (مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۸۸)

اس کے مطابق آجکل عورتوں کو زنانے ڈبہ میں بیٹھنے سے خطرہ ہو تو مردوں کے ڈبہ میں بیٹھ سکتی ہیں۔ پردہ کا حکم مرد کی بجائے عورت کو اس لیے ہے کہ مرد کے دائرہ عمل میں عورت کے بھی حقوق ہیں۔ جب عورتیں

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(۳۳) اور اپنے میں سے جو بیوائیں ہیں اور جو اپنے غلاموں یا لونڈیوں میں سے نیک ہوں۔ ان کی شادیاں کر دیا کرو۔ اگر وہ غریب ہیں۔ تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی بنا دے گا۔ اور اللہ (تعالیٰ) بہت وسعت رکھنے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ

(۳۴) اور چاہئیے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کی توفیق نہیں پاکیزگی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ (تعالیٰ) انکو اپنے فضل سے غنی بنا دے۔ اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت کا مطالبہ کریں اگر تم ان میں بھلائی دیکھو۔ تو ان

پردہ کرتی تھیں اسوقت ان کی صحتیں بھی اچھی تھیں اور جنگوں میں بھی شامل ہوتی تھیں اس لیے یہ خیال غلط ہے کہ عورتیں پردہ میں رہ کر ترقی نہیں کر سکتیں۔

۳۳ یہاں بدی کو دور کرنے کا ایک اور طریق بتلایا کہ بیواؤں، غلاموں، اور لونڈیوں کی شادیاں کی جائیں۔ لوگ خود تو بیوی فوت ہونے پر دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مرد کے فوت ہو جانے پر اس کی عورت کی شادی پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ اسے اپنے جیسا انسان نہیں سمجھتے۔ مگر قرآن کی رُو سے مرد و عورت کے احساسات ایک جیسے ہیں (اعراف ۱۸۹/۲۴)۔

تمام بڑے بڑے ملکوں کی ترقی غلاموں کی خدمات کی مرہونِ منت ہے مگر اسلام کی رُو سے قیدی بنانا صرف اس صورت میں جائز ہے جب کسی قوم سے باقاعدہ مذہبی جنگ ہو اور عین میدانِ جنگ میں دشمن کے سپاہیوں یا ان کی مدد کرنے والوں کو پکڑ لیا جائے (۴۸/۵) ۔ اور پھر ان کے متعلق بھی مالک کو حکم ہے کہ احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دے (۴۷/۵)۔ یا مکاتبت کے ذریعہ چھوڑ دے (آیت ۳۴)

يُغْنِهِمُ اللّٰهُ میں یہ اشارہ ہے کہ محض غربت کے ڈر سے ان کی شادی کرنے سے نہ ہچکچاؤ کیونکہ خدا تعالیٰ کشائشِ رزق دینے پر قادر ہے۔ اگر کوئی کہے کہ بعض لوگ شادی کر کے بھی غنی نہیں ہوتے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غنا سے مراد کثرتِ مال ہی نہیں۔ دل کا سکون بھی مراد ہے اور وہ بیوی ملنے سے ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہاں متوکل لوگوں کا ذکر ہے۔ جن کو الٰہی وعدوں پر یقین ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ضرور روحانی و مادی نعمائیں مل جاتی ہیں۔ اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شادی کے تعلقات کی بنیاد تقویٰ پر رکھنی چاہیئے۔

اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ وَلَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَنۡ يُّكۡرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝

سے مکاتبت کرلو اور (اگر ان کے پاس پورا مال نہ ہو تو) جو اللہ نے تم کو مال دیا ہے اس میں سے کچھ مال دیکر (ان کی آزادی ممکن بنا) دو۔ اور تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ نیک رہنا چاہتی ہوں تاکہ تم اس ذریعہ سے دنیوی زندگی کا سامان جمع کرو۔ اور جو کوئی ان کو مجبور کرے۔ تو اللہ تعالیٰ (ان عورتوں کی مجبوری کے بعد بہت بخشنے والا) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ (وہ اُن پر گرفت نہیں کرے گا)

(۳۵) وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝

اور ہم نے تم پر کھلے کھلے نشانات اتارے ہیں۔ اور جو لوگ تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ ان کے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ اور متقیوں کے لئے نصیحت کی باتیں بھی بیان کی ہیں۔

ع ۱۴

(۳۶) اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِىۡ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوۡكَبٌ

اللہ آسمانوں کا بھی نور ہے۔ اور زمین کا بھی۔ اس کے نور کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے ایک طاق ہو جس میں ایک دیا پڑا ہوا (اور وہ) دیا ایک شیشے کے گلوب کے نیچے ہو (اور) وہ گلوب ایسا چمکدار ہو گویا وہ

۳۴-۳۵ غنی کر دینے کے الٰہی وعدہ کے باوجود اگر کسی غریب کو غربت کی وجہ سے رشتہ نہ ملتا ہو تو اس کو شہوات کو کم کرنے والی احتیاطیں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ غلاموں کے نکاح کے احکام انسانی مجبوری کی وجہ سے تھے ورنہ ہم غلامی کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے اگر کسی میں قابلیت دیکھو (جس کا فیصلہ قاضی کرے گا) تو مطالبہ پر ان کو مشروط آزادی دے دو۔ اور اپنے مال سے کچھ حصہ ایسے غلاموں کو کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے دو۔ کیونکہ وہ اموال جو تمہارے پاس ہیں اصل میں خدا تعالےٰ کی امانت ہیں اور سب کے لیے ہیں۔

ولا تکرھوا۔ یعنی جو عورت مشروط آزادی حاصل کرکے جبری نکاح سے بچنا چاہے اس کو اس ارادہ سے باز رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بدکاری پر مجبور کرنا۔

ومن یکرھھنّ کا مطلب یہاں بے حیائی پر مجبور کرنا ہے۔

دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ

ایک چمکتا ہُوا ستارہ ہے (اور) وہ (چراغ) ایک ایسے برکت والے درخت (کے تیل) سے جلایا جارہا ہو کہ وہ (درخت) نہ مشرقی ہو نہ مغربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل خواہ اُسے آگ (بھی) چھوئی ہو۔ بھڑک اُٹھے (یہ چراغ) بہت سے نوروں کا مجموعہ (معلوم ہوتا) ہے اللہ (تعالیٰ) اپنے نور کیلئے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) لوگوں کے لیے (تمام ضروری) باتیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے۔

---

۳۶ یہاں بتایا گیا ہے کہ آسمانی نور بھی خدا تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے اور زمینی نور بھی یعنی شریعت حقہ بھی آسمان سے آتی ہے۔ اور اس کی زمین پر اشاعت بھی خدا کے فضل سے ہوتی ہے۔

مبارکۃ:۔ مبارک برکۃ سے نکلا ہے اور برکۃ کے معنے اس نیچی جگہ کے ہیں۔ جہاں بارش کا پانی جمع ہو جائے اس لیے مبارکۃ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسا شجرہ ہے جس میں سارے کمالات جمع ہیں۔

زیتونۃ:۔ زیتون تازہ پھل بھی دیتا ہے اور اس کا روغن اچار کی صورت میں مختلف چیزوں کو دیر تک محفوظ بھی کر دیتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ قرآنی تعلیم نہ صرف گلنے سڑنے سے محفوظ ہو گی۔ بلکہ اس سے تازہ بتازہ معارف حاصل ہوتے رہیں گے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ:۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نور تو وہ مادی چیزوں کی رگڑ سے پیدا ہوتا ہے اور مادی ہے پھر خدا نور کیسے ہوا؟ نحویوں نے تو اسے اس طرح حل کیا ہے کہ انہوں نے نور سے پہلے صاحب محذوف نکالا ہے۔ اور یہ معنے لیے ہیں۔ کہ اَللّٰهُ صاحب نور السمٰوٰت والارض۔ بعض کے نزدیک اس کا استعمال استعارۃً ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ جیسے بُری بھلی چیز میں امتیاز نور ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نیکی بدی میں امتیاز الٰہی ہدایت سے ہی میسّر آتا ہے۔ لُغت والوں کے نزدیک جس چیز پر کسی کا دار و مدار ہو اُسے نور کہتے ہیں۔ چونکہ انسانی کامیابی کا دار و مدار خدا تعالےٰ (کے فضل) پر ہے۔ اس لیے اُسے آسمان و زمین کا نور کہا گیا ہے۔

یہ معانی بھی درست ہیں مگر یہاں یہ توجہ بھی دلائی گئی ہے۔ کہ زمین و آسمان میں تم جس چیز کو بھی روشن کرنا چاہو۔ اس میں خدا تعالےٰ کا نور داخل کر دو۔ جو بھی خدا تعالےٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیتا ہے وہ حسب استعداد اس کے نور کو جذب کر لیتا ہے۔ اور پھر دوسروں کو بھی اس سے منور کر دیتا ہے۔ کیونکہ نور ہمیشہ پھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ مقید نہیں رہتا۔

پھر اَللّٰهُ نور السمٰوٰت والارض میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کا نور خدا ہی ہے اور

سب چیزیں اسی سے طاقت پاتی ہیں۔ اس کا قانون جنبہ داری سے پاک ہوتا ہے۔ اور لا شرقیۃ و لا غربیۃ کا مصداق ہوتا ہے اس لیے تمدن کی بنیاد اس پر رکھے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔

مثل نورہ کمشکوٰۃ۔ یہاں بتایا ہے کہ کمال نور ہمیشہ مشکوٰۃ، مصباح اور زجاجہ سے ہوتا ہے مصباح ایسے طاقچہ کو بھی کہتے ہیں جس کے دوسری طرف سوراخ نہ ہو۔ اور اس شعلہ کو بھی جو بتی سے نکلتا ہے در اصل مصباح کے معنے صبح کر دینے والے آلہ کے ہیں۔ اس لیے ہر وہ چیز جس سے بہت تیز روشنی ہوتی ہو مصباح کہلاتی ہے۔ ہریکین جلاؤ تو شروع میں دھوئیں میں گھرا ہوا ایک شعلہ ہوتا ہے مگر چمنی رکھنے سے وہ دھوآں جاتا رہتا ہے اور روشنی بڑھ جاتی ہے اور بتی موسم کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ پھر ریفلیکٹر اس روشنی کو دور تک پھیلا دیتا ہے۔

یہاں الوہیت۔ نبوت اور خلافت کا جوڑ بتلایا گیا ہے۔ مصباح اللہ تعالےٰ کا نور ہے یہ نور جب تک نبوت کے شیشہ کے نیچے نہ آئے۔ لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور گو یہ درست ہے کہ زمین و آسمان میں اللہ تعالےٰ کی بہت سی آیات پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی مثال دھوئیں میں گھرے ہوئے شعلے کی سی ہوتی ہے۔ جس پر نبوت کا شیشہ رکھنے سے نور نظر آنے لگتا ہے پھر خلافت ریفلیکٹر کا کام دیتی ہے اور اس سے یہ نور دور تک پھیل جاتا ہے۔ اور جب تک لوگ خراب نہ ہوں خلافت چلتی چلی جاتی ہے۔

ان آیات سے پہلے زنا کے الزامات کا ذکر کیا۔ پھر حضرت عائشہؓ پر الزام کا واقعہ بیان فرمایا پھر اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض کا مضمون بیان کیا پھر آیت ۵۶ میں خلافت کا وعدہ فرمادیا۔ پھر ان آیات میں بغیر چار گواہ لانے کے زنا کا الزام لگانے والوں کا نام بھی فاسق رکھا ہے (پ۲/۵) اور منکرین خلافت کا بھی فاسق (پ۲۴/۵) — اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض میں بتایا گیا تھا کہ خلافت کا وجود بھی نبوت کی طرح ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ زمانہ نبوت کو ممتد کیا جاتا ہے یہ پڑھ کر مسلمانوں کے دلوں میں طبعًا یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا کرے ایسی نعمت ہم کو بھی ملے اس لیے آیت ۵۶ میں خلافت کا وعدہ فرمادیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اس مضمون سے پہلے حضرت عائشہؓ پر الزام کا ذکر کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی سلول کو اوس و خزرج نے مدینہ کا بادشاہ بنانے کی تجویز کی تھی مگر آنحضرتؐ کے وہاں تشریف لے جانے اور اہل مدینہ کے آپؐ پر ایمان لے آنے سے عبد اللہ کی بادشاہت دھری کی دھری رہ گئی اس لیے وہ بظاہر تو مسلمان ہو گیا۔ مگر در پردہ ہمیشہ اسلام میں رخنے ڈالتا رہتا تھا حدیثوں میں صریح ذکر آتا ہے کہ صحابہؓ آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے حقدار صرف حضرت ابوبکرؓ ہیں اس لیے عبد اللہ بن ابی سلول کو خیال ہوا کہ اگر ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے تو آنحضرتؐ کے بعد بھی اس کی بادشاہت قائم نہیں

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

(۳۷) یہ دیئے ایسے گھروں میں ہیں جنکے اونچا کیے جانیکا خدا نے حکم دیدیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے (اور) ان میں اسکی تسبیح کی جاتی ہے دن کے وقتوں میں بھی اور شام کے وقتوں میں بھی۔ (۳۸) (یہ ذکر کرنے والے) کچھ مرد ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے سے اور زکوٰۃ کے دینے سے نہ تجارت اور نہ سودا بیچنا غافل کرتا ہے۔ وہ اس

ہوسکے گی اس لیے جب ایک سفر میں غلطی سے حضرت عائشہؓ پیچھے رہ گئیں تو اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یہ الزام آپ پر لگا دیا تا آنحضرتؐ کو آپ سے نفرت پیدا ہو۔ اور حضرت ابو بکرؓ کو مسلمانوں میں جو اعزاز حاصل ہے وہ کم ہو جائے اور ان کے آئندہ خلیفہ بننے کا امکان نہ رہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گو الزام لگانے والا مسلمان کہلانے والا ایک جتھہ ہے ۲۴/۱۲ مگر لاتحسبوہ شرًّا لکم بل ھو خیرٌ لکم۔ یہ الزام بھی تمہاری بہتری کا موجب ہو جائیگا چنانچہ اب ہم خلافت کے متعلق اصول بھی بتلا دیتے ہیں۔ اور یہ بھی بتلا دیتے ہیں کہ یہ منافق ناکام رہیں گے اور ہم خلافت کو قائم کر دینگے۔ کیونکہ خلافت نبوت کا جزو ہے اور الٰہی نور کے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔

لاشرقیّۃ ولا غربیّۃ میں ایک بات تو یہ بتائی کہ اسلامی شریعت مشرقی یا مغربی لوگوں سے مخصوص نہیں۔ بلکہ عالمگیر ہے۔ دوسرے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انتخاب خلافت میں مشرقی و مغربی کا خیال نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ مسلمانوں میں سے جو شخص لائق ہو اس کو خلیفہ بنانا چاہیئے۔

یکاد زیتھا یضیٓءُ ولو لم تمسسہ نارٌ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ تعلیم ایسی ہے کہ فطرتِ صحیحہ اسے قبول کرنے کے لیے خود بخود اس کی طرف دوڑتی ہے اسپر اگر نبی بھی آجائے تو معاملہ نورٌ علیٰ نور والا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ساری دنیا کو روشن کر دیتی ہے۔

۳۷ اس امر کے مزید ثبوت کے طور پر کہ اوپر جس نور کا ذکر ہے۔ وہ نور خلافت ہی ہے فرماتا ہے فی بیوتٍ۔ نور نبوت تو صرف ایک گھر میں تھا مگر یہ نور چند گھروں میں ہے۔ اذن اللہ ان ترفع۔ وہ گھر ابھی چھوٹے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان کو بلند کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے گھروں سے یہاں گھروں والے مراد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں اونچا کرنے سے بلندیٔ درجات مراد ہے اس لیے مسیحؑ کے متعلق بھی رفع کے یہی معنے لیے جائیں گے۔

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ (۳۹) اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل الٹ جائینگے۔ اور آنکھیں پلٹ جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کی بہتر سے بہتر جزا دے گا۔ اور ان کو اپنے فضل سے (مال و اولاد) میں بڑھا دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

۳۸-۳۹ بعض مالدار ایسے ہوتے ہیں کہ نادان انسان سمجھتا ہے کہ انہیں مال سے بہت محبت ہے۔ مگر ان کے آسمانی ہونے کی یہ دلیل ہوتی ہے کہ جب بھی انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آواز آتی ہے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں۔ کہ ان کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ان کی دنیا دین کے راستہ میں روک نہیں بلکہ وہ دنیا اس لیے کماتے ہیں کہ زیادہ دلجمعی سے خدمتِ دین کر سکیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سرے سے دنیا کمانی ہی نہیں چاہیے۔ اور چاہیئے کہ تمام افراد سارا وقت دینی کام کرتے رہیں۔ مثلاً حضرت مسیحؑ نے مال نہ جمع کرنے اور تمام مال لوگوں کو دے دینے کی تعلیم دی (متی ۲۴/۱۹، ۲۰-۱۹/۶) مگر عیسائیوں کی ترقی اس تعلیم سے منہ پھیر لینے کا نتیجہ ہے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ دولت جیسے جی چاہے کمائی جائے۔ مذہب کا اس سے کوئی دخل نہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے دنیا کمانے سے منع نہیں کیا۔ بلکہ مال کا نام فضل اللہ رکھا ہے۔ (جمعہ ۹۲/۱۱) اگر اسلام تجارت و صنعت و حرفت سے منع کرتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ اسلام اس امر کو روا رکھتا ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو اسلام میں داخل ہو۔ مگر دوسرا حصہ بیشک داخل نہ ہو۔ اس لیے اسلام نے ان چیزوں کی اجازت دے کر کچھ قواعد کی پابندی لازم قرار دے دی ہے تاکہ دین کو بھی نقصان نہ ہو اور دنیا کی مشکلات میں بھی اضافہ نہ ہو۔ یہ قواعد حسب ذیل ہیں:-

پہلا قاعدہ تو یہی بیان ہوا ہے کہ وہ بے شک تجارت کریں۔ بیع کریں مگر یہ چیزیں دین کے راستہ میں روک نہیں ہونی چاہئیں۔

دوسرا قاعدہ۔ توبہ ۱۱/۳۴ سے ظاہر ہے کہ جو شخص روپیہ کما کر اتنا بخیل ہو جاتا ہے کہ راہِ خدا میں بھی خرچ نہیں کرتا وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایسی تجارت جائز نہیں جس کے نتیجہ میں بیکار رکھنے کے لیے روپیہ جمع کیا جائے۔ ہاں کسی دوسرے وقت خرچ کرنے کے لیے روپیہ پس انداز کرنا جائز ہے۔

تیسرا قاعدہ۔ جو روپیہ اپنی ضروریات کے لیے عارضی طور پر جمع کیا جائے۔ اور اس پر ایک سال

وَالَّذِينَ كَفَرُوٓا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْـَٔانُ مَآءً حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَهُۥ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَوَجَدَ ٱللَّهَ عِندَهُۥ فَوَفَّىٰهُ حِسَابَهُۥ ۗ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلْحِسَابِ ۝

(۴۰) اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں جو ایک وسیع میدان میں نظر آتی ہے جسکو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آجاتا ہے تو وہ اسے کچھ بھی نہیں پاتا۔ اور اللہ (تعالیٰ) کو اس کے پاس دیکھ لیتا ہے تب اللہ (تعالیٰ) اُسے اس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانیوالوں میں سے ہے۔

گذر جائے۔ تو اس پر زکوٰۃ ادا کی جائے (زکوٰۃ کی حکمت کے لیے دیکھیں ص ۱۵۸) ہاں جس مال پر گورنمنٹ نے زکوٰۃ کے برابر ٹیکس لے لیا ہو۔ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

چوتھا فائدہ۔ کشائش و تنگی دونوں حالتوں میں مسلمان کو مساکین کے لیے خرچ کرنا چاہیئے۔ (۳/۱۳۵) تنگ دست پر زکوٰۃ نہیں اس لیے یہاں طوعی صدقہ مراد ہے نہ کہ زکوٰۃ۔ ضراء کے یہ معنے نہیں کہ انسان کے پاس کچھ نہ ہو پھر بھی خرچ کرے۔ بلکہ اس لفظ کا استعمال اس لیے ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے تاجروں پر بھی تنگی آجاتی ہے۔

پانچواں قاعدہ۔ فرماتا ہے تعاونوا على البر والتقوىٰ۔ (۵/۲) ۔ یعنی ایک تو یہی تجارتیں اور صنعتیں اختیار کی جائیں جو تقویت دین کا موجب ہوں۔ دوسرے آپس میں بھی تعاون کیا جائے۔ یعنی دوسروں کو کام سکھلا کر علم کو وسیع کیا جائے۔

چھٹا قاعدہ۔ حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ، خواہ کسی کام میں مصروف ہو انسان کو ایک مقصد سامنے رکھنا چاہیئے۔ کہ دین کی ترقی ہو۔

ساتواں قاعدہ۔ وزن درست ہونا چاہیئے۔

آٹھواں قاعدہ۔ دھوکہ فریب اور ملاوٹ جائز نہیں۔

نواں قاعدہ۔ اس لیے غلہ یا کوئی اور چیز روکی نہ جائے کہ مہنگی ہونے پر بیچیں گے۔

دسواں قاعدہ:۔ مزدور کو اس کا حق پورا اور وقت پر دیا جائے۔

گیارھواں قاعدہ۔ انسان مال کے نتیجہ میں اپنے اندر کبر اور امیر و غریب میں فرق پیدا نہ ہونے دے۔

بارھواں قاعدہ:۔ مالدار موت کے وقت اپنے اموال کا کچھ حصہ غرباء اور دین کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ (۲/۱۸۲) ۔ اگر کوئی تاجرانہ اصولوں کو مدنظر رکھے تو خواہ بظاہر وہ تجارتی کام کر رہا ہو مگر وہ ایسا ہی سمجھا جائیگا جیسا کہ دین کا کام کر رہا ہو۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ؒ

(۴۱) یا ان کافروں کے اعمال کی کیفیت، ان تاریکیوں جیسی ہے۔ جو ایک گہرے سمندر پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں جس پر لہریں اٹھ رہی ہوتی ہیں اور ان لہروں پر اور لہریں اٹھ رہی ہوتی ہیں اور ان سب کے اوپر ایک بادل ہوتا ہے یہ ایسی تاریکیاں ہوتی ہیں کہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر چھائی ہوئی ہوتی ہیں جب انسان اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو باوجود کوشش کے اس کو دیکھ نہیں سکتا اور جس کیلئے اللہ نور نہ بنائے اسکو کہیں سے نور نہیں ملتا۔

ع ۵

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝

(۴۲) کیا تو دیکھتا نہیں کہ اللہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں رہتے ہیں۔ سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور پرندے صف باندھے ہوئے اس کے سامنے حاضر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک (اپنی اپنی پیدائش کے مطابق) اپنی نماز اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے خوب جانتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

(۴۳) اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

ف۴۰ حٰمٓ سجدہ ۳۱-۳۲-۳۳ سے ظاہر ہے کہ اسلامی احکام پر عمل کرنے والا خیالی طور پر نہیں عملاً الٰہی برکات سے متمتع ہو جاتا ہے۔ مگر دوسرے مذاہب چونکہ الہام، معجزات اور قبولیت دعا کے نشان نہیں دکھا سکتے۔ وہ صرف اگلے جہان کے انعامات کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے ماننے والوں کا ہر قدم سراب کی طرف بڑھتا ہے اور انہیں آبِ حیات سے دور سے دور تر لے جاتا ہے۔

ف۴۱ یعنی جب قوم شریعت سے منہ موڑ لیتی ہے تو ایک طرف اس کے نفس کی تاریکیاں جوش مارنے لگتی ہیں۔ اور دوسری طرف خدا تعالیٰ بھی اپنے نور کو اس سے کھینچ لیتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کے مصائب بڑھتے جاتے ہیں اور ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا یعنی کام کے ذرائع بھی اس سے غائب ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ قرآنی نور کے بعد بھی اندھیرے کے دور آتے رہیں گے اور مصلح آکر اس تاریکی کو دور کرتے رہیں گے۔

ف۴۲-۴۳ یعنی ہر چیز اپنے وجود سے (نہ کہ منہ سے) ثابت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بے عیب ہے کیونکہ اس کے لیے ہر مزدوت خدا تعالیٰ نے مہیا کی ہوئی ہے۔ پرندے تک اپنی ہیئت سے خدا کی تسبیح کر رہے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ ؕ یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ؕ

(۴۴) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ (اللہ تعالیٰ) بادلوں کو آہستہ آہستہ ہانک کر لاتا ہے پھر ان کے درمیان اتصال پیدا کر دیتا ہے پھر ان کو تہ بتہ بنا دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر سے بارش ٹپکنے لگتی ہے اور وہ بادل ہی سے بہت بڑے حجم کی چیزیں گراتا ہے۔ جن میں سے بعض اولوں کی قسم کی ہوتی ہیں اور اس کو جس (قوم) تک چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اُسے روک لیتا ہے۔ قریب ہوتا ہے کہ اس کی بجلی کی روشنی بعض آنکھوں کو اندھا کر دے۔

یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ۝

(۴۵) اللہ (تعالیٰ) رات اور دن کو چکر دیتا رہتا ہے۔ اس میں عقل والے لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَمِنْهُمْ

(۴۶) اور اللہ (تعالیٰ) نے ہر چلنے والے جانور کو پانی (یعنی نطفہ) سے پیدا کیا ہے۔ پس کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے پیٹ پر چلتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو اپنے دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں۔ جو

اور اس کا فرض ادا کر رہے ہیں جو پرندہ کے تعلق میں صلوٰۃ کے معنے ہیں۔

۴۴ یہاں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ جب اپنے نور کو اٹھاتا ہے تو وہ پہلے آہستہ چلنے والے بادلوں کی طرح جو پانی کے ذرّوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ہلکا سا غبار معلوم ہوتا ہے۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ اسے طاقت بخشنا شروع کرتا ہے اور آخر وہ موسلا دھار بارش کی طرح انسانوں پر برس پڑتا ہے۔

من جبالٍ:- یہ محاورہ ہے جو کثرت کے لیے آتا ہے۔ کہتے ہیں۔ فلانٌ یملک جبالًا من فضّةٍ۔ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ کبھی کبھی وہ بادلوں سے موسلا دھار بارش اتارتا ہے۔

فِیْهَا۔۔۔۔۔۔ یَّشَآءُ۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ شریعت جس طرح بعض کی ہدایت کا موجب ہوتی ہے۔ بعض کی تباہی کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔

۴۵ یعنی جس طرح خدا تعالیٰ رات اور دن کو ایک دوسرے سے بدلتا رہتا ہے۔ اس سے عقلمند سمجھ سکتے ہیں کہ ہدایت اور کفر کے ادوار کا بدلنا بھی ضروری ہے۔

۴۶ اس میں اشارہ ہے کہ روحانی پانی سے بھی لوگ اپنی استعدادوں کے مطابق ہی طاقت حاصل

مَّنۡ يَّمۡشِىۡ عَلٰۤى اَرۡبَعٍ‌ؕ يَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ‏ ○

اپنے چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ○

(۴۷) ہم نے کھلے کھلے نشانات اتارے ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے۔ سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

وَيَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوۡلِ وَاَطَعۡنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ ؕ

(۴۸) اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کا وعدہ کر لیا۔ پھر ان میں سے ایک گروہ اس کے بعد اپنے

کرتے ہیں بعض پیٹوں کے بل چلتے ہیں یعنی جب تک انعامات ملتے رہتے ہیں۔ خدا کے ساتھ رہتے ہیں اور بعض دو پاؤں یعنی انسانوں کی طرح اعلیٰ ترقیات حاصل کر جاتے ہیں۔ اور بعض چوپایوں کی طرح خدا کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور کھانے پینے کی طرف زیادہ۔

۴۷ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ سے مراد ایسے نشان ہیں جو غیب کو کھول دیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کی ہستی غیب میں ہے اسی مذہب کا فائدہ ہے جو معجزات کے ذریعہ اسے ظاہر کر دے۔ جب حضرت حمزہؓ کی نعش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب دشمنوں نے ایسے ظلم کی ابتدا کر دی ہے۔ تو میں بھی (تنبیہ کے طور پر) ایسا ہی کرونگا۔ مگر وحی ہوئی کہ تمہیں عفو و درگذر سے کام لینا چاہیئے (آل عمران ۱۳۵/۱۴۱) اس کے بعد ولید اور عاص اور ابو جہل جیسے دشمنوں کی اولادوں کے مسلمان ہونے اور اسلام کی شاندار خدمات بجالانے سے ثابت ہو گیا کہ یہ حکم عفو ایک عالم الغیب ہستی کی طرف سے تھا۔ اصل میں اسلامی تاریخ کا ہر ورق آیات بینات کا حامل ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونا کوئی بوجھ نہیں کیونکہ اسلام غیبی طاقتوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔

اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ کا نمونہ امتِ محمدیہ میں اولیاء اللہ کے ذریعہ ہمیشہ قائم رہا ہے اور اس زمانہ میں حضرت مسیح موعودؑ کا وجود آیات مبینات بن گیا۔

وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ میں بتایا کہ آیات مبینات کے ذریعہ خدا تعالیٰ اپنا چہرہ تو دکھا دیتا ہے مگر ہدایت فضل الٰہی کے بغیر میسر نہیں آسکتی اور مغضوب و ضال ہونے کا خطرہ رہتا ہے جیسا کہ ۱:۷ میں ارشاد ہے۔ اس لئے آستانہ الوہیت پر لگے رہنا ضروری ہے۔

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اقرار سے پھر جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

(۴۹) اور جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس لیے بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ اعراض کرنے لگتا ہے۔

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝

(۵۰) اور اگر کوئی بات ان کے حق میں ہو تو وہ فوراً اچھا اطاعت کرتے ہوئے آجاتے ہیں۔

اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۚ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(۵۱) کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے؟ یا وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ خود ظالم ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(۵۲) مومنوں کا جواب جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں۔ کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا۔ اور وہی لوگ کامیاب ہوا کرتے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

(۵۳) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اللہ سے ڈریں۔ اور اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ وہ بامراد ہو جاتے ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ

(۵۴) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پکی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر تو ان کو حکم دے تو وہ فوراً گھروں سے نکل کھڑے ہونگے۔

۴۸تا۵۳ یہاں بتلایا ہے کہ آپس کے اختلافات میں جب تک خدا اور رسول کو حکم نہ بنایا جائے مسلمان بحیثیت مجموعی ترقی نہیں کرسکتے۔ یہ منافقت ہے کہ جہاں فائدہ دیکھا ان کی بات مان لی۔ اور جہاں نقصان دیکھا رد کر دی۔ اسلام چونکہ مذہبی، سیاسی معاشرتی تمام امور میں ہدایات دیتا ہے اس لیے ان سب کے متعلق اس کے احکام کا ماننا ضروری ہے۔ (نساء ۶۵) میں بھی بتلایا گیا ہے کہ آنحضرت آخری قاضی ہیں۔ آپ کے فیصلہ کی اپیل نہیں ہوسکتی اور آپ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا جزوِ ایمان ہے۔

قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

کہو قسمیں نہ کھاؤ۔ ہمارا حکم تو تمہیں صرف ایسی اطاعت کا ہے جو عرف عام میں اطاعت سمجھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو یقیناً خبردار ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

(۵۵) تو کہہ اللہ کی اطاعت کرو۔ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پس اگر وہ پھر جائیں تو اس (رسول) پر صرف اس کی ذمہ داری ہے جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے اور تم پر اس کی ذمہ داری ہے جو تمہارے ذمہ لگایا گیا ہے اور اگر تم اس کی اطاعت کرو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور رسول کے ذمہ تو صرف بات کو کھول کر پہنچا دینا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

(۵۶) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانیوالوں اور مناسب حال عمل کرنیوالوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو زمین میں خلیفہ بنادیگا۔ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور جو دین اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ وہ ان کے لیے اُسے مضبوطی سے قائم کردے گا۔ اور ان کے خوف کی حالت کے بعد وہ ان کیلئے امن کی حالت تبدیل کردے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے (اور) کسی چیز کو میرا شریک نہیں بنائینگے اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں گے۔ وہ نافرمانوں میں سے قرار دیئے جائیں گے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(۵۷) اور تم سب نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰتیں دو اور اس رسول کی اطاعت کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ

(۵۸) اور (اے مخاطب) کبھی خیال نہ کر کہ کفار زمین میں ہمیں اپنی تدبیروں سے عاجز کردیں گے اور ان کا ٹھکانا

ف۵۵-۵۶ یعنی صرف ظاہری ایمان اور زبانی دعوے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کامیابی کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی عملاً اطاعت ضروری ہے۔

مَأْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۔ تو دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

۷ ع ۱۴

۵۸-۵۴ یہاں پیشگوئی نہیں مشروط وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان خلافت کے قائل رہے اور اس کے لیے مناسب کوشش کرتے رہے تو پہلی قوموں کی طرح خدا تعالیٰ ان میں بھی خلافت قائم کر دے گا۔ اور دین کی جڑیں مضبوط کر دے گا۔

آیت ۵۷ سے ظاہر ہے کہ خلفاء کے ساتھ مل کر دین کی تمکین کر کے وہ اطاعت رسول کرنے والے ہی قرار پائیں گے۔ آنحضرت صلعم نے یہی نکتہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ من اطاع امیری فقد اطاعنی۔ وعدہ خلافت کی اغراض یہ ہیں کہ (ا) مسلمان پہلوں کی طرح انعام پائیں گے (ب) تمکین دین ہو (ج) مسلمانوں کا خوف امن سے بدل جائے (د) شرک دور کیا جائے اور عبادت قائم کی جائے۔

یہاں یہ بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ خلافت کے بغیر اقامت صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ صحیح طور پر ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ زکوٰۃ کے متعلق ضروری ہے کہ امراء سے لے کر ایک نظام کے ماتحت غرباء پر خرچ کیا جائے۔ آنحضرتؐ کے بعد لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ اس کا حکم صرف آپؐ کو تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے یہ نظام پھر جاری فرما دیا۔ اسی طرح اقامت صلوٰۃ خلافت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ صلوٰۃ کا بہترین حصہ جمعہ ہے۔ جمعہ اور عیدین پر قومی ضرورتوں کے متعلق خطبے پڑھے جاتے ہیں۔ اگر ایسا واجب الاطاعت خلیفہ ہوگا۔ جس کے پاس ساری دنیا سے رپورٹیں آئیں گی تو وہ ضرورت کے مطابق قربانیوں کی ہدایت دے سکیگا۔ انفرادی رنگ میں یہ ممکن نہیں۔ پھر اطاعت رسول بھی خلافت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نماز روزہ تو اطاعت احکام الٰہی ہے۔ اطاعت رسول یہ ہے کہ وہ جس وقت جس کام پر زور دینے کا حکم دے اس پر زور دیا جائے۔

یہاں خلفاء کی علامات بھی بتلائی گئی ہیں۔

پہلی علامت:۔ خلیفہ خدا بناتا ہے۔ کوئی شخص خواہش یا منصوبہ کر کے خلیفہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وعدہ خدا تعالیٰ کا ہے اس لیے وہی پورا کرتا ہے۔

دوسری علامت:۔ کما استخلف الذین من قبلھم کہہ کر بتایا کہ یہ خلفاء نصرت الٰہی کے ایسے ہی مستحق ہوں گے جیسے پہلے خلفاء۔ پہلی خلافتیں اوّل آدمؑ اور داؤد کی خلافت کی طرح خلافت نبوت تھیں۔ (بقرہ ۲/۳۱، ص ۳۸/۲۷) دوسرے قوم ہود اور عاد کی خلافت کی طرح خلافت ملوکیت بھی (اعراف ۷/۷۰) یوسف کو خلافت نبوت اور خلافت ملوکیت دونوں دی گئی تھیں۔ (۱۲/۵۷) تیسری خلافت خلافت نبوت ہوتی ہے۔ بعض نبی ایسے ہوتے ہیں۔ جو عہدہ کے لحاظ سے براہ راست

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر جہاں تک شریعت کا تعلق ہے وہ پہلے نبی کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ ایسے نبی پہلے نبی کے خلیفہ ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل میں ایسے انبیاء بہت ہوئے ہیں جو موسیٰؑ کے لیے بطور خلیفہ تھے۔ کیونکہ ان کا کام شریعت موسوی کا قیام تھا (مائدہ ۵/۴۵) گو مقام نبوت انہیں براہِ راست عطا ہوا تھا۔ حضرت مسیحؑ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھے (مائدہ ۵/۴۷) جنہوں نے کہا کہ میں (تورات کو) منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں (متی ۵/۱۷-۱۸)۔ اس آیت استخلاف میں صرف خلافتِ نبوت کا ذکر ہے کیونکہ ولیمکنن لھم دینھم کا اصول بادشاہوں کے متعلق نہیں خلفاء کے متعلق ہی ہے۔ اسی طرح خوف کو امن سے بدلنے کا وعدہ بھی بادشاہوں سے نہیں ہوتا۔ وہ تو بسا اوقات خطرہ کے وقت ہمت کھو بیٹھتے ہیں پھر سچے خلفاء یعبدوننی و لایشرکون بی کے مصداق ہوتے ہیں۔ مگر بادشاہ تو شرک بھی کر لیتے ہیں پھر فرماتا ہے ایسے خلفاء کے منکر فاسق ہو جائیں گے مگر بادشاہوں کے انکار سے انسان فاسق نہیں بنتا۔

تیسری علامت یہ ہے کہ نبوت تو ظھر الفساد فی البر و البحر (روم ۳۰/۴۲) کے وقت آتی ہے مگر خلافت اس وقت آتی ہے جب قریباً تمام لوگ ایمان اور عمل صالح پر قائم ہوتے ہیں اس لیے خلافت کا مٹنا خلیفہ کے گنہگار ہونے کی دلیل نہیں بلکہ امت کے گنہگار ہونے کی دلیل ہوتا ہے

چوتھی علامت:۔ خلیفہ برحق کے ذریعہ دین کو تمکنت دی جاتی ہے (آیت ۵۶) جیسے باوجود اس کے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے خاندانوں کو عرب میں وہ قوت حاصل تھی۔ کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے خاندانوں کو نہیں تھی۔ مگر جو عزت ان کے فتووں کو حاصل ہے وہ حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے فتووں کو حاصل نہیں۔ اسی طرح بنو عبد الشمس کے زمانہ میں حضرت علیؓ کو اور دولت عباسیہ کے زمانہ میں حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی مگر خدا تعالیٰ نے سارے عالم اسلام میں ان کی عزت قائم کر دی۔ پھر دین کے معنے سیاست اور حکومت کے بھی ہیں۔ اس لیے سچے خلفاء کی یہ بھی علامت ہے کہ ان کی پالیسی کامیاب کی جاتی ہے۔

پانچویں علامت:۔ ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔ یہاں من بعد الخوف نہیں فرمایا۔ بلکہ من بعد خوفھم فرمایا ہے۔ پس وعدہ یہ ہے کہ جس چیز سے وہ ڈریں گے اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے گا۔ نہ یہ کہ جس سے زید و بکر ڈریں گے اسے دور کر دیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ پھر خلفاء شہید کیوں ہوئے۔ تو جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ خود دعا کرتے رہتے تھے کہ انہیں شہادت نصیب ہو۔ اور حضرت عثمان بھی شہادت سے ڈرتے نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے نہ گھر پہ پہرہ پسند کیا۔ نہ حضرت معاویہ کے ساتھ شام جانا پسند کیا۔ حضرت علیؓ کا بھی یہی حال تھا۔ کہ باوجود اس کے کہ بعض دفعہ حضرت معاویہ کا لشکر آپ کے لشکر سے کئی گنا بڑا ہوتا تھا آپ پرواہ نہ کرتے اور

یہی فرماتے تھے کہ قرآن کے خلاف کوئی بات نہیں مانوں گا۔ غرض یہ لوگ خائف تھے تو اس سے کہ اسلام کی روشنی میں فرق نہ آئے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے اس خوف کو امن میں بدل دیا۔ اور ان کی وفات کے بعد امت کی ہدایت کے سامان ہوتے رہے۔ اور اصل معجزہ یہی ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کی خواہشات پوری ہوتی رہیں۔ کیونکہ یہ خدا کے محبوب ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ جیسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کے ہاتھ میں سونے کے کنگن دیکھے تو آپؐ کے بعد خدا تعالےٰ نے تمام روکوں کو ہٹا کر ایسی باتوں کو جمع کر دیا جو اس خبر کو پورا کرنے والی تھیں۔

چھٹی علامت:۔ یعبدونني لا یشرکون بي شیئاً یعنی وہ بندوں سے نہیں ڈرتے وہی کرتے ہیں جس سے منشاء الٰہی پورا ہو۔

چنانچہ جب مکہ اور مدینہ کے علاوہ سارے عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اور مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اس وقت بھی باوجود صحابہؓ کی مخالفت کے اسامہؓ والے لشکر کو شام جانے سے نہیں روکا۔ اور نہ زکوٰۃ معاف کی۔ اسی طرح آپؓ نے ایک ہی وقت میں قیصر و کسریٰ جیسی زبردست حکومتوں سے جنگ شروع کر دی۔ پھر حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو اسی عمرؓ نے جو جیش اسامہؓ کو روکنے کا مشورہ دیتے تھے ایک ہی وقت میں قیصر و کسریٰ سے جنگ شروع کر دی۔ اور دونوں کا تختہ الٹ دیا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ جیسے رقیق القلب آدمی نے اندرونی مخالفت کا مقابلہ جرات کن یقین سے کیا ہے۔ غرض تمام خلفاء نے یعبدونني لا یشرکون بي کا شاندار نظارہ دکھایا جو ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا تعالےٰ نے خود ان کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور خود ان کی تائید کا ذمہ وار تھا۔

اب اس آیت پر اعتراضات کے جواب لکھے جاتے ہیں:۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس آیت میں وعدہ امت سے ہے نہ کہ افراد سے اس لیے مراد مسلمانوں کو حکومت ملنا ہے نہ کہ کسی فرد کو خلافت کا ملنا۔

جواب:۔ قرآن سے ثابت ہے کہ کئی وعدے قوم سے ہوتے ہیں مگر پورے افراد کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ جیسے یہود کے متعلق آتا ہے جعلکم ملوک (مائدہ ۵/۲۱) اس نے تم سب کو بادشاہ بنایا لیکن ہر یہودی بادشاہ نہیں بنا۔ پھر بقرہ ۲/۹۲ میں لکھا ہے کہ یہود نے کہا نؤمن بما انزل علینا۔ مگر ظاہر ہے کہ وحی ان پہ نہیں موسیٰؑ پر اتری تھی۔ اسی طرح خلافت سے چونکہ سب قوم نے فائدہ اٹھانا تھا اس لیے فرمایا تم کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ دوسرے آنحضرتؐ کے بعد خلافت صرف بعض افراد کو ملی اس لیے یا یہ ماننا پڑے گا کہ آپؐ کے بعد لوگ الذین امنوا وعملوا الصلحت کے مصداق نہیں رہے تھے اس لیے یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ یا یہ کہ خدا تعالےٰ کی فعلی شہادت نے ثابت

کردیا کہ یہ وعدہ بعض افراد کے ذریعہ ہی پورا کیا جاتا تھا۔

دوسرا اعتراض۔ مانا کہ آیت میں افراد کی خلافت کا ذکر ہے مگر پہلوں میں یا خلافت نبوت تھی یا خلافت ملوکیت مگر خلفاء اربعہ نہ بادشاہ تھے نہ نبی۔ پھر وہ اس آیت کے مصداق کیسے ہو گئے؟

جواب:۔ کسی چیز سے مشابہت اصولی ہوتی ہے نہ کہ ہر رنگ میں جیسے آیت انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا (مزمل $\frac{۴۳}{۱۶}$) میں آنحضرت اور موسےٰؑ کی مشابہت بیان کی گئی ہے لیکن حضرت موسےٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف آئے تھے اور آپ کا زمانہ ۱۹۰۰ سال تک تھا۔ مگر آنحضرتؐ ساری دنیا کی طرف آئے۔ اور آپ کا زمانہ قیامت تک ہے ایسا ہی جزوی فرق پہلے خلفاء اور خلفاء اربعہ میں ہے۔ ورنہ اپنے نبی کی امت کو سنبھالنے کا جو اصل فرض تھا وہ انہوں نے بہ نسبت سابق خلفاء کے زیادہ پورا کیا۔ پھر جس طرح موسیٰؑ کے تیرہ سو سال بعد مسیحؑ آئے جو تابع نبی تھے۔ اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سو سال بعد مسیح موعودؑ آئے۔ جو تابع امتی نبی تھے ۔ آیت کما استخلف الذین من قبلھم میں پہلوں کے طریق انتخاب کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اور حضرت مسیح موعودؑ کے الہام "کلیسیا کی طاقت کا نسخہ" (تذکرہ ص۶۰۷) میں بھی یہ اشارہ ہے کہ کلیسیا کی طاقت کی ایک خاص وجہ ہے اسے یاد رکھو یعنی جس طرح وہ خلیفہ انتخاب کرتے ہیں۔ ویسا ہی یا اس کے قریب کے طریق تم اختیار کرو۔

تیسرا اعتراض۔ اگر خلافت کا وعدہ تھا تو حضرت علیؓ کے بعد کیوں خلیفے نہیں ہوئے۔

جواب:۔ یہاں خلافت کا ذکر ہے۔ اور عملوا عملاً مناسباً لحصول الخلافۃ ہے یہ شرط چونکہ اس وقت پوری نہیں ہوئی تھی۔ الٰہی وعدہ بھی پورا نہیں ہوا۔

چوتھا اعتراض۔ جب خلیفہ انتخاب سے ہوتا ہے۔ تو امت کے لیے اس کا عزل بھی جائز ہو۔

جواب:۔ گو خلفاء کا انتخاب لوگوں کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن لیستخلفنھم کے الفاظ بتاتے ہیں کہ خدا تعالےٰ خود ان کو حقدار کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور پھر اس کے دین کو قائم کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس لیے اسے امت معزول نہیں کر سکتی۔ دوسرے اس جگہ وعدہ کا لفظ ہے جو احسان پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اس انعام کو رد کرنے پر اللہ تعالےٰ فرمائے گا۔ کہ تم نے جس شخص کی صورت میں انعام خلافت لینا چاہا ہم نے دے دیا۔ جب میں نے تمہاری مان لی۔ تو اب تم کہتے ہو کہ ہم اس انعام پر راضی نہیں۔ اس لیے ہم کھٹکتے ہیں۔ من کفر بعد ذٰلک فاُولٰٓئک ھم الفاسقون۔ اس کے مقابعد نماز، زکوٰۃ اور اطاعت رسولؐ کا حکم دے کر اشارہ کیا کہ اگر برکات خلافت کے نزول میں کمی آجائے۔ تو بحیثیت قوم مسلمانوں کو ان باتوں میں چست ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(۵۹) اے مومنو! چاہیئے کہ وہ لوگ جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہیں۔ اور وہ لوگ جو ابھی بلوغت کو نہیں پہنچے۔ وہ تین وقتوں میں اجازت لیکر اندر آیا کریں۔ صبح کی نماز سے پہلے۔ اور جب تم دوپہر کے وقت اپنے کپڑے اتارتے ہو۔ اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں۔ ان وقتوں کے بعد اندر آنے جانے پر نہ تم پر کوئی گناہ ہے۔ اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے۔ کیونکہ بعض تم میں سے بعض کے پاس ضرورتاً اکثر آتے جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت علم والا (اور) حکمت والا ہے۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(۶۰) اور جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں۔ تو اسی طرح اجازت لیا کریں۔ جس طرح ان سے پہلے (یعنی بڑے) لوگ اجازت لیا کرتے تھے اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

ایسا کریں گے تو پھر ان پر رحم کر دیا جائے گا۔ اور انہیں ایک ہاتھ پر جمع کر دیا جائے گا۔ مگر بہرحال منکرین خلافت کبھی بھی دین پر غالب نہیں آئیں گے چنانچہ خوارج کبھی بھی دنیا پر حاکم نہیں بنے۔

۵۹-۶۰ یہاں یہ بھی پیشگوئی ہے کہ جب مسلمانوں کو قومی غلبہ حاصل ہوگا تو غلاموں کا رواج بڑھ جائیگا۔ اندلس اور بغداد میں یہی چیز مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی۔

یہ آیات چونکہ خلافت کے ذکر کے بعد آئی ہیں ان میں قومی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کچھ اوقات انسان پر ننگا ہونے یعنی غفلت کے بھی آتے ہیں ان اوقات میں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اس آیت میں مذکورہ اوقات حفاظتی نقطۂ نگاہ سے بہت اہم ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت نماز فجر کے وقت ہوئی تھی۔ غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر صحابہؓ دوپہر کے وقت غافل ہوگئے۔ تو آنحضرتؐ

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(۶۱) اور وہ عورتیں جو کہ بڑھیا ہو گئی ہیں۔ اور نکاح کے قابل نہیں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اپنے کپڑے اتار کر رکھ دیں۔ اس طرح کہ زینت کو ظاہر نہ کیا کریں۔ اور ان کا بچے رہنا ان کے لیے بہتر ہوگا اور اللہ (تعالےٰ) بہت سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔

لَيْسَ عَلَي الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَي الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَي الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَاۗىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ فَاِذَا دَخَلْتُمْ

(۶۲) نہ اندھوں پر۔ نہ لنگڑوں پر، نہ مریض پر نہ تم پر اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادوں کے گھر سے یا اپنی ماؤں (یا ننھیال) کے گھر سے۔ یا اپنے بھائیوں کے گھر سے یا اپنی بہنوں کے گھر سے۔ یا اپنے چچوں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھر سے یا اپنے ماموؤں کے گھر سے یا اپنی خالاؤں کے گھر سے یا جن کے سامان کے انتظام پر تم مقرر ہو۔ یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کوئی چیز لے کر کھا لینے میں کوئی حرج ہے۔ (اسی طرح) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ الگ کھاؤ یا سب مل کر کھاؤ۔ پس جب گھروں میں داخل ہونے لگو۔ تو اپنے

کے پاس ایک دشمن بد ارادہ سے پہنچ گیا تھا۔ اسی طرح رات کے وقت خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے صحابہؓ رات کو آنحضرت صلعم کا پہرہ ہتھیار لگا کر دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب بچہ جوان ہو جائے یعنی مسلمانوں کو حکومت مل جائے۔ تو تین وقتوں کا سوال نہیں ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیئے۔

لاٹ یعنی پردہ ایک عمر تک ہے اس کے بعد پردہ کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وان یستعففن خیر لھن اگر وہ پردہ قائم رکھیں تو بہرحال بہتر ہے۔

ضمنًا یضعن ثیابھن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ چہرہ کا پردہ ہے۔ ورنہ اس کے معنے یہ ہونگے کو منہ پہلے ہی ننگا ہے اب باقی جسم بھی ننگا کرنا جائز ہوگا۔

بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۠ ۚ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

عزیزوں یا دوستوں پر سلام کہہ لیا کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑی برکت والی اور پاکیزہ دعا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہیں کھول کر سناتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

(۶۳) صرف وہی لوگ مومن کہلانے کے مستحق ہیں۔ جو اللہ اور رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب کسی قومی کام کے لیے اس (رسول) کے پاس بیٹھے ہوں تو اٹھ کر نہیں جاتے۔ جب تک اس کی اجازت نہ لے لیں۔ اور وہ لوگ جو کہ اجازت لے کر چلتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں پس جب

---

۶۲ بیماروں، کمزوروں اور معذوروں کو یہودیت نے بھی حقارت سے دیکھا اور ان سے دور رہنے کی تعلیم دی (احبار ۲۱/۱۶-۲۳) اور دوسرے مذاہب نے بھی۔ مگر اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کو بھی سوسائٹی کا ایک جزو سمجھا جائے۔ اور الگ نہ رکھا جائے۔ دوسری جگہ فرمایا وفی اموالھم حق للسائل والمحروم (ذاریات ۲۰) رشتہ داروں کا ذکر اس لیے کیا ہے۔ کہ ایک طبقہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھر کھانا کھانا بھی معیوب سمجھتا ہے مگر اسلام نے اس کی اجازت دی ہے تا محبت بڑھے۔ مل کر کھانا کھانے سے یہ مراد نہیں کہ جن سے خطرناک بیماری لگنے کا ڈر ہو ان سے بھی پرہیز نہ کیا جائے۔ مثلاً آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ جذامی سے بچو اور قرآن فرماتا ہے لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (بقرہ ۲/۱۹۶)

بیوتکم،۔ سے بیٹیوں اور بیویوں کے گھر مراد ہیں۔ کیونکہ وہ ایسے ہی ہیں جیسے انسان کا اپنا گھر۔

جمیعًا اور اشتاتًا میں یہ اشارہ ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں سے اکٹھا کھانا کھانا بھی تمہارے لیے جائز ہے۔ یعنی اجازت سے اور الگ الگ بھی یعنی بغیر اجازت کے تاکہ آپس کے تعلقات بڑھیں۔

فسلموا علیٰ انفسکم،۔ اس سے مراد ان رشتہ داروں اور دوستوں کو سلام ہے جو ان گھروں میں رہتے تھے سلام معمولی چیز نہیں۔ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی سلامتی کا وعدہ ہے اور آنحضرتؐ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے وقت بندے کو جو سب سے پہلی چیز ملیگی وہ بھی سلام ہی ہے۔

بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ۚ فَاِذَا اسۡتَاۡذَنُوۡکَ لِبَعۡضِ شَاۡنِہِمۡ فَاۡذَنۡ لِّمَنۡ شِئۡتَ مِنۡہُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَہُمُ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝

وہ اپنے کسی اہم کام کے لیے اجازت لیں۔ تو ان میں سے جن کے متعلق تو چاہے۔ انہیں اجازت دے دے۔ اور اللہ (تعالیٰ) سے ان کے لیے بخشش مانگ۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡکُمۡ لِوَاذًا ۚ فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ فِتۡنَۃٌ اَوۡ یُصِیۡبَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝

(۶۴) (اے مومنو!) یہ نہ سمجھو کہ رسول کا تم میں سے کسی کو بلانا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ تم میں سے بعض کا بعض کو بلانا۔ اللہ (تعالیٰ) ان لوگوں کو جانتا ہے۔ جو کہ تم میں سے پہلو بچا کر (مشورہ کی مجلس سے) بھاگ جاتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ جو اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے ڈریں کہ ان کو خدا (تعالیٰ) کی طرف سے کوئی آفت نہ پہنچ جائے۔ یا ان کو دردناک عذاب نہ پہنچ جائے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ ؕ وَ یَوۡمَ یُرۡجَعُوۡنَ اِلَیۡہِ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝

(۶۵) سنو! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اللہ کا ہی ہے۔ جس (مقام) پر تم (کھڑے) ہو۔ اس کو بھی اللہ ہی جانتا ہے اور جس دن وہ لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ ان کو ان کے اعمال کا حال بتائے گا۔ اور اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے۔

ع ۹ / ۱۵

---

۶۳ قومی نظام کو درست رکھنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ سردار سے اجازت لیے بغیر ممبران شوریٰ مجلس سے نہ اٹھیں۔ ہاں سردار کو بھی حکم ہے کہ ضرورت پڑنے پر اجازت دیدے لیکن ایسی ضرورت کا پڑنا بھی شامتِ اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور شوریٰ کے نفع سے محروم کر دیتا ہے اس لیے آپکے لیے استغفار کا حکم ہے۔

۶۴ فرماتا ہے امام کی آواز کے مقابلہ میں افراد کی آواز کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لیے حکم ہے کہ وقت آئے تو نماز کو توڑ کر بھی نبی کی آواز کا جواب دیا جائے۔ یہی حکم درجہ کے مطابق خلیفہ، رسول کے متعلق بھی ہے۔ احد اور حنین میں مسلمانوں نے جو عارضی تکلیف اٹھائی وہ حضرت نبی کریم صلعم کے حکم کی خلاف ورزی ہی کا نتیجہ تھی۔

۶۵ یہاں بتلایا ہے کہ الٰہی احکام توڑنے سے ترقی نہیں ہو سکتی لیکن اگر تم اس کے ہو جاؤ گے۔ تو زمین و آسمان کا سب کچھ وہ تمہارے حوالے کر دے گا۔

رکوعاتہا ۶	سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ	اٰیاتہا ۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) باربار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝ (۲) وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے فرقان اپنے بندے پر اتارا ہے۔ تاکہ وہ سب جہانوں کے لئے ہوشیار کرنے والا بنے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ نور کے آخر میں اسلامی تنظیم کا ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں اور کفر کے کھوکھلے نظام سے ڈرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ ڈر انہیں تباہی سے بچائے گا نہیں، اس کے اور زیادہ قریب کر دیگا۔ اب اس سورۃ میں بتایا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سب جہانوں کے لیے نذیر ہے اور اس کی تعلیم فطرت کے مطابق ہے اس لئے اس کی مخالفت قانون نیچر کی مخالفت ہے۔

سورۃ نور میں بتایا گیا تھا کہ کامیابی کے لیے عقائد افکار اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ قومی تنظیم بھی ضروری ہے اور افراد کے حقوق پر قوم کے حقوق کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ اس سورۃ میں اس مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نیک اور بد کا مقابلہ کس طرح چلتا ہے۔ گویا ایمانی ترقی اور کفر کی ترقی کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ان کو مقابل پر بہنے والے دو دریا قرار دیا گیا ہے۔ اور زمانہ مسیح موعودؑ تک کی اسلامی ترقی اور تنزل کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۲ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے تبارک کے لفظ سے اپنے پاک اور بے عیب ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس بات کا ثبوت یہ دیا ہے کہ نزّل الفرقان:۔ اس نے ایسا کلام نازل کیا ہے جس کا ایک ایک لفظ حق و باطل اور مفید و مضر میں تمیز کر دیتا ہے جس کی وجہ سے انسان کے لیے اس تعلیم پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کی اس تعلیم کی طرح کہ اگر کوئی تیری گال پر ایک تھپڑ مارے تو تو دوسرا بھی آگے کر دے (متی $\frac{5}{39}$) نہیں کہ اس پر عمل ہی نہ ہو سکے اور خود اس تعلیم دینے والے کو بھی بعد میں کہنا پڑتے ہیں صلح کرنے نہیں تلوار چلانے آیا ہوں" (متی $\frac{10}{34}$) قرآن کریم کے شروع میں ہی اسکی امتیازی خصوصیت اس کا فرقان ہونا بیان کی گئی ہے ($\frac{2}{185}$) ہر نبی کو فرقان دیا جاتا ہے مگر جہاں دوسرے انبیاء کو کتاب اور اس کے علاوہ فرقان ملا تھا وہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کتاب ملی وہی فرقان بھی ہے اور پہلی کتب کی طرح وہ اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے دوسرے معجزات کی محتاج نہیں۔

عَلٰى عَبْدِهٖ:۔ بعثت انبیاء کی دو اغراض ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے ذریعہ روحانی تعلیم کی علمی طور پر تکمیل ہوتی ہے۔ دوسرے وہ خود عمل کر کے اس علم کی صحیح تشریح کر دیتے ہیں۔ اور لوگوں

الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ۝

(۳) وہ (ذات) جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اور جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا۔ اور جس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔

کی تعلیم اول تو غلط ہوتی ہے۔ دوسرے وہ خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ برکت والا ہے۔ جس نے اپنا کلام کسی بدعمل پر نہیں اُتارا۔ بلکہ اپنے عبد پر اتارا ہے (یعنی اس نبیؐ پر) جس نے اپنے آپ کو کامل طور پر خدا تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا۔ اور اپنے نیک نمونہ سے دنیا کو نیکی کی طرف کھینچ لایا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو اس جگہ عَلٰی عَبْدِہٖ کی بجائے عَلٰی عِبَادِہٖ بھی پڑھنے کی اجازت دی ہے اس لیے یہ معنی بھی ہیں کہ بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس نے یہ فرقان اپنے تمام بندوں کے لیے نازل کیا۔ چنانچہ اسلام نے ہر کام میں حتیٰ کہ عبادات میں بھی اعتدال کی تعلیم دی ہے۔ تاکہ ہر انسان اس پر عمل کر سکے (دیکھیں بنی اسرائیل ع۲)

لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ میں چونکہ ضمیر کا فاعل ظاہر نہیں کیا گیا۔ اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم کا اور رسول کریم صلعم کا ذکر ہے اس لیے تینوں کی طرف ضمیر پھر سکتی ہے اور یہ معنے ہوں گے کہ اس نے اس لئے قرآن نازل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یا قرآن یا محمد رسول اللہ (صلعم) ساری دنیا کے لیے نذیر بن جائیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف ضمیر پھیریں تو یہ اشارہ سمجھا جائے گا کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والا ایسا خدا ہے جو اب ایک ہی کتاب اور ایک ہی رسول پر ساری دنیا کو اکٹھا کرنا چاہتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ان کا ایک ہی وقت میں ان سب مذاہب پر تبلیغی حملہ ہونا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ برکتوں والا اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جبکہ مسلمان بھی اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ برکتوں والا ہے۔

قرآن کی طرف ضمیر پھیریں تو یہ اشارہ نکلے گا۔ کہ فتح قرآن کے لیے مقدر ہے اس لیے تم اپنے قول و فعل کو قرآن کے تابع کر کے اپنے وجود کو اس کے سپرد کر دوگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی فتح دیگا۔

اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف لِیَکُوْنَ کی ضمیر پھیریں تو چونکہ آپ مادی جسم کے ساتھ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے اس لیے یہ اشارہ سمجھا جائیگا کہ جبتک مسلمان آپ کے نقش قدم پر نہیں چلتے اور اپنے اپنے دائرہ میں چھوٹے محمدؐ بننے کی کوشش نہیں کرتے اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝	(۴) اور ان لوگوں نے اس (یعنی خدا) کے سوا معبود بنا چھوڑے ہیں۔ جو کچھ (بھی) پیدا نہیں کرتے حالانکہ وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور جو اپنی ذات کے لئے نہ کسی ضرر پر قادر ہیں نہ نفع پر۔ نہ موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے۔ اور نہ پھر جی اٹھنے کے۔

۳ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ اسلام نے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کے ماتحت ساری دنیا کو مخاطب کرنا تھا۔ اس لئے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے ذکر سے اشارہ فرمایا کہ اسلامی علماء کو دنیا کی تمام زبانیں سیکھنی چاہئیں۔

دنیا کے تمام مذاہب پر تبلیغی حملہ کے نتیجہ میں چونکہ مخالفت ضروری تھی اس لئے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر ایک طرف دشمنوں کو تنبیہہ کی کہ اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کرو۔ آسمان و زمین کی اصل حکومت خدا تعالیٰ کی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو خوشخبری دی کہ تمہاری قربانیاں ضائع نہیں جائینگی بلکہ خدا تعالیٰ تمہیں تخت و تاج کا وارث بنائے گا۔ اور اس طرح ثابت ہو جائیگا کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس طرح زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ پر خدا تعالیٰ کی حکومت ہے۔ ضروری تھا کہ روحانی طور پر بھی کسی وقت تمام قوموں کو ایک نقطہ مرکزی پر جمع کرنے کا سامان کیا جاتا۔ اگر قرآن مجید نہ آتا تو عالمگیر روحانی بادشاہت کا قیام نہیں ہو سکتا تھا۔

چونکہ عالمگیر مذہب کا تصور اور خدائے واحد کی زمین و آسمان پر حکومت کا عقیدہ ان مذاہب میں کھلبلی ڈالنے والا تھا جو الوہیت مسیح کے قائل تھے۔ اس لیے اس کے ساتھ ہی فرمایا لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا۔ بیٹا ہونا الگ رہا وہ بیٹے کے مقام پر بھی کسی کو کھڑا نہیں کرتا۔ پھر فرماتا ہے کہ بادشاہت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس لیے انسان کو کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کے لیے اندازہ مقرر کر دیا ہے جس کے ماتحت وہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ اشیاء اگر ایک قانون کے ماتحت کام نہ دیتیں تو ان کا استعمال ناممکن ہو جاتا۔ کسی چیز کا ایک

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ

(۵) اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ایک جھوٹ ہے جو اُس نے بنا لیا ہے اور اس کے بنانے پر ایک اور قوم نے اس کی مدد کی ہے۔ پس ان لوگوں نے (یہ بات کہہ کر) بہت بڑا ظلم کیا ہے اور بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝

(۶) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو پہلوں کی باتیں ہیں جو اس (کسی سے لکھوالی ہیں اور اب وہ صبح شام اس کے سامنے پڑھکر سنائی جاتی ہیں (تاکہ وہ قرآن اچھی طرح لکھ لے)

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ

(۷) تو کہدے کہ اس (قرآن) کو تو اُس (خدا) نے اتارا ہے

مفوضہ قانون کے تحت کام کرتے چلے جانا ہی تقدیر ہے اور یہ ہستی باری تعالیٰ کا ثبوت ہے کیونکہ صنعت بغیر صانع کے نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی منظم دنیا کا جس کی ہر چیز دوسری کے ساتھ جوڑ رکھتی ہے خود بخود ہونا ممکن نہیں۔

ٰ یہاں معبودانِ باطلہ کی تردید میں دلائل دیئے ہیں اور بتلایا ہے کہ ان میں احتیاج الی الغیر پائی جاتی ہے اور وہ ایک بالا قانون کے تابع ہیں اس لیئے خدا نہیں ہو سکتے۔

۵-۶ اس آیت کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ صحابہ نمازوں کے لیے یا قرآن سیکھنے کے لیے صبح و شام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوتے تھے اس سے دشمن یہ خیال کرتے تھے کہ وہاں جا کر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی بعض باتیں ان کو بتلا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ حفظ کر لی جاتی ہیں۔ عقلمندوں کے لیے اس میں بھی نشان ہے کیونکہ اس میں یہ اعتراف ہے کہ قرآن کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا تھا۔ بہرحال اس کے جواب میں فرماتا ہے فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا:- یعنی اول یہ کہنا ظلم ہے کیونکہ اگر کوئی جماعت یہ کتاب بنا سکتی تو وہ اسے محمد رسول اللہ کی طرف منسوب کیوں کرتی۔ دوسرے کفار کا یہ دعویٰ خود اپنے آپ کو باطل کر رہا ہے کیونکہ قرآن سب مذاہب کی تردید کرتا ہے اس کے سکھانے والے خواہ کسی بھی مذہب کے پیرو ہوں کیا وہ اپنے مذہب کے خلاف سکھا سکتے تھے؟

سوچنا چاہیئے کہ جو لوگ خود جھوٹے طور پر قرآن بنانے میں مدد دیتے تھے کیا وہ اس کے لیے وہ قربانیاں کر سکتے تھے جو صحابہؓ نے کیں۔ انہیں تپتی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹایا جاتا۔ انہیں اونٹوں کے ساتھ باندھکر اور انہیں مخالف سمت میں دوڑا کر چیر دیا جاتا عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار کر انہیں شہید کر دیا جاتا مگر وہ اسلام کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرتے

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝

(۸) اور وہ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس پر فرشتہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ کھڑا ہو کر لوگوں کو ہوشیار کرتا۔

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝

(۹) یا اس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا۔ یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا۔ جس کے پھل وہ کھاتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو جس کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝

(۱۰) دیکھ! یہ تیرے متعلق کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں اور وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ پس ان کو کوئی (صحیح بات کہنے کا) رستہ نہیں ملتا۔

ع ۱۶

ک فرماتا ہے جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ پیشگوئیاں ہیں جن کو زمین و آسمان کے غیب کو جاننے والے خدا نے بیان کیا ہے کوئی بندہ ان کو وضع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے اساطیر الاولین کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

کفار یہ اعتراض تو کر دیتے ہیں مگر وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے۔ کہ اس زمانہ میں تورات کا کوئی عربی نسخہ بھی تھا جس کی مدد سے قرآن بنایا گیا ہو۔ چنانچہ بائیبل کا پرانے سے پرانا عربی ترجمہ آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا، مگر آنحضرتؐ چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے

۸-۱۰ ان اعتراضات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کفار کا خیال تھا کہ خدا رسیدہ وہی ہوتا ہے جو کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی ہو۔ یہی خیال ہندوؤں کا بھی ہے اور آجکل کے مسلمانوں کا بھی۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کے قبضے میں جن ہوتے ہیں جو انہیں ہر چیز لا دیتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان لوگ سمجھتے ہیں کہ توکل اس بات کا نام ہے کہ انسان اسباب سے کام نہ لے ویسے اللہ تعالےٰ پر انحصار رکھے۔

خدا تعالےٰ نے تو کفار کے منہ سے نبی کے ساتھ فرشتوں کے اُترنے اور اس کے پاس خزانوں اور باغات کے ہونے کا مطالبہ کروا کے ان کی غلطی واضح کرا دی تھی مگر افسوس یہی اعتراض مامور زمانہ پر آجکل کے مسلمانوں نے کیا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝

(۱۱) بہت برکت والا ہے وہ خدا جو چاہے تو تیرے لئے (ان کے تجویز کردہ) اس باغ سے بھی بہتر باغات پیدا کردے جن (کے سایہ) میں نہریں بہتی ہوں۔ اور تیرے لئے بڑے بڑے محل تیار کردے۔

ـلاـ یعنی یہ تو تجھ سے ایک باغ مانگتے ہیں۔ مگر ان نادانوں کو کیا معلوم کہ ہم نے تیرے لیے کیسے کیسے باغات اور محلات کا ملنا مقدر کیا ہوا ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ جن باغات اور خزانوں پر ان کو ناز ہے وہ ان سے چھن کر مسلمانوں کے قبضے میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ اسی پیشگوئی کے مطابق مسلمان طائف کے باغوں کے اور عرب، عراق، شام و ایران کی حکومتوں کے مالک ہوئے۔ اور انہوں نے خود بھی اپنی ترقی کے دور میں بڑے بڑے باغات اور محلات بنائے۔ مگر ہر ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہوتا ہے۔ یہاں بھی آنحضرتؐ اور آپؐ کے خدام کو ظاہری کے ساتھ ہمیشہ سرسبز رہنے والے روحانی باغات عطا کئے جانے کا وعدہ تھا۔ آنحضرت صلعم کو مثیل موسےؑ قرار دیا گیا ہے (مزمل ۱۶) اس لیے آپ کی امت مثیل امت موسویہ ہوئی۔ بنی اسرائیل کو دو باغ (موسوی اور عیسوی) دیئے گئے تھے (۱۸ / ۳۳-۳۴) اس لیے آنحضرت صلعم کو بھی دو باغ ملنے کا اشارہ تھا۔ چنانچہ آپؐ کو بھی دو باغ عطا کئے گئے۔ ایک حضرت مسیح موعود کے ظہور سے پہلے اور ایک آپ کے ظہور کے بعد کے زمانہ میں۔ پہلے زمانہ میں دنیوی لحاظ سے بھی وہی باغ آپ کو ملا جو موسیٰؑ کی امت کو ملا تھا یعنی فلسطین اور کشمیر کا علاقہ جو باغات کی کثرت کی وجہ سے مشہور رہیں۔ اور اگرچہ یہ باغ آج غیروں کے ہاتھ میں ہیں مگر ایک دن پھر آنحضرتؐ کو مل جائیں گے۔ ظاہری طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی یعنی وہاں کے حاکم مسلمان ہو جائیں گے۔

لطیفہ یہ ہے کہ دنیا میں اور لوگ باغ لگاتے رہے مگر وہ باغ آنحضرتؐ کو مل گئے چنانچہ فلسطین اور کشمیر آنحضرت صلعم کو ملے اور اب حضرت مسیح موعود کا لگایا ہوا باغ بھی آپؐ کو مل گیا۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ابو جہل۔ ولید اور عاص بن وائل کے باغوں کے درخت عکرمہ۔ خالدؓ اور عمرؓ آپ کو مل گئے۔ پھر موسےؑ کے باغ میں ایک بڑا درخت پیدا ہوا تھا جس کا نام داؤدؑ تھا۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے باغ میں ہزاروں ایسے وجود پیدا ہوئے۔

وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا۔ یعنی تجھے ایک نہیں بہت سے قصر یعنی قلعے یا محل ملیں گے مرد کامل کو بھی قلعہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ دنیا کی حفاظت ہوتی ہے اس لیے ان الفاظ

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝

(۱۲) حق یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں اور ہم نے اس کیلئے جو قیامت کا منکر ہو بھڑکنے والے عذاب کا انتظام کر چھوڑا ہے۔

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝

(۱۳) جب وہ (یعنی جہنم) ان کو دُور سے دیکھے گی تو وہ اس کے جوش کی اور (آنیوالی مصیبت کی) آواز کو سنیں گے۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝

(۱۴) اور جب وہ اس (یعنی دوزخ) کے ایک تنگ حصہ مکان میں مشکیں باندھے ہوئے پھینکے جائیں گے اور وہ اس وقت موت کی آرزو کریں گے۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝

(۱۵) (تب خدا کے فرشتے ان سے کہیں گے) آج ایک موت کی آرزو نہ کرو بلکہ بار بار موت کی خواہش کرو کیونکہ تم پر بار بار

میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کے روحانی شاگرد ملنے کی پیشگوئی تھی۔ چنانچہ ہر صدی میں خدا تعالیٰ نے ایسے وجود پیدا کیے جنہوں نے اسلام کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے بچایا۔ یہ بات صرف اسلام کو نصیب ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اب وہی مقرب الٰہی ہو سکتا ہے جو محمدی باغ کا خوشہ چین بنے۔

۱۲ یہاں ساعت کا لفظ محمد رسول اللہ صلعم کے غلبہ اور آپ کی کامیابی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کیونکہ تمام انبیاء کے زمانہ میں یوم القیامت کی دونوں خصوصیات یعنی (ان کے دشمنوں کی) ہلاکت (اور ان کے ماننے والوں کا) روحانی احیاء بڑی شان سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

واعتدنا لمن کذب بالساعة سعیرا۔ ایک آگ یہ تھی کہ جس مذہب کو وہ مٹانا چاہتے تھے اس مذہب کو خود ان کی اولادوں نے اختیار کر لیا اور اسلام عرب سے باہر بھی پھیل گیا۔ اور دوسری آگ یہ تھی کہ ان کے لیڈر بدر میں مارے گئے اور گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ پھر اسلام کی کامل تعلیم بھی ان کے دل جلاتی تھی۔ کیونکہ جب وہ اپنے مذہب سے اس کا مقابلہ کرتے تو کہتے تھے کہ ہمارے مذہب میں رکھا ہی کیا ہے۔ کاش یہ باتیں ہمارے مذہب میں ہوتیں۔ (دیکھیں الحجرات ۴) آج بھی طلاق و خلع نکاح بیوگان اور ورثہ وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیم کی فوقیت کا انکار منکرین اسلام نہیں کر سکتے۔

۱۳ الفاظ تو یہ ہیں کہ دوزخ انہیں دیکھے گی مگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اس کو دیکھیں گے یعنی سمجھ جائیں گے کہ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اسے عربی میں "تقلیب نسبت" کہتے ہیں۔

۱۴ ہاتھ پاؤں بندھنے سے یہ مراد ہے کہ انہیں مقابلہ کی طاقت نہ ہوگی اور وہ ملک کو اپنے لیے تنگ پائیں گے۔ اور بھاگنے کی کوشش کریں گے مگر فرماتا ہے کہ ان کو بھاگنے کی بھی جگہ نہ مل سکیگی کیونکہ جہاں بھی وہ جائیں گے وہاں مسلمانوں کو غلبہ میسر آجائے گا۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ۝ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ؕ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ

(۱۶) تو ان سے کہدے کہ یہ انجام، بہتر ہے یا دائمی جنت جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ ان کا (صحیح صحیح) بدلہ اور آخری ٹھکانہ ہوگی۔

(۱۷) انہیں اس میں جو کچھ چاہیں گے ملیگا وہ اسمیں ہمیشہ کیلئے بستے چلے جائینگے یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا تیرے رب پر واجب ہے۔

(۱۸) اور جب وہ ان کو اور ان کے جھوٹے معبودوں کو اپنے حضور میں کھڑا کرے گا۔ اور پھر ان سے کہے گا۔ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ آپ ہی سیدھے راستہ سے بھٹک گئے تھے۔

(۱۹) (تب) وہ جواب دینگے تو پاک ہے ہمیں کوئی حق نہ تھا کہ ہم تیرے سوا اور ہستیوں کو اپنا کارساز بناتے لیکن تونے ان لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو دنیوی متاع بخشی یہاں تک کہ انہوں نے (تیری) یاد کو ترک کردیا۔ اور ہلاک ہونے والی قوم بن گئے۔

(۲۰) پس (کفار سے کہا جائیگا کہ دیکھ لو) ان جھوٹے معبودوں نے تمہاری باتوں کو جھٹلا دیا ہے پس آج تم نہ تو عذاب کو ہٹا سکتے ہو اور نہ کوئی مدد حاصل کرسکتے ہو اور جو کوئی تم

۱۶-۱۷ ؎ تاریخ سے واقف جانتے ہیں۔ کہ یہ وعدہ کس شان سے پورا ہوا اور کس طرح چند سال میں عرب، ایران، مصر، روم اور شام وغیرہ اسلام کے آگے سرنگوں ہوگئے۔

وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا۔ میں اس کے وعدہ ہونے پر پھر زور دیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وعدہ ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے آیت ۱۱ میں بھی انشاء کے الفاظ رکھکر اس طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ آج بھی اگر مسلمان خدا اور رسولؐ کی سچی پیروی کریں تو اللہ تعالےٰ انہیں اس جنت میں داخل کردیگا جس سے وہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے نکالے گئے تھے۔

۱۸-۲۰ ؎ یہاں معبودوں سے مراد خدا تعالےٰ کے وہ فرستادہ ہیں جن کو ان کی امتوں نے بعوث سے بعد ہونے پہ نادانی سے خدا تعالےٰ کا شریک بنا لیا۔ ان سے سوال مجرموں پر اتمام حجت کیلئے ہوگا اور وہ ان لوگوں کے عقائد سے بیزاری کا اظہار کریں گے یہی بات مسیح نے کہی ہے (متی ۷ ۲۲-۲۳ لوقا ۱۳ ۲۳-۲۸)

نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝ ع

میں سے ظالم ہے ہم اُسے بڑا عذاب پہنچائیں گے۔

(۲۱) اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے تھے۔ وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ (یہ دیکھنے کے لئے)، کہ کیا تم (مسلمان) صبر کرتے ہو (یا نہیں) اور (اے مسلمان) تیرا ربّ (حالات کو) بہت دیکھنے والا ہے۔

ع ۲/۱۷ ابجزء ۱۹

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝

(۲۲) اور انہوں نے جو ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے کہدیا کہ کیوں ہم پر فرشتے نہیں اتارے گئے؟ یا ہم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے؟ انہوں نے اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا ہے اور سرکشی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

---

۲۱ اس میں یہ اشارہ ہے کہ خدا کے اندر صمدیت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور باقی سب اس کے محتاج ہوں مگر جن کو وہ لوگ معبود ٹھہراتے ہیں ان میں سے کوئی بھی حوائج بشریہ سے مستغنی نہیں تھا۔ (چنانچہ مسیح بھی کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے دیکھیں لوقا ۴/۲۰۱، ۲۴/۴۲-۴۳، مرقس ۱۱/۱۲-۱۴، ۵/۵۶، متی ۹/۹-۱۰-۱۱، ۲۶/۲۰ تا ۲۹ اور ۲۴/۴۲-۴۳) علاوہ ازیں اس میں بتایا گیا ہے کہ جب پہلے انبیاء بھی کھانے پینے کے محتاج تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے تو پھر آنحضرت صلعم پر اعتراض کیسا؟

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً :- کہکر بتایا کہ دشمنوں کے اعتراضات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ ہم نے ابتلاؤں کا سلسلہ اس لئے جاری کیا ہوا ہے کہ کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کریں اور دیکھیں کہ کون صبر کرنے والے ہیں۔ چنانچہ مخالفت کی آگ ہی تھی جس نے صحابہ کو کندن بنا دیا اور کفار کا ملمع اتار کر ان کا پیتل ہونا ظاہر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کی جماعت کو آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا ہے (۲/۲۱۵)

۲۲ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا کے معنوں کے لیے دیکھیں نوٹ ۲ ۱۰/۸-۹۔ رویت کے معنے تو خدا کا جلوہ دیکھنے کے ہوتے ہیں مگر لِقَا کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا مل گیا۔ اور یہ ایک مستقل مقام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ لقائے الٰہی دنیا میں حاصل ہو سکتا ہے اور وہ اس پر زور دیتا ہے۔ دیکھیں ۱۷/۲۳، ۵۳/۱۶، ۷۵/۲۲-۲۳، ۱۰/۸-۹۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ

(۲۳) (کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ) جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کو کوئی خوشخبری نہیں ملے گی۔ اور (وہ گھبرا کر) کہیں گے (ہم سے) پرے ہی رہو۔
(۲۴) اور ہم نے ان کے ہر قسم کے عمل کی طرف توجہ کی جو انہوں نے کیا تھا اور اسکو ہوا میں بکھیر کر اڑائے ہوئے ذرات کی طرح کر دیا۔
(۲۵) جنتی لوگ اُس دن ٹھکانہ کے لحاظ سے بھی اچھے ہونگے اور خوابگاہوں کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔
(۲۶) اور اس دن کو یاد کرو، جب آسمان پھٹ جائیگا اور بادل سر پر منڈلا رہے ہونگے اور ملائکہ بار بار اتارے جائیں گے۔
(۲۷) اس دن بادشاہت سچ مچ رحمٰن (خدا)

چونکہ دوسرے مذاہب اس بات میں اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ دنیا میں لقائے الٰہی کے سرے سے ہی منکر ہوتے ہیں۔ لقاء الٰہی کس طرح حاصل ہوتا ہے اس کے لیے دیکھیں ۲۷)
اوپر کی آیات سے ظاہر ہے کہ کفار کے نزدیک صداقت کے دو ہی ثبوت ہیں۔ اول مادی غلبہ دوسرے سنت اللہ کے خلاف محیر العقول کارنامے۔ آنحضرت میں یہ باتیں نہ دیکھ کر کفار آپ کے دعویٰ پر ہنسی اڑاتے تھے اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ لقد استکبروا فی انفسھم...... الخ ان کے اعتراض کا اصل باعث یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں ان باتوں کو بہت بڑا اور ناممکن الحصول سمجھتے ہیں۔ اور اس مایوسی کی وجہ سے وہ ان قربانیوں کے لیے تیار نہیں ہوتے جو محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ مل کر کرنی پڑتی ہیں۔ یا پھر تکبر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایسے بے سروسامان پر اُترنے کی بجائے کیوں ہم پر فرشتے نہیں اُترتے۔

۲۳ یعنی فرشتے یا الہام لاتے ہیں یا عذاب۔ یہ عذاب کے ہی مستحق ہیں اس لیے ان پر فرشتوں کا اترنا موجب تباہی ہی ہوگا۔ مگر یہ عذاب بلا وجہ نہیں ہوگا بلکہ اس لیے ہوگا کہ یہ لوگ صداقت کو مٹانا چاہتے ہیں اس لیے جب بھی یہ صداقت پر حملہ کریں گے ہم ان کو منتشر کر دیں گے۔

۲۵ یعنی مومنوں کو اعلیٰ مقام ملیں گے۔ اور ان کے قیلولہ کی جگہ بھی اچھی ہوگی۔ یعنی ان کے صبح کے کام ان کے دوپہر کے آرام کو خوشگوار بنا دیں گے۔ اور ان کی اس ابتدائی زمانہ کی قربانیاں ان کی آئندہ نسلوں کو لمبے عرصے کے لیے برکات الٰہی سے متمتع کرتی رہیں گی۔

۲۶-۲۷ آسمان کے پھٹنے سے مراد نزول رحمت بھی ہوتا ہے (۲۰۲) اور نزول عذاب بھی (۱۹ ۹۲-۹۳) یہاں

لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝ کے قبضہ میں نظر آئے گی۔ اور وہ دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ (۲۸) اور اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا۔ (اور) کہے گا۔ اے کاش! میں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِى لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ (۲۹) وائے بدبختی! کاش! میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔

نزول عذاب مراد ہے کیونکہ اس کے مقابل فرماتا ہے وکان یوما علی الکفرین عسیرا۔ چنانچہ اس دن کفار کے لیڈر مارے گئے اور یسعیاہ $\frac{۲۱}{۱۳ تا ۱۷}$ کی پیشگوئی کے مطابق قیدار کی حشمت مٹ گئی۔

اس دن کی تین علامات بتائی ہیں۔ اول یہ کہ بارش برسے گی دوسری یہ کہ عذاب کے فرشتے بکثرت اتریں گے۔ تیسرے یہ کہ خدائے رحمان کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ یہ عذاب کفار مکہ پر جنگ بدر کی صورت میں آیا۔ چنانچہ اول گو اس دن کفار کے پاس سخت اور مسلمانوں کے پاس رتیلی زمین تھی۔ لیکن يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ کے مطابق بارش ہو جانے سے رتیلا میدان پختہ میدان بن گیا اور کفار کا پختہ میدان پھسلواں ہو گیا۔ دوسرے خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لیے ایک ہزار فرشتے اتار دیئے $(\frac{۸}{۱۰})$ چونکہ اس دن کفار کا لشکر ہزار آدمیوں کا تھا ہزار فرشتوں سے مراد وہی فرشتے تھے جو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں اور جو کفار پر رعب ڈال رہے تھے اور بعض کفار کو کشفی رنگ میں نظر بھی آئے۔ فرشتوں کا نزول اس رنگ میں بھی ہوا کہ آنحضرتؐ نے کفار کی طرف مٹھی بھر کنکر پھینکے تو خدا تعالےٰ نے تیز آندھی چلا دی جس سے کفار کے منہ ریت سے بھر گئے اور اس کے متعلق خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی $(\frac{۸}{۱۸})$ اسی طرح صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے کہ کفار کو انہوں نے نہیں خدا نے قتل کیا $(\frac{۸}{۱۸})$ یعنی ان کی پشت پر خدا تعالےٰ اور فرشتوں کی مدد تھی۔ تیسرے اس دن خدائے رحمان کی حکومت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ خدا کی بات جو اس سے قبل کہی گئی تھی اس دن پوری ہوئی $(\frac{۹۷}{۱۶-۱۷})$

۲۸-۲۹ یہاں بتایا ہے کہ انسان گندے جلیسوں کی وجہ سے تباہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا حکم ہے۔ $(\frac{۹}{۱۱۹})$

لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ؕ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ○

(۳۰) اُس نے مجھے خدا کے ذکر سے غافل کر دیا جبکہ وہ (رسول کے ذریعہ سے) میرے پاس آیا تھا۔ اور شیطان آخر انسان کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ○

(۳۱) اور رسول نے کہا۔ اے میرے رب! میری قوم نے تو اس قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا ہے۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ وَکَفٰی بِرَبِّکَ ھَادِیًا وَّنَصِیْرًا ○

(۳۲) اور ہم نے اسی طرح مجرموں میں سے سب نبیوں کے دشمن بنائے ہیں اور تیرا رب ہدایت دینے اور مدد کرنے کے لحاظ سے (بالکل) کافی ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ج

(۳۳) اور کافروں نے کہا کیوں نہ قرآن اس (نبی) پر ایک ہی دفعہ نازل کر دیا گیا۔ ان کا کہنا بھی ایک طرح ٹھیک ہے لیکن ہم نے

---

۳۰ الذکر سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ اسے خدا تعالیٰ نے عمل کے لیے نازل کیا ہے اور اس کا ایک نام الذکر بھی ہے (۱۵/۱، ۲۱/۱۵، ۴۵/۲۵ اور ۱۴۱/۴۲-۴۴/۳۲)

۳۱ یہ بات آنحضرت ؐ قیامت کے دن فرمائیں گے۔ "ھٰذَا" کا لفظ بہت ہی درد اور افسوس کو ظاہر کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ الٰہی! تو نے میری قوم کو قرآن ایک اعلیٰ اور بے مثل نعمت دی۔ مگر اس نے اسے بھی مہجور کر دیا۔ اس جگہ قوم سے مراد زمانہ نبوی کے منکر بھی ہیں اور آجکل کے مسلمان بھی جو قرآن کو عمل کرنے کی بجائے مردوں پہ پڑھنے یا قسمیں کھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یا پھر آیت لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا؛ وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ۔ (۲/۴۲) پیش کر کے اس کی بڑی بڑی قیمت وصول کرتے ہیں حالانکہ اس آیت میں یہ حکم نہیں تھا۔ قرآن نے تو دنیا کے سب مال کو حقیر قرار دیا ہے (۴/۷۸) سورۃ بقرہ کی اس آیت کا یہ مطلب تھا کہ دنیا کے بدلے میں قرآن کو نہ بیچو۔

۳۲ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کوئی عجیب بات نہیں ہر نبی کی مخالفت ہوئی ہے۔ اور گو مخالفین انبیاء کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں (۱۴/۱۴، ۳۶/۱۹) مگر مخالف حالات کے باوجود ہمیشہ انبیاء ہی جیتتے رہے ہیں۔ دراصل انبیاء کی مخالفت لوگوں کو ان کی طرف مائل کرنے کے لیے ایک الٰہی تدبیر ہوتی ہے اور جھوٹے مدعی نبوت اس سے قطعی محروم رہتے ہیں چنانچہ جعلنا کہکر اس تدبیر کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ گویا شر ہم نے خود پیدا کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی مخالفتوں کے نتیجہ میں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہدایت دینے اور مدد کرنے کے لحاظ سے کافی ہے۔

كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝

اسکو مختلف سورتوں اور وقتوں میں اسلیے اتارا ہے کہ ہم اس قرآن کے ذریعہ سے تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں اور ہم نے اسکو نہایت عمدہ بنایا ہے۔ (۳۴) اور (تیری تردید کے لئے) وہ کوئی بات نہیں کہتے کہ ہم اس کے جواب میں ایک پختہ بات بیان نہیں کر دیتے اور اس کی اچھی سے اچھی توجیہہ نہیں کر دیتے۔

مع

۳۳-۳۴ مخالفوں کا یہ اعتراض آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی تھا اور آج بھی ہے کہ چونکہ قرآن اکٹھا نازل نہیں ہوا معلوم ہوتا ہے کہ محمد (رسول اللہ صلعم) اسے حسب ضرورت ساتھ ساتھ بناتے جاتے تھے اس لیے یہ آپؐ کا ہے خدا کا کلام نہیں۔ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ اے رسولؐ! قرآن آہستہ آہستہ اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ تیرے دل کو تسلی حاصل ہو اور اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ جو بات یہ لوگ اعتراض کے طور پر بیان کرتے ہیں ہم اس کی بہتر تفسیر کر دیتے ہیں (آیت ۳۴) چنانچہ (۱) جب کوئی ضرورت پیش آتی اس کے متعلق وحی ہو جاتی اگر آنحضرتؐ اجتہاد سے ہی آیات قرآنیہ کو کسی واقعہ پر چسپاں کرتے تو اس سے آپؐ کو وہ لطف نہ آتا۔ (۲) قرآن کے آہستہ آہستہ اترنے سے کئی لوگوں نے اسے ساتھ ساتھ حفظ کر لیا اور آنحضرتؐ کو اس کے محفوظ ہونے کا یقین ہو گیا (۳) چونکہ اس وقت کوئی نمونہ موجود نہ تھا قرآنی تعلیم کو قلوب میں راسخ کرنے کے لیے اس کا آہستہ آہستہ اترنا ضروری تھا۔ (۴) قرآن ایک ہی وقت میں اترتا تو اس کی وہ ترتیب رکھنی پڑتی جو اب ہے مگر یہ ترتیب اس وقت کے لحاظ سے خطرناک ہوتی کیونکہ اس وقت پہلے توحید الٰہی کا اور آنحضرتؐ کی نبوت کا ثابت ہونا ضروری تھا پھر عمل کی دعوت کا موقعہ تھا (۵) قرآن ایک ہی وقت اترتا تو ایک حصہ کی پیشگوئیوں کے پورے ہونے کی طرف اشارہ دوسرے حصہ میں نہیں ہو سکتا تھا (۶) قرآن اکٹھا نازل ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ کتاب کسی نے لکھ کر اسے دیدی ہے لیکن آہستہ آہستہ ہر موقع کے مطابق اس کی آیات نازل ہونے پر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس طرح قرآن کا آہستہ آہستہ اترنا آنحضرتؐ کے تثبیت فواد کا موجب ہوا۔

وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرآن کی ترتیب بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے چنانچہ ترتیب قرآن نہایت اہم حکمتوں پر مبنی ہے نزول کی ترتیب ان لوگوں کے مطابق تھی جو اس زمانہ میں موجود تھے اور موجودہ ترتیب (جو حکم الٰہی سے خود آنحضرتؐ نے قائم کی ہے) آئندہ آنیوالی نسلوں کی ضرورت کے مطابق ہے اور یہ اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ایک بڑا بھاری ثبوت ہے۔

کفار کے اس اعتراض سے بعض نے سمجھا ہے کہ پہلی کتب الہامیہ ایک ہی وقت میں نازل ہوتی ہونگی

اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ اِلٰی جَہَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۳۵﴾ جو لوگ اپنے سرداروں سمیت جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے - ان کا مقام بہت بُرا ہوگا - اور ان کا رستہ بڑی گمراہی کا ہوگا -

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنَا مَعَہٗۤ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ وَزِیۡرًا ﴿۳۶﴾ اور ہم نے موسیٰؑ کو ایک (معلوم) کتاب دی تھی اور ہم نے اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو بھی نائب بنا کر بھیج دیا تھا -

فَقُلۡنَا اذۡہَبَاۤ اِلَی الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرۡنٰہُمۡ تَدۡمِیۡرًا ﴿ؕ۳۷﴾ اور ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا ہے پھر جب وہ تبلیغ کر چکے، ہم نے ان جھٹلانیوالوں کو بالکل تباہ کر دیا -

---

مگر جاننا چاہیئے کہ یہ اعتراض کفار مکہ سے نقل ہوا ہے اور وہ کسی کتاب کے قائل ہی نہ تھے ان کے اعتراض کی بنا محض عقلی تھی - اگر انہوں نے واقعی یہ اعتراض کیا ہو پھر بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ علوم آسمانی سے اور مذہبی تاریخ سے بے بہرہ تھے - موسیٰؑ کے متعلق جو آتا ہے کہ انہیں طور پر الواح مل گئیں ($\frac{7}{145}$) اس سے بعض نے سمجھا ہے کہ تورات اکٹھی اتری تھی - اول تو جو کچھ طور پر نازل ہوا ایک ہی وقت میں نہیں ہوا - بلکہ چالیس راتوں میں ہوا - دوسرے تورات میں ان الواح کے علاوہ بھی بہت سے الہام ہیں الواح صرف وہ احکام ہیں جن کا ذکر خروج باب ۲۰ تا ۳۱ میں ہے اس لیے موسیٰؑ کو طور پر مکمل تورات نہیں ملی - دراصل ہر نبی کا کلام ایک طرف صفات الہیہ کے تازہ ظہور پر روشنی ڈالتا ہے - دوسری طرف اس کی تائید و نصرت کا ثبوت ہوتا ہے اور تیسری طرف خود اس نبی کے ایمان اور یقین کو پیش کر کے اس کے روحانی کمالات کو ظاہر کرتا ہے اگر شروع میں ہی یکدفعہ سارا کلام نازل ہو جائے تو اس میں یہ باتیں جمع نہیں ہو سکتیں اور وہ موجب ہدایت نہیں ہو سکتا - ان حکمتوں کے علاوہ یسعیاہ نبی کی پیشگوئی بھی تھی کہ آخری زمانہ کا کلام آہستہ آہستہ مختلف ٹکڑوں میں نازل ہوگا اور اس قوم کے پاس آئے گا جو الہام کے دودھ سے محروم ہو چکی ہوگی - یعنی اس وقت انقطاع نبوت پر لمبا زمانہ گزر چکا ہوگا (دیکھیں $\frac{5}{16}$)، لکھا ہے "وہ کس کس کو دانش سکھلائے گا - کیا ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے ہیں پس خداوند کا کلام ان کے حکم پر حکم - حکم پہ حکم، قانون پر قانون - قانون پر قانون تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں ہوگا - تاکہ وہ ..... شکست کھائیں - اور دام میں پھنسیں" (یسعیاہ $\frac{28}{9-13}$)

۳۵ وجوہ کے معنے سردار کے بھی ہیں - قرآن نے دوسری جگہ بھی ان کی بیزاری کا نقشہ کھینچا ہے دیکھیں حم سجدہ $\frac{41}{29}$ اور

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ

(۳۸) اور قوم نوح کو بھی جب انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہم نے غرق کر دیا۔ اور ہم نے انہیں لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔ اور ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب تیار کر چھوڑا ہے۔

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝

(۳۹) اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی اور کنوئیں والے لوگوں کو بھی اور ان کے درمیان اور بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے تباہ کر دیا)

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝

(۴۰) اور ان میں سے ہر قوم کے لئے ہم نے حقیقت بیان کر دی اور (جب نہ سمجھے تو) سب کو ہلاک کر دیا۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ

(۴۱) اور یہ (مکہ کے کفار) اس بستی کے پاس سے گذر چکے ہیں جس پر ہم نے ایک تکلیف دہ بارش نازل کی تھی کیا یہ اس (بستی) کے

احزاب $\frac{۳۳}{۶۸-۶۹}$ مگر اس وقت عمل کا وقت گذر چکا ہوگا اس لیے ان کا یہ فعل انہیں فائدہ نہ دے گا۔

۳۶-۴۰ یہاں بتلاتا ہے کہ ہم ابتدائے آفرینش سے رسول بھیجتے رہے ہیں اور ان کی تائید میں نشان دکھلاتے رہے ہیں۔ اگر لوگ اس سلسلہ رسالت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو ان کا یہ کہنا کہ ہمیں تو ہمارے سرداروں نے بہکا دیا تھا۔ ان کے جرم کو ہلکا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ گذشتہ اقوام کی مثالیں دے کر اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے نتائج بد سے لوگوں کو ڈرایا ہے۔

آیت ۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارونؑ موسےٰؑ کے تابع تھے مگر $\frac{۲}{۲۴۹}$ اور $\frac{۳۷}{۱۱۸}$ سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں صاحب امت اور صاحب کتاب نبی تھے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی جس دعا کے نتیجہ میں حضرت ہارونؑ نبی بنے تھے وہ تابع نبی کے لیے تھی ($\frac{۲۰}{۳۲-۳۳}$)۔ پھر حضرت موسےٰؑ نے ہارونؑ کو اپنے بعد بطور نائب کام کرنے کا حکم دیا اور امت کو اپنی امت قرار دیا۔ ($\frac{۷}{۱۴۳}$) پھر قرآن کہتا ہے کہ قوم موسےٰؑ نے ان کی غیر حاضری میں بچھڑا بنا لیا ($\frac{۷}{۱۴۹}$) کیا قوم ہارونؑ نے بچھڑا نہیں بنایا تھا؟ کیونکہ یہاں صرف قوم موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ پھر موسیٰؑ اس وجہ سے ہارونؑ سے ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا کہ قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور وہ مجھے قتل کرنے لگے تھے ($\frac{۷}{۱۵۱}$) اگر قوم ہارونؑ الگ تھی تو اس نے کیوں اس موقعہ پہ ہارونؑ کی مدد نہ کی۔ پھر $\frac{۲۰}{۹۱-۹۲}$ میں ہارونؑ بگڑنے والی قوم کو اپنی قوم کہتے ہیں مگر قوم یہ جواب دیتی ہے کہ ہم موسیٰؑ کے آنے تک تیری بات نہیں مانیں گے۔

۴۱ اس جگہ قریہ سے مراد قوم لوط کی بستی ہے اور اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ سے یہ مراد ہے کہ

یَکُوْنُوْا یَرَوْنَهَا ۚ بَلْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝

نشانوں) کو نہیں دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوبارہ اٹھنے کی امید ہی نہیں رکھتے تھے۔

وَاِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝

(۴۲) اور جب وہ تجھے دیکھتے ہیں۔ تو تجھے صرف ایک ہنسی ٹھٹھے کی چیز سمجھتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا اللہ تعالےٰ نے اس شخص کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا ۭ وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝

(۴۳) اگر ہم اپنے معبودوں پر قائم نہ رہتے۔ تو یہ (شخص) تو ہم کو ان سے گمراہ کرنے ہی لگا تھا۔ اور جب یہ عذاب کو دیکھیں گے تو ان کو ضرور حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ کون اپنے طور و طریق میں زیادہ گمراہ تھا۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْهِ وَکِیْلًا ۝

(۴۴) (اے رسول!) کیا تو نے اس شخص کا حال بھی معلوم کر لیا ہے جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا۔ کیا تو اس شخص پر نگران ہے (کہ تو اسے جبراً گمراہی سے روکے)

خدا تعالےٰ نے زلزلہ سے ان کی زمین کو تہ و بالا کر دیا۔ اس کا ذکر (15/74) میں بھی ہے بَلْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا میں ان کے انکار کی وجہ بتاتا ہے کہ انہیں آئندہ کی زندگی کا خوف نہیں ہے۔ رجا کے معنے امید کے علاوہ خوف کے بھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے حصول کے لیے خشیت اللہ اور حیات بعد الموت کا ڈر بھی ضروری ہے۔

۴۲-۴۳ فرماتا ہے کہ حیات بعد الموت کا ڈر نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہنسی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اس کو اللہ تعالےٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مگر پھر آپ کی قبولیت دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ ہے تو جھوٹا مگر ہے چالاک اگر ہم صبر نہ کرتے تو یہ ہمیں ہمارے معبودوں سے منحرف کر دیتا۔ لیکن جب ان پر عذاب آئیگا تب انہیں پتہ لگے گا کہ وہ سچا تھا یا دھوکا باز۔

۴۴ مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں قلب واقع ہوا ہے اور اتّخذ کا مفعول اول (الٰہ) در اصل مفعول ثانی ہے اور ھَوٰىهُ جو مفعول ثانی ہے مفعول اول ہے اور معنے یہ ہیں کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ لیکن یہاں قلب نہیں اور معنے یہ ہیں کہ بتا تو سہی جو شخص اپنے معبود کو اپنی خواہشات نفس کا درجہ دیتا ہے۔ یعنی جس طرح لوگ نفس پر حکومت کرتے ہیں وہ اس پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور اس کی جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے اسے رد کر دیتا ہے اسے کون فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝

(۴۵) کیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ وہ تو فقط جانوروں کی طرح ہیں بلکہ رویہ کے لحاظ سے ان سے بھی بدتر۔

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ۝

(۴۶) (اے قرآن کے مخاطب) کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے رب نے کس طرح سایہ کو لمبا کیا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر ایک گواہ بنا دیا۔

ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ۝

(۴۷) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا ۝

(۴۸) اور وہی (خدا) ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس بنایا اور نیند کو آرام کا موجب اور دن کو پھیلنے اور ترقی کا ذریعہ۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ۝

(۴۹) اور وہ (خدا) ہی ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بشارت دینے کے لئے بھیجا۔ اور ہم نے بادل سے پاک (وصاف) پانی اُتارا ہے۔

لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا ۝

(۵۰) تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ ملک کو زندہ کریں اور اسی طرح اس (پانی) سے اپنے پیدا کئے ہوئے چارپایوں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کریں۔

۴۵؎ بَلْ هُمْ أَضَلُّ اس لئے فرمایا کہ جانور بھی اپنے مالک کا تابع فرمان رہتا ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے محسن کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

۴۶؎ یہاں سایہ سے مراد آنحضرتؐ کا سایہ ہے اور اس میں بتایا ہے کہ اگر آپؐ خدا کی طرف سے نہ ہوتے تو اس میں طاقت تھی کہ آپؐ کے سایہ کو ساکن کر دیتا اور آپؐ کو ترقی سے محروم کر دیتا۔ مگر اسے ساکن کرنے کی بجائے وہ اس پر دلیل بن گیا اور اپنی نصرتوں اور آسمانی ذرائع سے اسے بڑھاتا جا رہا ہے جیسا کہ جعلنا الشمس علیہ دلیلا میں اشارہ ہے اس لیے اسکے خدائی ہونے میں کیا شبہ ہے۔

۴۷؎ اس میں پیشگوئی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ سایہ سمٹنے لگ جائیگا یعنی اسلام پر تنزل کا دور آ جائے گا۔

۴۸؎ وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ تنزل کے بعد اسلام پر پھر ترقی کا دور آئیگا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ (۵۱) اور ہم نے اس (پانی) کو اُن (یعنی انسانوں) میں خوب پھیلا دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ لیکن لوگوں میں سے اکثر لوگ کفر کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہوتے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝ (۵۲) اور اگر ہم چاہتے۔ تو ہر بستی میں ایک ہوشیار کرنیوالا (نبی یا مامور) بھیج دیتے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ (۵۳) پس تو کافروں کی بات نہ مان اور اس (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے اُن سے بڑا جہاد کر۔

۴۹-۵۲ ان آیات میں کلام الٰہی سے تشبیہ دینے کے لیے پہلے پانی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے۔ کہ وہ پانی کی نعمت تو قبول کر لیتے ہیں مگر فابی اکثر الناس الا کفورا۔ اکثر لوگ کلام الٰہی کی نعمت کو جو اس سے بہت بہتر ہے رد کر دیتے ہیں

ولو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیرا۔ فرماتا ہے ہم چاہتے تو ہر بستی میں رسول بھیجدیتے مگر سب بستیوں پر ایک ہی وقت میں حجت تمام ہو جاتی تو سب پر ایک ہی وقت میں عذاب بھی آجاتا اس لیے ہم نے ایسا نہیں کیا کہ ایک ہی وقت میں سب بستیوں کی طرف رسول بھیجیں۔

۵۳ جاھدھم بہ سے مراد قرآن کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور یہاں بتایا گیا ہے کہ سب سے بڑا جہاد جہاد بالقرآن ہی ہے۔

قرآن کریم نے جہاد کے متعلق انفرادی طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے نہ کہ جماعتی طور پر اور ہر مسلمان پر جہاد فرض کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاد سے مراد جہاد بالقرآن ہے جہاد بالسیف نہیں کیونکہ جہاد بالسیف جتھے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

حضرت مسیح موعودؑ نے بتایا کہ جہاد کی دو صورتیں مقرر ہیں۔ جب تلوار سے اسلام پر حملہ ہو تو تلوار کا جہاد فرض ہوتا ہے ورنہ قرآن کا تا کہ اسلام ایام جنگ کی طرح ایام صلح میں بھی ترقی کرے۔ گویا آپ نے ہر زمانہ میں جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔

دیگر علمائے اسلام بھی اسی قسم کا مذہب رکھتے تھے چنانچہ مفردات راغب صفحہ ۱۰۰ پر جہاد کی تین قسمیں لکھی ہیں۔ مسلمانوں سے لڑنے والے دشمن سے جہاد۔ شیطان سے جہاد اور نفس سے جہاد۔

اسی طرح تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۹ پر بھی لکھا ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی قوم حملہ کرے صرف اس وقت جہاد فرض ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ امام واجب الاطاعت جنگ عام کا حکم دے۔ چونکہ اس زمانہ میں اسلام پر تلوار سے حملہ نہیں ہوا۔ لہذا حضرت مسیح موعودؑ نے تلوار کے جہاد کو ملتوی قرار

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝

(۵۴) اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو چلایا ہے جن میں سے ایک تو بہت میٹھا ہے اور دوسرا نمکین (اور) کڑوا ہے اور اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) ان دونوں کے درمیان ایک روک بنادی ہے اور ایسا سامان بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پرے رکھتے ہیں۔ ملنے نہیں دیتے۔

دیا ہے آپ نے "دین کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال" کے الفاظ فرمائے ہیں۔ اس میں حرام سے مراد قطعی حرام نہیں کیونکہ آپ آنحضرت صلعم کے امتی ہونے کے مدعی تھے۔ اور آپ کا عقیدہ تھا کہ قرآن دائمی شریعت ہے پھر آپ اس کے احکام کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کس طرح کر سکتے تھے۔ ہاں عارضی طور پر کسی شئے کو روک دینا یہ نسخ کے محدود معنے ہیں اور عربی میں مستعمل ہیں (دیکھیں مفردات راغب) ورنہ حضرت مسیح موعودؑ نے خود تحریر فرمایا ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں مسلمانوں کو تلوار کے جہاد کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ (ازالہ اوہام جلد اول طبع اول صفحہ ۲۰۰) تفسیر روح المعانی والوں نے بھی اس جگہ جاھدھم سے مراد جہاد بالقرآن ہی لیا ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ کی تعلیم یہ ہے کہ جہاد ہر اس فعل کا نام ہے جو نیکی اور تقویٰ کے طور پر کیا جائے۔ اور جہاد جس طرح تلوار کا ہوتا ہے اسی طرح اصلاح نفس کا بھی ہوتا ہے۔ اور مال کی قربانی کا بھی ہوتا ہے آپ کے نزدیک جس جہاد کا یہ زمانہ تھا وہ جہاد آپ نے کیا مگر دوسرے مسلمانوں نے تلوار کا جہاد (جسے وہ فرض جانتے تھے) نہیں کیا۔

۵۴ مَرَجَ کے معنی ملا دینے کے ہوتے ہیں یہاں یہ اشارہ ہے کہ جیسے مادی پانی کے دو ذخیرے ہیں ایک میٹھے یعنی دریاؤں کے پانی کا اور دوسرا نمکین یعنی سمندر کے پانی کا۔ اور ان کے درمیان اس نے حدود قائم کر دی ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو خراب نہیں کر سکتے اسی طرح اسلامی تعلیم جو میٹھے پانی سے مشابہ ہے اور کفر کی تعلیم جو نمکین پانی سے مشابہت رکھتی ہے ان میں ایک بیّن امتیاز ہے اور ایک حدِ فاصل انہیں جدا رکھتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ کافر مومن نہیں بن سکتا بلکہ اس کے معنے ہیں۔ کہ کفر ایمان کی اور ایمان کفر کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اور باوجود اکٹھے رہنے کے جو میٹھے ثمرات سچے مذہب کے پیرو کو حاصل ہوتے ہیں دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے۔

کفر و ایمان کے مقابلہ کے علاوہ اس میں مغربیت اور دجالیت کی طرف بھی اشارہ ہے چنانچہ اُجَاجٌ سے یاجوج اور ماجوج دونوں قومیں مراد ہیں۔ اس کے مقابل پر عَذْبٌ فُرَاتٌ رکھا ہے اور حِجْرًا مَّحْجُوْرًا میں بتایا گیا ہے کہ گو تمہیں ان دونوں اقوام کے ساتھ مل کر رہنا پڑے گا مگر یاد رکھنا کہ تم میٹھے پانی کا سمندر رہو اور وہ کڑوے پانی کا۔ تم مغربیت کی کبھی نقل نہ کرنا اور صاف طور پر کہہ دیا کرنا کہ

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا ۝ | (۵۵) اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان بنایا پس اس کو کبھی تو نسب بنایا ہے (یعنی شجرۂ آباد) اور کبھی صہر بنایا ہے (یعنی شجرۂ سسرال) اور تیرا رب ہر چیز پر قادر ہے۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُھُمْ وَلَا یَضُرُّھُمْ ؕ وَکَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَھِیْرًا ۝ | (۵۶) اور وہ لوگ (یعنی کافر) اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں۔ جو نہ انہیں نفع دے سکتے ہیں۔ اور نہ تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور کافر ہمیشہ اپنے رب کے (جاری کردہ سلسلوں کے) خلاف ہوتا ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (کافرون) - ایک برزخ ان کے اور تمہارے درمیان حائل رہنی چاہیئے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت تک دجالی فتنہ سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہوگا (مشکوٰۃ) چنانچہ پہلے فتنوں اور اس وقت کے فتنہ میں یہ فرق ہے کہ یہ فتنہ عالمگیر ہے اور اس زمانہ میں کہیں سے بھی کوئی تحریک اُٹھے اس کا مقصد ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دنیا کو خدا سے دور کرایا جائے اور مادیت کی طرف مائل کرایا جائے۔ پھر پہلے فلسفیانہ حملے ہوتے تھے اور فلسفہ کی بنیاد واہمہ پر ہے مگر آج جتنے رائج الوقت علوم ہیں ان سب کو مذہب کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ غرض اس زمانہ کا حملہ اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے بے مثال ہے۔

مغرب کی مادی بنیاد دنیا پرستی پر ہے۔ اور اسلام کی بنیاد کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی پر اور روحانیت اور اخلاق کی درستی پر ہے اس لیے ان کا اجتماع ناممکن ہے۔

چونکہ حضرت مسیح موعود اس زمانہ کے ذوالقرنین ہیں۔ اس لیے بالکل ممکن ہے۔ کہ قرآن میں جو ذوالقرنین کے دو قوموں کے درمیان دیوار حائل کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اس زمانہ میں مغربیت اور اسلام میں دیوار حائل کرنا ہی ہو۔ اور دو قوموں سے مراد دو قسم کے جذبات و افکار رکھنے والے لوگ ہوں۔

۵۵ یہاں بتلایا گیا ہے کہ انسانی تمدن کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ازدواجی تعلقات ہیں۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے خاندانوں اور قوموں کے آپس میں گہرے روابط قائم ہو جاتے ہیں۔

وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا میں یہ اشارہ ہے کہ جیسے مآء سے یعنی حقیر نظر آنے والے نطفہ سے خدا تعالیٰ اربوں انسان پیدا کر دیتا ہے اسی طرح گو نبی ابتداءً حقیر نظر آتے ہیں مگر خدا تعالیٰ ان کی روحانی نسل کو پھیلا دیتا ہے اور یہی سلوک وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمائیگا۔

۵۶ یعنی بے شک کافر نظریہ توحید کی ہمیشہ مخالفت کرتے ہیں۔ مگر خدا کو چھوڑ کر وہ جن کی عبادت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا (۵۷) اور ہم نے تو تجھے صرف بشارت دینے والا اور ہوشیار
وَّنَذِيْرًا ۝ کرنے والا بنایا ہے۔
قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ (۵۸) تو ان سے کہدے کہ میں تم سے اس (یعنی خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے)
اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ کا کوئی اجر نہیں مانگتا ہاں اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے چاہے تو اپنے
اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ رب کی طرف جانیوالی راہ کو اختیار کرے (یہی میرا اجر ہوگا)
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا (۵۹) اور تو اس پر توکل کر جو زندہ ہے (اور سب کو زندہ رکھتا ہے)
يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى کبھی نہیں مرتا اور اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی تسبیح بھی کر
بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۝ اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے۔

کرتے ہیں وہ نہ نفع کی طاقت رکھتے ہیں نہ نقصان کی مگر تجھے تو ہم نے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے یعنی اس لیے بھیجا ہے کہ تجھ پر ایمان لانے والے ترقی کریں اور تیرے منکر تباہ ہو جائیں پھر وہ تیرا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ کہ آنحضرتؐ کے ماننے والے غالب آئے اور آپ کے دشمن نامراد رہے۔

۵۸ اس آیت میں اس بلند اسلامی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ قبول مذہب کے بارہ میں ہر شخص کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۲/۲۷۵۔ تفصیل کیلئے دیکھیں بقرہ آیت ۲۷۵

۵۹ توکل کے معنے اپنے معاملہ کو کلی طور پر خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ اسباب سے کام نہ لینا بھی توکل کے خلاف ہے کیونکہ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر خدا تعالیٰ پہ توکل کرو یعنی پہلے مادی تدبیر بھی کرو۔ پھر جب تمہاری عقل کہے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی اس وقت تم کہو کہ اس کام میں ضرور کوئی رخنہ ہے جسے خدا تعالیٰ ہی پورا کرے گا۔ یہ علمی توکل ہے اور عملی توکل یہ ہے کہ سب ممکن ذرائع حصول مقصد کے استعمال کرنے کے بعد اگر بعض سامانوں کی ضرورت رہ جائے جن کا مہیا کرنا تمہارے لیے ممکن نہ ہو گویا تمہیں رخنے ہی رخنے نظر آئیں تو اس وقت مایوس نہ ہو بلکہ یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ ضرور یہ کام کر دے گا اور خود کمی کو پورا کر دے گا۔

الغرض توکل عقل کے بالکل خلاف فتویٰ دیتا ہے جب عقل کہتی ہے سامان مکمل نہیں اور تباہی یقینی ہے تو توکل کہتا ہے خدا کی طرف دیکھ وہ محیی ہے اور جب عقل کہتی ہے کہ اب تباہی کا کوئی امکان نہیں تو توکل کہتا ہے کہ تم ڈرو کہ خدا ممیت بھی ہے۔ اکثر لوگوں کا طریق ہے کہ جب کام کا نتیجہ حسب منشاء نہیں نکلتا تو اسے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے یہ کام نہیں کیا ہمارا کیا قصور ہے مگر جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ انسانی محنت کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کا قائم مقام نہیں ہوتا۔ اگر وہ انسانی محنت کا قائم مقام ہوتا۔ تو حضرت ابراہیمؑ کا یہ فرمانا کہ اذا مرضت فھو یشفین

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ۝

(۶۰) وہ (خدا) جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کو چھ اوقات میں پیدا کیا ہے پھر وہ مضبوطی سے عرش پر قائم ہو گیا۔ وہ رحمٰن ہے پس جب بھی (اے انسان) تو اس کے متعلق کوئی سوال کرے تو خبیر سے سوال کر جو بہت باخبر ہے (اور ٹھیک ٹھیک جواب دے سکتا ہے)

غلط ہوتا ہے مگر آپ نے اذا مرضت کہکر بتا دیا کہ اگر میں بیمار ہونے والے افعال کروں تو خدا مجھے بیمار ہونے سے روکتا نہیں اور ھو یشفین میں بتایا کہ میں خود بخود کامل شفا نہیں پا سکتا۔ کامل شفا دینے والا خدا تعالےٰ ہی ہے یہی ترقی کی کلید ہے۔

سبّح بحمدہٖ میں یہ سمجھایا ہے کہ انسان کا اسباب پر پورا انحصار کر لینا اور سمجھنا کہ وہ کسی چیز کے کرنے پر پورے طور پر قادر ہو گیا ہے توکل کے خلاف ہے کیونکہ ہر عیب سے پاک صرف ذات باری ہے اسی طرح بحمدہٖ میں بتایا کہ اسباب سے بالکل ہی کام نہ لینا بھی خدائی کاموں کو لغو قرار دیتا ہے، اس کی تعریف نہیں۔

ثالث خدا تعالےٰ کی صفات دو طور پر ظاہر ہوتی ہیں ایک تنزیہی طور پر جس پر "عرش" کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ اور دوسرے تشبیہی طور پر جس پر خدا تعالےٰ کی ابدیت۔ رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت یوم الدین کا تفصیلی ظہور دلالت کرتا ہے تشبیہی صفات خدا تعالےٰ کے اصل جلوہ کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ انسان کی قابلیت کے مطابق وہ صفات ڈھل جاتی ہیں خدا تعالےٰ اپنی صفات تنزیہیہ کو صفات تشبیہہ کے رنگدار شیشے میں سے انسان کو دکھاتا ہے تاکہ ان کے جلوہ کی کثرت اس کی روحانی بینائی کو ضائع نہ کر دے لیکن جس طرح عقلمند روشنی کی قوت کا اندازہ اس روشنی پر نہیں کرتے جو رنگدار شیشے میں سے نظر آتی ہے اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کے اس ظہور پر معترض نہیں ہو سکتا جو اس کی کمزوری کے پیش نظر تنزل اور تشبیہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔

تشبیہ کی صورت میں چونکہ غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں اس لئے قرآن نے لیس کمثلہ شیء کہکر اس کی اصل شان بھی ظاہر کر دی۔ اور بتا دیا کہ وہ رب ہی نہیں رب العرش ہے۔ پس اس کی صورت کو انسانی صورت پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ غرض عرش خدا تعالےٰ کی صفات تنزیہیہ کا نام ہے جو ازلی اور غیر متبدل ہیں اور جس میں کوئی مخلوق اس سے ذرہ بھر مشابہت نہیں رکھتی۔ اس لیے ثم استوی علی العرش کے یہ معنے ہیں کہ زمین و آسمان کی تکمیل کے بعد خدا کی صفات تنزیہیہ کامل طور پر ظاہر ہونے لگ گئیں اور چونکہ ان کا ظہور صفات تشبیہہ کے ذریعہ ہوتا ہے

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝ (۶۱) ع السجدة

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ تو کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا ہم اس کے آگے سجدہ کریں۔ جس (کے آگے سجدہ کرنے) کا تو حکم دیتا ہے اور یہ بات ان کو نفرت میں اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

ع ۵ / ۴ الجزء ۱۹

اس لیے یہ مطلب ہے کہ سب صفات تشبیہہ اپنے کام پر لگ گئیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اسلام کے ذریعہ چونکہ نیا آسمان و زمین قائم کیا گیا ہے۔ اب خدا کی تمام صفات جو اس کی صفات تنزیہیہ کے تابع ہیں محمد رسول اللہ صلعم کی تائید میں کام کرنے لگیں گی۔

الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔ اس میں ہٖ کی ضمیر لفظ رحمٰن کی طرف جاتی ہے۔ مگر "ب" "عن" کا قائم مقام بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں خبیر سے آنحضرتؐ مراد ہونگے جنہیں خدا تعالیٰ نے الہاماً اپنی صفات کا علم دیا ہے۔ فرماتا ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے ان عظیم الشان احسانات سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو اس نے صفت رحمانیت کے ماتحت ساری دنیا پہ کئے ہیں اور کلام الٰہی کی ضرورت بھی تسلیم نہیں کرتے۔ جو صفت رحمانیت کے ماتحت نازل ہوا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ حقیقت منکشف کر دے

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اپنی عقدہ کشائی چاہو۔ کیونکہ ان کا اپنا وجود خدا کی صفت رحمانیت کے ظہور کا زندہ ثبوت ہے (دیکھیں نوٹ ۹۰۷ سورۃ الضحیٰ) یاد رہے کہ وہ روحانی وجود جن کے ذریعے آنحضرتؐ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا میں شامل ہیں۔

۶۱ رحمٰن بلا مبادلہ اور بغیر ہماری کوشش و سعی کے احسان کرنے والے کو کہتے ہیں اس قول کا ثبوت یہ ہے کہ اہل عرب نے کبھی بھی سوائے اللہ کے رحمان کا لفظ بطور صفت بجز خدا کے اور کسی پہ استعمال نہیں کیا۔

(۲) بو علی فارسی امام نحو کہتے ہیں کہ رحمٰن عام ہے اور سب قسم کی رحمتیں اس میں شامل ہیں۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے۔ رحمی تعلقات میں سے سب سے زیادہ رحمانیت سے مشابہت رکھتے ہیں، جیسے ماں کی بچے سے محبت بالکل طبعی ہوتی ہے پس ان کا رحمانیت سے نکلا ہوا ہونا بتاتا ہے کہ رحمانیت بلا مبادلہ سلوک کا نام ہے۔

(۴) پھر رحمان فعلان کے وزن پر ہے اور عربی میں اس وزن پہ آنے والے تمام الفاظ پھیلاؤ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝	(۶۲) برکت والی ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں ستاروں کے ٹھہرنے کے مقام بنائے ہیں اور اس میں چمکتا ہوا چراغ بنایا ہے اور نور دینے والا چاند بنایا ہے۔
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝	(۶۳) وہی ہے جس نے رات کو اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنیوالا بنایا ہے اس شخص کے (فائدہ کے) لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گذار بندہ بننا چاہے۔

وسعت اور غلبہ پر دلالت کرتے ہیں۔ پس رحمٰن کے معنے نہایت وسیع رحمت والے کے ہیں جس کی رحمت سے دنیا کی کوئی چیز باہر نہیں اور جو ترقی کے سلسلہ میں ہر ضروری سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اس جگہ کفار کے یہ کہنے سے کہ رحمٰن کون ہے بعض نے یہ سمجھا ہے کہ یہ لفظ معرب ہے اس لیے عرب کے لوگ اس کو سمجھ نہ سکے۔ اس غلط فہمی کو بخاری کی اس روایت سے مزید تقویت ملی کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کا حکم دیا تو کفار کے نمائندوں نے کہا کہ ہم نہ رحمٰن کو پہچانتے ہیں نہ رحیم کو مگر خود اس حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان کو اعتراض معاہدہ کو ان الفاظ سے شروع کرنے پر تھا نہ کہ الفاظ کے عربی ہونے پر کیونکہ رحیم کا لفظ سب کے نزدیک عربی ہے اور اسے وہ جانتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ کفار کے یہ کہنے سے کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے کیا مراد ہے تو جاننا چاہیئے کہ لفظ رحمٰن کفار بھی استعمال کیا کرتے تھے (زخرف ۴۳) مگر وہ اس کے ان معنوں سے ناواقف تھے جو اسلام پیش کرتا ہے اس لیے وہ چڑ کر کہہ دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمان کون ہے اور ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ ہم ان معنوں میں کسی کو رحمٰن ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ایسی بات ہے جیسے قرآن میں آتا ہے کہ کفار نے کہا اے شعیب! ہماری سمجھ میں تیری اکثر باتیں نہیں آتیں۔ (ہود - ۸) حالانکہ ہر رسول کو قوم کی زبان میں وحی دیکر بھیجا جاتا ہے (۱۴)

۶۲-۶۳ یہاں کفار کو یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا کی رحمت نے دنیوی زندگی کے لیے سورج اور چاند پیدا کیے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ دینی زندگی کے لیے ایسا نہ کیا ہو۔ اگر روحانی سورج اور چاند نہ ہو تو انسان پر روحانی موت آجائے۔ چنانچہ ۵ سے ظاہر ہے کہ ایک موت روحانی بھی ہوتی ہے۔

پس ان آیات میں انسان کو ظاہری نظام دیکھکر روحانی نظام کی طرف توجہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اس لیے فرماتا ہے۔ لمن اراد ان یذکر۔ لیل و نہار کے ایک دوسرے کے

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝

(۶۴) اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں۔ (یعنی تکبر کے ساتھ نہیں چلتے) اور جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں (یعنی جہالت کی باتیں کہتے ہیں) تو وہ لڑتے نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۝

(۶۵) اور وہ لوگ بھی جو اپنے رب کے لئے راتیں سجدوں میں اور کھڑے ہو کر گذار دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۝

(۶۶) اور وہ (یعنی رحمٰن کے بندے) کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب ٹلا دے۔ اس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے۔

پیچھے آنے میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ کبھی دنیا کی اصلاح کے لیے انبیا آتے ہیں اور کبھی تاریکی کا دور دورہ ہوتا ہے اس لیے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں بتایا کہ روحانی رات اور دن کو یکے بعد دیگرے اس لیے لایا جاتا ہے کہ نصیحت سنکر اپنی اصلاح کرنے والے اپنی اصلاح کرلیں اور جو فطری نیکی کے مقام پر ہوں وہ مقام شکر کو پالیں۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر آدمی کی اصلاح ہو سکتی ہے اور عیسائیوں کا یہ نظریہ کہ انسان فطرتی طور پر گناہ گار ہے غلط ہے۔

نظام عالم سے فائدہ تو کفار بھی اٹھا رہے ہیں۔ پھر یہاں دو گروہوں کی تخصیص کیوں کی گئی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق لولاک لما خلقت الافلاک کے الفاظ آتے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں اصل میں مومن کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور کفار کا ان سے فائدہ اٹھانا ایسا ہی ہے جیسے آقا کہیں جائے تو اس کے گھوڑے کو بھی چارہ مل جاتا ہے۔

۶۴-۶۷ آیت فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ سے ظاہر ہے کہ خدا کا بندہ ہونا دو رنگ میں ہوتا ہے ایک لحاظ سے تو تمام انسان اس کے بندے ہیں لیکن ایک لحاظ سے صرف اس کے احکام کی اطاعت کرنیوالے اس کے بندے ہوتے ہیں اور دوسروں کو خدا تعالےٰ کا انعام بندر، سؤر اور شر البریہ قرار دیتا ہے۔ (۱۸ - ۶۱/۵ - ۹/۴۲)۔ یہاں عباد اللہ کی بجائے عباد الرحمٰن کے الفاظ اس لیے ہیں کہ کفار کا سوال تھا کہ رحمٰن کون ہے؟ سو خدا تعالےٰ نے صفت رحمانیت کے ثبوت میں پہلے زمین و آسمان سورج اور چاند کی طرف توجہ دلائی۔ پھر آنحضرتؐ کا وجود پیش کیا۔ اب ان بندوں کو پیش کرتا ہے جو اس کی رحمانیت کے چلتے پھرتے مجسمے ہیں۔ اور ان کی علامات بیان فرماتا ہے۔

پہلی علامت:۔ وہ زمین پر سکون و آرام سے چلتے ہیں یعنی دنیوی زندگی اعتدال سے گذارتے

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ (۶۷) وہ (دوزخ) عارضی ٹھکانہ کے طور پر بھی بُری ہے اور مستقل ٹھکانے کے طور پر بھی (بُری ہے)

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۝ (۶۸) اور وہ (اللہ کے بندے) ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے اور نہ بخل کرتے ہیں اور ان کا (خرچ) ان دونوں حالتوں کے درمیان ہوتا ہے

ہیں نہ ہی مفوضہ فرائض سے سست ہوتے ہیں اور نہ جاہلوں کے جوش دلانے پر بیجا طیش میں آتے ہیں

ان آیات میں مسلمانوں کی اقتدار کے وقت کی حالت بتلائی گئی ہے چنانچہ یہاں یمشون فی الارض نہیں فرمایا یمشون علی الارض فرمایا ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کا چلنا اقتدار اور غلبہ کے ساتھ ہوگا۔ ایسا ہی فقرہ حضرت سلیمان کے متعلق آتا ہے (۲۷/۱۹)

یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا میں بتایا ہے کہ ایسے وقت میں بھی جبکہ انہیں دنیا کو روندنے کی طاقت ہوگی وہ اس طرح چلیں گے کہ کسی کو ان کے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچے بلکہ ایسے وقت میں اگر کوئی ان سے جہالت سے خطاب کریگا تو وہ کہدیں گے سَلٰمًا۔

دوسری علامت:۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (۱) وہ راتوں کے اوقات میں یعنی مشکلات میں دعاؤں سے کام لیتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کے آستانہ پر جھکے رہتے ہیں (۲) وہ تہجد گذار ہوتے ہیں۔

تیسری علامت:۔ یہ بیان فرمائی کہ وہ جہنم کو دور رکھنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جہنم جہن اور ھم سے مرکب ہے۔ جھن کے معنے کسی چیز کے قریب ہونے کے، اور جھم کے معنے منہ کے بگڑ جانے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے جہنم کا اطلاق ہر اس چیز پر ہو سکتا ہے جس کی طرف انسان پہلے تو شوق سے بڑھے مگر اسے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ جائے۔ اس لفظ میں جہنمی اعمال کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ عباد الرحمٰن ان سے بچنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں گویا یہ وہی دعا ہے جو ۱/۷ میں سکھائی گئی ہے

۶۷ یہاں دوزخ کو مستقر کہکر عارضی قرارگاہ بتایا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ دوزخ خواہ عارضی ہو یا مستقل بڑی تکلیف دہ ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ دوزخ کا تھوڑا عذاب بھی بہت ہے اس لیے اس کو لمبا کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جہنم کے عارضی ہونے کے متعلق دیکھیں نوٹ ۸/۲۴ ـ حدیث میں آتا ہے کہ جہنم پر ایک زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ جو آتا ہے وما هم بخارجين من النار اس سے یہ مطلب نہیں کہ دوزخ سے وہ کبھی بھی نہیں نکلیںگے بلکہ اس میں ان کے اپنے زور سے نکلنے کی نفی کی گئی ہے۔

۶۸ یہاں عباد الرحمٰن کی دو اور علامتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ وہ اسراف سے کوئی کام نہیں لیتے دوسرے

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ (۶۹) اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ اور معبود کو نہیں پکارتے اور نہ کسی جان کو جسے اللہ تعالیٰ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ نے حفاظت بخشی ہو قتل کرتے ہیں سوائے (شرعی) حق کے۔ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ اور نہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی ایسا کام کرے گا وہ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ اپنے گناہ کی جزا کو دیکھے گا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۖ (۷۰) قیامت کے دن اس کے لئے عذاب زیادہ کیا جائے گا۔ اور وہ اس میں ذلّت کے ساتھ رہتا چلا جائے گا۔

یہ کہ بخل نہیں کرتے۔ ~~بخ~~ میں بھی اسراف کے نقص کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آنحضرتؐ قومی اموال کے خرچ کرنے میں اس قدر محتاط تھے کہ باوجود اس کے کہ دوسرے صحابہؓ کی طرح حضرت علیؓ کا بھی حق تھا مگر آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کی درخواست پر انہیں جنگی قیدی دینا پسند نہیں فرمایا۔ ایک دفعہ بچپن میں حضرت حسنؓ یا حسینؓ نے صدقہ کی ایک کھجور منہ میں ڈال لی تو آنحضرتؐ نے اسے نکال کر باہر پھینک دیا اور فرمایا یہ غرباء کا حق ہے۔ آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اسراف سے احتیاط برتی اور حکام سے کبھی غفلت ہوتی تو ان کو بھی ڈانٹتے۔ مگر اسراف کی تعریف مختلف آدمیوں کی مالی حالت اور حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام مختلف حالات میں مختلف قسم کی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

وَلَمْ يَقْتُرُوْا۔ قاتر کے معنے ایسے شخص کے ہیں کہ جو مال جمع کرے اور ان لوگوں پر خرچ نہ کرے جن پر خرچ کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس لفظ کے استعمال میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس کے پاس مال نہ ہو اس کا خرچ نہ کرنا قابل اعتراض نہیں۔ بخل کا نقصان خود بخیل کو ہوتا ہے (۹۲/۴۷) کیونکہ وہ نہ اپنی ذات کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے نہ رشتہ داروں اور قوم کو اس لیے ان کی نگاہ میں بھی ذلیل ہو جاتا ہے۔

وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ ان کا طریق افراط و تفریط سے پاک اور میانہ روی کا ہوتا ہے۔

ف۶۹ یعنی عِبَادُ الرَّحْمٰنِ شرک کے قریب نہیں جاتے۔ کیونکہ شرک رحمانیت کے خلاف ہے۔ آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے دل میں توحید کا ایسا عشق تھا کہ نہ انتہائی مظالم، نہ کوئی لالچ انہیں اس کی اشاعت سے باز رکھ سکے۔ بلکہ ایک موقع پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکر رکھ دیں پھر بھی میں اشاعت توحید سے باز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ آپؐ نے ساری دنیا کا مقابلہ کیا اور توحید کو غالب کر کے دکھا دیا۔ رحلت کے وقت بھی آپؐ صحابہؓ کو یہ سمجھاتے رہے کہ میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا پھر عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی یہ علامت بتلائی کہ وہ کسی کو ناجائز قتل نہیں کرتے چنانچہ صحابہؓ کی تلوار

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝	(۷۱) سوائے اس کے جس نے توبہ کرلی اور ایمان لایا۔ اور ایمان کے مطابق عمل کئے۔ پس یہ لوگ ایسے ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ، ان کی بدیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ، بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔
وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝	(۷۲) اور جو توبہ کرے اور اس کے مطابق عمل کرے تو وہ شخص حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ، کی طرف جھکتا ہے۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝	(۷۳) اور وہ لوگ بھی اللہ کے بندے ہیں، جو جھوٹی گواہیاں نہیں دیتا اور جب لغو باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو بزرگانہ طور پر (بغیر ان میں شامل ہوئے) گذر جاتے ہیں۔

عملاً جنگ کرنیوالوں کے علاوہ کسی کے خلاف نہیں اٹھتی تھی۔

تیسری علامت یہ بتلائی کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ تم زنا کے قریب بھی نہ جاؤ (۱۷/۳۳)

۷۱-۷۲ کے یہاں توبہ پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا حصول اس کے بغیر ناممکن ہے۔ توبہ کے سات شرائط ہیں۔ توبہ کرنے والا اوّل گذشتہ گناہوں پر نادم ہو۔ دوسرے حتی الوسع گذشتہ رہے ہوئے فرائض کو پورا کرے۔ تیسرے حتی الوسع گذشتہ گناہوں کا ازالہ کرے چوتھے جسے دکھ پہنچایا ہوا ہو اس کے دکھ کا ازالہ کرکے اس سے معافی مانگے (مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن گناہوں کی خدا تعالیٰ نے پردہ پوشی کی ہو ان کو ظاہر کرتا پھرے) پانچویں جن کو نقصان پہنچایا ہو ان پر مقدور بھر احسان کرے اور کمی پوری کرنے کے لیے دعا کرے۔ چھٹے آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے ساتویں اپنے نفس کو نیکی کی طرف رغبت دلانا شروع کردے۔ ظاہر ہے کہ ان شرائط سے کی ہوئی توبہ گناہوں کا رستہ بند کرتی ہے کھولتی نہیں۔ انسان کا یہ خیال کہ میں جب چاہونگا توبہ کرلوں گا غلط ہوتا ہے کیونکہ وقتِ موت کا اعتبار نہیں۔ غرض توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کو نہیں کہتے بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہی اصلاح کا حقیقی طریق ہے۔

۷۳ کے عباد الرحمٰن کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا کام سچ بولنا ہی ہے لیکن سچ کے معنے صرف یہ ہیں کہ بات کہو تو سچ کہو یہ نہیں کہ تم ہر جگہ اور ہر وقت سچی بات کہتے پھرو۔ ورنہ بعض باتوں کے بیان سے اسلام نے روکا ہے۔ مثلاً لوگوں کے عیوب بیان کرنے سے منع فرمایا ہے اور اسے غیبت قرار دیا ہے۔

زُور کے معنے جھوٹ کے علاوہ عقل، طاقت، شرک اور گانے بجانے کی مجلس کے بھی ہیں ان کی رُو سے یہاں بتایا گیا ہے۔ کہ عبادُ الرحمٰن اوّل واقعات کے مطابق گواہی دیتے ہیں۔ قیاسی گواہی

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ (۷۴) اور وہ لوگ بھی کہ ان کے رب کی آیات جب انہیں یاد
رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا دلائی جائیں۔ تو ان سے بہروں اور اندھوں کا
صُمًّا وَّعُمْيَانًا معاملہ نہیں کرتے۔
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ (۷۵) اور وہ لوگ بھی الرحمٰن کے بندے ہیں) جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ

نہیں دیتے۔ دوسرے وہ طاقت کے گھمنڈ پر غرباء کو ذلیل کرنے کے لیے گواہی نہیں دیتے۔ تیسرے وہ شرک نہیں کرتے۔ چوتھے وہ گانے بجانے کی مجالس میں نہیں جاتے۔ آنحضرتؐ نے بھی منع فرمایا ہے کہ گانا بجانا اور باجے وغیرہ سب شیطان کے ہتھیار ہیں۔ بغداد میں معتصم باللہ کی اور ہند میں مغلیہ حکومت کی تباہی گانے بجانے ہی کے نتیجہ میں ہوئی۔

عِبَادُ الرَّحْمٰن کی ایک علامت یہ بتلائی کہ وہ لغویات میں شامل نہیں ہوتے۔ اس زمانہ کی لغویات میں سے مقدم سینما ہے۔ گو سینما اپنی ذات میں بُرا نہیں مگر اس کے غلط استعمال نے اسے انتہائی طور پر نقصان دہ بنا دیا ہے اور ملک کے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ ان خالص علمی یا تبلیغی فلمیں دیکھنا جائز ہیں۔ پھر قمار بازی، تاش، حقہ، بیکار بیٹھے گپیں ہانکنا سب لغویات میں شامل ہے۔

عِبَادُ الرَّحْمٰن کی ایک یہ علامت بتلائی کہ وہ کان اور آنکھیں کھول کر آیاتِ الٰہی کو سنتے ہیں ان کی اسی خوبی کا ذکر سجدہ ۳۲/۱۶ میں ہے ان کے مقابل کفار کی حالت صافات ۳۷/۱۴-۱۵ میں بیان کی گئی ہے اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ عِبَادُ الرَّحْمٰن آیاتِ الٰہی کو اندھا دھند نہیں مانتے سوچ سمجھ کر مانتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۹) اسی لیے قرآن نے بے دلیل ماننے والوں کو مجرم قرار دیا ہے (۵۳/۲۸) اور متعدد آیات میں زور دیا ہے کہ ایمان دلائل و براہین پر مبنی ہونا چاہیے۔ دیکھیں (احقاف ۴۶/۵، روم ۳۰/۳۶، انعام ۶/۱۴۹-۱۵۰، ۶/۱۰۸) اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ آیاتِ الٰہی سے منافقوں کی طرح ٹھوکریں نہیں کھاتے۔ اور دشمن کا لشکر دیکھ کر یہ نہیں کہتے کہ ما وعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا (۳۳/۱۲) بلکہ ایمان اور یقین میں اور بڑھ جاتے ہیں (۳۳/۲۲)

اس جگہ آیات سے صرف قرآنی آیات یا اللہ تعالیٰ کے نشانات ہی مراد نہیں بلکہ تمام مصلحین کا وجود بھی آیات میں شامل ہے۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے وجعلنا ابن مریم و امہ اٰیۃ (۲۳/۵۱) اور اس جگہ بتلایا گیا ہے کہ غلطی کی حالت میں بھی جب کسی مصلح کے ذریعہ عباد الرحمٰن کو ان خامیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو وہ یہ نہیں کرتے کہ طاقت کے گھمنڈ میں اس کی بات ہی نہ سنیں بلکہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ

اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

(۷۶) یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کی نیکی پر قائم رہنے کی وجہ سے (بہشت میں) بالاخانے دیئے جائینگے اور ان کو اس میں علیک دی جائیگی اور سلامتی کے پیغام پہنچائے جائیں گے۔

(۷۷) وہ ان میں رہتے چلے جائینگے وہ (یعنی جنت) عارضی قرارگاہ کے طور پر بھی بڑی اچھی ہے اور مستقل قرارگاہ کے طور پر بھی (بڑی اچھی ہے)

(۷۸) (اے رسول!) تو ان سے کہدے کہ میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے۔ اگر تمہاری طرف سے دُعا (اور استغفار) نہ ہو پس جبکہ تم نے پیغام الٰہی کو جھٹلا دیا تو (اب)

---

۷۵ مسلمانوں نے دَورِ اقتدار میں اس دعا کو بھی نظر انداز کر دیا ہے اور اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت سے غافل ہو گئے جس کے نتیجہ میں تمام حکومتیں ان کے قبضہ سے نکل گئیں۔ اگر اب بھی وہ یہ دعا کرتے رہیں تو انہیں ان کی کھوئی ہوئی متاع دوبارہ مل سکتی ہے۔ پس انہیں ہمتوں کو بلند کرنا چاہیئے کیونکہ یہاں اللہ تعالےٰ بتلاتا ہے کہ مومن چھوٹی چھوٹی باتوں پر راضی نہیں ہوتے بلکہ وہ امام بننے کی دعا کرتے ہیں اور امام بھی متقیوں کے۔ اگر سوال ہو کہ ہر شخص کیسے امام ہو سکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ اپنی بیوی بچوں کی تربیت کرنے والا ان کا امام ہو جاتا ہے۔ قرآن نے حضرت اسمٰعیلؑ کی ایک بڑی خوبی یہ بتلائی ہے کہ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (۱۹/۵۶) اور یہی مومن کا کام ہے۔

۷۶ یعنی عباد الرحمٰن کے مندرجہ بالا کاموں کا انعام یہ ہوگا کہ انہیں بہشت میں اونچے مقامات دیئے جائیں گے اور چونکہ دنیا میں لوگ ان سے امن میں رہے اس لیے ان کو سلامتی کا پیغام پہنچے گا۔ (غرفہ کے معنے ساتویں آسمان کے بھی ہیں) اس لیے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ ساتویں آسمان پر ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ساتویں آسمان پر ہیں (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صـ۲۰۷ - ۲۰۹) اس لیے یہ مطلب بھی ہے کہ انہیں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رکھا جائے گا۔

یہاں یہ بھی بتایا گیا کہ عباد الرحمٰن کی مذکورہ بالا نیکیاں ضائع نہیں جائیں گی بلکہ دنیا ان کے دیدنگیں ہو جائے گی۔

لِزَامًا ؏ اس کا عذاب (تم سے) چمٹا چلا جائے گا۔

شہ[78] یہاں "ما" نافیہ بھی ہوسکتا ہے اور استفہامیہ بھی مگر مفہوم دونوں کا ایک ہی رہے گا۔ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کے ایک معنے یہ ہیں کہ لولا دعاؤکم ایاکم الی طاعتہ یعنی اگر خدا تعالےٰ نے یہ لازم نہ کرلیا ہوتا کہ میں اپنے بندوں کو پکاروں گا۔ اور ان کی ترقی کے سامان کرونگا تو تم ایک مشت خاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ لولا دعاؤکم کی صداقت ہی کا کرشمہ تھا کہ آنحضرت صلعم گوشۂ گمنامی سے نکل کر دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ اور آپؐ کے ساتھ آپ کے وابستگان بھی بڑھتے چلے گئے۔ اسی بنا پر کونوا مع الصدقین ($\frac{9}{119}$) کا حکم ہے لولا دعاؤکم کے دوسرے معنے یہ ہیں لولا تضرعکم علیہ یعنی اگر تم اس کو نہ پکارو تو تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔ دراصل مذہب کی جان اور خلاصہ دعا ہی ہے مگر دعا صرف منہ سے الفاظ نکال لینے کا نام نہیں بلکہ خدا کے حضور پگھل جانے کا نام ہے چنانچہ جب تم دعا کرو تو چاہیئے کہ تمہارا ہر ذرہ جلال الٰہی کا شاہد ہو۔ تمہارے دماغ کا ہر گوشہ اس کی قدرتوں کو منعکس کر رہا ہو۔ اور تمہارے دل کی کیفیت اس کی عنایتوں کا لطف اٹھا رہی ہو۔

فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا۔ یعنی عذاب لمبا ہوتا چلا جائے گا۔ اور تم خود بھی اس دنیا میں ذلیل ہوگے۔ اور تمہاری نسلیں بھی ہر قسم کی برکتوں سے محروم رہیں گی ؎

آیاتہا ۲۲۸	سورۃ الشعراء مکیۃ	رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) میں اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)
طٰسٓمّٓ ۝ (۲) طاہر اور سمیع اور مجید خدا اس سورۃ کا نازل کرنیوالا ہے)

نزول و ترتیب :- یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ فرقان کے آخر میں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی آواز پر لبیک کہنے اور اعلیٰ اخلاق ظاہر کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اگر وہ اس غرض کو پورا نہیں کرتا۔ تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کیا ضرورت ہے اور اس کے تباہ کرنے کا کیا غم؟ اس سورۃ میں بتلایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم بھی انسانوں کی ہمدردی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ بجائے تباہ کرنے کے انسان کو بچا لیا جائے تو اچھا ہے۔ یہ بے شک آپ کی محبت کا ثبوت ہے مگر الٰہی سکیم یہ ہے کہ انسان کو علم و عرفان دے کر قربِ الٰہی کی کوشش کا موقعہ دیا جائے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے طبعی نتائج بھگتے۔

اس سورۃ سے مسیحیوں اور یہودیوں سے خطاب جو سورۃ یونس سے شروع تھا اس کا رخ بدل کر پھر مسلمانوں کی طرف کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے مقطعات میں تبدیلی کی گئی ہے۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے انسانی ترقی قول اور عمل میں یکرنگی سے ہی حاصل ہوتی ہے جو لوگ شعراء کی طرح کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔ وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے مسلمان کامیاب ہوں گے اور کفار ناکام۔

۲ طٰسٓمّٓ :- جو حروف مقطعات میں سے ہیں بتلاتے ہیں کہ اس سورۃ اور اس کے تابع سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے محسن عظیم ہونے، مخفی رازوں سے واقف ہونے، سمیع الدعا ہونے اور بلند شان ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔

اسلام نے صفاتِ الٰہیہ کے بارہ میں ایک جامع تعلیم پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ صفات الٰہی تنزیہی اور تشبیہی دو رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیں سورۃ یونس نوٹ ۲)

اسلام ایک کامل الصفات خدا پیش کرتا ہے۔ اور اس کی ان تمام صفات کا ذکر کرتا ہے جن کا انسانی پیدائش کے ساتھ تعلق ہے۔ گویا اس نے سب آسمانی ڈیپارٹمنٹس کو ننگا کر کے دکھا دیا ہے جو اس کے حسن السماء ہونے کا ثبوت ہے۔ مگر دوسرے مذاہب میں خدا کا نام تو ہے مگر اس کی صفات کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہے۔

پھر اسلام نے حصولِ قربِ الٰہی کے طریق بھی بتلائے ہیں اور بتایا ہے کہ خدا سے ملنے کیلئے ضروری ہے کہ بندے اور خدا میں روحانی مشارکت ہو جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ بندہ خدائی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو اس کا خدا تعالیٰ سے اتصال ممکن ہو جاتا ہے اور گو وہ خدا تو نہیں مگر خدا نما بن جاتا ہے۔

اسلام بتاتا ہے کہ انسان کا تمام تر حسن صفاتِ الٰہیہ کے رنگ میں رنگے جانے میں ہے اور جتنا جتنا کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا جائیگا اتنا ہی وہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہوتا جائیگا۔ اور اسی نسبت سے اسے قربِ الٰہی بھی حاصل ہوگا۔ گویا اسلام نیکی اور بدی کی تعریف ایک جدید زاویۂ نگاہ سے پیش کرتا ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کام کے کرنے کو جی چاہے وہ نیکی ہے دوسرا بدی۔ مگر انسان کا جی ایک وقت ایک چیز کو چاہتا ہے تو دوسرے وقت نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ تعریف غلط ہے۔ بعض کے نزدیک، جس کام کو سوسائٹی یا تہذیب چاہے وہ نیکی ہے جسے نہ چاہے وہ بدی اس پر سوال یہ ہے کہ کس سوسائٹی یا تہذیب کی بات مانی جائے؟ بعض کے نزدیک جسے دنیا کی اکثریت نیکی کہے وہ نیکی ہے مگر دنیا کی اکثریت ہمیشہ ایک رائے پر نہیں رہتی۔ اس لیے یہ اصول تسلیم کرلیں تو نیکی بدی کی تعریف بدلتی رہے گی۔ پھر بعض کے نزدیک نیک عمل وہ ہے جس کے کرنے سے سب سے زیادہ خوشی حاصل ہو لیکن اگر کسی کو ڈاکہ زنی سے خوشی حاصل ہو تو کیا وہ نیک فعل ہوگا؟ پھر بعض کے نزدیک نیکی وہ ہے جس سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے لیکن یہ تعریف صحیح سمجھیں تو ماننا پڑے گا کہ بڑی آبادی والے ملکوں کے لیے چھوٹی آبادی والے ملکوں کو لوٹ لینا نیکی ہے۔

بعض کے نزدیک نیکی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو زیادہ فائدہ پہنچے لیکن اگر کسی کو جھوٹ سے نفع پہنچے تو کیا وہ نیکی ہوگی؟ پھر بعض کے نزدیک نیکی بدی کی بنیاد فطرت پر رکھنی چاہیے۔ یہ تعریف ایک حد تک درست ہے مگر انسانی فطرت بے شک بعض باتوں کے متعلق بولتی ہے مگر محدود حد تک کیونکہ بسا اوقات بُرے ماحول کے نتیجہ میں وہ مسخ بھی ہو جاتی ہے۔

اسلام ان تمام نظریات کے خلاف بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ (جو بے عیب ذات ہے) کی صفات کی موافقت اختیار کرنا نیکی ہے اور ان کے خلاف کام کرنا برائی ہے۔ کیونکہ خدا اصل ہے اور انسان اس کی تصویر ہے اور تصویر کا حسن اسی میں ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو اور عیب یہی ہے کہ وہ اصل کے خلاف ہو۔ چنانچہ اسلام ہدایت دیتا ہے کہ صبغۃ اللّٰہ و من احسن من اللّٰہ صبغۃ (۲/۱۳۹)

اس سورۃ کی ابتداء خدا تعالیٰ کی تین صفات سے کی گئی ہے پہلی صفت لطیف ہے خدا تعالیٰ کے لیے یہ لفظ آئے تو اس کے ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ لوگوں کی خبر گیری کرنے والا اور محبت اور احسان سے ان کو نفع پہنچانے والا۔ چنانچہ زمین و آسمان میں ہزاروں ہزار نعمتیں خدا تعالیٰ نے محض اپنے احسان سے انسان کو عطا کر رکھی ہیں بلکہ ہر اچھا کام جو انسان کرتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کے محض فضل سے ہوتا ہے۔

تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ٥ (۳) یہ آیتیں اس کتاب کی ہیں جو اپنے مطالب کو کھولکر بیان کرتی ہے

جب انسان ہر چیز کو خدا کا انعام سمجھتا ہے اور اس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے تو اسے ایک سیڑھی مل جاتی ہے جو اسے خدا تک پہنچا دیتی ہے اس لیے قرآن بار بار خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

لطیف کے دوسرے معنے ایسی ہستی کے ہیں جو تمام امور کے مخفی در مخفی پہلوؤں کو جاننے والی ہو۔ اس لیے صفت لطیف کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ انسان مختلف چیزوں کی پوشیدہ حکمتوں سے اس وقت تک آگاہ نہیں ہوتا جب تک خدا تعالےٰ صفت رحیمیت کے ماتحت اسے آگاہ نہیں کرتا۔ اس کی طرف $\frac{ع ۷}{۱۸}$ میں بھی اشارہ ہے۔

دراصل خدا تعالےٰ نے علم غیب کو اپنے ہاتھ میں رکھکر دو برکتیں پیدا کی ہیں ایک وہ جو غیب کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہ جو کشف غیب سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی ساری زندگی جدوجہد سے تعلق رکھتی ہے اور جدوجہد کی بنیاد ہی غیب پر ہے۔ پردہ غیب نہ ہوتا تو اول سعی وعمل وایجادات کا سلسلہ ختم ہو جاتا دوسرے انسان مستحق سزا وجزا نہ رہتا۔

لیکن جہاں دینی اور دنیوی کاروبار پردۂ غیب کی وجہ سے چل رہا ہے وہاں مومنوں کے ایمان کی ترقی انکشاف غیب سے تعلق رکھتی ہے۔ جب انبیاء اخبار غیبیہ بتلاتے ہیں۔ اور وہ مخالف حالات میں پوری ہو جاتی ہیں تو خدا تعالےٰ کی ہستی عریاں ہو کر لوگوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایک نیا ایمان پیدا ہو جاتا ہے۔

ان مقطعات میں خدا تعالےٰ کی دوسری صفت سمیع بیان ہوئی ہے اور السمیع کے معنے ہیں کہ صرف وہی ہے جو بندوں کی دعائیں سنتا اور انہیں نرالے طور پر قبول کرتا ہے۔ اس صفت کے ذکر سے انسان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ہر ضرورت کے وقت خدا تعالےٰ کے حضور دعا کرو۔ دعا سب انسانوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور دعا ہی وہ ہتھیار ہے جس کے متعلق خدا تعالےٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ ...... الخ ($\frac{ع ۲}{۲۷}$) پس یہ عمل سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ بے شک نماز روزہ بھی ضروری ہیں مگر دعا وہ چیز ہے جس کے متعلق خدا تعالےٰ فرماتا کہ اگر کوئی سچے دل سے مجھے پکارے تو میں ضرور اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں ($\frac{ع ۲}{۱۸}$)

تیسری صفت جس کی طرف ان مقطعات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ مجید کی صفت ہے مجید کے معنے بڑی بزرگی اور شان رکھنے والے کے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی اس صفت کی طرف $\frac{۵۵}{۱۳۵}$ میں اشارہ ہے

اور بتلایا گیا ہے کہ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ظاہر ہوتا ہے انسانی فطرت ہے کہ وہ نئی چیزوں سے لطف اٹھاتا اور تسلی پاتا ہے کیونکہ اس سے اس کے اندر نئی امید پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی فطرتی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسی قدرتیں ظاہر کرتا ہے جن سے اس کی اعلیٰ شان اور مجد کا اظہار ہوتا ہے۔ طٰسٓمٓ میں خدا تعالیٰ کی جن تین صفات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس سورۃ میں ان کو واقعاتی رنگ میں ثابت کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے یہ آیات ایسی کتاب کی ہیں جو ہر ایک حقیقت کو خوب کھول کر بیان کرنے والی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسان کی تمام ضروریات کو جانتا ہے اور اس کی فطرت کے اسرار سے آگاہ ہے۔

قرآن میں لفظ مُبین الہامی صحیفوں میں سے صرف قرآن کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ ایک تورات کے متعلق تبیین کا لفظ آتا ہے (۲۷/۱۱۷) مگر جہاں استبان کے معنے صرف واضح ہو جانے کے ہیں وہاں آیات کے یہ معنے ہیں کہ وہ واضح ہونے کے علاوہ موضح بھی ہے۔ یعنی پہلی کتب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مثلاً سلاطین ۱۱/۵-۹ میں سلیمانؑ پر اور خروج ۳۲ میں ہارونؑ پر شرک کا الزام لگایا گیا ہے مگر قرآن نے ۲/۱۰۲ اور ۲۰/۹۱ میں اسے رد کیا ہے اسی طرح یہود نے حضرت مسیحؑ پر ولد الزنا ہونے کا الزام لگایا تھا مگر قرآن نے اس الزام کو غلط بتایا (انبیاء ۲۱/۹۲)۔ عیسائی مسیحؑ کے متعلق کہتے تھے کہ آپ صلیب پر لعنتی موت مرے (گلیتون ۳/۱۳) مگر قرآن نے اس الزام کو بھی غلط بتلایا (مریم ۱۹/۳۴) اسی طرح اجمالی طور پر قرآن نے تمام انبیاء پر سے الزامات دور کیے ہیں اور ان پر ایمان لانا لازمی قرار دیا ہے۔

اسی طرح قرآن نے نفس انسانی کے متعلق مختلف مذاہب کے غلط نظریات کا رد کیا ہے۔ (التین نوٹ ۲)

پھر قرآن کا مبین ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ہزاروں ایسی صداقتیں بتلائی ہیں جن کا پہلی اسلامی کتب میں ذکر نہیں (مثال کے لیے دیکھیں یونس نوٹ ۹۳)

پھر قرآن اس لحاظ سے بھی کتاب مبین ہے کہ وہ پہلی کتب کی طرح اپنے دلائل کے ثبوت کے لیے بیرونی دلائل کا محتاج نہیں بلکہ خود ہی اپنے دعاوی کے دلائل مہیا کرتا ہے۔

پھر قرآن اس لیے بھی مبین ہے کہ وہ وصول الی اللہ، احکام اخلاق، اعتقادات وغیرہ کے متعلق تمام ضروری امور کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ مثلاً امنِ عالم کا مسئلہ ہے۔ دنیا میں متضاد اور مخالف خیالات کے لوگ ہیں اور اسلام بتلاتا ہے کہ امن اسی صورت میں ممکن ہے جب ساری دنیا ایک ایسی ہستی کے تابع ہو جو سب کو امن دینے کا ارادہ رکھتی ہو اور وہی شخص حقیقی امن دینے والا قرار پائے گا جو ایسی ہستی کی طرف بلائے۔ ایسی شخصیت آنحضرت صلعم ہیں اور آپؐ کے ذریعہ

دنیا کو معلوم ہوا کہ خدا کا ایک نام امن دینے والا بھی ہے۔ (حشر ۵۹/۲۴)

پھر خدا تعالیٰ نے قیام امن کے ذرائع بھی بتائے ہیں۔ فرماتا ہے کہ ہم نے بیت اللہ کو مدرسہ بنایا ہے۔ یہاں چاروں طرف سے لوگ جمع ہوں گے اور امن کا سبق سیکھیں گے (بقرہ ۲/۱۲۶)

پھر خدا تعالیٰ نے امن کے لیے صرف مدرسہ نہیں بنایا۔ بلکہ امن کا کورس بھی مقرر کر دیا جو قرآن ہے اور مدرس امن یعنی آنحضرتؐ کو بھی بھیج دیا (دیکھیں مائدہ ۵/۱۶-۱۷) اس کے بعد وَ سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (نمل ۲۷/۶۰) کہکر بتا دیا کہ تمام لوگ جو آنحضرتؐ کی اتباع کرنے والے اور اس مدرسہ سے تعلیم حاصل کرنے والے ہیں ان کے لیے کامل امن ہے۔ پھر (زخرف ۴۳/۸۹-۹۰) میں بتایا کہ امن صرف مومنوں کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی ہے جنہوں نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا امن برباد کر دیا تھا اور جس کی طرف قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ میں اشارہ ہے کیونکہ اٰمَنَ کے معنے ایمان لانے کے علاوہ امن دینے کے بھی ہوتے ہیں پھر صرف آنحضرتؐ کو ہی ایسے لوگوں کے متعلق سَلٰمٌ کا حکم نہیں بلکہ تمام مومنوں کے متعلق فرماتا ہے وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان ۲۵/۶۴)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلامتی عارضی ہے یا مستقل تو اس کے متعلق فرماتا ہے وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (یونس ۱۰/۲۶) یعنی جس امر کی تعلیم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے دی ہے وہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ مرنے کے بعد وہ انسان کو ایسے جہان میں لے جائے گا جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے۔

پھر قرآن نے انعام ۶/۸۲ میں قیام امن کے دو گر بتائے ہیں۔ اوّل یہ کہ امن کے زیادہ مستحق وہی ہیں جو توحید کے قائل ہیں کیونکہ توحید کامل کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اخوت کا جو سبق توحید سے حاصل ہوتا اور ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر حقیقی توحید قائم ہو اور رب العالمین کی حمد سے انسان کی زبان تر ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی قوم کا کینہ اس کے دل میں رہے۔

قیام امن کے لیے دوسرا نکتہ "مالم ینزل بہ علیکم سلطانا" میں بیان فرمایا۔ کہ دنیا میں امن اسی وقت برباد ہوتا ہے جب انسان فطرتی مذہب کو چھوڑ کر بے دینی کی باتوں اور رسم و رواج کے پیچھے چل پڑتا ہے۔

امن کی اس تعلیم کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لڑائی بہر صورت بُری چیز ہے؟ اس کے جواب میں قرآن فرماتا ہے کہ بعض دفعہ خود قیام امن کے لیے جنگ ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بعض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بعض کی شرارتوں کو دور نہ کرتا تو لفسدت الارض (۲/۲۵۲) زمین میں فساد پھیل جاتا

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۴) شاید تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا۔ کہ وہ کیوں نہیں مومن ہوتے؟

مندرجہ بالا سے ثابت ہے کہ اسلام کس طرح اس مسئلہ کو بالتفصیل بیان فرماتا ہے باقی مذاہب اس کے متعلق خاموش ہیں اور انسان کی کوئی راہنمائی نہیں کرتے۔ بلکہ عیسائیت نے تو جو تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی آگے کر دے (متی ۵ ۳۹ تا ۴۲) یہ امن کو برباد کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین کی شناخت کا انحصار صرف ظاہری دلائل پر نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے اس نے ایک اور کتاب تیار کی ہوئی ہے جسے کِتَابٌ مَّکْنُوْنٌ (۵۶ / ۷۹) کہا جاتا ہے۔ کتاب مکنون سے مراد فطرت صحیحہ اور ضمیر ہے اور کتاب مبین خدا تعالیٰ کا تازہ الہام ہے اور کتاب مبین کی سچائی کا ثبوت یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کتاب مکنون کے مطابق ہو گویا یہ دونوں ایک ہی کتاب مطلق کے ٹکڑے ہیں۔ اور جب دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو کتاب مکنون کی صداقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن جس طرح بارش نہ ہونے پر کنوئیں کے پانی بھی سوکھنے لگتے ہیں اسی طرح کتاب مکنون اسی وقت تک کام دیتی ہے جب تک کتاب مبین کا پانی پستا رہے۔ جب کتاب مکنون کسی شخص کی اپنی جلا کی وجہ سے نمایاں ہونے لگتی ہے اور اس کا مالک اس کے مطابق اعمال بجا لا کر اسے اور مصفّٰی کر دیتا ہے تو معًا کتاب مبین یعنی الہام الٰہی اس پر نازل ہونے لگتا ہے اسی کی طرف آیت یَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (النور ۲۴ / ۳۶) میں اشارہ ہے۔ فطرت صحیح ہو تو وہ الہام کو کھینچ لیتی ہے اور الہام کی روشنی کسی کو نصیب ہو جائے تو اس کی فطرت کے صحیح جذبات اُبھر آتے ہیں۔ غرض عرفان نفس سے خدا ملتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کے کلام کے بغیر عرفان نفس بھی حاصل نہیں ہوتا۔

بَخَعَ کے معنے ہوتے ہیں اس طرح چھری پھیری کہ گردن کے پچھلے حصے تک پہنچ گئی۔ اس لئے اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بنی نوع انسان سے اتنی شدید محبت تھی۔ اور آپؐ ان کے ہدایت نہ پانے کو اس طرح محسوس فرما رہے تھے جس طرح جوش میں بھرا ہوا انسان آگے سے چھری پھیرنا شروع کرتا ہے تو گردن کے پچھلے حصے تک کاٹ جاتا ہے۔ دنیا میں خالی عقل نے کبھی زندگی نہیں پائی۔ زندگی ہمیشہ عشق اور جذبات نے پائی ہے۔ آنحضرت صلعم صرف عقل کے میدان میں ہی نہیں جذبات کے میدان میں بھی سب عاشقوں سے آگے نکل گئے تھے دنیوی حسن سے لوگوں کو عشق ہوتا ہے مگر وہ اس سے متمتع ہونے کے لیے ہوتا ہے مگر آنحضرت صلعم کا جو عشق لوگوں سے تھا وہ کسی فائدہ کی غرض سے نہ تھا اور پھر وہ ایک دو سے نہیں تھا بلکہ اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ جن لوگوں کی روحانی شکل دیکھ کر گھن آتی ہے آپؐ ان کے لئے

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝ (۵) اگر ہم چاہیں تو آسمان سے اُن پر ایک ایسا نشان اتار دیں کہ اس کے سامنے ان کی گردنیں جھکی کی جھکی رہ جائیں۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝ (۶) اور رحمان کی طرف سے کبھی کوئی نیا ذکر نہیں آتا۔ کہ جس سے لوگ اعراض نہ کرتے ہوں۔

بھی بے قرار رہتے تھے کہ کیوں وہ ہدایت نہیں پاتے۔ پھر آپ کا عشق اس زمانہ کے لوگوں ہی سے نہیں تھا بلکہ آئندہ آنے والوں سے بھی تھا جیسا کہ الجمعہ ۳/۶۲ میں اشارہ ہے پھر آپ کی محبت وقتی نہ تھی بلکہ آپ کے روح اور جسم کا ایک حصہ تھی یہاں تک کہ سکرات موت کے وقت بھی آپ کے اندر مسلمانوں اور کفار دونوں کی محبت جلوہ گر تھی۔ ایک طرف یہ غم تھا کہ یہود و نصاریٰ شرک کر کے اپنے لیے کیوں جہنم مول لے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ فکر تھی کہ یہی غلطی کہیں مسلمان بھی کریں۔ غرض حضرت مسیحؑ تو ایک دفعہ صلیب پر چڑھے مگر آنحضرتؐ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں لوگوں کے لیے صلیب پر چڑھے اور آپؐ نے ان کے لیے لاکھوں موتیں قبول کیں۔

اس آیت میں صرف آنحضرتؐ کی ایک بے مثال فضیلت اور آپؐ کی شفقت علی خلق اللہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہی بیان نہیں کیا گیا بلکہ مومنوں کو یہ نصیحت بھی کی گئی ہے۔ کہ اگر تم خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی قربانیوں کو اس حد تک پہنچاؤ کہ تمہاری گردن کٹنے کے قریب پہنچ جائے۔ اس مقام کے بغیر روحانی جماعتوں کو ابدی حیات حاصل نہیں ہو سکتی۔

۵ اَلْعُنُق کے معنے گردن کے علاوہ سرداران قوم اور لوگوں کی جماعت کے بھی ہیں۔ یہاں بتایا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو ایسے زبردست نشان ظاہر کرے کہ سرداران کفار بھی اور انکی جماعت بھی ایمان لانے پر مجبور ہو جائے۔ مگر جب تک نشانوں میں ایک حد تک اخفاء کا پہلو نہ ہو ایمان اجر کا مستحق نہیں رہتا۔ انعام تو قربانی کے نتیجہ میں ملتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ ایسے نشانات نہیں دکھاتا۔ صحابہؓ نے ایمان لانے کے لیے قربانیاں کیں اور بعد میں آنے والوں کو ایمان قائم رکھنے کے لیے قربانیاں کرنی پڑتی ہیں

۶ اس میں بتایا ہے کہ انکار تو سب انبیاء کا ہوتا رہا ہے۔ کبھی منکروں کو جبرًا مومن نہیں بنایا گیا اس لیے اگر خدا تعالیٰ اب جبر کرے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ ایک نبی کی طرفداری کرتا ہے۔

اس جگہ یہ مطلب نہیں کہ ہر نبی کوئی نیا پیغام لاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دنیا اس پیغام کو بھول چکی ہوتی ہے

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَأْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا (۷) سو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے اسکے
مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ نتیجہ میں ان کے استہزاء کی حقیقت ضرور ان پر کھل جائیگی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ (۸) کیا وہ زمین کو نہیں دیکھتے۔ کہ ہم نے اس میں قسم قسم
اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ کے عمدہ جوڑے بنائے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ (۹) اس میں ایک بڑا نشان ہے۔ مگر ان میں سے اکثر
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ایمان نہیں لاتے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ (۱۰) اور تیرا رب ہی یقیناً غالب (اور) بار بار رحم
الرَّحِيْمُ ۝ع کرنے والا ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى (۱۱) اور (یاد کر) جب کہ تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا تھا۔
اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (اور کہا تھا) کہ ظالم قوم یعنی فرعون کی قوم کے پاس
قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝ جا (اور ان سے کہہ کہ) کیا وہ تقویٰ نہیں کرتے؟

اور اس سے ایسی بیگانہ ہو چکی ہوتی ہے کہ اسے ایک نئی چیز سمجھنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو پہلے انبیاء بھی توحید ہی کو پیش کرتے آئے ہیں مگر جب آنحضرتؐ نے توحید کو پیش کیا تو لوگوں نے حیران ہو کر اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص ۳۸ پ ۲۳) کہنا شروع کر دیا۔

ک سورۃ فرقان کے آخر میں تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے حضور گریہ و زاری نہیں کرو گے تو وہ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ گویا انہیں عذاب کی خبر دی گئی تھی جس پر کفار نے ہنسی اڑاتی اور آنحضرتؐ صلعم کے پیغام سے اعراض کیا۔ اس لیے فرماتا ہے کہ جن امور کے متعلق یہ ہنسی اڑاتے تھے ان کے متعلق اب ہماری خبریں ان کے سامنے پوری ہو جائیں گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے رسولؐ نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔

نباء عظیم الشان خبر کو کہتے ہیں اور چونکہ غلبہ اسلام سے بڑی اور کوئی خبر نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس جگہ النباء میں انہی خبروں کی طرف اشارہ ہے جو غلبہ اسلام کے متعلق قرآن میں دی گئی تھیں چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ خبریں پوری ہو گئیں۔

۸ اس میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ نیک کا جوڑا نیک اور بد کا بد پس آنحضرتؐ کے وجود کے لئے خدا تعالیٰ نے پاک جوڑے بنائے ہیں (یعنی صحابہ کرامؓ) شقی القلب لوگوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان کا انکار کرتے۔

۱۲-۱۱ اس ذکر سے یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ جس خدا نے فرعون کی قوم کے لیے ہدایت کا سامان مہیا کیا تھا

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ (۱۳) اس نے (جواب میں) کہا۔ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ
یُّكَذِّبُوْنِ ؕ وہ میری تکذیب نہ کریں۔
وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ (۱۴) اور میرا سینہ تنگی محسوس کرتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح)
لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ؕ چلتی نہیں پس (میرے ساتھ) ہارون کو بھی مبعوث کر۔

وہ مکہ والوں کے لیے کیوں نہ کرتا۔ قوم فرعون کے لیے تو کسی پہلے نبی کی دعا موجود نہیں تھی لیکن مکہ والوں کے لیے ابراہیمؑ کی دعا (بقرہ) اور نسل اسمٰعیل سے انعامات کا وعدہ موجود تھا (پیدائش ۱۲/۲۰ تا ۲۲) اور پھر موسیٰؑ کو کہا گیا تھا۔ کہ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ (استثنا ۱۸/۱۵ تا ۲۰)

افکار کی صفائی یعنی تنویر، دماغ کی صفائی سے حاصل ہوتی ہے اور تنویر کے معنے فقط صحیح خیال کے پیدا ہو جانے کے نہیں بلکہ ایسے ملکہ کے پیدا ہو جانے کے ہیں کہ ہمیشہ صحیح خیالات ہی پیدا ہوتے رہیں۔ اور تنویر کے جو معنے دماغ کی نسبت سے ہیں وہی تقویٰ کے دل کی نسبت سے ہیں اس کی تائید آنحضرت صلعم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے" یعنی میرے دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے وہ نیک ہی ہوتا ہے۔ پس حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف تقوی اللہ کا پیغام لائے تھے تاکہ نہ صرف ان کے افکار و جذبات درست ہو جائیں بلکہ آئندہ ان کے دلوں میں صرف نیک خیال ہی پیدا ہوں۔ تمام انبیاء نے اس پر زور دیا ہے اور اسلام نے بھی ادھر توجہ دلائی ہے کیونکہ روحانی علوم دل پر نازل ہوتے ہیں اور دل پاک نہ ہو تو انسان الٰہی فیضان سے محروم رہتا ہے۔

۲۶/۱۴ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ۔ رحم کی وجہ سے موسیٰؑ کا دل ڈرا کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو الٰہی گرفت میں آ جائیں گے۔ موسیٰؑ کو تو اپنی قوم سے صرف اتنی محبت تھی کہ ان کا کفر دیکھ کر آپ کا سینہ تنگی محسوس کرتا تھا۔ مگر آنحضرتؐ کو قوم کا اتنا درد تھا کہ صدمہ سے آپؐ کی جان نکل رہی تھی (آیت ۴)

پھر حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میری تو زبان بھی نہیں چلتی لیکن ہارونؑ مجھ سے فصیح البیان ہے۔ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ یقیناً فصیح البیان تھے اور ان کی زبان میں کوئی خلقی نقص نہیں تھا۔ ہاں وہ اپنے آپ کو فصاحت میں حضرت ہارون سے کم درجہ پر سمجھتے تھے۔ مگر جب آپ فرعون کے سامنے گئے تو خدا کا ایسا فضل ہوا کہ آپؑ نے ہارونؑ کو ایک لفظ بھی بولنے نہ دیا اور آپؑ کی فصاحت اور دلائل کی فرعون پر ایسی دھاک بیٹھی کہ اس نے سمجھا کہ آپ کے مقابلہ کے لیے کوئی اجتماعی پروگرام مرتب کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی اخلاص سے احمدی ہوتا ہے تو باوجود اس کے کہ بعض دفعہ وہ اَن پڑھ

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ (۱۵) اور (یہ بات بھی ہے کہ) ان لوگوں کا میرے خلاف ایک الزام بھی ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ (۱۶) فرمایا ہرگز نہیں پس (ہمارا حکم سنکر تم) دونوں ہماری آیتیں لیکر (چلے) جاؤ ہم تمہارے (اور تمہارے ساتھیوں کے) ساتھ ہونگے اور (تمہاری دعاؤں کو) سنتے رہینگے

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۷) پس فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین (خدا) کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (۱۸) (اس حکم کے ساتھ) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے۔

اور جاہل ہوتا ہے اس کی زبان اس طرح کھل جاتی ہے کہ بڑے بڑے مولوی اس کی بات سُنکر گھبرانے اور کترانے لگتے ہیں۔

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ سے موسیٰؑ کی یہ مراد نہیں تھی کہ مجھے رسول دینا۔ انہوں نے ہارونؑ کو صرف بطور مددگار مانگا تھا۔ دیکھیں (طٰہٰ $\frac{۲۰}{۳۳}$) اور یہ اس لیے تھا کہ وہ انکساری کی وجہ سے گھبراتے تھے کہ شاید یہ ذمہ داری ادا کر بھی سکوں گا یا نہیں جیسے آنحضرتؐ کو جب فرشتہ نے کہا۔ اقرأ تو آپؐ نے فرمایا ما انا بقارئ مگر آپؐ کا عرفان چونکہ موسیٰؑ سے زیادہ تھا جب آپؐ نے دیکھا کہ الٰہی منشاء یہی ہے کہ مجھے آگے بڑھنا چاہیئے تو آپؐ نے مددگار نہیں مانگا بلکہ اکیلے ہی یہ بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے حالانکہ موسیٰؑ ایک متمدن قوم کی طرف آئے تھے اور آپؐ نہایت درجہ اُجڈ قوم کی طرف۔

۱۵-۱۶ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ۔ یہ ڈر اس وجہ سے نہیں تھا کہ موسیٰؑ کو اپنی جان کی فکر تھی۔ بلکہ اس لیے تھا کہ کہیں آپ اپنے فرائض کی بجا آوری سے پہلے ہی قتل نہ کر دیئے جائیں۔ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا فعل محض ایک اتفاقی حادثہ تھا کیونکہ ذَنْبٌ کے معنے ایسے فعل کے ہوتے ہیں جس کا نتیجہ خراب نکلے خواہ وہ انسان کو شرعی مجرم بنانے والا نہ ہو۔ مگر اس سے اتنا پتہ لگتا ہے خواہ وہ جھوٹا ہی تھا موسیٰؑ پر ان کی بعثت سے قبل ایک الزام لگایا گیا تھا۔ مگر آنحضرتؐ قبل از بعثت بھی امین اور صدوق مشہور تھے۔

آنحضرتؐ کی موسیٰؑ پر اس جگہ بھی فضیلت ظاہر ہے کیونکہ موسیٰؑ نے پہلے خدا تعالےٰ سے اپنی حفاظت کا وعدہ لیا مگر آنحضرتؐ بغیر کچھ بولے کھڑے ہو گئے اور آپؐ نے خدا کی راہ میں کسی تکلیف کی پرواہ نہیں کی۔

۱۷-۱۸ ان آیات سے پتہ لگتا ہے کہ موسیٰؑ کا بڑا کام بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانا تھا چنانچہ جب بنی اسرائیل مصر سے چلے گئے تو آپؐ کا مصریوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ (۱۹) اس (پر فرعون) نے کہا (اے موسیٰؑ) کیا ہم نے تجھ کو اس وقت نہیں پالا جبکہ تو ابھی بچہ تھا۔ اور تو نے ہم میں اپنی عمر کے بہت سے سال گذارے ہیں۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۰) اور تو نے وہ کام بھی کیا ہے جو تو کر چکا ہے اور تو ہمارے (احسانوں کا) ناشکر گذار ہے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ (۲۱) (موسیٰؑ نے) کہا وہ کام (جس کا تو نے اشارہ کیا ہے) میں نے اس وقت کیا تھا جبکہ حقیقت مجھے معلوم نہ تھی۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پر بعض نے اعتراض کیا ہے کہ یہاں موسےٰؑ اور ہارونؑ دونوں کا ذکر ہے اس لیے رسول کی جگہ رسولان چاہیئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کبھی ھٰذٰان رسولی استعمال کر لیتے ہیں (فتح البیان جلد ۶ صفحہ ۱۳ قرآن میں دوسری جگہ بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے مثلاً شعراء ع میں ابراہیمؑ نے کہا یہ سب میرے عدو ہیں حالانکہ عام انداز کے لحاظ سے اعداء کا لفظ چاہیئے تھا۔

اِنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ - بائیبل کہتی ہے کہ خدا تعالےٰ نے موسیٰؑ کو کہا ایسے لوگ جانے نہیں دے گا تو فرعون سے کہہ بنی اسرائیل کو تین دن کی منزل تک بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خدا وند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں (خروج باب ۱۳/۱۸) گویا دھوکہ کی تعلیم دی۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے موسیٰؑ کو کہا کہ جاتے ہی اپنا اصل مقصد کہ ہم بنی اسرائیل کو لینے آئے ہیں بیان کر دینا۔

یہاں اَنْ تفسیری بھی ہو سکتا ہے اور مصدری بھی۔ مصدری کی صورت میں یہ معنے ہونگے کہ ہم خدا تعالےٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ موسےٰؑ ایک مختص القوم نبی تھے لیکن محمد رسول اللہ صلعم کو یہ فضیلت دی گئی کہ آپ تمام دُنیا کی طرف مبعوث ہوئے (سبا ع ۲۹) اور باوجود اس کے کہ آپؐ کے پاس کوئی ایسے سامان نہیں تھے جن کے ذریعہ آپ اپنا پیغام دنیا کے تمام ممالک میں پہنچا سکتے مگر خدا تعالےٰ نے آپ کے دین کو ہر جگہ پھیلایا اور آپؐ کو قبولیت بخشی۔

ف ۱۹ فرعون نے موسیٰؑ کو ان کی ابتدائی کس مپرسی یاد دلا کر کہا کہ تم مجھے کیا نصیحت کر سکتے ہو تمہاری تو خود ہمارے خاندان نے پرورش کی ہے۔ حالانکہ دنیا میں کبھی کسی چیز کی ابتداء کو نہیں دیکھا جاتا انتہاء پر نظر ڈالی جاتی ہے

غرض فرعون اس وقت بھول گیا کہ خدا تعالےٰ اپنے نبیوں کو دشمنوں کے زیر سایہ ہی ترقی عطا کیا کرتا ہے (دیکھیں سورۃ نیل نوٹ ۲)۔

ف ۲۰ اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے قبطی قوم کا ایک آدمی مارا

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

(۲۱) پس اسکے نتیجہ میں جب مجھے تم سے ڈر محسوس ہوا - تو میں تم سے بھاگ کر چلا گیا ۔ اس پر میرے رب نے مجھے حکم (یعنی عہدۂ نبوت) عطا فرمایا اور مجھے رسولوں میں سے (ایک رسول) بنا دیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

(۲۲) اور (یہ بچپن میں مجھے پالنے کی) نعمت جس کا تم احسان جتاتے ہو کیا یہ اس بات کے مقابل میں پیش کی جاتی ہے کہ تم نے بنی اسرائیل کی ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

(۲۳) اس پر فرعون نے اثر مندہ ہو کر اور بات پھیرنے کے لئے) کہا یہ رب العالمین کون ہے؟ (جسکی طرف سے آنا تم بیان کرتے ہو)

قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ ۝

(۲۵) (موسیٰ نے) کہا آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا رب - اگر تم میں یقین کرنے کی خواہش ہے۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ۝

(۲۶) اس (یعنی فرعون نے) اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کہا کیا تم سنتے نہیں (کہ موسیٰ کیا کہتا ہے)

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۝

(۲۷) (موسیٰ نے اپنے پہلے بیان کی تشریح کرتے ہوئے) جواب دیا وہی جو تمہارا رب بھی ہے اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا بھی رب تھا

قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي

(۲۸) (اس پر فرعون) بولا (اے لوگو!) تمہارا وہ رسول جو تمہاری

گیا تھا۔ انت من الکفرین سے یہ مراد نہیں کہ تو کافروں میں سے ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو سخت ناشکرا نکلا کہ تو نے ایک محسن قوم کا آدمی مار ڈالا۔

۲۱ حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ جب میں نے دیکھا کہ ایک دشمن قوم کا فرد میری قوم کے ایک آدمی کو بلا وجہ مار رہا ہے تو مجھے اسکی مظلومیت کی وجہ سے جوش آگیا اور میں نے ظالم کا مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں وہ نادانستہ طور پر ہلاک ہو گیا اس لیے میں مجرم نہیں۔

۲۲ یعنی گو دانستہ طور پر نہیں مگر چونکہ حاکم قوم کا ایک فرد مارا گیا تھا مجھے ڈر پیدا ہوا کہ میرے معاملہ میں انصاف سے کام نہیں لیا جائے گا اس لیے میں تمہارے ملک سے بھاگ گیا۔ مگر میرے رب نے جو میرے دلی خیالات کو جانتا تھا مجھے بری قرار دے کر نبی بنا دیا۔

۲۳ یعنی تم اپنے باپ رعمسیس کے زمانہ سے سارے بنی اسرائیل پر ظلم ڈھا رہے ہو کیا یہ بات کہ اس قوم کا ایک بچہ تمہارے گھر میں پلا اس کا جواز ہو سکتی ہے؟

یاد رہے کہ حضرت موسیٰ کو جس فرعون نے پالا تھا وہ رعمسیس تھا مگر دعویٰ نبوت کے بعد آپ جس فرعون کے پاس گئے وہ اس کا بیٹا منفتاح تھا جو اپنے باپ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتا تھا

اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ طرف بھیجا گیا ہے ضرور پاگل ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۹) موسیٰ نے سمجھ لیا کہ وہ بات ٹلانا چاہتا ہے وں کہا (رب العالمین) وہی ہے جو مشرق کا بھی رب ہے، اور مغرب کا بھی (رب ہے)، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (ان کا بھی رب ہے) بشرطیکہ تم عقل سے کام لو

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ۝ (۳۰) اس پر، فرعون نے (طیش میں آکر) کہا۔ اگر میرے سوا تو نے کوئی اور معبود بنایا تو میں تجھے قید کر دونگا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۳۱) اس (یعنی موسیٰ) نے کہا۔ کیا اس صورت میں بھی کہ میں کوئی (حقیقت حال کی کھول دینے والی چیز تیرے پاس لے آؤں (یعنی معجزہ)

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۳۲) اس پر اس (یعنی فرعون) نے کہا۔ اگر تو سچا ہے تو لے بھی آ۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۳۳) پس اس (یعنی موسیٰ) نے اپنا عصا زمین پر دھر دیا تو اچانک (اہل فرعون نے دیکھا کہ) وہ ایک صاف صاف نظر آنیوالا اژدہا ہے۔

وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ (۳۴) اور اس نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل سے) نکالا تو سب دیکھنے والوں نے اچانک دیکھا کہ وہ بالکل سفید ہے۔ ع

۲۴-۲۸ پاگل چونکہ بسا اوقات ایسے جوش سے کام کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتا ہے اس لیے جب لوگ انبیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ کی رَو کے بالکل خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور اپنے مقصد کے پورا کرنے میں انہیں ہلاکت کی بھی پرواہ نہیں تو وہ انہیں مجنون کہنے لگ جاتے ہیں۔

چنانچہ جب موسیٰؑ نے فرعون کو کہا کہ اگر آسمان و زمین کے بنانے والے کو تم نہیں سمجھتے تو پھر یہی دلیل سمجھ لو کہ جس نے تمہاری اور تمہارے باپ دادوں کی پرورش کی تھی۔ وہ رب العالمین ہے فرعون اس دلیل کی طاقت سے جھنجلا اٹھا اور گالیوں پر اُتر آیا۔

۲۹-۳۰ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو مجنون کہکر بات کا رُخ بدلنا چاہا۔ مگر انہوں نے اصل موضوع جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ فرعون مصر والوں کو پال رہا ہے تو وہ باقی لوگ جو مشرق و مغرب میں رہ رہے ہیں۔ انہیں کون پال رہا ہے جو سب کو پالتا ہے وہی رب العالمین ہے۔ اس پر فرعون کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اور اس نے حضرت موسیٰؑ کو قید کی دھمکی دی۔

۳۱-۳۴ عصائے موسیٰؑ کا سانپ بن جانا اور آپؑ کے ہاتھ کا لوگوں کو چمکتا ہوا نظر آنا بھی ایک کشفی نظارہ تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو بھی دکھا دیا۔ اور یہ ثابت شدہ

حقیقت ہے کہ بعض دفعہ کشفی نظارے وسیع کر کے صاحب کشف کے علاوہ دوسروں کو بھی دکھا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً شق القمر کے کشفی نظارہ میں دوسروں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔

(۱) ایک دفعہ جبرائیلؑ نے آ کر آنحضرتؐ سے ایمان اور ارکان اسلام کے متعلق کچھ سوال کیے اور صحابہؓ نے بھی ان کو دیکھا (ترمذی جلد ۲۔ ابواب الایمان)

(۲) جنگ بدر کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لیے جو ملائکہ بھیجے وہ مسلمانوں نے بھی دیکھے اور کفار نے بھی۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۴ صفحہ ۴۹ و تفسیر فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۱۰۳)

(۳) اسی طرح آنحضرتؐ کے بچپن میں جب ایک فرشتہ نے آپؐ کا سینہ چاک کر کے آپؐ کا قلب مبارک دھویا تو یہ نظارہ آپ کے رضاعی بھائی نے بھی دیکھا۔

(۴) ایک دفعہ آنحضرتؐ نے کشف میں دیکھا کہ خزاعہ کے لوگ کفار کی بدعہدی کی شکایت کر کے آپؐ کی مدد مانگ رہے ہیں اور آپ نے کشف میں لبیک اور نصرت کہا۔ یہ الفاظ آپؐ کی زوجہ مبارکہ حضرت میمونہؓ نے بھی سنے۔

(۵) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ خطبہ دیتے دیتے کشف میں دیکھا کہ اسلامی جرنیل معاویہ دشمن سے لڑ رہا ہے اور دشمن کا پلہ بھاری ہے اس لیے آپؓ نے اسی وقت کہا یا معاویۃ الی الجبل "اے معاویہ پہاڑ کی طرف ہو جاؤ۔" یہ الفاظ ادھر خطبہ سننے والوں نے سنا اور ادھر حضرت معاویہؓ نے سنکر ان پر عمل کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں فتح حاصل ہو گئی۔ (تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۲۴۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ سینکڑوں میل دور رہنے والے بھی کشفی نظارے میں شامل کر لیے جاتے ہیں۔

اسی طرح بعض اور اولیاء کی بھی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں اور اس زمانہ میں حضرت مسیح موعودؑ کو جو سرخی کے چھینٹوں والا کشف دکھایا گیا اس میں حضرت عبداللہ سنوری کو بھی شامل کر لیا گیا۔ رؤیا و کشوف میں بعض دفعہ دوسروں کا شریک کر لیا جانا ایسا قطعی امر ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ نے لکھا ہے "اگر کوئی طالب حق نیت کی صفائی سے ایک مدت تک میرے پاس رہے اور حضرت مسیحؑ کو کشفی حالت میں دیکھنا چاہے تو میری توجہ اور دعا کی برکت سے وہ ان کو دیکھ سکتا ہے" (تحفہ قیصریہ صفحہ ۲۱) ایک دفعہ آنحضرتؐ نے ابوجہل کے گھر جا کر اسے ایک شخص کا قرضہ واپس کرنے کو کہا تو اس نے دیکھا آپ کے دائیں بائیں دو مست اونٹ کھڑے ہیں اور اگر اس نے انکار کیا تو اسے کھا جائینگے

حضرت مسیح موعودؑ کا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے ایک دفعہ علم توجہ کے ایک ماہر نے آپ پر مسمریزم کرنا چاہا۔ مگر جب وہ توجہ کرتا اسے معلوم ہوتا کہ ایک شیر اس پر حملہ کرنے لگا ہے اسی طرح جب آپؑ نے عبداللہ آتھم کے متعلق پیشگوئی فرمائی کہ وہ ۱۵ ماہ کے اندر ہاویہ میں گرایا جائے گا تو اسے کبھی سانپ نظر آتے اور کبھی برچھیوں والے آدمی اس پر حملہ کرتے دکھائی دیتے۔

جس طرح ابوجہل کو دوست اونٹ اور ایک ماہر علم تعبیر کو شیر حملہ کرتا ہوا دکھائی دیا اسی طرح فرعون کو موسٰےؑ کا عصا ایک اژدہا کی صورت میں نظر آیا۔ اور گو اس نے اُسے ظاہری واقعہ سمجھا۔ مگر اس کی تعبیر یہ تھی کہ موسٰےؑ کی جماعت ایک دن اس کے سارے لاؤ لشکر کو اژدہا بن کر کھا جائے گی۔ اور موسٰیؑ کو غلبہ حاصل ہو جائے گا چنانچہ اگر کوئی رؤیا میں دیکھے کہ اژدہا اس کے قبضہ میں آگیا ہے۔ تو اس کی تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اسے غلبہ حاصل ہوگا (تعطیر الانام) اسی طرح اس کشف میں فرعون کو توجہ دلائی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کا موسٰےؑ کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ فرعونی اخلاق سیکھ کر سانپ بن جائیں گے اور مضبوط جماعت نہیں بن سکیں گے۔

عصاء موسٰےؑ کے متعلق اعراف $\frac{۱۴}{۱۰۷}$ اور تفسیر زیر آیت ہٰذا میں ثعبان اور سورۃ $\frac{۲۰}{۲۱}$ میں حیّۃ اور نمل $\frac{۲۷}{۱۰}$ ور قصص $\frac{۲۸}{۳۱}$ میں جان کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر فرعون کے دربار میں جب حضرت موسٰیؑ نے عصا پھینکا اور وہ اژدہا بن گیا تو اس واقعہ کے متعلق قرآن نے ہر جگہ صرف ثعبان کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے اس بارے میں اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حیّۃ کو دوسرے مقام پر جانّ کیوں کہا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ سورۃ نمل اور قصص دونوں جگہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ جانّ تھا بلکہ یہ کہا ہے کہ تَھْتَزُّ کَاَنَّھَا جَانٌّ یعنی گو وہ تھا تو بڑا سانپ مگر چلتا اس طرح تھا جس طرح چھوٹا سانپ چلا کرتا ہے۔

دوسرا نشان ید بیضا کا تھا اس میں یہ اشارہ تھا کہ موسٰیؑ کے ہاتھ پر بڑے تغیرات مقدر ہیں مگر وہ تغیرات کسی ظلم یا مکر و فریب کے نتیجہ میں نہیں ہوں گے بلکہ تائید الٰہی ان کا باعث ہوگی۔ اور وہ روحانی سلسلہ جس کی اس کے ہاتھ سے بنیاد رکھی جا رہی ہے ایک دن دنیا کو روشن کر دیگا (دیکھیں طٰہٰ $\frac{۲۳}{۱}$)

یہ محض ایک وسوسہ ہے کہ انسان کے جسم سے ایسی شعاعیں کیسے نکل سکتی ہیں جو دوسروں کو بھی نظر آجائیں کیونکہ یہ ایک کشف تھا اور کشفی نگاہ رکھنے والوں نے اس زمانہ میں بھی الٰہی نور کو ظاہری شکل میں متمثل دیکھا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۶ء میں شیخ رحمت اللہ صاحب اور ان کے ایک ساتھی نے دیکھا تھا کہ ایک نور کا ستون حضرت مسیح موعودؑ کے سر سے نکل کر آسمان تک جا رہا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح موعودؑ نے لکھا ہے ”روزہ کے عجائبات میں سے وہ عجیب مکاشفات ہیں جو اس زمانہ میں میرے پر کھلے ...... انوار روحانی تمثیلی طور پر برنگ ستون ...... نظر آتے تھے۔ (کتاب البریہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۶)

اسی طرح ایک دفعہ آپؑ نے رؤیا میں دیکھا کہ آنحضرتؐ کی پیشانی مبارک سورج کی طرح چمک رہی ہے (تذکرہ صفحہ ۳۴) اور حوالوں کے لیے دیکھیں تذکرہ صفحہ ۲۹۵ اور الحکم مورخہ ۲۸ فروری سنہ ۱۹۰۳ء خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کو بھی الٰہی نور بعض دفعہ تمثیل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

اسی طرح آپ لکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک شخص میرے ساتھ بات کرتا ہے۔ اور میری روح اس کی روح سے ٹکرا کر معلوم کر لیتی ہے کہ یہ منافق کی روح ہے۔ بعض دفعہ تو انسان کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔ جو اس کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اور کبھی اس کے اندر سے باریک شعاعیں نکل کر دوسروں کے قلوب پر پڑتی ہیں اور وہ چیز جسے وہ مخفی سمجھ رہا ہوتا ہے دوسرے پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

بائیبل نے ید بیضاء والے معجزہ کا ذکر نہیں کیا۔ مگر بائیبل سے ثابت ہے کہ ایسا نشان موسیٰؑ نے دکھایا ضرور تھا۔ چنانچہ بائیبل (خروج ۴/۱-۹) میں عصا کے اور ہاتھ کے سفید ہونے کا ذکر کرنے کے بعد آیت ۸ میں لکھا ہے اگر وہ پہلے معجزہ کو بھی نہ مانیں تو دوسرے معجزہ سے یقین کرینگے چونکہ فرعون عصا کا معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لایا ظاہر ہے کہ دوسرا معجزہ اسے ضرور دکھایا گیا ہوگا۔

عصا کا معجزہ بائیبل نے ہارونؑ کی طرف منسوب کیا ہے مگر خروج ۴/۲ تا ۴ اور ۴/۹ سے ثابت ہے کہ عصا کے متعلق سب بات موسیٰؑ سے ہی ہوئی تھی۔ انہی کی لاٹھی سانپ بنی اور انہی سے کہا گیا کہ اگر فرعون پہلے معجزہ سے ایمان نہ لایا تو دوسرے سے لائے گا۔ پس یہ ممکن نہیں تھا کہ فرعون کے دربار میں موسیٰؑ کی جگہ ہارونؑ اپنا عصا پھینک دیتے اسلئے قرآنی بیان ہی صحیح ہے۔

بے شک موسیٰؑ کا عصا بڑے بھاری نشانات کا حامل تھا۔ مگر موسیٰؑ کی وفات کے ساتھ ہی اس کی نشان نمائی ختم ہو گئی۔ مگر آنحضرتؐ کو قرآن کی شکل میں وہ عصا دیا گیا۔ جو آج بھی کفر کے سر کو کچل رہا ہے اور قیامت تک شیطان کی پھیلائی ہوئی رسیوں کو نگلتا جائے گا۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے قرآن کو ایک کامیاب ہتھیار قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو جاھدھم بہ جھادا کبیرا (فرقان ۱۸/۵۳) کا حکم دیا ہے اور اس زمانہ میں حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ بتلایا ہے کہ مسلمانوں کو فتح بموں سے نہیں قرآن سے ملے گی۔

حضرت موسیٰؑ کا دوسرا نشان یہ تھا کہ آپ کا ہاتھ سفید دکھائی دیا۔ مگر آنحضرتؐ کو خدا تعالیٰ نے سراپا نور قرار دیا ہے (نساء ۴/۱۷۵ اور مائدہ ۵/۱۶) اور یہ فرق اس لیے تھا کہ موسیٰؑ مختص القوم نبی تھے اور آنحضرت صلعم ساری دنیا کی طرف آئے تھے۔ پھر موسیٰؑ کا ہاتھ تو بے شک نورانی دکھائی دیا مگر پھر بھی وہ موسیٰؑ ہی کا ہاتھ تھا۔ مگر آنحضرتؐ کے ہاتھ کو خدا تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا (فتح ۴۸/۱۱ انفال ۸/۱۸)

پھر اگر ہاتھ کی سفیدی سے یہ اشارہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قوم کو روحانی پاکیزگی بخشیگا اور وہ دین کے لیے قربانیاں کرنے والے ہوں گے تو اس پہلو سے بھی آنحضرت صلعم کو موسیٰؑ پر نمایاں فضیلت دی گئی ہے۔ چنانچہ قوم موسیٰؑ نے تو کنعان میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور موسیٰؑ کو کہا کہ جا تو اور تیرا خدا لڑو ہم تو یہیں بیٹھیں گے (مائدہ ۵/۲۵) مگر صحابہؓ نے آنحضرتؐ کو کہا ہم آپ کے آگے

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ

(۳۵) اس پر فرعون نے اپنے ارد گرد کے سرداروں سے کہا یہ تو کوئی بڑا واقف کار جادوگر ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ○

(۳۶) یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعہ سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ پس بتاؤ تم کیا مشورہ دیتے ہو؟

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ

(۳۷) انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی کو (کچھ دن) ڈھیل دے اور مختلف شہروں کی طرف آدمی بھجوا جو (قابل) آدمیوں کو جمع کر لیں۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ○

(۳۸) (اور) ہر بڑے جادوگر اور بڑے جاننے والے کو تیرے پاس لے آئیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ

(۳۹) اس پر سب جادوگر ایک معلوم دن پر جمع کئے گئے۔

وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ

(۴۰) اور لوگوں سے کہا گیا کیا تم سب (ایک مقصد پر) اکٹھے ہونے کے لیے تیار ہو کہ نہیں)

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○

(۴۱) تا اگر جادوگر غالب ہو جائیں۔ تو ہم ان کے کہنے پر چلیں۔

بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے۔ اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گذرے اور پھر انہوں نے ایسا کر بھی دکھایا۔ چنانچہ میور لکھتا ہے کہ غزوہ احزاب میں کفار کو شکست ہوئی اس لیے کہ وہ خندق گذر کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خیمہ پر حملہ کر دیتے تھے۔ مگر صحابہ آپ پر ایسے فدا تھے کہ دیوانوں کی طرح مقابلہ کرنے لگ جاتے تھے اس لیے دشمن شکست کھانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

۳۵-۳۶ دینی علوم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے فرعون نے عصا اور ید بیضا کا نشان دیکھا تو انہیں کشف سمجھنے کی بجائے جادو سمجھا۔ اور اس کے پیچھے یہ غرض نکالی کہ موسٰیؑ ہم کو ملک سے نکالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو بنی اسرائیل کو نکالنا چاہتے تھے وہ ان کے مخالفوں کو ساتھ نکالنے کے آرزومند کیسے ہو سکتے تھے۔

۳۷-۴۱ حضرت موسٰیؑ کے مقابلہ میں ان کا ساحروں کو بلانا بتاتا ہے کہ انبیاء کی ابتدائی حالت کتنی کمزور ہوتی ہے مگر کجا وہ حالت اور کجا یہ حالت کہ آج قوم موسٰیؑ کی پیٹھ پر سامریکہ جیسی طاقت ہے۔

۴۱ اس سے ظاہر ہے کہ کفار کے دل چونکہ خشیت الٰہی سے خالی ہوتے ہیں اس لیے وہ نبی کو ماننے کو کسی صورت

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝

(۴۱) پس جب جادوگر آ گئے۔ تو انہوں نے فرعون سے کہا۔ کہ اگر ہم غالب ہوئے۔ تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا؟

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝

(۴۲) (فرعون نے) کہا۔ ہاں! بلکہ اس صورت میں تم دربار میں مقربین میں جگہ پاؤ گے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝

(۴۳) اس پر موسےٰؑ نے ان سے کہا۔ جو تدبیر تم نے کرنی ہے کر لو۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

(۴۴) اس پر انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنے سونٹے میدان میں نکال کر، رکھ دیئے۔ اور کہا۔ فرعون کے اقبال کی قسم! ہم ضرور غالب آئیں گے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ۚۖ

(۴۶) تب موسےٰؑ نے بھی اپنا عصا دے مارا تو اچانک وہ ان کے جھوٹوں کو ملیامیٹ کرنے لگا۔

فَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ۙ

(۴۷) تب جادوگر (خدا کے سامنے) سجدہ میں گرا دیئے گئے۔

میں تیار نہیں ہوتے لیکن اس کے مخالف کی کسی ذرا سی کامیابی پر اس کے پیچھے چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ فرعونیوں کی اسی ذہنیت کی طرف $\frac{۱۱}{۹۸-۹۷}$ میں اشارہ ہے۔

سورۃ ۴۱-۴۲ ؎ اوپر کی باتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت موسےٰؑ اپنا اور ساری دنیا کا پالنے والا صرف خدا کو سمجھتے تھے مگر درباریوں نے آتے ہی فرعون سے انعام کا مطالبہ کر لیا۔ اس سے نبی اور غیر نبی کی طبیعتوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اعراف $\frac{۷}{۱۱۴}$ میں ساحروں کا قول اس طرح درج ہے کہ ہمیں ضرور انعام ملے گا۔ مگر یہاں الفاظ سوالیہ ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ بعض دفعہ سوالیہ فقرہ توقع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۴۳-۴۵ ؎ اعراف $\frac{۷}{۱۱۶}$ میں لکھا ہے کہ حواریوں نے موسےٰؑ سے پوچھا کہ پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم پھینکیں یہاں اس کا ذکر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں حواریوں کا یہ یقین ظاہر کیا گیا تھا کہ ہمیں ضرور اجر ملے گا مگر یہاں صرف امید کا اظہار ہے اس لیے صرف موسےٰؑ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ میری نسبت پھر دیکھا جائے گا پہلے تم اپنی امید پوری کر لو۔

عرب میں قومداری نہیں ہوتے تھے۔ پھر درباریوں کے یہ الفاظ کہ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ضرور غالب آجائیں گے آنحضرتؐ کو کیسے معلوم ہو سکتے تھے اس لیے ان کا ذکر قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ فقرہ (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ نے بنا لیا تھا پھر بھی یہ آپ کے کمال کا مظہر ہے

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝ (۴۸) (اور) انہوں نے کہا ہم رب العالمین پر جو موسٰے اور ہارون (۴۹) کا رب ہے ایمان لاتے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۚ۬ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (۵۰) اس پر وہ (یعنی فرعون جھنجلا کر) بولا کہ کیا میرے حکم دینے سے پہلے تم ایمان لے آئے ہو؟ یہ شخص یقیناً تمہارا کوئی سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے پس عنقریب تم (اپنا انجام) معلوم کر لوگے میں تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو (اپنی) خلاف ورزی کی وجہ سے کاٹ دونگا اور تم سب کو صلیب پر لٹکا دونگا۔

قَالُوْا لَا ضَیْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ (۵۱) انہوں نے کہا (اس میں) کوئی حرج نہیں آخر کار ہم اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ؕ (۵۲) ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے گناہ اس وجہ سے معاف کر دیگا کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے بن گئے۔

ع

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ (۵۳) اور ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِیْنَ ۝ (۵۴) اس پر فرعون نے شہروں کی طرف جمع کرنے والے آدمی بھجوائے۔

کیونکہ یہ بعینہ اسی رنگ کا فقرہ ہے جو داری اب بھی استعمال کرتے ہیں۔

۴۶ تا ۵۲ موسٰے کے اس معجزہ کا ساحروں پر ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً ایمان لے آئے اور ایمان لاتے ہی ان کی حالت ایسی بدل گئی کہ فرعون کے ڈرانے پر انہوں نے کہا کہ ہم مارے گئے تو کونسی بڑی بات ہے ہمارا فائدہ ہی ہے کہ ہمارا خدا اس قربانی کی وجہ سے ہمارے گناہ بخش دیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نظر آجانے کے بعد دنیا انسان کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کو افغان حکام نے کہا کہ تم کم از کم ظاہر میں احمدیت سے انکار کر دو ورنہ جان کا خطرہ ہے تو انہوں نے کہا کہ میں تو قوم کی نجات کے لیے اپنی جان پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اسی حکمت کی وجہ سے روحانی بادشاہت کو انگور کی بیل سے تشبیہ دی گئی ہے (لوقا ۲۰ / ۱۸-۹) کیونکہ ہر ایسی بیل ہے جسے خون کی کھاد ڈالی جاتی ہے۔ جو جب الشان خدا کے لیے قربان ہو جاتے تو وہ

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۙ (۵۵) (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) تو ایک تھوڑی سی جماعت ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ۙ (۵۶) باوجود اس کے وہ ہم کو غصہ دلا رہے ہیں۔

وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ۗ (۵۷) اور ہم ایک (بڑی) جماعت ہیں جو بہت محتاط ہیں (پس کیا ہیں انکا مقابلہ)

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ (۵۸) تب ہم نے ان (یعنی فرعون اور اس کی جماعت) کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک

وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ (۵۹) سے نکال دیا (یعنی محروم کر دیا)

كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (۶۰) ایسا ہی ہوا۔ اور ہم نے ان (چیزوں) کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ (۶۱) پھر صبح کے وقت وہ (یعنی فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کو روکنے کے لئے) ان کے پیچھے چل پڑے۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ (۶۲) پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو موسٰے کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (۶۳) (موسٰی نے) جواب دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ مجھے کامیابی کا رستہ دکھلائے گا۔

غذا میں شامل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جس طرح ذبیح شدہ بکرے کا گوشت غذا بن کر انسان کا جزو بدن بن جاتا ہے اس لیے اس کو ابدی بادشاہت دی جاتی ہے۔

۵۳-۵۷ ہر نبی کے دشمن اکثریت کے گھمنڈ میں ایسے مظالم ڈھاتے ہیں۔ مگر سچے عاشق یعنی مومن انہیں برداشت کرتے چلے جاتے ہیں حتٰی کہ کافر کیفر کردار کو پہنچ جاتے ہیں۔

۵۸-۶۰ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نکالنے کو خدا تعالٰے نے اپنی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ کہ موسٰیؑ کو یہ حکم کہ بنی اسرائیل کو نکال کر لے جاؤ۔ اسی نے دیا تھا اس واسطے بالواسطہ طور پر وہی فرعون اور اس کے لشکر کو نکالنے کا موجب بنا۔

اَوْرَثْنٰهَا میں اشارہ ملک مصر کی طرف نہیں۔ بلکہ وہ جگہ مراد ہے جہاں انہیں سب چیزیں میسر آگئیں۔ یعنی فلسطین کا ملک جو باغات اور چشموں میں مصر کے بالکل مشابہ ہے۔

۶۱ فرعون نے سورج نکلتے وقت ان کا پیچھا اس لیے کیا کہ اس نے لشکر جمع کرنا تھا۔

۶۲-۶۳ بے شک حضرت موسٰیؑ نے توکل علی اللہ کا شاندار نمونہ دکھایا مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ (۶۴) تب ہم نے موسٰے کی طرف وحی کی۔ کہ اپنے سونٹے کو سمندر پر مار۔ جس پر (سمندر) پھٹ گیا۔ اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح نظر آنے لگا۔

وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۚ (۶۵) اور اس وقت ہم دوسرے گروہ (یعنی فرعون کے گروہ) کو قریب لے آئے۔

وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۚ (۶۶) اور موسٰے اور اس کے ساتھیوں کو نجات دی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ؕ (۶۷) اور دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۶۸) اس (واقعہ) میں ایک بڑا نشان ہے لیکن ان (منکروں) میں سے اکثر ماننے نہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۧ (۶۹) اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۘ (۷۰) اور ان کو ابراہیمؑ کا واقعہ پڑھ کر سنا۔

کا نمونہ اس سے بدرجہا شاندار تھا۔ چنانچہ موسٰےؑ کے ساتھ ہزاروں آدمی تھے اور بھاگنے کے لیے وسیع جگہ تھی۔ مگر جب آنحضرتؐ نے ہجرت فرمائی تو آپؐ کے ساتھ صرف ایک حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اور جہاں آپؐ نے پناہ لی وہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور دشمن اس غار کے منہ پر آ پہنچا تھا۔ پھر بھی آپؐ نے فرمایا۔ اُسْکُتْ یا ابابکر اثنان اللہ ثالثھما۔ پھر حضرت موسٰےؑ نے تو صرف یہ کہا کہ خدا میرے ساتھ ہے مگر آنحضرتؐ نے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ ۴۰) کہکر حضرت ابوبکرؓ کو بھی شامل کر لیا۔ پھر موسٰیؑ کو تو دشمن نے دیکھ لیا۔ مگر آپؐ کو وہ غار میں دیکھ بھی نہ سکا۔ اور اگر کسی نے آپؐ کو راستہ میں دیکھ بھی لیا جیسے سراقہ نے تو وہ آپؐ کی عظمت کا قائل ہو کر لوٹا۔

انفلق کے معنے جدا ہو جانے کے ہیں۔ اور سمندر کے جدا ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ پھٹ گیا تھا۔

ف ۶۴-۶۷ دیکھیں حاشیہ نوٹ ۶۸۔

ف ۶۸ یہاں بتایا گیا ہے کہ اتنا بڑا نشان دیکھ کر بھی اکثر لوگوں کی آنکھیں بند رہتی ہیں۔

ف ۶۹ عربی کے قواعد کے مطابق رحیم کے وزن پر آنے والے تمام الفاظ کے معانی میں لمبائی اور تواتر پایا جاتا ہے۔ پس صفت رحیم کے ذکر سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا ذکر فرمایا ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور بتایا ہے کہ ہر زمانہ میں خدا اور اس کا رسول غالب رہے دوسری جگہ فرمایا کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی۔ مجادلہ ۲۲) اور اس کے رحیم ہونے کا ثبوت ملتا رہا۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ نبیوں کی مخالفت

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (۱) جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۝ (۲) انہوں نے کہا ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور ان کے آگے بیٹھے رہتے ہیں۔

قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ۙ (۳) اس پر اس (یعنی ابراہیمؑ) نے کہا۔ کہ کیا جب تم ان کو بلاتے ہو تو وہ تمہاری (اس) پکار کو سنتے ہیں؟

اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝ (۴) یا تمہیں کوئی نفع پہنچاتے یا ضرر دیتے ہیں؟

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ (۵) انہوں نے کہا۔ ایسا تو نہیں۔ لیکن ہم اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھتے آئے ہیں۔

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ۙ (۶) اس نے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ جن کی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو۔ تم بھی اور تمہارے پرانے باپ دادا بھی۔

اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ۙ

کی گئی وہ بار بار نبی بھیجتا رہا اور انہیں کامیاب کرتا رہا۔ چنانچہ موسیٰؑ کے اس واقعہ نے ہی خدا کے عزیز اور رحیم ہونے کو ثابت کر دیا ہے۔

۷۰-۷۲ یعنی اگر وہ موسیٰ کے واقعہ سے عبرت حاصل نہیں کرتے تو تو ابراہیمؑ کا جس کی عزت مکہ والوں کے دلوں میں جاگزین ہے ذکر کر۔ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کا گذارہ ہی بتوں کی تجارت پر تھا اس لیے آپؑ کے چچا وغیرہ نے آپؑ کو کہا کہ بتوں کو سجدہ کریں ورنہ ہمارا رزق بند ہو جائے گا۔ مگر آپؑ نے نہ صرف یہ کہ خود سجدہ کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایک گاہک کو بھی کہا کہ کیا تجھے یہ بُت پوجکر شرم نہ آئے گی جو ابھی دو دن ہوئے میرا باپ بنا کر لایا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی جب بتوں کے خلاف وعظ شروع کیا تو آپؐ کی قوم نے آکر ابو طالب کو کہا کہ آپؐ کو روکیں۔ چنانچہ ابو طالب نے آپ کو کہا کہ تم کم از کم بتوں کو بُرا نہ کہا کرو ورنہ میری قوم مجھے چھوڑ دے گی۔ مگر اس کے جواب میں آپؐ نے کہا کہ چچا میں آپ کے لیے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں مگر یہ بات نہیں مان سکتا۔

۷۳-۷۵ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کی بے چارگی ظاہر کرنے کے لیے کہا کہ کیا یہ تمہاری دعا سنتے ہیں۔ یا ان میں طاقت ہے کہ ماننے والوں کو فائدہ پہنچائیں۔ اور منکروں کو تباہ کر دیں۔ اگر ان میں خدا تعالیٰ والی طاقتیں نہیں ہیں تو تم ان کی پرستش کیوں کرتے ہو اس کا جواب وہ کیا دیتے یہی کہا کہ ہم اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھتے آئے ہیں۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ (۷۸) وہ سب کے سب رب العالمین کے سوا میری تباہی چاہتے ہیں۔

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ (۷۹) جس (رب العالمین) نے مجھے پیدا کیا ہے اور (اس کے نتیجہ میں) وہ مجھے ہدایت بھی دے گا۔

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۙ (۸۰) اور جس کی صفت یہ ہے کہ وہی مجھے کھانا کھلاتا اور وہی مجھے پانی پلاتا ہے۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ (۸۱) اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

لے ۷۸ یہاں اعداء کی جگہ عدو کا لفظ اس لیے ہے کہ عربی میں بعض دفعہ مبتداء کو جمع اور خبر کو مفرد کر لیتے ہیں مثال کے لیے دیکھیں اس سورۃ کی آیت فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔
بے جان بتوں کو جو عدو کہا گیا ہے مفسرین کے خیال میں یہاں قلب نسبت سے کام کیا گیا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ میں ان کا دشمن ہوں" لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہاں مخالفین کے عقیدہ پر تعریض کی گئی ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ وہ میرے معبود ہیں مگر میں ان کی عبادت نہیں کرتا اس لیے لازماً وہ میرے دشمن ہوں گے اب اگر وہ مجھے تباہ نہ کر سکیں تو ان کی ناطاقتی ثابت ہو جائے گی۔
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ کہکر حضرت ابراہیمؑ نے بتایا کہ میرا خدا ایک زندہ خدا ہے جس سے ہر زمانہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب بھی مومنوں کو تکلیف دی جاتی ہے خدا تعالےٰ ان کی مدد کے لیے آتا ہے ہر نبی کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا ہے" تم کبھی دشمن کے حملہ کی تمنا نہ کرو" مگر کون دشمن کے حملہ کی تمنا کیا کرتا ہے۔ اس لیے آپؐ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ مومنوں کے لیے خدا کا یہ پیار ایسی قیمتی چیز ہے۔ کہ اس کے لیے وہ دشمن کے حملہ کی خود تمنا کر سکتے تھے مگر چونکہ یہ الٰہی حکمتوں کے خلاف تھا اس لیے آنحضرتؐ نے منع فرما دیا۔

لے ۷۹ اس میں بتایا ہے کہ صفت خلق کا تقاضہ ہے کہ کامیابی بھی خالق کی طرف سے آئے۔ کیونکر وہ ہستی اپنے معرض وجود میں آنے کے لیے دوسرے کی محتاج ہے وہ ترقی کے وسائل بھی خود بخود مہیا نہیں کر سکتی۔
ان الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے غلبہ کی خبر دی ہے اور اس یقین کا اظہار فرمایا کہ میرا خدا مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔

لے ۸۰ اس میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ہمیں کھانا پینا اصل میں خدا تعالےٰ ہی دیتا ہے اور وہی محسن حقیقی ہے۔ یہی بات یاد دلانے کے لیے اسلام نے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۙ (۸۲) اور جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔
وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ (۸۳) اور وہ ایسا ہے کہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہ
خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ؕ جو سزا کے وقت مجھے معاف کر دے گا۔

---

۸۱ یہاں حضرت ابراہیم نے بیماری کو اپنی طرف اور شفا کو خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنی ذات میں نقصان دہ نہیں۔ نقصان دینے والی چیز صرف غلط استعمال ہے جو انسان کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ورنہ خدا تعالےٰ نے زہر اور سنکھیا اور انیوں کو بھی ہزاروں بیماریوں کا تریاق بنایا ہے۔

۸۲ ہزاروں بچے روزانہ ایسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں جو انسانی دائرہ اختیار میں نہیں اور پھر وہ ایسے حالات میں سے گذر کر بڑھتے ہیں کہ اگر کسی بالا ہستی کا تصرف نہ ہو تو ان کے بڑھنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اموات کا سلسلہ بھی ہر وقت جاری رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کی صفت محی اور ممیت کا نظارہ ہر وقت انسان کے سامنے آتا رہتا ہے۔ جو انسان نے بڑا ہو کر بننا ہوتا ہے یا جیسی اس کی موت ہو اس کے مطابق آسمان پر خوشی یا رنج کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ خوشی اور رنج کا ملا جلا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی ظالم مرتا ہے۔ تو اس خیال سے کہ دنیا نے اس سے نجات پائی ملائکہ خوش ہوتے ہیں مگر اس خیال سے کہ وہ خدا کو راضی کرنے سے پہلے مر گیا وہ غمگین ہوتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں والدین، انبیاء اور قومی خدمت بجا لانے والے لوگ دنیا میں حیات کا موجب ہوتے رہتے ہیں اور قتل و غارت کرنے والے موت کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ مگر صرف وہی شخص خدا کی صفت محی یا ممیت کو پورا کرنے والا قرار پا سکتا ہے جو اس کے قوانین کے ماتحت ان صفات کا مظہر بنتا ہے ورنہ ناجائز بچے پیدا کرنے والا یا ناجائز طور پر قتل کرنے والا ان صفات کا مظہر نہیں کہلا سکتا۔ پس اسلام سکھاتا ہے کہ اپنے کاموں کو ہمیشہ رضاء الٰہی کے ماتحت رکھنے کی کوشش کرو۔ خدا تعالیٰ چونکہ ممیت ہی نہیں محی بھی ہے اس لیے باوجود اس کے کہ وہ لاکھوں انسانوں کی جان ہر سال لیتا ہے۔ لوگوں میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ مگر ایٹم بم وغیرہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو صرف مارنا جانتے ہیں۔ اس لیے لوگوں کو گھبراہٹ ہے اس گھبراہٹ کا علاج صرف یہ ہے کہ اس خدا کی طرف رجوع کیا جائے جو ممیت ہی نہیں محی بھی ہے۔

۸۳ غفر کے معنے صرف گناہوں کی معافی کے نہیں بلکہ کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے بھی ہیں۔ اور خَطِیْٓئَۃٌ کا لفظ ان بشری کمزوریوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جن میں انسانی ارادہ کا دخل نہ ہو۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۸۴) اے میرے رب! مجھے صحیح تعلیم عطا کر۔ اور نیکوں میں شامل کر۔

یَوْمُ کا لفظ دن کے علاوہ وقت اور زمانہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور دین کے بھی کئی معنی ہیں اس لیے یَوْمُ الدِّیْن کے معنے صرف قیامت کے نہیں کہ اس دعا کو آخری جزا کے دن کے لیے مخصوص سمجھا جائے۔ بلکہ دین کے ایک معنے جزا کے اور مطابق اعمال نتیجہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جب بُرے اعمال کا نتیجہ نکلے گا تو مجھے امید ہے کہ خدا تعالیٰ میری کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہوئے مجھ پر رحم کرے گا اور میرے مقصد میں کامیابی بخشے گا۔

یہ خیال کہ انسان مغفرت کا طلبگار اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ گناہ گار ہو۔ غلط ہے۔ انسان کو ہر لمحہ خدائی مدد کی ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ عبادت کے لیے بھی اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں اشارہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی فرماتے ہیں کہ میں اپنی طاقت کے مطابق تو توحید الٰہی پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر میری کوشش خدا کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس لیے میں اس سے مدد کا طلبگار ہوں۔

دِیْن کے ایک معنے غلبہ کے بھی ہیں اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ میں امید رکھتا ہوں کہ اس سلسلہ کی ترقی کے زمانہ میں بھی (جبکہ ہزاروں مذہبی تعلیم سے ناواقف لوگ روحانی سلسلہ میں شامل ہو کر اس کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں) خدا تعالےٰ میری کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے سامان فرمائے گا کہ تبلیغ اور تربیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۸۴ حکم کے معنے اصلاح کی خاطر کسی کام سے روکنے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ لفظ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی معقول وجہ اور اہم مقصد ہو۔

قرآن میں حُکْم کا لفظ حکومت اور غلبہ کے معنوں میں (۴۵/۴۷، آل عمران ۳/۷۸) فیصلہ کرنے کی فراست کے معنوں میں (۱۲/۲۲) فیصلہ کے معنوں میں (۵/۴۸) احکام الٰہیہ اور تعلیم مذہبی کے معنوں میں (۴/۴۴) اور عہدہ نبوت کے معنوں میں (۲۶/۲۲) استعمال ہوا ہے۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ذہن پر یہ خیال حاوی تھا کہ آپ کی بعثت کا مقصد جو اشاعت توحید تھا پورا ہو۔ اور چونکہ اس کام کے لیے الٰہی مدد کی ضرورت تھی آپؑ نے دعا کی کہ الٰہی تو خود دینی معاملات میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت اور پُر حکمت تعلیم دے اور خود مجھے غلبہ عطا فرما۔

وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ:۔ انبیاء کا لوگوں کی نجات کے لیے کھڑا کیا جانا بتاتا ہے کہ وہ پہلے ہی نجات یافتہ ہوتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ نبی تھے پھر آپؑ نے یہ دعا کیوں کی؟ سو یاد رکھنا چاہیئے

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۙ (۸۵) اور بعد میں آنے والے لوگوں میں ایک ہمیشہ قائم رہنے والی تعریف مجھے بخش۔

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ۙ (۸۶) اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا

کہ جس طرح رنگ اور قد کے معنی مختلف علاقوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح صالح کے معنی بھی مختلف حالات میں بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے صالحیت کو نبوت صدیقیت شہادت سب سے ادنیٰ مقام قرار دیا ہے (نساء ۶۹/۵) اور دوسری طرف بڑے بڑے نبیوں کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے (تحریم ۶۶/۱۱، انبیاء ۷۲/۲۱، آل عمران ۳/۴۶) اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی یہ دعا مانگے گا۔ تو مطلب یہ ہوگا مجھے اپنے مقام سے بالا مقام رکھنے والوں کی معیت عطا فرما۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حجرات ۴۹/۱۵ میں تو اسلام کو ایمان کا ابتدائی قدم قرار دیا ہے لیکن بقرہ ۲/۱۳۲ میں ایمان اور معرفت کا انتہائی قدم قرار دیا ہے۔ یا ایک طرف سب انسانوں کو عبد قرار دیا گیا ہے مگر دوسری طرف آنحضرتؐ کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے (جن ۷۲/۲۰) اور صوفیا کے نزدیک یہ آپؐ کا سب سے بڑا مقام ہے۔

معراج کی رات آنحضرتؐ نے مختلف انبیاء کو مختلف آسمانوں پر دیکھا۔ اس سے ثابت ہے کہ انبیاء کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ پس جب نبیؑ الحقنی بالصلحین کہتا ہے۔ تو وہ اپنے سے بالا مقام رکھنے والے انبیاء کی معیت کی دعا کرتا ہے۔ نہ کہ اس مقام صالحیت کی جو صدیقیت اور شہادت سے بھی کم درجہ پر ہے۔

اس دعا کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بتایا ہے کہ کسی مقام کے حصول پر انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے ترقی کے تمام مدارج کو طے کر لیا ہے بلکہ اس سے اگلے مقام کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

انبیاء کا ایسی دعائیں مانگنا لوگوں کو سکھانے کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے یوں تو انبیاء کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت میں بسر ہوتا ہے (انعام ۶/۱۶۳) مگر پھر بھی ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ لوگ جھوٹے صوفیاء کی طرح یہ نہ کہنے لگ جائیں۔ کہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں نماز کی ضرورت نہیں رہی۔ دراصل قرب الٰہی کے غیر متناہی مراتب ہیں۔ اس لیے کسی مقام پر رک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنحضرتؐ جن کے اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے تھے (بلکہ جن کا کوئی گناہ تھا ہی نہیں) اتنی اتنی دیر عبادت میں کھڑے رہتے کہ آپؐ کے پاؤں سُوج جاتے۔ اور آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپ اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں تو فرمایا افلا اکون عبدًا شکورًا۔ (البخاری کتاب التہجد)

۸۵-۸۶ عربی زبان میں جب صدق کی طرف کوئی لفظ مضاف ہو تو اس کے مفہوم میں دوام اور ظاہر و باطن کی خوبی کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس اس دعا کے یہ معنے ہیں کہ الٰہی تو لوگوں میں میرے لیے دائمی دعا کی تحریک پیدا کر اور ایسا کر کہ صرف لوگوں کی زبان پر میری تعریف نہ ہو بلکہ واقعہ میں میرے نیک اعمال دنیا میں قائم رہیں تا مجھے ظاہری اور باطنی طور پر اچھی تعریف حاصل ہو۔

واغفر لابی انہ کان من الضالین ۝	(۸۷) اور میرے باپ کو معاف کر دے۔ وہ بیشک جانے والوں میں سے تھا۔

مسلمان نمازوں میں جو درود پڑھتے ہیں اس کے ذریعہ وہ ۱۳۰۰ سال سے حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا پوری کر رہے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم جب افضل الرسل تھے تو درود میں آپ پر برکات کے نزول کے لیے ابراہیمؑ کی مثال کیوں دی جاتی ہے۔ سوچنا چاہیئے کہ ہر کمال نسبتی ہوتا ہے۔ درود میں یہ دعا مانگی جاتی ہے۔ کہ خدایا جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو جو محض القوم نبی تھے اپنی جنس میں کمال درجہ کا وجود بنایا تھا اسی طرح اے خدا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی جو جمیع عالم کی طرف نبی ہیں ان کی جنس کے لحاظ سے جو سب سے بڑا اور جو ہے وہ عطا کر۔ اور جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو یہودی قوم کے لیے برکت دی اسی طرح تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کے لوگوں کے لیے برکت دے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو ہی بیٹے تھے آپ نے ایک کو آباد علاقہ میں بھیج دیا۔ کہ وہاں تبلیغ کرے اور دوسرے کو وادی غیر ذی زرع میں بٹھا دیا تاکہ جب وہ آباد ہو تو اس کی نسل وہاں تبلیغ کرے۔ اتنی لانگ ٹرم پالیسی اس سے قبل اور کسی نے اختیار نہیں کی۔ بے شک آپ کو الہام کی تائید حاصل تھی مگر الہام قلبی کیفیت کے مطابق نازل ہوتا ہے اگر آپ کے دل میں یہ تڑپ نہ ہوتی تو خدا تعالیٰ بھی آپ کو بیٹے کی قربانی کا حکم کبھی نہ دیتا۔ درود پڑھنے کا حکم دے کر یہ ابراہیمی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم آباد ملکوں میں بھی تبلیغ کے لیے نکل جائیں اور غیر آباد ملکوں میں بھی اپنے بچوں کو بسا دیں تاکہ جب بھی وہ ملک آباد ہوں۔ تو ہماری اولاد ان میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنے والا ہو۔

۸۷ اس جگہ "اب" سے مراد چچا ہے۔ اور ان معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآنی محاورہ ہے (دیکھیں ۲/۱۱۴)۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا سے ان کی مغفرت کی دعا کا وعدہ کیا تھا (۱۹/۴۷) اس کے مطابق یہ دعا تھی مگر جب خدا تعالےٰ نے یہ کھول دیا کہ وہ توحید کا دشمن تھا۔ تو آپ نے اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا (۷/۱۱۴-۱۱۳)

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین کے لیے دعا کی تھی (۱۴/۴۲) اور یہ وہ وقت تھا جبکہ حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو چکے تھے۔ اور وہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی بڑھاپے کی اولاد تھے یہ دعا آپؑ کی عمر کے آخری حصہ کی ہے اس سے بھی ثابت ہے کہ یہاں "اب" سے مراد والد نہیں چچا ہے ورنہ اس علم کے بعد کہ وہ توحید کے دشمن ہیں آپ یہ دعا کیسے کر سکتے تھے۔ والدین کے لیے آپؑ کی دعا

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۙ (۸۸) اور جس دن لوگ زندہ کرکے اُٹھائے جائیں مجھے اس دن رسوا نہ کیجیو۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ (۸۹) جس دن کہ نہ مال نفع دیگا نہ بیٹے (نفع دیں گے)۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۗ (۹۰) ہاں (وہی نفع پائیگا) جو اللہ تعالیٰ کے پاس ایک تندرست دل لیکر آئیگا۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ (۹۱) اور جس دن جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی۔

اس لیے تھی کہ وہ زمانہ فترت میں انتقال فرما چکے تھے اور جن پر نبی کی جسمانی حیات کے یا حیاتِ فیضان کے زمانہ میں حجت تمام ہوچکی ہو اور جن پر نہ ہوئی ہو ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اور قرآن عدمِ آگاہی کو ایک معقول عذر قرار دیتا ہے (بنی اسرائیل ع ۲)

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے 'اَب' کا نام "آذر" بتایا ہے۔ (انعام ع ۹) مگر بائیبل نے اس کا نام "تارا" بتایا ہے (پیدائش ۱۱/۲۷) عیسائی اعتراض کرتے ہیں۔ کہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آذر قرار دے کر غلطی کی ہے۔ اول تو بائیبل نہ تاریخ کی کتاب ہے نہ مستند ہے اس میں جگہ جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔ اس سبب بائیبل سے قرآن کا اختلاف ہو تو بھی جائے اعتراض نہیں۔ دوسرے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے یہاں 'اب' سے مراد باپ نہیں چچا ہے۔ اگر باپ کا نام تارا ہی ہوتا تو طالمود میں اس کا نام زادا کیوں لکھا جاتا۔ اور مشہور یہودی مورخ جوزیفس اس کا نام آثر یعنی آذر کیوں بتاتا (ترجمۃ القرآن از بل ص ۹۵) ان بیانوں سے ثابت ہے کہ ابراہیمؑ کے باپ کے نام کے متعلق اختلاف تھا۔ اور چونکہ قرآن اس لیے آیا ہے کہ پہلی کتب کے پیدا کردہ اختلافات دور کرے اس نے اس اختلاف کو بھی دور کر دیا۔

مگر یہ بھی ممکن ہے "تارا" سے ہی آذر بنا ہو۔ ت۔ ذ سے بدل جاتی ہے اور "قلب" کے ذریعہ الف پہلے آجاتا ہے اس طرح تارا سے ذارا بنا اور پھر ذارا سے آذر بن گیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن نے اصل نام کا ترجمہ کر لیا ہو جیسے یسوع کو عیسٰے حنوق کو ادریس اور یوحنا کو یحییٰ لکھا ہے۔

پھر بائیبل حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ کو تارہ کی بیٹی قرار دیتی ہے۔ (پیدائش ۲۰/۱۲) اس سے بھی ثابت ہے کہ تارا آپ کے چچا تھے ورنہ کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بہن سے شادی کرلی تھی؟

ف ۸۸-۹۰ انسان کا دل اس وقت مطمئن ہوسکتا ہے جب اس نے مقصدِ پیدائش کو حاصل کر لیا ہو۔ اور اسے انجام کے متعلق کوئی اضطراب لاحق نہ ہو۔ اور یہ صرف خدا تعالےٰ سے تعلق حاصل ہونے پر ہوسکتا ہے۔

ف ۹۱ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ انسان قربانی کے لیے آگے آجائے پھر اسے ذوق

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۙ (۹۲) اور گمراہوں کے لئے دوزخ پر سے پردے اٹھا دیئے جائینگے
وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ (۹۳) اور کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ سوا عبادت کرتے تھے۔ کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں؟
اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۭ (۹۴) یا تمہارا بدلہ لے سکتے ہیں۔
فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۙ (۹۵) پس اس وقت وہ (جھوٹے معبود اور کافر) اور گمراہ اور ابلیس کے لشکر سارے
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ۭ (۹۶) کے سارے اس (دوزخ) میں اوندھے منہ گرا دیئے جائیں گے۔
قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۙ (۹۷) وہ آپس میں جبکہ وہ اس (یعنی جہنم) میں جھگڑ رہے ہونگے کہیں گے
تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (۹۸) خدا کی قسم ہم کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔
اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۹۹) جبکہ ہم تم کو رب العالمین خدا کے برابر درجہ دیتے تھے۔
وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۰۰) اور ہم کو تو مجرموں نے ہی (راستہ سے) بھٹکایا تھا۔
فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۙ (۱۰۱) پس (آج) شفاعت کرنیوالوں میں سے کوئی ہماری شفاعت نہیں کرتا
وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ (۱۰۲) اور نہ کوئی ہمارا غمخوار دوست ہے۔
فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ (۱۰۳) پس اگر ہمیں لوٹنے کی طاقت ہوتی۔ تو ہم (لوٹ کر) فوراً
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مومنوں میں (شامل) ہو جاتے۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ (۱۰۴) اس (واقعہ) میں ایک بڑا نشان ہے۔ لیکن ان

پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جوں جوں وہ نیک کام کرتا جاتا ہے نیکی اس پر آسان ہوتی جاتی ہے۔
اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آخری زمانہ میں مذہبی باتیں لوگوں کی سمجھ میں آنے لگ جائیں گی
چنانچہ موجودہ زمانہ میں ایک طرف تو کچھ اہلِ یورپ اپنے بلند بانگ دعاوی کو چھوڑ رہے ہیں اور کچھ
لوگ ان باتوں کو جو اس سے قبل انہیں غیر قدرتی نظر آتی تھیں قانونِ قدرت میں شامل کرکے مذہب کی
طرف آ رہے ہیں گویا دَنٰی فَتَدَلّٰی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور جنت قریب ہو رہی ہے۔

۹۲-۹۴ یعنی ایسے زمانہ میں بھی جو ہدایت کو قبول نہ کریں گے انہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے
لیے حاضر ہونا پڑے گا۔

۹۵-۱۰۳ ان آیات میں کفار کی اس وقت کی حالت کا ذکر ہے جب ان پر گرفت کی جائے گی۔ اور بتایا
گیا ہے کہ اس وقت نہ کسی دوست کی دوستی کام آئے گی نہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر اٹھا لینے کا دعوٰی کرنے
والے کسی کو جہنم سے بچا سکیں گے۔

۱۰۴-۱۰۵ حضرت ابراہیم نے کس ضعف کی حالت میں توحید کی آواز بلند کی۔ مگر مخالفت کے باوجود آخر کامیاب ہو گئے

اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝	(کافروں) میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے۔
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝	(۱۰۵) اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے۔
كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝	(۱۰۶) نوح کی قوم نے (اپنے) رسولوں کا انکار کیا۔
اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝	(۱۰۷) جبکہ ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا۔ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝	(۱۰۸) میں تمہاری طرف ایک امانتدار پیغامبر ہو کر آیا ہوں۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝	(۱۰۹) پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	(۱۱۰) اور میں اس (خدمت کے سلسلہ) میں کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میری اُجرت تو رب العالمین (خدا) کے ذمہ ہے۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝	(۱۱۱) پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور میری اطاعت کرو۔
قَالُوْا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝	(۱۱۲) انھوں (یعنی کافروں) نے کہا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ نہایت حقیر لوگ تیرے متبع ہوئے ہیں۔
قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝	(۱۱۳) اس نے کہا مجھے کہاں سے علم آیا ہے کہ ان کے اندرونی اعمال کیسے ہیں؟
اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝	(۱۱۴) ان کا حساب کرنا تو میرے رب کے ذمہ ہے۔ اگر تم سمجھو۔

یہ بہت بڑا نشان تھا لیکن پھر بھی اکثر لوگ دنیوی لذات میں منہمک رہے۔ لیکن فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ۔ تیرا رب کہہ کر اشارہ فرمایا کہ تیرے لیے وہ خاص طور پر اپنی صفات عزیز و رحیم کا مظاہرہ کرے گا۔ اس لیے تیری قوم کی اکثریت منکر نہیں رہے گی اور ایمان لے آئے گی۔

۱۰۶ یہاں نوح کے انکار کو مرسلین کا انکار قرار دیا گیا ہے کیونکہ نوح اس وقت سب رسولوں کے قائم مقام تھے۔

۱۰۷-۱۱۱ اَطِيْعُوْنِ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی اطاعت اور شریعت پر عمل جُدا جُدا چیزیں ہیں اور نبی کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ خدا سے تعلق کا پہلا زینہ ہے۔ اہل کتاب کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم نہیں غلط ہے۔ ہاں اگر کسی کو نبی کی رہنمائی میسر نہ ہو اور اس کے دل میں خدا سے ملنے کی تڑپ ہو تو شاذ کے طور پر خدا تعالےٰ اسے خود بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے مگر شاذ پر قانون کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۱۵) اور جو شخص مومن ہو کر میرے پاس آتا ہے میرا کام نہیں کہ میں اسے دھتکار دوں۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۱۶) میں تو صرف ایک کھلا کھلا ہوشیار کرنے والا انسان ہوں۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ (۱۱۷) انہوں (یعنی کافروں) نے کہا اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو تو سنگسار

لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ میں شامل ہو جائیگا (یعنی ہم تجھے سنگسار کر دینگے)

۱۱۲-۱۱۴ ہر نبی پر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ اس کے ماننے والے ادنیٰ لوگ ہیں۔ حضرت نوحؑ نے وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کہہ کر کیا عمدہ جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم کہ ان کی کونسی چھپی نیکیاں تھیں جن کی وجہ سے خدا نے ان کو ایمان لانے کا شرف بخشا۔ جب خدا کے فضل نے انہیں اعلیٰ درجہ کا ثابت کر دیا تو پھر میں انہیں رذیل کیسے سمجھ لوں۔

اِنْ حِسَابُهُمْ ..... لَوْ تَشْعُرُوْنَ ا- اس میں اشارہ ہے کہ بے شک آج یہ لوگ غریب ہیں مگر خدا تعالےٰ ان کی قربانیوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ بلکہ جس طرح اس نے میری مدد کی ہے میرا رنگ اختیار کرنے کی وجہ سے ان کی بھی کرے گا۔ اور انہیں ترقی دے گا۔ کاش تم شعور سے کام لیتے۔

شعور اس حس کو کہتے ہیں جو انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور علم اس حس کو جو باہر سے آتی ہے اور جب محنت کر کے انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں چیز اس کے لیے مفید یا مضر ہے تو اس کا نام فکر ہوتا ہے۔ اور عقل اس قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو علم، فکر اور شعور کے مطابق کام کرنے کی توفیق بخشے۔ اسی طرح تفقہ کے معنے کسی چیز کی باریکی کو پالینے کے ہیں۔ اور جب انسان مختلف واقعات سے ایک نتیجہ نکالتا ہے تو اسے استنباط کہتے ہیں

قرآن کریم بار بار توجہ دلاتا ہے۔ کہ تم شعور، علم، فکر، عقل، تفقہ اور استنباط سے کام لو بلکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دشمنوں میں فرق یہی بتاتا ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی ہر بات دلیل سے مانتے ہیں (۱۲/۱۰۹)

حدیث سے پتہ لگتا ہے۔ اگر کوئی غور کر کے کسی نتیجہ پر پہنچے تو خواہ وہ نتیجہ غلط ہی ہو وہ مستحق ثواب ہوگا۔ اسی لیے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ جس پر حجت تمام نہیں ہوئی یا جو دیوانہ ہے وہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائیگا اسی طرح مستحق انعام بھی وہی ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر سچائی کو قبول کرے۔

حضرت نوحؑ نے بھی قوم کو اسی مخفی حس (یعنی شعور) سے جو انسان کو اس کے اندرونی قویٰ کا علم دیتی اور فطرت صحیحہ کو بیدار کرتی ہے کام لینے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۱۱۵-۱۱۶ دیکھیں سورۃ ہود نوٹ ۳۰

۱۱۷-۱۱۹

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ ۚۖ (۱۱۸) اس پر اس (یعنی نوح) نے کہا۔ اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

فَافْتَحْ بَيْنِیْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۱۹) پس تو میرے اور ان کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو (دشمن کے) شر سے بچا لے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۚ (۱۲۰) پس ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ (شر سے) بچا لیا۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ؕ (۱۲۱) پھر اس کے بعد جو باقی لوگ تھے ان کو غرق کر دیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۲۲) اس میں ایک بہت بڑا نشان تھا مگر ان (یعنی کافروں) میں سے اکثر ایمان لانے پر آمادہ نہیں تھے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ع (۱۲۳) اور تیرا رب ہی غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ۚۖ (۱۲۴) (اسی طرح) عاد نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ (۱۲۵) جبکہ ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ (۱۲۶) میں تمہاری طرف ایک امانتدار پیغامبر ہو کر آیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ (۱۲۷) پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ (۱۲۸) اور میں تم سے اس (خدمت) پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میری اُجرت صرف رب العالمین خدا کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے)

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۙ (۱۲۹) کیا تم ہر ٹیلے پہ فضول کام کرتے ہوئے عمارت بناتے ہو۔

ركوع ٦

---

۱۲۰ الْمَشْحُوْنِ کے معنے بھری ہوئی کے ہوتے ہیں لیکن وہ کشتی پہلے ہی بھری ہوئی ہوتی تو نوحؑ اور ان کے ساتھی اس میں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے یہ لفظاً آئندہ کی حالت کے مطابق استعمال ہوا ہے جب وہ کشتی بھر جانیوالی تھی اور یہ عربی قواعد کے مطابق ہے۔

۱۲۳،۱۳۰ یہاں حضرت ہود کو تمام انبیاء کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایک رسول کا انکار دراصل سب انبیاء کا انکار ہوتا ہے۔ مزید دیکھیں ہود نوٹ ۵۱، ۵۲۔

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۚ (۱۳۰) اور تم بڑے بڑے محل بناتے ہو۔ تاکہ تم ہمیشہ قائم رہو۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۚ (۱۳۱) اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو تو تم ظالموں کی طرح پکڑتے ہو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ (۱۳۲) پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۚ (۱۳۳) پھر میں کہتا ہوں کہ اس (ذات) کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہاری ان چیزوں سے مدد کی ہے جن کو تم جانتے ہو۔

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۚ (۱۳۴) اس نے تمہاری مدد کی ہے چار پائے اور بیٹے اور

وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۚ (۱۳۵) باغ اور چشمے دے کر۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۚ (۱۳۶) میں تم پر ایک بڑے دن کا عذاب نازل ہونے سے ڈرتا ہوں۔

۱۲۹-۱۳۶ قوم عاد فن تعمیر میں خاص شغف رکھتی تھی۔ کیونکہ اس کی تہذیب کی بنیاد علم ہندسہ، کیمسٹری اور ہیئت پر تھی۔ بابلی تحریک جس نے دنیا کے کلچر پر گہرا اثر چھوڑا ہے کی علمبردار دو قومیں ہوئی ہیں۔ ایک عادِ اولیٰ جو اس تہذیب کے بانی تھے۔ اور دوسرے ثمود جو بعد میں اس کے حامل بنے یہاں عادِ اولیٰ کا ذکر ہے۔

جبّار کے معنے دوسرے کو نیچا کر کے اپنے آپ کو اونچا کرنے والے کے ہوتے ہیں اور اس میں یہ بتایا ہے کہ تم دوسری قوموں کے تہذیب و تمدن کو تباہ کر کے اپنی تہذیب کو قائم کرتے ہو۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ سے یہ استنباط بھی ہوتا ہے کہ آلاتِ جنگ کی بعض حیرت انگیز ایجادات انہیں کے زمانہ میں ہوئی ہیں۔ غرض بابلی تحریک میں عمارتوں کی تعمیر آلاتِ جنگ کی ایجاد اور رصدگاہیں بنانے پر زور تھا۔ اور پیدائش ۱۱ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اہل یورپ پہلے عاد کے وجود ہی سے منکر تھے۔ مگر نصف صدی سے جبکہ ان کے آثار ملے ہیں وہ ان کا وجود ماننے لگے ہیں۔ حضرت ہودؑ نے ان کو توجہ دلائی کہ یہ ظاہری باتیں جن کے پیچھے تم پڑے ہوئے ہو سب عبث ہیں قائم صرف تقویٰ رہے گا۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۳۳-۱۳۶ یعنی تمہاری ترقی کے سب سامان خدا کے دیئے ہوئے ہیں اگر اس کی طرف توجہ نہیں کرو گے تو مجھے ڈر ہے کہ یہ سب کچھ چھینا جائے گا۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

(۱۳۷) انہوں نے کہا۔ تیرا وعظ کرنا یا نہ کرنا ہمارے لئے برابر ہے (کیونکہ جو باتیں ہم کرتے ہیں) وہ تو پہلے (۱۳۸) زمانہ کے لوگوں سے رائج ہیں۔

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝

(۱۳۹) اور ہم پر (کبھی) عذاب نہیں آئے گا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(۱۴۰) پس ان (کافروں) نے اس کو جھٹلا دیا اور ہم نے ہلاک کر دیا۔ اس واقعہ میں ایک بہت بڑا نشان ہے لیکن ان میں سے اکثر مومنوں میں سے نہ بنے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

(۱۴۱) اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

(۱۴۲) ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(۱۴۳) جبکہ انھیں ان کے بھائی صالح نے کہا تھا کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝

(۱۴۴) میں تمہاری طرف ایک امانتدار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

(۱۴۵) پس اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۱۴۶) اور میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت طلب نہیں کرتا۔ میری اُجرت تو رب العالمین کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے)

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝

(۱۴۷) کیا (تم خیال کرتے ہو کہ) جو کچھ اس (دنیا) میں ہے تمہیں اسی میں امن کے ساتھ (زندگی بسر کرتے ہوئے)

فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝

(۱۴۸) چھوڑ دیا جائیگا۔ یعنی باغات اور چشموں میں۔

وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا

(۱۴۹) اور لہلہاتے کھیتوں میں اور کھجوروں میں جنکے

۱۳۷-۱۳۹ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی انسان سرکشی میں بڑھ جائے تو اسے نیکی کی طرف توجہ دلانا مشکل ہوجاتا ہے لیکن یہ مشکل تسلیم کرنے کے باوجود قرآن کریم فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (اعلیٰ ع) کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں کہ کب خدا کا فضل انسان کے قلب پر سے زنگ اتار دے اور وہ ہدایت پاجائے۔

۱۴۰-۱۴۱ یعنی انہوں نے بڑے بڑے مکان بنا کر اپنا نشان قائم کیا تھا مگر ہم نے ان کی بستیاں مٹا کر ایک نشان قائم کر دیا۔ مگر اس سے ان کو کیا فائدہ پہنچا؟ عزیز و رحیم کے لیے دیکھیں نوٹ نمبر ۱۶۰۔

هَضِيْمٌ ؕ پھل بوجھ کی وجہ سے ٹوٹے جا رہے ہوں۔
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا (۱۵۰) اور تم لوگ پہاڑ کھود کھود کر (اپنی بڑائی پر) اِتراتے
فٰرِهِيْنَ ۚ ہوئے گھر بناتے ہو۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ (۱۵۱) پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ (۱۵۲) اور حد سے بڑھ جانیوالے لوگوں کی باتیں مت مانو۔
الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۱۵۳) وہ لوگ جو ملک میں فساد کرتے ہیں۔ اور اصلاح
وَلَا يُصْلِحُوْنَ ‏ نہیں کرتے۔
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ (۱۵۴) اس پر وہ لوگ جو کافر تھے) بولے تجھ کو صرف
الْمُسَحَّرِيْنَ ۚ کھانا دیا جاتا ہے۔
مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ (۱۵۵) تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے پس اگر تو سچا ہے
فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ‏ تو کوئی نشان ظاہر کر۔
قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ (۱۵۶) اس نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے ایک دن اس کیلئے گھاٹ پر پانی
وَّلَـكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۚ پینا مقرر ہے اور ایک دن تمہارے لئے گھاٹ کا پانی لینا مقرر ہے
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ (۱۵۷) اور تم اس (یعنی اونٹنی) کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ ورنہ
عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ‏ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آپکڑے گا۔
فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا (۱۵۸) (یہ سنکر بھی) انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ
نٰدِمِيْنَ ۙ ڈالیں اور پھر (شرمندہ ہو گئے۔

۱۵۳-۱۴۲ قوم ثمود کے نبی حضرت صالحؑ نے بھی ان کو توجہ دلائی کہ حصول عزت کا وہ طریق نہیں جو تم اختیار کر رہے ہو۔ بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کا ملک چشموں اور باغوں والا تھا۔ وہاں کھجور اچھی قسم کی ہوتی تھی زراعت ترقی پر تھی۔ اور ان کو سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا۔

۱۵۴ سحر کے معنے کھانا دیئے جانے کے ہوتے ہیں۔ یہاں استعارۃً مدد کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان الفاظ سے ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی غیر حکومت تجھے ہماری تباہی کے لیے رشوت دے رہی ہے آنحضرتؐ کے مخالف بھی کہتے تھے کہ بعض اور لوگ اس کی مدد کرتے ہیں اور حضرت مسیح موعودؑ کے مخالف بھی کہتے تھے کہ انگریز انہیں روپے دیکر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر رہے ہیں۔

۱۵۸-۱۵۵ قرآن کریم نے اس اونٹنی کی پیدائش کو نہیں اس کی آزادی کو نشان قرار دیا ہے اور عذاب

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ (۱۵۹) تب ان کو (موعود) عذاب نے آپکڑا - اس میں یقیناً
ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ ایک بہت بڑا نشان تھا - لیکن ان میں سے اکثر
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ مومنوں میں شریک نہ ہوئے۔
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ (۱۶۰) اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم
الرَّحِیْمُ ۝ع کرنے والا ہے۔
كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ࣙالْمُرْسَلِیْنَ ۚۖ (۱۶۱) لوط کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔
اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ (۱۶۲) جبکہ ان کے بھائی لوط نے کہا - کہ کیا تم تقویٰ
اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اختیار نہیں کرتے۔
اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ۙ (۱۶۳) میں تمہاری طرف ایک امانتدار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝ۚ (۱۶۴) پس اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو - اور میری اطاعت کرو۔
وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ (۱۶۵) اور میں اس (کام) کے بدلہ میں تم سے کوئی اجرت
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی نہیں مانگتا - میری اجرت تو صرف رب العالمین
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ؕ کے ذمہ ہے۔
اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ (۱۶۶) کیا تمام مخلوقات میں سے تم نے نروں کو
الْعٰلَمِیْنَ ۝ۙ اپنے لیے چنا ہے۔
وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ (۱۶۷) اور تم ان کو چھوڑتے ہو جن کو تمہارے رب نے تمہاری بیویوں کی
رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ حیثیت سے پیدا کیا ہے (مگر یہی نہیں کہ تم ایسا فعل کرتے ہو) بلکہ حقیقت
اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۝ یہ ہے کہ تم انسانی فطرت کے تقاضوں کو ہر طرح توڑنے والی قوم ہو۔
قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ (۱۶۸) انہوں نے کہا، اے لوط! اگر تو باز نہ آیا - تو تُو ملک بدر
لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ۝ کئے جانے والوں میں شامل ہو جائے گا۔
قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ (۱۶۹) اس (یعنی لوط) نے کہا (بہر حال) میں تمہارے عمل کو

اس وجہ سے تھا کہ اس طرح وہ صالح کی تبلیغ میں روک پیدا کرنا چاہتے تھے دیکھیں سورۃ ہود نوٹ ۶۵۵ ۔

۱۵۹-۱۶۰ یعنی بعد میں آنیوالوں کیلئے تو اس میں درس عبرت ہے مگر خود اس قوم کی اکثریت ایمان لانے سے محروم
رہی گو اس نے خدا کا عزیز و رحیم ہونا ثابت کر دیا - عزیز ہونا اس طرح کہ خدا اور اس کا رسول غالب آئے اور رحیم ہونا
اس طرح کہ خدا تعالیٰ نے حضرت صالح کی کوششوں میں برکت دی۔

۱۶۱-۱۶۵ یہاں بھی رسول کی جگہ رسولوں کے انکار کا لفظ رکھنے کی وہی وجہ ہے جو اوپر نوح کے متعلق بیان ہو چکی ہے

اَلْقَالِيْنَ ۝ نفرت سے دیکھتا ہوں۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۷۰) اے میرے رب! مجھے اور میرے اہل کو انکے اعمال سے نجات دے

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۷۱) پس ہم نے اس کو اور اس کے اہل سب ہی کو نجات دی۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِيْنَ ۝ (۱۷۲) سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو گئی۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ (۱۷۳) پھر لوط کو نجات دینے کے بعد سب دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ (۱۷۴) اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی - اور جنکو (خدا کی طرف سے) ہوشیار کر دیا جاتا ہے (لیکن پھر بھی باز نہیں آتے) ان پر برسائی جانیوالی بارش بہت بُری ہوتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۷۵) اس واقعہ میں یقیناً ایک بڑا نشان تھا لیکن ان (کفار) میں سے اکثر پھر بھی مومن نہ بنے۔

---

۱۶۹ یہاں بتایا گیا ہے کہ عذاب ظاہری کی نسبت عمل بد سے نجات انکی زیادہ اہم ہے نیز یہ کہ نفرت بدی سے ہونی چاہیئے۔ نہ کہ بدانسان سے۔ جیسی دشمن کے ساتھ بھی ناانصافی سے اسلام نے منع کیا ہے (مائدہ ع۲) بلکہ اس سے نیکی اور حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے (ممتحنہ ع۲) کیونکہ جن کی خیرخواہی کا جذبہ نہ رہے اس کی اصلاح سے غفلت ہو جانا یقینی ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں لوطؑ کے بلند اخلاق کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا فرمایا ہے (انبیاء ع۵) مگر بائیبل نے ان پر بیٹیوں سے بدکاری کا الزام لگایا ہے۔ (پیدائش ۱۹/۳۰-۳۸) اور لکھا ہے کہ اس بدکاری کے نتیجہ میں ان کے دو بیٹے ہوئے مگر بائیبل ہی کی رُو سے وہ بیٹے دو بڑے خاندانوں کے باپ بنے۔ اگر لوطؑ ایسے ہی ہوتے تو کیا خدا تعالےٰ ان کو ایسی برکت دیتا؟

۱۷۰ اس سے پتہ لگتا ہے کہ انسان کو بدی سے نفرت ہو پھر بھی اس کے اثرات سے بچنے کے لیے دعا کرنی چاہیئے

۱۷۱-۱۷۲ غٰبِر کے معنی کینہ کے ہیں (اقرب) اور یہاں بتایا گیا ہے کہ لوطؑ کی بیوی ان کی تعلیم سے کینہ رکھنے والی تھی اس لیے موردِ عذاب ہوئی۔ بائیبل کہتی ہے کہ لوطؑ کی بیوی بچائی گئی تھی (پیدائش ۱۹/۱۶) مگر پھر لکھا ہے کہ اس نے مڑ کر دیکھا تو نمک کا کھمبا بنا دی گئی (پیدائش ۱۹/۲۶) یہ متضاد بیان بتاتے ہیں کہ انسانی دست بُرد نے بائیبل کے بیانات کو مخدوش بنا دیا ہے۔

۱۷۳-۱۷۴ پتھر برسائے جانے کا ذکر حجر ع۵ میں کیا گیا ہے۔

۱۷۵ اس میں یہ اشارہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن شرارتوں سے باز نہ آئے تو قوم لوطؑ والا سلوک ان سے بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ جیسے قوم لوطؑ پر پتھر برسے بدر کے دن ان پر بھی

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾ تیرا رب یقیناً وہ ہے جو غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧٦﴾ بَن کے رہنے والوں نے بھی رسولوں کا انکار کیا تھا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾ جب ان سے شعیب نے کہا۔ کہ کیا تم تقوےٰ نہیں کرتے؟

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٧٨﴾ میں تمہاری طرف ایک امانتدار پیغامبر کی حیثیت سے آیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٧٩﴾ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَا أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٨٠﴾ اور میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میری اُجرت صرف رب العالمین (خدا) کے ذمہ ہے۔

ہے اور جس طرح سدوم کی بستی کے اوپر کے حصہ کو نیچے کر دیا گیا۔ اسی طرح کفار مکہ کی عزتیں خاک میں مل گئیں۔

ن ۱۷۶ دیکھیں نوٹ ۱۶۰

ن ۱۷۷ تا ۱۸۰ ایکۃ کے معنے ہیں ایسا درخت جس کی ٹہنیاں بہت پھیلی ہوئی ہوں (۲) ایسا جنگل جس میں کثرت بیریاں اور پیلو کے درخت ہوں اسی طرح اَیْکَۃ اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو بھی کہتے ہیں۔

ن ۱۸۱ سب رسولوں نے جو یہ کہا۔ کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی طرف سے جس اطاعت کا حکم آتا ہے وہ جبری اطاعت نہیں ہوتی۔ بلکہ اطاعت کروانے والا در اصل بندوں کا خادم ہوتا ہے اور خادم بھی ایسا جو خدمت کی اجرت نہیں لیتا۔

اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کے متعلق فرماتا ہے قُلْ لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ $\frac{24}{23}$) بعض نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ میں تم سے ذاتی طور پر اجر نہیں مانگتا۔ ہاں یہ خواہش کرتا ہوں میرے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا۔ مگر یہ بھی اجر مانگنے والی بات ہے حالانکہ قرآن نے اس کا رد کیا ہے۔ (سباء $\frac{1}{48}$ ۳) اس لیے اس کے معنے یہ ہیں کہ میں تم سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا۔ ہاں تمہاری اصلاح اور ترقی کے لیے یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ ایسی ہی محبت ہو جیسی ذوی القربیٰ میں ہوتی ہے۔ اس آیت کا اگلا حصہ بتا رہا ہے کہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى سے مراد دنیوی سلوک نہیں ورنہ نزد له فیها حسنًا کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے اس کے معنے تو یہی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ جس طرح بچہ بغیر فکر اور دلیل کے اپنے والدین کی نقل کرتا ہے اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم میری نقل کرو۔ جو ایسا کریگا نزد له فیها حسنًا ہم ترقی دیکر ایسے مقام پر پہنچا دینگے کہ اسے عمل کے متعلق کامل بصیرت حاصل ہو جائیگی۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا (۱۸۲) (اے لوگو!) پیمانہ پورا (بھر کر) دیا کرو۔ اور (دوسروں
مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ کو) نقصان پہنچانے والے مت ہو۔
وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ (۱۸۳) اور سیدھی ڈنڈی تولا کرو۔
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (۱۸۴) اور لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دیا کرو
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ اور ملک میں ہرگز فساد نہ کیا کرو۔
وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَ (۱۸۵) اور جس نے تم کو اور تم سے پہلی مخلوقات کو پیدا
الْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ۝ کیا ہے اس کا تقوٰی اختیار کرو۔
قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ (۱۸۶) (اس پر اس کی قوم نے کہا تو تو ایسا شخص ہے) جسے غذا دیجاتی ہے
وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَ (۱۸۷) اور تو صرف ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ اور ہم یقیناً
إِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ تجھے کاذب سمجھتے ہیں۔
فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ (۱۸۸) پس اگر تو سچا ہے تو ہم پر کوئی بادل کا
إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ ٹکڑا گرا۔

۱۸۲-۱۸۴ قسطاس کے معنے اس ترازو کے ہیں جو بالکل صحیح تول دیتا ہو (اقرب) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم میں شرک کے علاوہ تجارتی بد دیانتی کا بھی زور تھا۔ یہ احمقانہ خیال ہے کہ روپیہ صرف بے ایمانی سے حاصل ہوتا ہے۔ صحابہ برابر میں دیانت کو مدنظر رکھتے تھے مگر حضرت عبدالرحمٰن کا ترکہ دو کروڑ روپیہ نکلا تھا جو آجکل کے دو ارب کے برابر ہے حالانکہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ بعض دفعہ چیز بیچنے والا کم قیمت لینے پر اور خریدنے والا زیادہ دینے پر مُصر ہوتے تھے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں بھی بکثرت ہوتی تھیں۔ چونکہ وہ گھنے جنگلوں میں رہتے تھے اور اس کا علاقہ عرب و شام اور مصر کے راستہ پر تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹ کر جنگلوں میں چھپ جاتے ہونگے۔

۱۸۵ اس میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم سے پہلے بھی کئی طاقتور قومیں گذری ہیں۔ جب انہوں نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی تو وہ تباہ ہوگئیں۔ پھر تم کیوں اپنی چند روزہ زندگی میں تقوٰی سے کام نہیں لیتے۔ اور مادی لذات کے حصول کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہو۔

۱۸۶ دیکھیں نوٹ ۱۵۴

۱۸۷ دیکھیں ہود نوٹ ۳۲

۱۸۸ یعنی اتنی بارش ہو کہ بجائے فائدہ کے موجب تباہی بن جائے۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۸۹) (اس پر شعیبؑ نے) کہا میرا رب تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ (۱۹۰) مگر (اس کے سمجھانے کے باوجود) انھوں نے اس کو جھٹلایا پس

يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ان کو سایہ کے دن والے عذاب نے آپکڑا (یعنی گھنے اور دیرپا

عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ بادلوں کے عذاب نے)، وہ یقیناً ایک بڑے بھاری دن کا عذاب تھا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا (۱۹۱) اس واقعہ میں ایک بڑا نشان تھا اور (اسے دیکھ کر بھی)

كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ان کافروں میں سے اکثر مومنوں میں شامل نہ ہوئے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ (۱۹۲) اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار کرم

الرَّحِيْمُ ۝ ع کرنے والا ہے۔

ع ۱۱

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۹۳) اور یقیناً یہ (قرآن) رب العالمین خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ (۱۹۴) اس کو لیکر ایک امانت دار کلام بردار فرشتہ (جبریل)

---

۱۹۰ قرآن میں عذاب کے متعلق صیحۃ (۱۱/۹۵) اور رجفۃ (۲۹/۳۸) کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں صیحۃ کے معنے مطلق عذاب اور ایسی تباہی کے ہیں جو اچانک آجائے اور رجف الانسان کے معنے ہوتے ہیں کہ کسی خوف کی وجہ سے اس کا قرار چھینا گیا۔ اسی طرح رجف الرعد کے معنے ہوتے ہیں بادلوں میں بڑے زور سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ اور یہ الفاظ بھی بارش کے تباہ کن عذاب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۱۹۱-۱۹۲ دیکھیں نوٹ ۱۶۰

۱۹۳ پہلے انبیاء کی تعلیم چونکہ قومی تھی ان کے پیرو الگ الگ خدا پیش کرنے لگ جاتے تھے جیسے فرعون نے کہا۔ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء ۲۶/۲۴) اور آنحضرتؐ کے نظریہ توحید سے حیران ہو کر کفار کہتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص ۳۸/۵)، پہلے انبیاء نے تکالیف اٹھائیں مگر صرف اپنی قوم کے لیے لیکن آنحضرتؐ نے رب العالمین خدا کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہوئی تھی (جیسا کہ ۶/۱۶۳ سے ظاہر ہے) اس لیے آپؐ ساری مخلوق کے لیے دکھ اٹھاتے تھے۔ اور آپؐ ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ حدیث بعثت الی الاسود والابیض سے ظاہر ہے۔

غرض رب العالمین کا تصور صحیح معنوں میں آنحضرتؐ نے دنیا میں قائم فرمایا اور اسی کی طرف ان آیات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

۱۹۴ عیسائیوں کو فخر ہے کہ مسیح پر روح القدس اتری۔ مگر آنحضرتؐ پر بھی روح القدس ہی کلام لے کر نازل ہوا (نحل ۱۶/۱۰۲) اور پہلے انبیاء پر بھی بلکہ تمام فرشتے بھی بوجہ اس کے وہ جو حکم ہو صرف وہی کرتے ہیں ۶۶

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ﴿۱۹۴﴾ تیرے دل پر اترا ہے۔ تاکہ تو ہوشیار کرنے والی جماعت میں شامل ہو جائے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (۱۹۶) (اسکو جبریل نے خدا کے حکم سے) کھول کر بیان کرنیوالی عربی زبان میں اتارا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ (۱۹۷) اور یقیناً اس کا ذکر پہلی کتابوں میں بھی موجود تھا۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ (۱۹۸) کیا ان کیلئے یہ نشان کم ہے کہ اس (قرآن) کو علمائے بنی اسرائیل بھی پہچانتے ہیں (یعنی سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے)

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۙ﴿۱۹۸﴾ (۱۹۹) اور اگر ہم اس کو عجمیوں میں سے کسی پر اتارتے۔

روح القدس ہی ہوتے ہیں اس لیے روح القدس کا مفہوم فرشتہ کے لفظ میں شامل ہے مگر آنحضرتؐ کو یہ زائد امتیاز حاصل ہے کہ آپ پر روح الامین نازل ہوا جس کی وجہ سے نزول قرآن میں کسی غلطی کا امکان نہ رہا۔ دوسری طرف خدا تعالٰی نے نزول کے بعد اس کی مستقل حفاظت کا وعدہ فرما دیا $\frac{۱۵}{۹}$ الیکن انجیل کیلئے نہ نزول کے وقت حفاظت کا وعدہ تھا نہ مستقل حفاظت کا

یوں تو ہر فرشتہ ہی امین ہوتا ہے مگر خاص طور پر اس صفت کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ حفاظت قرآن کا خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے۔

۱۹۵ اس میں بتایا ہے کہ جس پر کلام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اسے ایک قلبی پاکیزگی اور استقامت بھی دی جاتی ہے۔

اس سے بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ ہر خیال جو دل میں آئے وحی ہوتا ہے مگر یہ غلط ہے۔ آیت $\frac{۷۵}{۱۹-۱۷}$ اس امر پر نص صریح ہے کہ قرآن کریم آنحضرتؐ کے قلب مطہر پر ہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کو پڑھایا بھی جاتا تھا۔ علق $\frac{۱۹۳}{۱-۱}$ سے بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ قرآنی آیات معین الفاظ میں آپ پر نازل ہوتی تھیں۔

۱۹۶ عربی اور مبین کے لیے دیکھیں سورۃ یوسف نوٹ ۲

۱۹۷ قرآن کی ایک یہ فضیلت ہے کہ اس کا ذکر پہلے انبیاء کی کتب میں بھی موجود ہے مثلاً (یسعیاہ $\frac{۲۸}{۱۳-۹}$) میں پیشگوئی تھی کہ فترت کے لمبے زمانہ کے بعد آسمانی دودھ (یعنی کلام) نازل ہوگا۔ جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ مختلف مقامات پر لمبے زمانہ میں اترے گا۔ اور آنے والا رسول وحشی کے سے ہونٹوں سے کلام کرے گا۔ بائیبل کی اصطلاح میں عربوں کے لیے وحشی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں محمد رسول اللہ صلعم کے عرب میں مبعوث ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹۸ یعنی انبیاء بنی اسرائیل نے اس قرآن کی خبر دی ہے۔ اور جب ان نبیوں کی خبریں جو مدون

فَقَرَاَهٗ عَلَیۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَؕ (۲۰۰) اور وہ اس کو ان اکفار کے سامنے پڑھ کر سناتا تو وہ کبھی بھی اس پر ایمان نہ لاتے۔

كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِيۡنَؕ (۲۰۱) اسی طرح ہم نے مجرموں کے دلوں میں یہ (بات) داخل کر چھوڑی ہے۔

لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَۙ (۲۰۲) (پس) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔

فَيَاۡتِيَهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَۙ (۲۰۳) پس وہ (عذاب) ان کی لاعلمی میں ان کے پاس اچانک آجائے گا۔

فَيَقُوۡلُوۡا هَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَؕ (۲۰۴) تب وہ کہیں گے کیا ہمیں ڈھیل مل سکے گی؟

اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ‏ (۲۰۵) سو (بتاؤ کہ) کیا یہی لوگ ہمارے عذاب کو جلدی مانگا کرتے تھے۔

اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَۙ (۲۰۶) پس کیا تجھے یقین نہیں ہے کہ اگر ہم ان کو سالوں تک فائدہ پہنچاتے جاتے۔

ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَۙ (۲۰۷) پھر ان کے پاس وہ (عذاب) آجاتا جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا (۲۰۸) تو جو کچھ بھی ان کو دیا گیا ہے وہ ان سے اس (عذاب)

پہلے گذر چکے ہیں پوری ہوگئی ہیں تو کیا یہ نشان کافی نہیں۔

سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس جگہ علماء سے مراد وہی ہیں جن پر زیر اثر ہیں۔

۱۹۹-۲۰۰ عجمی غیر عرب کو بھی کہتے ہیں اور اسے بھی جو خواہ ہو عرب مگر اپنا مافی الضمیر ادا نہ کر سکے۔ یہاں کفار کو بتایا گیا ہے آنحضرتؐ عربوں میں سے ہیں اور کہیں باہر نہیں رہے تم ان کے اخلاق سے واقف ہو (یونس ۱۷/۱۰) پھر تم اس کی صداقت کے منکر کیسے ہو سکتے ہو بالخصوص اس صورت میں کہ خارجی شواہد اور انبیاء کی پیشگوئیاں اس کی تائید میں ہیں۔

۲۰۱-۲۰۲ آیات ۲۰۱ سے ۲۰۰ کے تسلسل میں فرماتا ہے کہ ایسے قرآن کا انکار بتاتا ہے کہ وہ عذاب دیکھے بغیر ایمان نہیں لائیں گے۔

۲۰۳ فرمایا عذاب تو آگرہے گا مگر اچانک آئیگا چنانچہ فتح مکہ کا واقعہ ایسا اچانک ہوا کہ ابوسفیان جیسا جہاندیدہ بھی حیران رہ گیا۔ اور پھر قرآنی پیشگوئی کے مطابق یہ لوگ ایمان لے آئے جبکہ پہلے لوگ نہیں لائے تھے اور خدا نے اپنے عزیز و رحیم ہونے کا ثبوت دے دیا۔

۲۰۴-۲۰۵ فرمایا عذاب میں دیر کی وجہ سے وہ ہنسی اڑاتے اور تمسخراً کہتے ہیں کہ شاید ہم کو ڈھیل دی جائیگی۔ ان کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہمارے غضب کو بھڑکا کر عذاب جلدی لانا چاہتے ہیں۔

يُمَتَّعُوْنَ ۝ کو ٹلا نہیں سکتا تھا۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا (۲۰۹) اور ہم نے کسی بستی کو بغیر اس کے کہ اس کی طرف نبی بھیجے مُنْذِرُوْنَ ۝ۖ ہوں ہلاک نہیں کیا۔

ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (۲۱۰) یہ اسلئے کیا گیا کہ ان کو نصیحت پہنچ جائے اور ہم ظالم نہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ (۲۱۱) اور شیطان اس (قرآن) کو لے کر نہیں اُترے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ (۲۱۲) اور نہ یہ کام ان کے مطابق حال تھا۔ اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے تھے۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (۲۱۳) وہ یقیناً (کلام الٰہی کے) سننے سے دُور رکھے گئے ہیں۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۱۴) پس تو (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکار۔

فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ ورنہ تو مبتلائے عذاب لوگوں میں سے ہو جائے گا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (۲۱۵) اور تو سب سے پہلے) اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔

۲۰۷-۲۰۸ ف یعنی فائدہ تو ہدایت پا کر ہو سکتا ہے۔ ورنہ عذاب میں اگر کچھ وقفہ پڑ جائے۔ تو اس سے کیا فائدہ۔

۲۰۹-۲۱۰ ف ذکرٰی کہکر بتلایا کہ ڈرانے والے کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اس لیے اس کے بعد بھی عذاب میں ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ جو ایمان لا سکتے ہوں وہ ایمان لے آئیں۔

۲۱۱-۲۱۳ ف اس آیت سے اور تکویر ۱۸/۲۶ سے پتہ لگتا ہے کہ کفار کا ایک یہ اعتراض بھی تھا کہ آپ پر شیطان نازل ہوتا ہے۔ فرماتا ہے یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ (ا) محمد رسول اللہ صلعم کا چال چلن ایسا پاکیزہ ہے کہ ایسے شخص کا شیطان سے تعلق ممکن ہی نہیں (ب) ناپاک شیطان ایسی پاک تعلیم اور ایسی تعلیم جو خود اس کے خلاف ہے اتار ہی نہیں سکتا۔ یہی دلیل مسیح نے بھی استعمال کی ہے (دیکھیں لوقا ۱۱/۱۴-۱۸ متی ۱۲/۲۴) (ج) اس میں آسمانی علوم ہیں جن تک شیطان کی رسائی ہی نہیں کیونکہ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں جو دلیل دی گئی ہے۔ کہ اس میں اخبار غیبیہ ہیں جن کا بیان کرنا شیطان کی طاقت سے باہر ہے یہ دلیل بھی حضرت مسیح نے استعمال فرمائی ہے (لوقا ۲۴/۳۶-۴۰)۔

۲۱۴ ف یہ اسلیے کہ نبوت صحیحہ کے راز معلوم کرنے کیلیے جو تعلیم غیر اللہ سے ملیگی وہ دکھ دینے والی اور موجب عذاب ہی ہوگی۔

۲۱۵ ف رشتہ داری بڑا بھاری اثر رکھتی ہے اور خونی تعلق کبھی کبھی ایسی قربانیاں بھی کروا دیتا ہے جو دوسرے حالات میں ناممکن نظر آتی ہیں اس لیے آنحضرت کو حکم دیا گیا کہ سب لوگوں کو ڈرا مگر پہلے اپنے عزیزوں کو ڈرا کیونکہ ان کا تجربہ دوسرا حق ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (۲۱۶) اور جو تیرے پاس مومن ہو کر آئیں ان کے لئے محبت کے بازو جھکا دے۔

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ (۲۱۷) پھر اگر کسی وقت وہ تیری نافرمانی کر بیٹھیں تو کہدے کہ میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ (۲۱۸) اور غالب (اور) بار بار کرم کرنیوالی ہستی پہ توکل کر۔

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ (۲۱۹) جو تجھے اسوقت بھی دیکھتا ہے جب تو اکیلا نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔

وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ (۲۲۰) اور اسوقت بھی جبکہ تو (نماز با جماعت کیلئے) سجدہ کرنیوالی جماعت میں سے ادھر ادھر پھرنا بھی دیکھتا ہے۔

---

۲۱۶ مومنوں سے حسنِ سلوک کا حکم اس لیے دیا کہ وہ اور بھی زیادہ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ اوپر مخالفوں اور بالخصوص رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم تھا۔ یہاں دوسرا حکم یہ دیا کہ جو تیرے روحانی رشتہ دار بن گئے ہیں ان کی تربیت کی طرف توجہ کر کیونکہ افراد جماعت کی طاقت کو صحیح استعمال کرنا اور آئندہ نسل میں جذبہ قربانی پیدا کرنا اور اس کی صحیح تربیت کرنا قوموں کو زندہ رکھنے کا ایک حتمی ذریعہ ہوتا ہے۔

۲۱۷ یہ فقرہ آیت ۲۱۵ سے متعلق ہے اور اس میں بتایا ہے کہ رشتہ داروں کو تبلیغ کرنی چاہیئے اور ان سے حسنِ سلوک کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں تو پھر ان سے ایک حد تک علیحدہ ہو جانا چاہیئے تاکہ انہیں ندامت ہو۔ اور تم ان کے بد اثرات سے بچ سکو۔ حضرت مسیحؑ نے بھی یہی بات سکھائی ہے (متی ۱۰/۱۴)

۲۱۸-۲۲۰ فرمایا (۱) تو خدا پہ توکل رکھ کہ وہ تیری مدد کرے گا (۲) الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وہ خوب جانتا ہے کہ تیرے اندر کیا روح کام کر رہی ہے۔ یعنی تجھ میں تربیت کا صحیح جذبہ موجود ہے (۳) وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ تو ان میں پھرتا ہے جو ہر طرح تیری اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔

اس میں بتایا ہے کہ تربیت و اصلاح کے لیے عزیز و رحیم پر توکل کا ہونا، تربیت کی صحیح روح کا ہونا اور جن کی تربیت کی جائے ان میں اطاعت کا مادہ ہونا ضروری امور ہیں اور یہ تینوں تجھے میسر ہیں۔

تقلب فی السّٰجدین سے مفسرین نے یہ مطلب نکالا ہے کہ آنحضرتؐ کے تمام آباء ساجد یعنی مومن تھے مگر یہ درست نہیں کیونکہ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی والدہ کے لیے دعائے مغفرت کی اجازت نہیں دی (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۵۵) اسی طرح جناب عبدالمطلب بھی توحید کے متعلق تردد کی حالت میں تھے۔

اصل میں ساجد کے معنے ایسے فرمانبردار کے ہوتے ہیں جو ہر بات کو تسلیم کرتا ہو۔ اور اس میں بغاوت اور نشوز کے آثار نہ ہوں۔ اور تقلب کے معنے کسی چیز کی طرف بار بار جانے کے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کا تقلب صحابہؓ ہی میں تھا اس لیے یہاں بتایا گیا ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہمارا تجھ پر

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ (۲۲۱) یقیناً وہ (خدا ہی) بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ○ (۲۲۲) کیا میں تمہیں بتاؤں۔ کہ شیطان کس پر اُترتے ہیں؟

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ○ (۲۲۳) (شیطان) ہر جھوٹے گناہگار پر اُترتے ہیں۔

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ○ (۲۲۴) وہ اپنے کان (آسمان کی طرف) لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ احسان ہے کہ تو جہاں جاتا ہے موحدین اور ساجدین میں پھرتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تریاق القلوب ایڈیشن سوم صفحہ ۱۳۳ پر اس آیت کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے ..... خدا ..... "تجھے اس وقت دیکھتا تھا جب تو تخم کے طور پر راستبازوں کی پشتوں میں چلتا تھا" اور یہ معنے بظاہر اُوپر کے معنوں کے خلاف ہیں۔ مگر جاننا چاہیئے کہ قرآن کے کئی بطن ہیں۔ اور اس کی آیات کے ایک معنے ان کی انفرادیت کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اور ایک سیاق و سباق کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ ساجد دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مومن ساجد جو خدا تعالیٰ کے قوانین کے پابند ہوں۔ اور ایک سوسائٹی کے ساجد۔ اس جگہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس آیت کے معنے اس کی انفرادی حیثیت کے ماتحت کئے ہیں نہ کہ سیاق و سباق کے تسلسل میں۔ نیز ساجد سے مراد سوسائٹی کا ساجد لیا ہے اور یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرتؐ اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے کہ انبیاء کو ہمیشہ شریف خاندانوں میں پیدا کرتا ہے اگر کوئی نبی ادنیٰ اقوام میں سے آجائے تو لوگ اس کو مان نہیں سکتے۔ ہرقل نے جب ابوسفیان سے آنحضرتؐ کے متعلق یہ پوچھا کہ آپؐ کا خاندان کیسا ہے۔ تو اس وقت اس نے بھی یہی جواب دیا کہ آپؐ کا خاندان اچھا ہے۔ چونکہ آنحضرتؐ کے متعلق پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں تھیں اور انہوں نے آپؐ کو کشفی حالت میں دیکھا ہوا تھا اس لیے تقلب فی السّٰجدین کے معنے تقلب فی الانبیاء کے بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۲۱ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں نمازوں اور دعاؤں میں مشغول رہنے والوں کا ذکر ہے۔

۲۲۲ تا ۲۲۳ اوپر بتایا تھا کہ قرآن کو شیطان نے نازل نہیں کیا اور نہ اس میں ایسا کرنے کی طاقت تھی اب بتاتا ہے کہ شیطان کا تعلق تو افاک اور اثیم کے سوا کسی سے ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر محمد رسول اللہ کی صداقت اور راستبازی کے تو تم بھی قائل ہو پھر شیطان کا آپ سے تعلق کیسے ممکن ہے۔

۲۲۴ یعنی وہ اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ ان پر الہام نازل ہو اور انہیں کچھ غیب کی خبریں

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ (۲۲۵) اور شعراء کی جماعت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے پیچھے چلنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ۙ (۲۲۶) (اے مخاطب) کیا تیری سمجھ میں (اب تک) نہیں آیا کہ وہ (یعنی شعراء) تو ہر وادی میں بے مقصود پھرتے ہیں۔

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۲۷) اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

معلوم ہو جائیں تاکہ وہ اپنی بڑائی جتائیں۔ اور وہ اپنی خواہش میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں شیطانی الہام ہونے لگتے ہیں مگر ہمارا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تو نفسانی رنگ میں کبھی نزول الہام کی خواہش نہیں کرتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں: "مکالمات الٰہیہ کی اپنے نفس سے خواہش نہیں ظاہر کرنی چاہیے۔ خواہش کرنے کے وقت شیطان کو موقعہ ملتا ہے۔ . . . . بلکہ اپنا مدعا اور مقصود یہ ہونا چاہیے کہ . . . . کچھ ایسے اعمال حسنہ میسر آجائیں کہ وہ راضی ہو جائے جس وقت وہ راضی ہوگا تب اس وقت ایسے شخص کو اپنے مکالمات سے مشرف کرنا اگر اس کی حکمت اور مصلحت تقاضہ کرے گی تو وہ خود عطا کر دے گا۔" (الحکم ۲۴ نومبر ۱۹۰۲ء صک)

پھر فرماتے ہیں: "جو اپنے نفس میں پوری پاکیزگی نہیں رکھتے اور پھر خوابوں کی خواہش رکھتے ہیں اور الہامات کی طرف اپنا دل لگاتے ہیں ان کو حدیث النفس اور اضغاث احلام کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" (اخبار بدر ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء ص۲)

يُلْقُوْنَ السَّمْعَ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ موحش انسانوں سے خدا تعالیٰ کی باتیں سنتے ہیں لیکن ان میں جھوٹ ملا کر لوگوں میں مشہور کر دیتے ہیں (تشریح کے لیے دیکھیں انعام $\frac{6}{113}$) ورنہ شعراء ۲۱۳ اور طور $\frac{52}{39}$ سے ثابت ہے کہ وہ آسمانوں پر جا کر خدا تعالیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔

اور پر كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کہہ کر ان میں سے ہر ایک کو جھوٹا کہا گیا تھا مگر وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ میں کہا ہے کہ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اَكْثَرُهُمْ کے الفاظ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین کے لیے آتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ گو بعض غلطی خوردہ بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۲۵ کفار آنحضرت کو شاعر بھی کہتے تھے انبیاء $\frac{5}{2}$ اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ کہ شعراء تو ایسے لوگ ہی گرویدہ ہوتے ہیں جن کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر محمد رسول اللہ کے متبع تو دن ذکر الٰہی میں اور راتیں قیام و سجود میں گذار دیتے ہیں پھر آپ شاعر کیسے ہو گئے۔

۲۲۶ فرماتا ہے شعراء کے سامنے کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا مختلف طبائع کو خوش کرنے کے لیے جو

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۠

(۲۲۸) سوائے (شاعروں میں سے) مومنوں اور نیک عمل کرنے والوں کے اور ان کے جو اللہ (تعالیٰ) کا (اپنے شعروں میں) کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اور (اگر ہجو کرتے ہیں تو ابتداء نہیں کرتے بلکہ) مظلوم ہونے کے بعد (جائز) بدلہ لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو کہ ظالم ہیں ضرور جان لیں گے کہ کس مقام کی طرف انکو لوٹ کر جانا ہوگا۔

ذہن میں آجائے کہتے چلے جاتے ہیں ان کا مقصد صرف لوگوں کے جذبات کو ابھارنا ہوتا ہے خواہ وہ اچھے رنگ میں ہو خواہ بُرے رنگ میں۔

۲۲۷ یعنی شعراء کا قول وفعل ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ کا قول وفعل ایک جیسے ہیں اس لیے تمہارا آپ کو شاعر کہنا عدمِ غور کا نتیجہ ہے۔

۲۲۸ یہاں بعض شاعروں کا استثناء کیا گیا ہے۔ اول وہ جو مومن اور مناسب حال عمل کرنے والے ہیں۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح ہو پھر ہی ایمان کا سچا ہونا ثابت ہوتا ہے ورنہ منافق بھی اپنے آپ کو مومن کہہ لیتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ایمان لایا اور وہ سمجھتا بھی یہی ہے مگر وہ حقیقت ایمان سے ناواقف ہوتا ہے۔ مگر تیسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود بھی فی الحقیقت ایمان کو سمجھتے ہیں اور بندے اور خدا بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مومنوں کی دُوسری خصوصیت یہ بتلائی کہ وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ خلوت میں بھی ذکر کرتے ہیں اور جلوت میں بھی۔ اسلام نے ہر قسم کے اجتماعوں کے لیے بھی ذکر بتلائے ہیں اور تنہائی میں کرنے کے لیے بھی۔ بلکہ نمازوں میں بھی اجتماعی اور انفرادی ذکر جمع کر دیے گئے ہیں۔

مومنوں کی تیسری خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ خود تو کسی پر ظلم نہیں کرتے لیکن جب ان پر ظلم ہو تو وہ پیچھے نہیں ہٹتے دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ یہ سورۃ مکی ہے اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اس وقت تو مسلمان کفار کے ظلم برداشت کر رہے ہیں۔ مگر ایک دن ان کو مقابلہ کی اجازت دی جائیگی مگر اس وقت بھی یہ ظلم نہیں کریں گے بلکہ جائز حد تک ان کے مظالم کا انتقام لیں گے۔

آخر میں آنحضرت کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل دی کہ ظالم عنقریب جان لیں گے کہ ان کا انجام کیسا ہے یعنی خدا تعالیٰ عنقریب اپنی مدد ظاہر کر دے گا اور معترض دیکھ لیں گے کہ آیا وہ شیطان کے پیچھے چل رہے تھے یا مسلمان؟

اٰیاتھا ۹۴	سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعاتھا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۲ (۲) طاہر (اور) سمیع (یعنی پاک اور دعاؤں کا سننے والا خدا) اس سورۃ کا اتارنیوالا ہے۔ اسکی آیتیں قرآن اور ظاہر کتاب کا حصہ ہیں (جو) مومنوں کیلئے ہدایت اور بشارت کا موجب ہیں۔

نزول وترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے سورۃ شعراء میں زیادہ زور اس قانون الٰہی کی تفصیل پر تھا کہ کفار ہمیشہ تباہ ہونے چلے آئے ہیں۔ اب کیوں تباہ نہ ہوں گے۔ اس سورۃ میں اس مضمون کے دوسرے پہلو کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ مومن باوجود کمزور ہونے کے ہمیشہ ترقی پاتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے۔ کہ مسلمان ایک لمبے عرصے تک ترقی کرتے جائیں گے۔ اور بنی اسرائیل کی طرح صرف اپنے ہی ملک کے بادشاہ نہیں بنیں گے بلکہ غیر ملکوں کے بادشاہ بھی بنیں گے۔

سورۃ شعراء کے آخر میں ذکر تھا کہ کفار اس نبی کو شاعر کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر شیطان اترتے ہیں حالانکہ شیاطین کی تعلیم میں جھوٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے اور شاعر نہ خود عمل کرتے ہیں نہ ان کے متبع عمل کرتے ہیں۔ اب اس سورۃ کے شروع میں یہ بتا کر کہ ایک طرف یہ کتاب ہدایت اور بشارت ہے اور دوسری طرف محمد رسول اللہ صلعم کے ماننے والے انسانوں کی ہمدردی اور خدا تعالےٰ کی محبت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ نہ تو اس نبی پر شیطان اترتے ہیں اور نہ اسے شاعر کہا جا سکتا ہے۔

۲ سورۃ شعراء کے شروع میں جو مقطعات تھے ان میں "م" بھی آتا تھا جو مجید کا قائم مقام تھا۔ مگر اس سورۃ میں اسے اڑا دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سورتوں کا مضمون تو مشترک ہے مگر پہلی سورۃ میں جو خدا تعالےٰ کی مجد پر زور دیا گیا تھا اس سورۃ میں اس پر اتنا زور نہیں۔ چنانچہ سورۃ شعراء میں محمد رسول اللہ صلعم کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں موسےٰؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر ہے اور خدا تعالےٰ کی مجد جیسی آنحضرت صلعم کے ذریعہ ظاہر ہوئی دوسرے انبیاءؑ کے ذریعہ ظاہر نہیں ہوئی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ میں بتایا ہے کہ قرآن تلاوت میں اس قدر آتا ہے کہ اور کوئی الہامی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مخالف کہتے ہیں کہ نمازوں میں قرآن کا پڑھنا فرض کیا گیا ہے اور اس کی زبان ایسی رکھی گئی ہے جو جلد حفظ ہو جاتی ہے اس لیے اس کی تلاوت کثرت سے ہو جانا طبعی امر ہے لیکن کثرت تلاوت تو بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے ماننے والوں کی تعداد بھی بہت ہو۔ اور پھر وہ ماننے والے حکم ماننے والے بھی ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ طبعی امر نہیں۔ علاوہ ازیں اگر ذرائع اختیار کرنا ہی قرآن کی کثرت تلاوت کا باعث ہے تو کیوں دوسری کتب کے لیے وہ ذرائع اختیار نہ کر لیے گئے۔ اور اگر خدا تعالےٰ نے تمام کتب میں سے

صرف ایک کتاب کو ہی قرآن بننے کے لیے چنا ہے تو ماننا پڑیگا کہ وہی سب سے افضل ہے۔ اس سورۃ میں صفت
قرآن کو کتاب سے پہلے اور صفتِ مبین کو کتاب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ مگر سورۂ الحجر میں یہ ترتیب الٹ ہے اس
کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ الحجر کی اس آیت کے بعد کفار کا اور سورۂ نمل کی اس آیت کے بعد مومنوں کا ذکر ہے۔ اور
کفار کا قرآن کے متعلق علم زیادہ تر مسلمانوں سے سنکر ہوتا ہے۔ اور سننے پر لفظ قرآن دلالت کرتا ہے پس ان کے
لیے قرآن مبین ہوتا ہے۔ مگر مومنوں کا پڑھنا ان کے سننے سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے کتاب مبین ہوتی ہے
اور یہ جو ان الفاظ کو آگے پیچھے رکھا ہے اس کی وجہ اوّل یہ ہے کہ کافر پہلے کلام کو سنتا ہے پھر جب اس
کا دل صاف ہوجائے تو وہ اسے اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے مگر مومن اسے پہلے واجب سمجھے ہوئے ہوتا ہے
پھر اس کے بعد اس کی قرأت کرتا ہے پس جس چیز سے زیادہ قرب تھا اس کے ساتھ اسے رکھا ہے۔ نیز دیکھیں
سورۃ الحجر نوٹ ۲۔

قرآن میں قُرۡاٰنٍ مُّبِيۡنٍ کا لفظ دو جگہ اور كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ کا لفظ بارہ جگہ استعمال ہوا ہے۔
اس میں یہ اشارہ ہے کہ اکثر لوگ قرآن کے کتاب ہونے سے فائدہ اٹھائیں گے اس لیے مسلمانوں میں تعلیم کا
رواج زیادہ ہونا چاہیئے۔ کتاب مبین میں قرآن کریم کی یہ فضیلت بتائی ہے۔ کہ وہ لکھی ہوئی موجود ہے
چنانچہ قرآن ہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے جو نزول کے ساتھ ساتھ لکھی جاتی رہی ہے۔ اور مخالف بھی معترف
ہیں کہ یہ محرف و مبدل نہیں حالانکہ تورات اور اناجیل محرف و مبدل ہوچکی ہیں۔ پھر کتاب وجوب پر دلالت
کرتی ہے۔ اور صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً مسیح کی اس تعلیم پر کہ کوئی تیرے ایک
گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی آگے کر دے۔ کہیں عمل نہیں ہوتا مگر قرآنی تعلیم کو عفو کے موقعہ پر عفو اور
سزا کے موقعہ پر سزا دو ایسی ہے کہ اس پر اب بھی عمل ہو سکتا ہے اور کرنے والے کرتے ہیں۔

کتاب اصل میں جمع کے معنے رکھتی ہے کتاب کو اس لیے کتاب کہتے ہیں کہ اس میں مختلف مضامین
جمع ہوتے ہیں اور خط بھی اسی لیے کتاب کہلاتا ہے کہ وہ دو دوستوں کو جمع کرتا ہے اور فرض اور حکم
کو بھی اس لیے کتاب کہتے ہیں کہ اس پر عمل کر کے انسان اپنے مطلوب سے مل جاتا ہے اور قضاؤ قدر کو بھی
کتاب اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان اسے پا کر رہتا ہے۔ وحی الٰہی بھی اسی لیے کتاب کہلاتی ہے کہ وہ
خدا اور بندے کو جمع کرنے والی ہوتی ہے

پس وہی کتاب فی الواقعہ کتاب کہلا سکتی ہے جو خدا اور بندے کا تعلق پیدا کر دے اور ایسی کتاب
صرف قرآن کریم ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے خلق الانسان من علق۔ خُلِقَ مِنۡ شَيۡءٍ کے
معنے بھی ہوتے ہیں کہ یہ چیز اس کی فطرت میں رکھی گئی ہے — دوسری جگہ آتا ہے۔ خلق الانسان
من عجل یعنی انسان کی فطرت میں عجلت رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس جملہ کے یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے
انسان کی فطرت میں محبت اور علاقہ کا مادہ رکھا ہے اور اس کی فطرت میں یہ بات مرکوز کر دی گئی ہے کہ

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

(۴) (ایسے مومن) جو نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے رہتے ہیں۔ اور اُخروی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ یا بعد میں آنے والی موعود باتوں پر۔
(۵) وہ لوگ جو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوبصورت کرکے دکھایا ہے پس وہ بھٹکے بھٹکے پھرتے ہیں۔

وہ کسی کا ہو رہے بے شک جب تک اسے اصل چیز نہیں ملتی۔ اس وقت تک وہ کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا ہو رہتا ہے مگر جب اسے خدا سے ملنے کا راستہ معلوم ہو جائے تو پھر وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے مذہب پر عمل کئے بغیر انسان سب کچھ بن سکتا ہے مگر خدا رسیدہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے یہی وہ چیز ہے جو سچے مذہب کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام نے خدا رسیدہ بننے کا راستہ بتلایا ہے (۱۲۳)۔ اور کسی مذہب کا کوئی پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اپنے مذہب پر عمل کر کے قرب الٰہی حاصل کر لیا ہے مگر اسلام میں ہر زمانہ میں اس بات کے مدعی ہوتے رہے ہیں بلکہ اسلام اس بات کا دائمی طور پر وعدہ فرماتا ہے (۱۲۴)۔

کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ رکھ کر بتایا کہ قرب الٰہی کے لیے جس قدر امور ہیں قرآن کریم نے ان کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ:۔ اس جگہ هُدًى کی تنوین تعظیم کے لیے استعمال کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہدایت کا کوئی درجہ ایسا نہیں جس کی طرف قرآن رہنمائی نہ کرتا ہو یعنی کامل ہدایت جس نے انسان کو نقطہ کمال تک پہنچا دیا۔ اور جس کے بعد اور کسی ہدایت کی ضرورت نہیں قرآن ہی ہے اور اس کے ذریعہ خدا تعالٰی ہدایت کے راستہ پہ چلنے والوں کو ہدایت دیتا چلا جاتا ہے کیونکہ جس طرح خدا تعالٰی غیر محدود ہے اس کے قرب کی راہیں بھی غیر محدود ہیں۔ (۱۲۵)

وَبُشْرٰى:۔ یعنی قرآن جو قرب الٰہی کے غیر متناہی دروازے کھولتا ہے تو اس کی تائید میں مومنوں کو بشارتیں بھی دیتا ہے اور نشانات کے ذریعہ ان کے ایمان کو تقویت دیتا اور ان کے دشمنوں پر حجت تمام کرتا ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ:۔ یعنی قرآن ہدایت و بشارت تو ہے مگر صرف منہ سے اظہار ایمان کرنے والوں کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے ہے جو نماز باجماعت ادا کرتے، ہمیشہ زکوۃ دیتے اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ (۶) الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝	اُن کے لیئے دردناک عذاب ہوگا - اور وہ آخری زندگی میں سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہوں گے ۔
وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ (۷) لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝	اور تجھ کو یقیناً قرآن اس ہستی کی طرف سے مل رہا ہے ۔ جو بہت حکمت والی (اور) بہت جاننے والی ہے ۔
اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ	(۸) (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے ایک

۵-۶ یہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بد عملی اور ان کے انکار کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار فرمایا ہے - جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ اپنے برے اعمال کو بھی اچھا سمجھتے ہیں یعنی نیکی اور بدی میں اصولاً کوئی فرق نہیں کر سکتے کیونکہ جب نہ اچھے کام کا کوئی نتیجہ ہے نہ برے کا تو پھر کسی فعل کا اچھا اور برا ہونا کوئی معنے نہیں رکھتا

ان آیات میں یہ بھی اشارہ ہے کہ عمل نیت سے ہوتا ہے گو کفار کے بھی بعض اعمال مومنوں کے مشابہ ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کی نیت نیک نہیں ہوتی اور حصول رضاء الٰہی کی خواہش نہیں ہوتی ان کے اعمال روحانی رنگ میں نتیجہ خیز نہیں ہوتے ۔

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ ۔ اس میں عام قانونِ قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کوئی عمل تواتر سے کرے تو اسے اس سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ فطرت انسانی کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے اس لیے اسے خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے ورنہ اس میں کسی خاص تقدیر کی طرف اشارہ نہیں ۔ چونکہ خدا تعالیٰ کا یہ بھی قانون ہے کہ کسی برے کام کا اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا - اس لیے فرمایا ہے کہ باوجودیکہ انہیں ان کے برے اعمال اچھے لگتے ہیں وہ ان کے نتائج بد سے بچ نہیں سکیں گے ۔

۷ تُلَقَّى کے معنے براہ راست منہ در منہ کلام سننے کے ہوتے ہیں ۔ فرماتا ہے بے شک دشمنوں کی دشمنی انتہا تک پہنچ چکی ہے مگر یہ تعلیم وہ ہے جو حکیم و علیم خدا تجھے بالمشافہ سکھا رہا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایک حکیم و علیم ہستی کی تعلیم کو دنیا قبول نہ کرے یا اسے مٹا سکے ۔

سورۂ شعراء میں فرمایا تھا کہ آنحضرت ؐ پر روح الامین کلام اتارتا ہے - اور یہاں فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ بالمشافہ تجھ سے کلام فرماتا ہے - اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ روح الامین کے کلام لانے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس نے من وعن کلام پہنچا دیا - اس لیے وہ ایسا ہی ہو گیا جیسا بالمشافہ کلام - پس یہ آیت سورۂ شعراء کی آیت کی وضاحت کرتی ہے اس کے مخالف نہیں ۔

۸ خدا تعالیٰ کے لطیف و سمیع ہونے کی دلیل کے طور پر یہاں موسیٰ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے - یہاں موسیٰ نے "ایک آگ" کہا ہے یہ نہیں کہا کہ میں نے آگ دیکھی - دوسرے آپؑ نے کہا

اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

آگ دیکھی ہے۔ میں یقیناً تمہارے پاس اس (آگ) سے کوئی (عظیم الشان) خبر لاؤنگا۔ یا تمہارے پاس ایک چمکتا ہوا انگارہ لاؤنگا تاکہ تم آگ سینکو۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۹) پھر جب وہ اس (یعنی آگ) کے پاس آئے تو انکو آواز دی گئی کہ جو کوئی آگ میں ہے اور جو اس کے گرد ہے اس کو برکت دی گئی ہے اور اللہ رب العالمین پاک ہے۔

یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ۙ

(۱۰) اے موسیٰ! بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں جو غالب (اور) حکمت والا ہوں۔

کہ وہ آگ مجھے نظر آتی ہے جس میں اشارہ ہے کہ وہ دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ اس لیے وہ آگ مادی نہیں تھی بلکہ وہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ کشف میں آگ دیکھنے سے مراد ہدایت ہوتی ہے اور ہدایت دیکھنے والے کے لیے مخصوص بھی ہو سکتی تھی۔ اور ساری قوم کے لیے عام بھی۔ اور چونکہ موسیٰؑ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جلوہ جلوۂ ولایت ہے یا جلوۂ نبوت اس لیے آپ نے فرمایا۔ سَاٰتِیْکُمْ مِّنْهَا الخ۔ قبس سے مراد عام انگارہ نہیں بلکہ یہاں چونکہ جلوۂ الٰہی کا نام آگ رکھا گیا ہے اس کے آثار کا نام قبس رکھا گیا ہے۔

۹ کشف میں آگ دیکھنے سے مراد جذبۂ محبتِ الٰہی ہوتا ہے۔ پس "بُوْرِکَ" سے مراد خدا تعالیٰ نہیں کیونکہ وہ مجسم نہیں اور کوئی اسے برکت نہیں دیتا۔ اور نہ اس سے مراد موسیٰؑ ہیں۔ بلکہ یہاں عام قانونِ الٰہی بیان ہوا ہے۔ کہ ہر وہ شخص جو محبتِ الٰہی کی آگ میں جل رہا ہو اس کو برکت دی جاتی ہے۔ وَمَنْ حَوْلَهَا۔ اور اس کے ہم صحبت بھی برکت پاتے ہیں۔ یہاں ماضی بمعنی مضارع استعمال ہوا ہے۔ ورنہ اگر "مَنْ فِی النَّارِ" سے مراد موسیٰؑ ہوتے تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ مَنْ حَوْلَهَا سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ اس وقت سوائے موسیٰؑ کے آگ کے پاس کون تھا؟

سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کے عیب سے جس میں تجسّم شامل ہے پاک ہے اس لیے یہ خیال کہ آگ میں خدا تھا غلط ہے وہ تو عالمین کا رب اور برکت دینے والا ہے اور جسے برکت دیتا ہے اس کے ذریعہ دنیا میں اس کی سبّوحیت کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۰ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ آگ کے اندر سے آواز آئی تھی بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ ایسی آواز آئی تھی خواہ وہ کہیں سے آئی ہو۔ یہاں آیت ۹ کی طرف اشارہ ہے اور خدا تعالیٰ نے بتایا ہے کہ میری محبت میں جلنے والا اس لیے برکت پاتا ہے کہ میں عزیز و حکیم ہوں۔ جو میری محبت میں جلے گا وہ

وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖ ۝

(۱۱) اور تُو لاٹھی پھینک - اور جب اُس نے اُس (یعنی لاٹھی) کو دیکھا کہ وہ ہل رہی ہے - گویا کہ وہ ایک چھوٹا سا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا - اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (تب ہم نے کہا) اے موسیٰؑ! ڈر نہیں - میں وہ ہوں کہ رسول میرے حضور میں ڈرا نہیں کرتے -

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًاۢ بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۱۲) مگر جس نے ظلم کیا لیکن پھر اس ظلم کو چھوڑ کر نیکی اختیار کی تھی (اس کیلئے) بڑا بخشنے والا (اور) بار بار کرم کرنیوالا ہوں -

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

(۱۳) اور تو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا - یہ ان نو نشانوں میں سے ہے جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جانے والے ہیں - وہ اطاعت سے نکل جانے والی قوم ہے -

---

غالب ہوگا اور غالب بھی اس طرح کہ اسے حکمتیں عطا ہوں گی - یعنی اس کا غلبہ دلائل و براہین پر مبنی ہوگا -

سلہ یہ کشفی نظارہ تھا اور عصا سے مراد جماعت تھی جیسے کہتے ہیں شَقَّ الْعَصَا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے جماعت کی وحدت کو توڑ دیا - اس کشف میں بتایا گیا تھا کہ جب تک تیری اطاعت میں رہے گی تیری جماعت عصا کی طرح کارآمد وجود رہے گی مگر جب اطاعت سے نکل جائے گی تو سانپ کی صفات اختیار کرلے گی -

لَا تَخَفْ ؕ - اس میں بتایا کہ یہ نظارہ تجھے ڈرانے کے لیے نہیں بلکہ حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لیے دکھایا گیا ہے -

سلہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسولوں میں سے بعض ظالم ہوتے ہیں بلکہ جہاں اِلَّا استثناء متصل کے لیے آتا ہے وہاں استثناء منقطع کے لیے بھی آتا ہے یعنی اس کے بعد نئے گروہ کا ذکر شروع ہوجاتا ہے یہاں بھی اِلَّا استثناء منقطع کے طور پر آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ انبیاء تو الگ رہے دوسروں میں سے جو ظلم سے کام لے اور ظلم کے بعد نیکی اختیار کرے ان کے لیے بھی ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں - کیونکہ خدا غفور الرحیم ہے -

سلہ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ - میں بتایا کہ تو اپنی قوم کو اپنے ساتھ چمٹالے یعنی ان کو اپنی ظلِ عاطفت میں لے لے اور ان کی نیک تربیت کر اس کے نتیجہ میں اس قوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کے بے عیب لوگ پیدا ہوں گے لیکن جب وہ تیری تعلیم کو پس پُشت ڈال دیں گے تو جس طرح سانپ زمین کی مٹی کھاتا ہے وہ بھی زمین کی طرف جھک جائیں گے اور دنیا کے کیڑے بن جائیں گے - چنانچہ موسیٰؑ

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ (۱۴) پس جب انکے پاس ہمارے نشانات جو آنکھیں کھول دینے والے تھے آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک کھلا کھلا جادو ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۧ (۱۵) اور انہوں نے اصرار سے ظلم اور تکبر کرتے ہوئے ان (نشانوں) کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان پر یقین لا چکے تھے پس دیکھ کہ فساد کرنیوالوں کا انجام کیسا ہوا کرتا ہے۔

ع ۱۶

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۶) اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا۔ اور دونوں نے کہا۔ اللہ ہی سب تعریف کا مالک ہے۔ جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ (۱۷) اور سلیمان داؤد کا وارث بنا۔ اور اس نے کہا۔ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے۔ اور ہر ضروری چیز (یعنی تعلیم) ہم کو دی گئی ہے یہ کھلا کھلا فضل ہے۔

کی تربیت سے غلام کہلانے والے بادشاہ بن گئے اور ان میں بڑے بڑے ربانی اور احبار بلکہ انبیاء تک پیدا ہوئے اور یہ تمام مقدسین مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کے مطابق معصوم اور بےعیب تھے اور ان پر بائیبل کے لگائے ہوئے الزامات غلط ہیں۔ تسع آیات کے لیے دیکھیں (مخزن معارف یونس تا کہف ص ۲۰۸ - ۱۰۲)

جوؤں کا عذاب اس طرح آیا کہ سردی اتنی پڑی کہ ان کے لیے نہانا مشکل ہو گیا اور بالوں میں جوئیں پڑ گئیں۔ مینڈکوں کا عذاب کثرت باران کے نتیجہ میں آیا۔ خون کے عذاب سے مراد خون کا خراب ہونا بھی ہو سکتا ہے اور جریانِ خون پیدا کرنے والی بیماریاں بھی۔

۱۴-۱۵ یعنی باوجودیکہ یہ نشانات آنکھیں کھولنے والے تھے پھر بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہ نشانات دکھائی تو خدا کی طرف سے دیتے ہیں مگر اصل میں محض اتفاقات ہیں حالانکہ ان کے دل سمجھ چکے تھے کہ یہ اتفاقات نہیں بلکہ عذاب ہیں۔ كَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب دشمنانِ موسیٰؑ ہلاک ہو گئے تو اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے دشمن کیونکر ہلاک نہ ہوں گے۔

۱۶-۱۷ داؤد کو یہود موسیٰؑ کا خاص بیٹا خیال کرتے تھے (اور سلیمانؑ ان کے خلیفہ تھے) اس لیے موسیٰؑ کے بعد ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ○

(۱۸) اور (ایک دفعہ) سلیمان کے سامنے جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اس کے لشکر ترتیب وار اکٹھے کیے گئے۔

مفسرین کا یہ خیال کہ سلیمانؑ کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی تھی صحیح نہیں کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بولی کے سکھانے کا کیا فائدہ تھا؟ پرندے تو غبی سے غبی انسان کے برابر بھی عقل نہیں رکھتے پھر سلیمانؑ نے ان سے کیا سیکھنا تھا؟۔ اگر ان کا دماغ ایسا اعلیٰ ہوتا کہ سلیمانؑ جیسے نبی کو بھی ان سے معارف سیکھنے کی ضرورت ہوتی تو شریعت ان کو ذبح کرنے کی کیوں اجازت دیتی؟۔ یہ اجازت دینا بتاتا ہے کہ ان کا دماغ عام انسانوں کے دماغ سے بھی ادنیٰ ہے۔

دراصل "طیر" اڑنے والی چیز کو کہتے ہیں اور استعارۃً اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو عالم روحانی کی فضاؤں میں پرواز کرتے اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ ہوتے ہیں۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا ایک الہام ہے "ہزاروں آدمی تیرے پروں کے نیچے ہیں"۔ اس الہام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو پرندہ قرار دیا گیا ہے اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں کو بھی عالم روحانی کے پرندے قرار دیا گیا ہے۔ اس الہام نے اس آیت کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ طیر سے مراد جسمانی پرندے نہیں بلکہ اس خدا تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے والے وجود مراد ہیں۔

بائبل حضرت سلیمانؑ کو حکیم قرار دیتی ہے۔ مگر نبی قرار نہیں دیتی ہے (سلاطین ۴/۲۹ تا ۳۴) یہاں اس خیال کی تردید کر کے بتایا ہے کہ وہ نبی اللہ تھے۔

وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ۔ اس سورۃ میں ملکہ سبا کے متعلق بھی آتا ہے۔ وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (آیت ۲۴) ایک ہی زمانہ کی دو شخصیتوں کے متعلق ان الفاظ کا استعمال بتاتا ہے کہ ان سے مراد ہر ضروری چیز کا عطا کیا جانا ہے نہ کہ ہر چیز کا۔ (نیز دیکھیں

ش ۱۸ جنات صرف سلیمانؑ پر ہی ایمان نہیں لائے تھے بلکہ ۴۶/۳۰ تا ۳۲ سے ثابت ہے کہ موسیٰؑ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی جن ایمان لائے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں فرمایا کہ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ وَالْجِنِّ رَسُوْلًا بلکہ یہ فرمایا کہ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (۴/۸۰) اس لیے جہاں یہ ذکر ہے کہ جن آپ پر ایمان لائے وہاں جن الانس ہی مراد ہے نہ غیر از انسان وجود۔

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ پہلے ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا مگر میں روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اس

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

(۱۹) یہاں تک کہ جب وہ وادی نملہ میں پہنچے تو نملہ قوم میں سے ایک شخص نے کہا۔ اے نملہ قوم! اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر (تمہارے حالات کو) نہ جانتے ہوئے تمہیں پیروں کے نیچے مسل دیں۔

حدیث میں قطعی طور پر بتایا گیا ہے کہ انبیاء سابقین میں سے کوئی بھی اپنی قوم کے سوا کسی کی طرف مبعوث نہیں ہوا۔

(۳) اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صرف انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور سلیمانؑ انسانوں کے علاوہ پرندوں کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے تو ماننا پڑے گا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل تھے مگر یہ بالبداہت غلط ہے۔

(۴) پ۶/۱۲۹ سے ثابت ہے کہ جنوں نے انسانوں سے بہت سے فائدے اٹھائے ہیں مگر آیت رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ سے ظاہر ہے کہ انسانوں سے انسان ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے یہاں جن سے مراد جن الانس ہی ہیں۔

(۵) ایک طرف خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جن بھی ایمان لاتے تھے اور دوسری طرف فرماتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کی طرف رسول انہی میں سے آتے رہے ہیں (پ۶/۱۳۱) اس سے ظاہر ہے کہ وہ جن انسان ہی تھے۔

(۶) پ۲۶/۱۰ میں لکھا ہے کہ ہم نے رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو آپؐ کی مدد کرنے کا حکم تھا مگر آپ کی مدد انسانوں ہی نے کی کسی جن کا آپ کی مدد کرنا ثابت نہیں اس لیے آپؐ پر ایمان لانے والے جن بھی انسان ہی تھے۔

(۷) پ۲۲/۵ میں خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ انسان کے علاوہ سب مخلوق نے اس شریعت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جب قرآن سے بھی ثابت ہے کہ جن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے تو معلوم ہو گیا کہ جن انسان ہی تھے۔

اصل میں لغت میں لکھا ہے کہ جن کے معنی ہر ایسی چیز کے ہیں جو حواس سے چھپی ہوئی ہو (اقرب) اس لیے بڑے بڑے لوگوں کو بھی جو عوام الناس سے زیادہ نہیں جن کہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی فوج تین قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ (۱) افراد کا خاص دستہ جسے جن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

(۲۰) پس وہ (یعنی سلیمانؑ) اس کی بات سُن کر ہنس پڑا - اور کہا۔ اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تیری نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والد پر کی ہے شکریہ ادا کرسکوں - اور ایسا مناسب عمل کروں جسے تو پسند فرمائے - اور اے خدا! اپنے رحم کے ساتھ تو مجھے اپنے بزرگ بندوں میں داخل کر۔

---

(۲) عوام الناس کی فوج (۳) روحانی لوگوں کا دستہ جن کے لیے لفظ طیر استعمال ہُوا ہے۔ حضرت سلیمانؑ انہیں الگ الگ کھڑا کیا کرتے تھے کیونکہ یہ سب لڑنے میں ایک جیسے نہیں تھے۔

۱۹ تا ۲۰ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ ہم نے سلیمان کو منطق الطیر کا علم دیا تھا۔ مگر مفسرین نے ان کو چیونٹیوں کی بولی کا علم بھی بخش دیا۔ نہ معلوم انہوں نے کہاں پڑھا ہے کہ چیونٹیاں بھی پرندوں کی ایک قسم ہے۔

اس جگہ نملہ سے مراد چیونٹی نہیں ہوسکتی کیونکہ (۱) دعویٰ تو یہ تھا کہ سلیمان کو منطق الطیر سکھائی گئی تھی۔ اس کے ثبوت میں چیونٹی کا ذکر کیونکر آسکتا تھا۔ (۲) یہاں حطیم کا لفظ ہے جس کے معنے پیروں میں مسل دینے کے نہیں بلکہ طاقت کو توڑ دینے کے اور غصہ میں حملہ کرنے کے ہیں اسی لیے عربی میں قحط کو حاطوم کہتے ہیں کیونکہ اس سے ملک کی طاقت ٹوٹ جاتی ہے پس لَا یَحْطِمَنَّكُمْ کے یہ معنے ہوئے کہ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر غصہ میں تم پر حملہ کر دے اور تمہیں توڑ یعنی روند ڈالے۔ ظاہر ہے کہ چیونٹیوں پر لشکروں سے حملہ نہیں کیا جاتا۔ (۳) یہاں جتنے صیغے استعمال ہوئے ہیں سب ایسے ہیں جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ادخلوا اور کم الفاظ ہیں۔ اُدْخُلْنَ اور کُنَّ کے الفاظ نہیں۔ اسی طرح وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ سے بھی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ چیونٹیاں نہیں تھیں۔

اصل میں شام کے ملک میں "جبرین" اور "عسقلان" کے درمیان ایک علاقہ ہے جسے وادی النمل کہا جاتا ہے (تاج العروس) مقام کی وضاحت کے لیے دیکھیں نقشہ فلسطین و شام بعہد قدیم و جدید نیلسنز نیز انسائیکلوپیڈیا ببلیکا (؟) پھر لغت کی کتاب قاموس جلد ۳ صفحہ ۲۱۹ پر لکھا ہے کہ نملہ قوم کے چشموں میں سے ایک چشمہ کا نام البعوقه تھا۔ اس سے نملہ نامی قوم کا بھی پتہ چل گیا۔

پرانے زمانے میں ایسے نام بہت مقبول تھے جب حضرت سلیمانؑ ملکۂ سبا پر حملہ کے لیے یمن کی

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ (۲۱) اور اس نے سب پرندوں کی حاضری لی۔ پھر کہا مجھے کیا ہوا ہے۔ کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا۔ یا وہ (جان بوجھ کر) غیر حاضر ہے۔

لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ (۲۲) میں اس کو یقیناً سخت سزا دوں گا۔ یا اسے قتل کر دونگا یا وہ میرے سامنے کوئی کھلی دلیل (اپنی غیر حاضری کی) پیش کرے گا۔

طرف چلے تو ان کا گذر نملہ قوم کی وادی میں سے ہوا۔ جب آپؑ وہاں پہنچے تو اس قوم کی ملکہ نے لوگوں کو کہا کہ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ (جو ہتھیار ڈالنے کی علامت تھی جیسا کہ آنحضرتؐ نے بھی فتح مکہ کے موقعہ پر کفار کو ایسا حکم دیا تھا) ایسا نہ ہو کہ اس غلط فہمی کی بناء پر کہ تم ان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو سلیمان کا لشکر تمہیں روند ڈالے حضرت سلیمانؑ نے جب یہ بات سُنی تو آپ ہنس پڑے۔ کہ خدا تعالیٰ نے کس طرح غیر قوموں کے دلوں میں بھی یہ بات ڈال دی ہے کہ سلیمان اور اس کا لشکر دانستہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

۲۱-۲۲ مفسرین کہتے ہیں کہ سچ مچ کے پرندے حضرت سلیمان کے لشکر میں تھے اور اس لشکر کا ایک سردار ہُدہُد تھا مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ **اوّل** حضرت سلیمان کے متعلق ابھی کہا گیا ہے وہ ایک چیونٹی کو بھی جانتے ہوئے پیروں کے نیچے نہیں کچلتے تھے۔ پھر وہ ایک پرندہ پر اتنے خفا کیسے ہو سکتے تھے کہ یہ کہتے کہ یا تو وہ زبردست دلیل (سُلْطَانٍ مُّبِينٍ) لائے (گویا وہ پرندہ دلائل بھی جانتا تھا) یا میں اسے قتل کر دونگا۔ **دوسرے** ہُدہُد تیز پرواز اور دور کے سفر کرنے والے پرندوں میں سے نہیں۔ یہ جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے۔ مگر قرآن یہ بتلاتا ہے کہ یہ ہُدہُد دمشق سے آٹھ سو میل دور سبا کے ملک تک اُڑ کر گیا۔ اور وہاں سے خبر بھی لایا۔ گویا معجزہ دکھانے والا ہُدہُد تھا نہ کہ سلیمان حالانکہ حضرت سلیمان کا معجزہ بتانا مقصود تھا۔ **تیسرے** آیت وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا.... لَا يَهْتَدُونَ سے ظاہر ہے کہ وہ ہُدہُد شرک اور توحید کے اسرار سے بھی واقف تھا پھر سیاست سے بھی واقف تھا۔ کیونکہ اس نے بتایا کہ ملکہ سبا کے پاس بادشاہت کے تمام سامان موجود ہیں۔ (أُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ) اور تخت سلطنت کی حقیقت سے بھی واقف تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ملکہ سباء کے پاس ایک عظیم الشان تخت ہے جو آپ کے پاس نہیں۔

چوتھے حَمَلَهَا الْإِنسَانُ والی آیت سے ظاہر ہے کہ انسان کے سوا کوئی مخلوق اسرارِ شریعت کی حامل نہیں۔ پس جبکہ ہُدہُد بھی اسرارِ شریعت سے واقف تھا تو لازماً وہ بھی انسان ہی تھا نہ کہ پرندہ۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝

(۲۳) پس کچھ دیر وہ ٹھہرا (اتنے میں ہُدہُد حاضر ہُوا) اور اس نے کہا کہ میں نے اس چیز کا علم حاصل کیا جو تجھے حاصل نہیں اور میں سبا کی قوم کے علاقہ سے تیرے پاس (آیا ہوں) (اور) ایک یقینی خبر لایا ہوں۔

اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝

(۲۴) (جو یہ ہے کہ) میں نے (وہاں) ایک عورت کو دیکھا جو ان (کی ساری قوم) پر حکومت کر رہی ہے۔ اور ہر نعمت اسے حاصل ہے اور اس کا ایک بڑا تخت ہے۔

وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(۲۵) اور میں نے اس کو اور اس کی قوم کو اللہ کے سوا سورج کے آگے سجدہ کرتے دیکھا۔ اور شیطان نے ان کے عمل ان کو خوبصورت کر کے دکھلائے ہیں۔ اور ان کو سچے راستہ سے روک دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝

(۲۶) اور مُصر ہیں کہ اللہ کو سجدہ نہ کریں۔ جو کہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ تقدیر کو ظاہر کرتا اور جو کچھ تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو ان تدبیروں کو بھی جانتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہُدہُد آدمی تھا تو اس کے لیے ذبح کا لفظ کیوں آیا ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ ذبح کے معنے قتل کے بھی ہیں قرآن میں آتا ہے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۴۹/۲) کیا وہ سب پرندے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہُدہُد عبرانی لفظ ھُدَدْ (یعنی اونچی آواز والا) کا معرب ہے یہ نام تیسرے ادومی بادشاہ کا بھی تھا اور حضرت اسماعیلؑ کے ایک لڑکے کا نام بھی ہُدہُد تھا (پیدائش ۲۵/۱۴) اور اس کے معنے ادومی خاندان کے آدمی کے بھی ہیں۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا) ادومی خاندان چونکہ حضرت سلیمانؑ کے خاندان کا رقیب تھا انہیں اس خاندان کے سردار کے غائب ہونے پر شبہ گذرا کہ کوئی شرارت نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ھُدھُد عرب قبیلہ کا کوئی سردار ہو۔ اور چونکہ یہود اور عربوں میں دشمنی تھی حضرت سلیمانؑ کو شبہ ہوا ہو کہ شاید اس دشمنی کی وجہ سے اس نے غداری کی ہے۔

۲۳-۲۷ ہُدہُد نے جواب دیا کہ (چونکہ سبا کا علاقہ میرے ملک کا ایک حصہ ہے) میں پہلے سے اس کی خبر لینے چلا گیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ میرے پاس تو ملکہ سبا سے بڑھ کر مال و دولت

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ (۲۶) حالانکہ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۩ (وہ) ایک بڑے تخت کا مالک ہے۔
قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ (۲۸) اس پر سلیمان نے کہا، کہ ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ بولا ہے یا
كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝ تو جھوٹوں میں سے ہے۔
اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ (۲۹) تو میرا یہ خط لے جا اور اسے ان کے (یعنی سبا کی قوم کے)
اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ سامنے پھینک دے پھر (ادب سے) پیچھے ہٹ (کر کھڑا ہو)
مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ۝ جا۔ اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔
قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْۤ اُلْقِیَ (۳۰) (جب اس نے ایسا کیا) تو وہ (ملکہ) بولی۔ اے میرے درباریو!
اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ ۝ میرے سامنے ایک معزز خط رکھا گیا ہے۔
اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَ اِنَّهٗ (۳۱) (جس کا مضمون یہ ہے کہ) یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ جو بے انتہا رحم کرنے
الرَّحِیْمِ ۝ والا اور بار بار کرم کرنے والا ہے اس کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں۔
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَ اْتُوْنِیْ (۳۲) (اور کہتے ہیں) کہ ہم پر زیادتی نہ کرو اور ہمارے حضور
مُسْلِمِیْنَ ۝ میں فرمانبردار بن کر حاضر ہو جاؤ۔

بتاتا ہے کہ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سے صرف یہ مراد ہے کہ ملکہ سباء کو اپنی مملکت کے لحاظ سے جس قدر چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب اسے میسّر ہیں۔

۲۸-۲۹ ہُدہُد کو جو آداب ملحوظ رکھنے کا حکم حضرت سلیمان نے دیا وہ احکام نہ کوئی پرندہ سمجھ سکتا ہے نہ ایسے احکام پرندوں کو دیئے جاتے ہیں۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا بھی ہُدہُد کی زبان سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ ہُدہُد کوئی پرندہ نہیں تھا۔

۳۰-۳۲ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ ..... الخ کے الفاظ میں واضح اشارہ ہے کہ پہلے اس ملک کے لوگوں نے کوئی سرکشی کی تھی۔ اسے دبانے کے لیے آپ نے فرمایا کہ تم فرمانبرداری اختیار کرو گے تو میں تمہارا پہلا قصور معاف کر دوں گا۔ مسیحیوں نے اعتراض کیا ہے کہ بسم اللہ کی آیت مسروقہ ہے۔ مگر وہ کسی یہودی یا مسیحی کتاب کا حوالہ نہیں دے سکے۔ بلکہ زرتشتیوں اور صابیوں کی کتب کے حوالے دیتے ہیں ان کی اس کوشش سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کے حسن کے قائل ہیں مگر جن کتب کا حوالہ دیا گیا ہے وہ خود ان کے ماننے والوں کے نزدیک اصل صورت میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ آیت اسلام کے بعد ان میں لکھی گئی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو پھر بھی

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝

(۳۳) پھر اس (ملکہ) نے کہا۔ اے سردارو! میرے معاملہ میں اپنی پختہ رائے دو۔ کیونکہ میں کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرتی جبتک کہ تم میرے پاس حاضر ہو کر مشورہ نہ دے لو)

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝

(۳۴) انہوں (یعنی درباریوں) نے کہا۔ ہم بڑی طاقت والے ہیں اور بڑے جنگجو ہیں اور (آخری) معاملہ آپکے ہاتھ میں ہے۔ پس غور کر لیں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں (ہم اس کی اتباع کریں گے)

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝

(۳۵) اس نے کہا کہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ اور اس کے باشندوں میں سے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور وہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں۔

کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ قرآن تو خود کہتا ہے۔ کہ یہ آیت پہلے موجود تھی۔ اور حضرت سلیمانؑ کے خط پر بھی لکھی گئی تھی۔ مگر بایں ہمہ قرآن میں ہر سورۃ سے پہلے اس آیت کی موجودگی حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی (استثناء ۱۸/۱۵-۲۰) کو پورا کرنے کے لیے ہے اور جو کلام کسی نئی غرض کے لیے دہرایا جائے وہ نقل یا چوری نہیں کہلا سکتا۔

۳۳ تا ۳۵ آیت ۳۴ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ڈیما کریسی قائم ہو چکی تھی اور بادشاہت کے حقوق محدود تھے۔ اگر ہُدہُد پرندہ تھا تو اسے دیکھنے کے بعد نہ ملکۂ سباء یہ کہہ سکتی تھی کہ جب بادشاہ کسی "زبردست لشکر" کے ساتھ ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو اجاڑ دیتے ہیں اور نہ اس کے سورما اپنے جنگجو اور بہادر ہونے کا تذکرہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ پرندوں کے لشکر کے ساتھ لڑنا سورماؤں کا کام نہیں ہوا کرتا۔

فاتح قومیں کچھ تو غرور کی وجہ سے اور کچھ اس ڈر کی وجہ سے کہ مفتوح قومیں بغاوت نہ کر دیں ان پر انتہائی ظلم ڈھاتی ہیں۔ اور سوائے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے جنھوں نے مکہ فتح کیا تو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہہ کر کفار کو بخش دیا۔ یا آپ کے بعض خدام کے یا ابراہیم لنکن کے جس نے مفتوح قوم کو ذلیل نہیں کیا تھا۔ دنیا میں اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔ حتیٰ کہ توریت نے بھی مفتوحین پر ظلم ہی کی تعلیم دی ہے دیکھیں (استثناء ۷/۱-۲ اور ۲۰/۱۰-۱۴) پس ملکۂ سباء کے سرداروں نے جب یہ کہا کہ ہم لڑنے مرنے کو تیار ہیں تو اس نے جواب دیا کہ دیکھنا صرف یہ نہیں کہ لوگ جنگ کیلئے

وَاِنِّیْ مُرْسِلَۃٌ اِلَیْھِمْ بِھَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝

(۳۶) اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کی طرف ایک تحفہ بھیجوں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ز فَمَآ اٰتٰنِۦَ اللّٰہُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰکُمْ ج بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝

(۳۷) پھر جب وہ تحفہ سلیمان کے سامنے لاکر رکھا گیا تو اس نے کہا کیا تم مال کے ذریعہ سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ اگر یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو تم کو دیا ہے اور (معلوم ہوتا ہے کہ) تم اپنے تحفہ پر بڑے نازاں ہو۔

اِرْجِعْ اِلَیْھِمْ فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَھُمْ بِھَا وَلَنُخْرِجَنَّھُمْ مِّنْھَآ اَذِلَّۃً وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

(۳۸) (اے ہُدہُد!) تو ان کی طرف لوٹ جا اور (ان سے کہدے کہ) ہم ایک بڑے لشکر کے ساتھ انکے پاس آئینگا ایسا لشکر کہ اس کے مقابلہ کی انکو طاقت نہ ہوگی اور میں انکو اس (ملک سے) (مفتوح ہونیکے بعد) ایسی حالت میں نکال دونگا کہ وہ بادشاہت (کی عزت) کھو چکے ہونگے۔

قَالَ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ۝

(۳۹) (اس کے بعد) اس نے (اپنے درباریوں کو مخاطب ہو کر کہا۔ اے درباریو! تم میں سے کون اس کے تخت کو میرے پاس لے آئیگا پیشتر اسکے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر میری خدمت میں حاضر ہوں۔

تیار ہیں یا نہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اگر ہم زندہ رہیں اور سلیمان کی بادشاہت قبول کر لیں تو یہ بہتر ہوگا یا یہ بہتر ہوگا کہ ہم لڑیں اور مارے جائیں۔ اور سلیمان ہمارے ملک پر غالب ہو جائیں۔ کیونکہ جب کسی ملک میں کوئی نیا بادشاہ داخل ہوتا ہے تو وہ اس کے معززین کو رسوا کر دیا کرتا ہے۔ یہی قانون روحانی دنیا میں بھی رائج ہے کہ جب انبیاء آتے ہیں تو ان کے ذریعہ بظاہر ذلیل نظر آنے والے معزز ہو جاتے ہیں اور معزز سمجھے جانے والے ان کا انکار کر کے اپنی عزت ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتے ہیں۔

ت ۳۶ اگر ھُدھُد پرندہ ہوتا تو نہ تو وہ اپنی چونچ میں کوئی معزز تحفہ لے جا سکتا تھا اور نہ حضرت سلیمانؑ اسے دیکھ کر یہ کہہ سکتے تھے کہ کیا تم میری مال سے مدد کرنا چاہتے ہو۔

بلقیس کے تحائف پر حضرت سلیمان اس لیے ناراض ہوئے کہ انہوں نے اسے رشوت سمجھا۔

ت ۳۸ حضرت سلیمانؑ کا یہ قول کہ فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ ۔۔۔۔۔ لَا قِبَلَ لَھُمْ بتاتا ہے کہ وہ پرندوں کا لشکر نہیں تھا وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ :۔ صاغر اسم فاعل ہے جو دوام کے معنے دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دیر تک اس لشکر کی ماتحتی میں رہیں گے۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝

(۴۰) (پہاڑی قوموں میں سے) ایک سرکش سردار نے کہا۔ آپ کے اس مقام سے جانے سے پہلے میں وہ (عرش) لے آؤں گا اور میں اس بات پر بڑی قدرت رکھنے والا (اور) امانت دار ہوں۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝

(۴۱) اس پر اس شخص نے جس کو (الٰہی) کتاب کا علم حاصل تھا کہا کہ میں تیرے پاس اس (تخت) کو تیرے آنکھ جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا۔ پس جب اس نے (یعنی سلیمان نے) اس کو پاس رکھا ہوا دیکھا تو اس نے کہا۔ یہ میرے رب کے فضل کی وجہ سے ہوا ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جو شکر کرے وہ اپنی جان کے فائدہ کے لیے ایسا کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو یقیناً میرا رب بے نیاز (اور) بڑی سخاوت کرنے والا ہے۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(۴۲) (پھر) اس نے کہا کہ اس (یعنی ملکہ) کیلئے اس کا عرش حقیر کرکے دکھاؤ (ہم دیکھیں گے کہ) کیا وہ ہدایت پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے بنتی ہے جو ہدایت نہیں پاتے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝

(۴۳) پس جب وہ آگئی تو کہا گیا۔ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس پر اس نے کہا کہ یُوں معلوم ہوتا ہے یہ وہی ہے؟ اور ہم کو پہلے ہی علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم (تیرے) فرمانبردار بن چکے تھے۔

۳۹-۴۰؎ چونکہ وہ سردار لشکر تھا اس نے اندازہ کرلیا کہ اتنے وقت میں میں ملکہ کو مرعوب کرکے اس کا تخت لے آؤنگا۔

۴۱؎ جب ایک سردار نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ملکہ سبا کا تخت لڑ بھڑ کر اتنے وقت میں لاسکتا ہے تو ایک یہودی عالم بول پڑا کہ میں اس سے پہلے یہ کام کرسکتا ہوں۔ یعنی ویسا ہی تخت اپنے ملک میں بنوا کر حاضر کرسکتا ہوں

۴۲؎ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا سے یہ مراد ہے کہ تم ایسا تخت بناؤ کہ اس کے مقابلہ پر ملکہ کو اپنا تخت حقیر نظر آنے لگے۔

۴۳-۴۴؎ ملکہ کا تجربہ اس طریق پر توڑ لینے کے بعد حضرت سلیمان نے اسے وعظ و نصیحت

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝

(۴۴) اور اس (یعنی سلیمان) نے ملکہ کو اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرنے سے روکا۔ وہ یقیناً کافر قوم میں سے تھی۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِى الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۴۵) اور اسے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جا۔ پس جب اس نے اس (محل) کو دیکھا تو اس کو گہرا پانی سمجھا۔ اور گھبرا گئی۔ تب اس (یعنی سلیمان) نے کہا یہ تو محل ہے جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ تب وہ (ملکہ) بولی۔ اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین خدا پر ایمان لاتی ہوں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

(۴۶) اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو ضرور رسول بنا کر بھیجا تھا (یہ کہتے ہوئے) کہ اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو۔ پس وہ سنتے ہی دو گروہ ہو گئے جو آپس میں جھگڑنے لگے۔

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ

(۴۷) اس (یعنی صالح) نے کہا۔ اے میری قوم! تم خوشحالی کے آنے سے پہلے خراب حالی کے لئے کیوں جلدی

ع ۱۸ ۳

کرنا مناسب سمجھا؟

۴۵ حضرت سلیمانؑ نے جب شرک کے خلاف وعظ کیا تو اس کے ساتھ ملکہ کو عملاً اس کے عقیدہ کی غلطی سمجھانے کے لیے آپ نے یہ تدبیر کی کہ اس کے قیام کے لیے ایسا محل بنایا جس کا فرش شیشے کا تھا اور اس کے نیچے پانی تھا۔ جب ملکہ اس فرش پر سے گذرنے لگی تو اسنے سمجھا کہ یہ پانی ہے اس لئے اس نے جھٹ اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھا لیا۔ یا اسے دیکھکر گھبرا گئی۔ (کشف عن ساق کے یہ دونوں معنے ہیں) جب حضرت سلیمانؑ نے اسے بتایا کہ یہ پانی نہیں شیشہ ہے جس کے نیچے پانی ہے تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ آپؑ نے ایک عملی مثال دے کر یہ سمجھایا ہے کہ جس طرح پانی کی جھلک شیشہ میں دیکھ کر تو نے شیشہ کو پانی سمجھ لیا۔ اسی طرح اجرام فلکی خدا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا نور ان میں جھلک رہا ہے۔ اس دلیل سے متاثر ہو کر وہ بے اختیار بول پڑی رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ ...... الخ

۴۶-۸۰ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں مذہب اور تمدن کی کتاب ہے اس لیے مذہب اور تمدن کے

لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ — کرتے ہو۔ کیا تم خدا (تعالیٰ) سے اپنے گناہوں پر استغفار نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝ — (۴۸) انہوں نے کہا (اے صالح!) ہم نے (جتنا سوچا ہے) تجھے اور تیرے ساتھیوں کو منحوس ہی پایا ہے (یعنی تم لوگ اپنی قوم کیلئے کسی ترقی کا نہیں بلکہ تباہی کا موجب ہوگئے) اس (یعنی صالح) نے کہا تمہاری نحوست کا سبب تو اللہ کے پاس ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو جس کو ابتلاؤں میں ڈالا جا رہا ہے

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ — (۴۹) اور شہر میں نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے۔ اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ — (۵۰) انہوں نے کہا کہ تم سب اس پر اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاؤ کہ ہم اس کے اور اس کے گھر والوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے پھر جو بھی اس کے خون کا مطالبہ کرنے آئیگا ہم اس سے کہیں گے کہ ہم نے اسکے اہل کی ہلاکت (کے واقعہ) کو نہیں دیکھا اور ہم سچے ہیں

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ — (۵۱) اور انہوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور وہ جانتے نہیں تھے۔

لحاظ سے جو واسطہ مختلف قوموں میں تھا اس کے لحاظ سے وہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ اس لیے گو ثمود پہلے گذرے تھے مگر چونکہ ان کا علاقہ حضرت سلیمانؑ کے ماتحت آگیا تھا اور یہودی تمدن نے ان پر اثر ڈال لیا تھا اور انہوں نے حضرت سلیمانؑ کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس لیے ان کا ذکر حضرت اسحٰقؑ کی قوم کے بعد کر دیا گیا۔ کیونکہ درحقیقت جن لوگوں کا نام جنّ رکھا گیا ہے وہ قوم ثمود ہی کے لوگ تھے۔ جنہیں غیر قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے جنّ کہہ دیا گیا۔

دو گروہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ایک حضرت صالحؑ پر ایمان لے آیا۔ مگر دوسرا مخالف ہو گیا اور بجائے یہ سمجھنے کے کہ حضرت صالحؑ انہیں زندہ کرنے آئے ہیں یہ کہنا شروع کر دیا کہ قوم میں بگاڑ صالحؑ کی نبوت کی وجہ سے پیدا ہونا شروع ہوا ہے اگر صالح نہ آتا تو ہماری یک جہتی کو یہ صدمہ نہ پہنچتا۔ حالانکہ وہ مُردوں کی یک جہتی تھی مگر دنیا میں تغیر زندوں سے آتا ہے نہ کہ مُردوں سے۔ حضرت صالحؑ نے انہیں کیا خوب جواب دیا کہ تمہارا نحس اور مبارک شگون تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ اگر تم اسے سزا پر آمادہ کروگے تو وہ سزا دیگا اور اگر انعام پر آمادہ کروگے تو انعام دیگا۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ (۵۲) پھر دیکھ کہ ان کی تدبیر کا نتیجہ کیا نکلا۔ ہم نے اُن کو، اور اُن کی قوم کو سب کو تباہ کرکے رکھ دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۵۳) پس دیکھ، یہ ان کے گھر ہیں جو اُن کے ظلموں کی وجہ سے گرے ہوئے ہیں۔ اس میں علم والی قوم کے لئے بڑا نشان ہے۔

وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (۵۴) اور ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور تقوی کرتے تھے نجات دی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۵) اور (ہم نے) لوطؑ کو (بھی رسول بناکر بھیجا) جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم بدیاں کرتے ہو اور تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (۵۶) کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت کی نیت سے آتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک جاہل قوم ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ (۵۷) پس اس کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ (اے لوگو!) لوطؑ کے خاندان کو اپنے شہر سے نکال دو۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو بڑا نیک بننا چاہتے ہیں۔

۵۴-۵۳ صالحؑ کے مخالف آئمۃ الکفر کی تباہی کا ذکر کرنے کے بعد اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً کے الفاظ میں یہ اشارہ فرمایا کہ صالحؑ کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالف آئمۃ الکفر بھی مل کر آپ پر حملہ کرنے کی سازش کرینگے مگر صالحؑ کے دشمنوں کی طرح وہ بھی ناکام و نامراد رہیں گے۔ اور جس طرح خدا تعالٰے نے حضرت صالحؑ اور ان کے ماننے والوں کو نجات دی اسی طرح وہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو دشمنوں کے نرغے سے نکالکر مدینہ لیجائیگا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی آپؐ کے نو دشمن۔ ابوجہل۔ امیہ بن خلف، عقبہؓ بن ابی معیط، عتبہ، شیبہ، النضر بن حارث، ولید، عاص بن وائل اور ابولہب تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی تھی۔ مگر خدا تعالٰی نے آپؐ کو اس کا علم دے دیا اور ہجرت کی اجازت دیدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہجرت سے اسلام کی ترقی کا نیا باب کھلا اور ان آئمۃ الکفر میں سے اول الذکر پانچوں جنگ بدر میں مارے گئے۔ النضر بن حارث جنگِ بدر میں قید ہوا اور پھر اپنے جرائم کی پاداش میں مارا گیا۔ اور باقی تینوں بھی چار ماہ کے اندر ہلاک ہوگئے۔

فَأَنْجَيْنٰهُ وَأَهْلَهٗٓ إِلَّا امْرَأَتَهٗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ (۵۸) نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اس (یعنی لوطؑ) کو اور اس کے خاندان کے لوگوں کو سوائے اسکی بیوی کے نجات دی ہم نے اس (یعنی بیوی) کو پیچھے رہنے والوں میں گن چھوڑا تھا۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ (۵۹) اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی۔ اور جن کو عذاب کا پیغام پہنچ چکا ہو ان کی بارش بہت بُری ہوتی ہے۔

ربع ۱۹

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۗ آٰللّٰهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۶۰) تو کہہ دے ہر تعریف کا اللہ ہی مستحق ہے اور اس کے وہ بندے جن کو اس نے چن لیا ہو ان پر ہمیشہ سلامتی نازل ہوتی ہے کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا وہ چیزیں جنکو وہ (اس کا) شریک قرار دیتے ہیں؟

۵۵-۵۹ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے چچا زاد تھے ان کا واقعہ یہاں اس لیے بیان ہوا ہے کہ اسے حضرت صالحؑ کی قوم کے واقعہ سے مشابہت ہے۔ دونوں کے خلاف رات کے وقت حملہ کا منصوبہ کیا گیا۔ یہ واقعات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور پیشگوئی بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ قوم لوطؑ کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی آپؐ کو شہر سے نکالنے کا منصوبہ کیا تھا اور دونوں نے الزام یہ لگایا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہم سے پاک قرار دیتے ہیں مگر ہوا یہ کہ جس طرح خدا تعالےٰ نے لوطؑ اور ان کے اہل کو بچا لیا اسی طرح آنحضرتؐ کو اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو بھی بچا لیا (عنتا اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے اہل میں سے تھے) ہاں لوطؑ کی بیوی پیچھے رہ گئی مگر آنحضرتؐ کا مقام چونکہ بلند تھا آپؐ کی کوئی بیوی ان معنوں میں پیچھے نہیں رہی جن معنوں میں لوطؑ کی بیوی رہی۔

وامطرنا.... مطر المنذرین یہ بارش خطرناک زلزلہ کے نتیجہ میں ہوئی یعنی زمین کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور مٹی سینکڑوں فٹ اوپر جا کر پھر نیچے گری اور اس طرح گویا مٹی اور پتھروں کی بارش ہوئی۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بارش بطور عذاب نازل ہوئی وہ ظاہری بارش بھی تھی جو جنگ بدر کے وقت ہوئی اور ریت اور کنکروں کی بارش بھی جو اس وقت آئی جب آپؐ نے ریت کی ایک مٹھی دشمن کی طرف پھینکی اور اس کے پھینکتے ہی مسلمانوں کی پشت کی طرف سے تیز آندھی چل پڑی۔ اور اس کے ساتھ ریت اور کنکروں کا طوفان اٹھا جس نے کفار کی آنکھوں کو اندھا اور ان کے تیروں کو بے ضرر کر دیا اور اس طرح ابوجہل نے جو دعا مانگی تھی (انفال ع۴) وہ پوری ہو گئی۔

۶۰ نبی کے دشمنوں کی تباہی کے ذکر کے بعد توجہ دلاتا ہے۔ کہ جب معبودانِ باطلہ کے ماننے والے ہمیشہ تباہ ہوتے ہیں لیکن خدا تعالےٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء کے ذریعہ ہمیشہ بچائے جاتے ہیں تو

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۞

(۶۱) (بتاؤ تو) آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور (کس نے) تمہارے لئے بادل سے پانی اتارا ہے پھر اس (یعنی پانی) کے ذریعہ سے ہم نے خوبصورت باغ نکالے ہیں تم ان باغوں کے درخت نہیں اُگا سکتے تھے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہے؟ (جو سب کائناتِ عالم کا انتظام کر رہا ہے) لیکن یہ (کافر) ایسی قوم ہیں جو اس کے شریک بنا رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سب تعریف کی مستحق ذاتِ باری ہی ہے

سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی۔ چونکہ برگزیدہ بندوں پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے اس لیے مومنوں کو حکم ہے کہ جب بھی کسی نبی کا نام لیں ساتھ علیہ السلام ضرور کہیں۔ بے شک مرنے کے بعد سب برگزیدہ لوگ خدا تعالیٰ کے سایۂ رحمت میں چلے جاتے ہیں مگر جو روحانی جائیداد وہ دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں اگر اسے گمراہی کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ تو صدیوں تک لوگ گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے سلامتی کی دعا بایں معنی ہوتی ہے کہ ان کی روحانی جائیداد سلامت رہے۔

۶۱ یہاں یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تو تمام نظامِ عالم بنایا ہے لیکن معبودانِ باطلہ خود زمین و آسمان کے محتاج ہیں۔ پھر ان کو خدا کا شریک ٹھہرانا کہاں کی دانشمندی ہے۔

پہلے حصہ آیت میں غائب کی ضمیر ہے اور پھر لکھ کر جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کارخانہ عالم دیکھ کر خدا تعالیٰ کے جلال و جبروت کا نقشہ انسان کے سامنے آجاتا ہے اور وہ اسے غائب نہیں حاضر سمجھنے لگتا ہے

یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ مادی دنیا کی طرح روحانی دنیا میں بھی بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ایک لمبے انتظار کے بعد انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں ظہور ہوتا ہے جو اپنے انفاس قدسیہ سے پیاسی دنیا کو سیراب کرتے اور علم و عرفان کے دریا بہا دیتے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے روحانی باغ تیار ہوتے ہیں۔ مگر جہاں بروقت بارش خدا کے فضلوں میں سے ایک بڑا فضل ہے وہاں اس میں ظلمات اور رعد اور برق بھی ہوتی ہے (بقرہ $\frac{2}{19}$) مگر ان تکالیف کے باوجود بارش کے لیے لوگ دعا مانگتے ہیں کیونکہ اس کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعثتِ انبیاء کے ساتھ بیشک تکالیف ہوتی ہیں مگر مومن کو ان کا دلیری سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اور اس نعمت کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ

(۶۲) (بتاؤ تو) کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا ہے؟ اور اس کے بیچ میں دریا چلائے ہیں اور اس کے (فائدہ) کیلئے پہاڑ بنائے ہیں۔ اور دو سمندروں کے درمیان (جن میں سے ایک میٹھا اور ایک کھاری ہوتا ہے) ایک روک بنائی ہے کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔ (۶۳) (نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دعا سنتا ہے جب وہ اس (یعنی خدا) سے دعا کرتا ہے اور (اسکی) تکلیف کو دور کر دیتا اور وہ تم (دعا کرنیوالے انسانوں) کو (ایک دن) ساری زمین کا وارث بنا دیگا۔ کیا (اس قادر مطلق) اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ تم بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

بارش کے ساتھ بعثتِ انبیاء کی مشابہت کے بیان میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس طرح مادی بارش ہونے پر میٹھی اور کڑوی ہر طرح کی روئیدگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کے آنے پر جہاں ایمان تر و تازہ ہوتا ہے وہاں کفر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر جھوٹے مدعیانِ نبوت کے وقت میں کفر ہرگز اپنا سر نہیں اٹھاتا۔ اور ان کو وہ مخالفت نصیب نہیں ہوتی جو سچے انبیاء کو ہوتی ہے کیونکہ جھوٹے مدعیان سے لوگ کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔

۶۲ سمندر اور دریاؤں میں روک سے مراد یہ ہے کہ سمندر بوجہ نشیب میں ہونے کے دریاؤں کے پانی کو نمکین نہیں بنا سکتے۔ اور دریاؤں کا پانی بوجہ مقدار میں بہت کم ہونے کے سمندر کے نمکین پانی کو میٹھا نہیں بنا سکتا جس طرح نمکین اور میٹھے پانی میں خدا تعالیٰ نے روک بنا دی ہے اسی طرح سے کفر اور ایمان میں بھی دلائل کی دیوار حائل کر دی ہے ایمان کا پانی اپنی حلاوت کی وجہ سے اور کفر کا پانی اپنی تلخی اور مرارت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ بے شک زمین انسانوں کی رہائش کے لیے بنائی گئی ہے۔ مگر پانی کو جمع رکھنے اور دنیا میں پھیلانے کیلئے پہاڑ اور دریا ضروری ہوتے ہیں اسی طرح روحانی زمین کے لیے ایسے کلام کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ہدایت کے ذخائر ہوں [اور پھر ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس ہدایت کو دنیا میں پھیلا دیں] جو خدا یہ سارے سامان کرتا ہے۔ کیا اس کا کوئی شریک ہو سکتا ہے؟

۶۳ اضطرار سے مراد وہ حالت ہے جب انسان کو چاروں طرف کوئی پناہ کی جگہ نظر نہ آتی ہو۔ مگر ایک طرف نظر آتی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دعا قبول ہوتی ہے جس کے کرنے وقت انسان کو یقین ہو کہ سوائے خدا کے میرے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہیں گویا اس سے مراد لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

(۶۴) (بتاؤ تو) خشکیوں اور سمندروں کی مصیبتوں میں کون تم کو نجات کی راہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری کے طور پر ہواؤں کو بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تمہاری شرک کی باتوں سے بہت بلند ہے۔

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

(۶۵) (بتاؤ تو کہ) وہ جو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر (پیدائش کے) سلسلہ کو جاری کرتا ہے۔ اور جو بادلوں اور زمین سے تمہیں رزق دیتا ہے کیا (اس قادرِ مطلق) اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟ تو کہدے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو (کہ اس کے ثانی اور بھی ہیں)

مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ والی حالت ہے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے تو اس آیت کے مطابق بندے کی دُعا خواہ وُہ کسی مذہب و ملّت کا ہو ضرور قبول ہو جاتی ہے اور یہ طریق خدا تعالےٰ نے بندوں کو اپنی ہستی پر یقین دلانے کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ میں بتایا کہ خدا تعالےٰ صرف افراد ہی کی مضطربانہ دعائیں نہیں سُنتا۔ بلکہ قوموں کی بھی سُنتا ہے۔ اور ظالموں کو مٹا کر انہیں ان کا جانشین بنا دیتا ہے جیسا کہ ۱۰/۱۴-۱۵ میں وضاحت ہے۔

۶۴ اس جگہ بَرّ سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام الٰہی نہیں پایا جاتا۔ اور بحر سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام تو پایا جاتا ہے مگر وہ انسانی دخل اندازیوں کی وجہ سے سمندر کے پانی کی طرح شور ہو گیا ہے۔ اسی کی طرف ۳۱/۴۲ میں اشارہ ہے۔

اسی طرح یہاں ہواؤں سے مراد روحانی ہوائیں ہیں اور رحمت سے مراد بعثتِ انبیاء ہے اور یہ بتایا گیا ہے انبیاء کے آنے سے پہلے خدا تعالےٰ ان کی قبولیت کے لیے لوگوں میں جوش پیدا کر دیتا ہے اور لوگ محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ اب کوئی نبی ہی آکر اصلاح کر سکتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے آنے سے پہلے بھی خدا تعالےٰ نے ایسی رَو چلا دی تھی۔ اور لوگ ایک مسیح اور مہدی کا انتظار کرنے لگ گئے تھے اسی لیے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا "میں عین ضرورت کے وقت خدا تعالےٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ صرف یہ کہ میں اس زمانہ کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہوں۔ بلکہ خود زمانہ نے مجھے بلایا ہے (براہین احمدیہ حصّہ پنجم کی یادداشتیں صفحہ ۱۲)

۶۵ طبقات الارض والی پیدائش تو نہ کسی نے دیکھی ہے اور نہ اس کو توحید باری تعالیٰ کی دلیل

کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس جگہ پیدائش اُولیٰ سے مراد قوموں کو سکنت بخشنا اور یُعِیْدُہٗ سے مراد غالب قوموں کے زوال کے بعد ان میں دوبارہ زندگی اور بیداری کی روح پیدا کرنا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں احیا خدا تعالیٰ ہی کے ہاتھوں سے ہوتے ہیں۔

انسان تو ہمیشہ زندہ نہیں رہتے مگر قومیں اگر چاہیں تو ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو یہ فرمایا ہے کہ قدرت ثانیہ کا سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ جب تک تم چاہو گے قدرت ثانیہ تم میں موجود رہے گی۔ قدرت ثانیہ سے مراد ایک تو تائیدات الٰہیہ ہیں جو مومنوں کے شامل حال ہوا کرتی ہیں۔ اور دوسرے وہ سلسلہ خلافت مراد ہے جو نورِ نبوت کو ممتد کرنے کے لیے خدا تعالیٰ قائم فرماتا ہے اور خدا تعالیٰ کا یہ سلوک انسان سے نہیں بدلتا جب تک کہ ان کی ذہنیت نہ بدل جائے (۱۳:۱۲)۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کو رؤیا میں بتایا گیا کہ مسلمانوں میں تیس سال کے بعد سلسلہ خلافت منقطع ہو جانے کی دو وجوہ تھیں۔

Their tamprament becoming morbid and anarchical.

یعنی ایک یہ کہ وہ ماربڈ (Morbid) ہو گئے تھے اور دوسرے ان کے میلان Anarchical ہو گئے تھے یعنی ان میں فسادات اور بغاوت کی روح پیدا ہو گئی تھی ان کا ماربڈ (Morbid) ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ جو ترقیات ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بدولت ملی تھیں انہوں نے انہیں اپنے ذاتی کمال کا نتیجہ سمجھ لیا۔ اور اپنی اسلام سے پہلے کی حالت کو بھول گئے اور Anarchical ہونا اس سے ثابت ہے کہ وہ مساوات کا یہ مطلب سمجھنے لگ گئے کہ کوئی ڈسپلن نہ ہو۔ چنانچہ چند ہی سال میں ان میں یہ خیال پیدا ہونے لگ گیا کہ خزانے ہمارے ہیں اور اگر حکام نے ان کے راستے میں روک ڈالی تو انہوں نے مارنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ کی حکومت اسی کے ہاتھ میں رہے تو بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ نور میں فرماتا ہے کہ خلیفے ہم بنائیں گے۔ مگر انہوں نے سمجھنا شروع کر دیا کہ خلیفے وہ بناتے ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے کہا کہ اگر خلیفے تم نے بنانے ہیں تو پھر اب تم ہی بناؤ۔

اب اگر احمدی خلافت کے لیے قربانیاں کریں گے اور اس سے وابستہ رہیں گے تو خلافت ہمیشہ قائم رہے گی لیکن اگر وہ انتخاب خلافت میں اہلیت کو مدنظر نہیں رکھیں گے۔ تو اس نعمت کو کھو بیٹھیں گے

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ ..... وَالْاَرْضِ۔ اس میں بتایا ہے کہ قوموں کی مالی ترقی بھی الٰہی سامانوں سے ہوتی ہے کیونکہ محنت اور بیج وغیرہ جو اس کے لیے ضروری ہیں ان کی توفیق خدا تعالیٰ ہی سے ملتی ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (۶۶) (پھر تو) کہدے کہ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی ہے خدا کے سوا ان میں سے کوئی غیب کو نہیں جانتی اور ان میں کوئی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو کب زندہ کرکے اٹھایا جائیگا۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ ع (۶۷) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُخروی زندگی کے بارہ میں ان کا علم بالکل ختم ہوگیا ہے بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ اس کے بارہ میں بالکل اندھے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ (۶۸) اور کافر کہتے ہیں کہ جب ہم اور ہمارے باپ دادے مٹی ہو جائینگے تو کیا ہم پھر زمین سے زندہ کرکے نکالے جائیں گے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۶۹) ہم اور ہمارے باپ دادوں سے اس سے پہلے ایسا ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ مگر یہ صرف پہلے لوگوں کی باتیں ہیں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۷۰) تو کہدے کہ زمین میں پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہؤا تھا۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ (۷۱) اور تو ان پر غم نہ کھا اور ان کی تدبیروں کی وجہ سے تنگی محسوس نہ کر۔

اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے کہ جو جسمانی حیات کے لیے رزق مہیا کرتا ہے ضرور ہے کہ رُوحانی حیات کے لیے بھی سامان مہیا کرتا ہو۔ اس غرض کے لیے وہ انبیاء بھیجتا ہے۔ اگر مشرک سچے ہیں تو وہ انبیاء کے مقابلہ پر کیوں ایسے مدعی پیش نہیں کرتے جنہیں بتوں نے کھڑا کیا ہو۔

۶۶تا۶۷ یہاں بتایا ہے مستقل علم غیب سوائے خدا تعالےٰ کے کوئی نہیں جانتا یہی وجہ ہے کہ انبیاء تو خدا تعالےٰ سے علم پاکر غیب کی بے شمار باتیں بیان کرتے ہیں اور وہ پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر مشرک خود اپنے انجام کے بارہ میں بھی علم نہیں رکھتے۔ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا صرف اندھوں کی طرح تخمینے لگاتے ہیں۔

۶۸تا۷۰ کفار کہتے ہیں کہ قیامت کا خوف پہلوں کو بھی دلایا گیا تھا مگر اب تک قیامت نہیں آئی اس لیے ہم کس طرح مان لیں۔ فرماتا ہے انہیں چاہیئے کہ زمین میں پھر کر کفار کا انجام دیکھ لیں۔ جس طرح پہلے مجرموں پر قیامت کا آنا اُخروی قیامت کا ثبوت ہے اسی طرح ان پر بھی جو دنیوی عذاب آئیں گے وہ بھی اُخروی قیامت کے لیے بطور ثبوت کے ہوں گے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۷۲) اور وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

(۷۳) تو کہہ دے کہ ممکن ہے کہ وہ (عذاب) جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(۷۴) اور تیرا رب لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن ان میں اکثر شکر نہیں کرتے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝

(۷۵) اور تیرا رب ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کو ان کے سینے چھپا رہے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کر رہے ہیں۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۷۶) اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی چھپی ہوئی چیز ہے ایک بیان کرنے والی کتاب میں (محفوظ) ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(۷۷) یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں سناتا ہے۔ جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۷۸) اور وہ ضرور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت

---

۷۱ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ قوم ہلاک ہو اس لیے خدا تعالےٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا لَا تَحْزَنْ ان کی تباہی پر غم نہ کر کیونکہ یہ تباہی کی گھڑی ان پر ضرور آنے والی ہے۔

۷۳-۷۵ یہاں بتایا ہے کہ ممکن ہے کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی کر رہے ہو اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو۔ یعنی تباہی کی کامل گھڑی تو کچھ دیر بعد آئے گی لیکن اس سے پہلے چھوٹے چھوٹے عذاب آجیں گے تاکہ تمہاری آنکھیں کھلیں۔ بڑے عذاب میں اس لیے دیر ہو رہی ہے کہ خدا تعالےٰ بندوں پر بہت فضل کرنیوالا ہے اس لیے وہ ڈھیل دیکر ہدایت پانے کا موقعہ دیئے بغیر عذاب نہیں بھیجتا۔

۷۶-۷۸ پہلے یہ فرمایا کہ خدا تعالےٰ کو ہر پوشیدہ چیز کا علم ہے پھر اس کے ثبوت کے طور پر فرمایا کہ قرآن کریم کو دیکھ لو کہ اکثر امور جن میں بنی اسرائیل اختلاف رکھتے ہیں قرآن کریم ان کی حقیقت کو بیان کردیتا ہے۔ مثلاً بائیبل نے حضرت ہارونؑ پر بچھڑا بنانے کا الزام لگایا ہے (خروج ۳۲/۱-۶) مگر قرآن نے اسے غلط بتلایا ہے (۲۰/۹۰) اور اب انسائیکلوپیڈیا برٹینکا نے بھی مانا ہے کہ حضرت

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُم (۷۹) تیرا رب ان (یعنی بنی اسرائیل) کے درمیان اپنے بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ حکم (یعنی قرآن) کے ساتھ (سچا) فیصلہ کرتا ہے۔ الْعَلِيمُ ۚ اور وہ غالب (اور) بہت بڑے علم والا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى (۸۰) پس اللہ (تعالیٰ) پر توکل کر۔ تو یقیناً ایک مدلل الْحَقِّ الْمُبِينِ ۝ حق پر قائم ہے۔

ہارونؑ کے شرک کرنے کا واقعہ بالکل غلط ہے۔ اسی طرح بائیبل کہتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے ہجرت کی تو وہ لاکھوں تھے مگر قرآن نے بتایا کہ وہ صرف ہزاروں تھے ($\frac{۲}{۲۴۴}$) اور تاریخ سے بھی قرآنی بیان ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کا واقعہ ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ انہیں اپنے بیٹے کو قتل کرنے کا حکم ہوا (پیدائش $\frac{۲۲}{۲-۱}$) مگر پھر خدا تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا۔ (پیدائش $\frac{۲۲}{۱۴-۹}$) گویا بائیبل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو کسی شکل میں بھی ذبح نہیں کیا نہ ظاہری رنگ میں نہ تشبیہی رنگ میں۔ اگر اس واقعہ سے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی آزمائش مقصود تھی۔ تو آپؑ کے ایمان کو تو خدا تعالیٰ پہلے بھی جانتا تھا اس لئے ایسا حکم دینا اور پھر اس کا منسوخ کر دینا بے حکمت ٹھہرتا ہے۔

قرآن کے مطابق بھی حضرت ابراہیمؑ کو ظاہر میں بیٹے کو ذبح کرنے سے منع کیا گیا۔ مگر خواب کا جو اصل مفہوم تھا یعنی بے آب و گیاہ جگہ پر چھوڑنا اس سے منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس پر عمل کروایا گیا۔ ظاہر میں ذبح کرنے سے نہ بیٹے کو فائدہ ہو سکتا تھا نہ ابراہیمؑ کو۔ مگر اسمٰعیلؑ کو مکہ میں چھوڑنے سے خود ان کو بھی فائدہ ہوا۔ کہ وہ توحید سکھانے کے استاد بن گئے۔ اور دنیا کو بھی فائدہ ہوا۔ کہ وہ ان کے ذریعہ توحید پر قائم ہو گئی۔

پھر قرآن یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات کو مدنظر رکھ کر بھی حقیقت کو بیان کرتا ہے مثلاً یہود ولادت مسیح کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ اور عیسائی ان کو روح القدس کا کرشمہ بیان کرتے ہیں قرآن کریم اس نزاع کا فیصلہ کرتے ہوئے فرماتا ہے والتی احصنت فرجھا... العالمین $\frac{۲۱}{۹۲}$ اسی طرح یہود رسالت مسیح کے منکر ہیں اور عیسائی آپؑ کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں۔ مگر قرآن نے بتلایا کہ یہ دونوں نظریے غلط ہیں۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ آپ نبی اللہ ہیں $\frac{۳}{۵۰}$۔ اسی طرح واقعہ صلیب کے متعلق ان کے اختلاف کا فیصلہ قرآن نے کیا ہے (دیکھیں $\frac{۴}{۱۵۸}$ اور $\frac{۲۳}{۵۱}$)

۷۹-۸۰ یعنی اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ صرف بنی اسرائیل کے باہمی اختلاف کو ہی دور نہیں کریگا بلکہ وہ چونکہ غالب اور حکمت والا ہے اس لئے وہ ان کے درمیان فیصلہ بھی کر دے گا چنانچہ

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ (۸۱) تو ہرگز مُردوں کو نہیں سُنا سکتا۔ اور نہ بہروں کو ہی (اپنی) آواز سُنا سکتا ہے۔ خصُوصًا جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔

وَمَآ أَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۸۲) اور تو اندھوں کو بھی ان کی گمراہی سے بچا کر ہدایت نہیں دے سکتا۔ تُو تو صرف انہی کو سُناتا ہے۔ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور وہ (عملاً بھی) فرمانبردار ہوتے ہیں۔

عیسائیت اور یہودیت کے باہمی نزاع میں چونکہ عیسائی حق پر تھے وہ ہر جگہ غالب کر دیئے گئے۔ مگر حق مبین چونکہ صرف اسلام کے پاس ہے اس لیے آیت ۸۰ میں مسلمانوں کو بتایا کہ اشاعت اسلام کے لیے تم ہر قسم کی تدابیر کو کام میں لاؤ۔ اور اللہ تعالےٰ پر یقین و توکل رکھو وہ اسلام کو سب مذاہب پر غلبہ بخشے گا۔

توکل کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کی جائے لوگ دنیا کے کاموں میں تمام تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر دینی کاموں میں تدبیر سے کام لینا خلافِ توکل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلاف عقل ہے بلاشبہ دین کا کام اللہ تعالیٰ ہی نے کرنا ہے مگر ہمارے دوسرے کام بھی تو وہی کرتا ہے۔ ہماری کسی کوشش کا خالصۃً اس میں دخل نہیں ہوتا۔ ورنہ ہمیں ہر کام میں کامیابی ہو لیکن کامیابی کسی بات میں ہو جاتی ہے کسی میں نہیں ہوتی۔ ثابت ہُوا کہ کامیابی کا ملنا فضل الٰہی پر منحصر ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر تدبیر نہ کی جائے تو خدا تعالےٰ کی طرف سے سزا نازل ہوتی ہے۔ مثلاً قوم موسیٰؑ سے خدا تعالےٰ نے کنعان کی زمین کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس کا طریق یہ بتلایا کہ جا کر جنگ کرو۔ مگر قوم موسےٰؑ نے کہا کہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے ہم اپنی جانوں کو ہلاکت میں کیوں ڈالیں۔ اے موسیٰؑ تو اور تیرا خدا جا کر لڑو۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ زمین چار سو سال تک ان پر حرام کر دی گئی۔ اس لیے توکل کے ساتھ تدبیر ضروری ہے جبھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو پھر توکل کرو۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ آپؐ نے کبھی تدبیر کو ترک نہیں کیا۔ پھر ان معنوں میں سب سے زیادہ توکل تو جنت میں ہو سکتا ہے مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مشغولیت ہوگی (ر ۳۶/۵۲)۔ پس اصل توکل یہ ہے کہ انسان ساری ممکن تدابیر کرے اور پھر خدا تعالےٰ کے حضور جھک کر کہے کہ جو سامان میرے اختیار میں تھے میں نے کر لیئے۔ اب جو رخنہ رہ گیا ہے وہ تو پورا فرما دے۔

۸۱-۸۲ اوپر کہا گیا تھا کہ تو واضح اور روشن سچائی پر قائم ہے یہاں بتایا ہے کہ ہدایت کے قابل ہونیکا

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝

(۸۳) اور جب ان کی تباہی کی پیشگوئی پوری ہو جائیگی تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک کیڑا نکالیں گے جو ان کو کاٹے گا اس وجہ سے کہ لوگ ہمارے نشانات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝

(۸۴) اور اس دن کو یاد کرو) جب ہر (اس) قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کرتی رہی ہوگی ہم ایک بڑا گروہ اکٹھا کریں گے پھر اس (گروہ) کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائیگا (تا خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر جزا دیں)

یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سب لوگ ضرور اسے مان لیں بلکہ ایسی باتوں کے منکر بھی پائے جاتے ہیں۔

۸۳ آنحضرتؐ نے دابۃ الارض کے متعلق فرمایا ہے۔ کہ اس کا خروج آخری زمانہ میں ہوگا جو مسیح اور مہدی کا زمانہ ہے (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد ۷ صفحہ ۲۳۱) پھر آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب آنے والے مسیح کی مخالفت بڑھ جائے گی تو فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ (مسلم جلد ۲ کتاب الفتن باب ذکر الدجال وصفتہ) یعنی اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں پھوڑا پیدا کر دیگا ان حدیثوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے دابۃ الارض سے مراد طاعون ہی کا کیڑا ہے جو زمین سے نکلتا ہے اور گردن یا بن ران میں پھوڑا پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دابۃ الارض کا خروج آخری زمانہ کی علامات میں سے قرار دیا ہے اس لیے وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ سے مراد مسیح موعود کے مکذب ہی لیے جائیں گے۔ جو روحانی طور پر اندھے اور بہرے ہونگے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتابوں میں قبل از وقت پیشگوئی فرمائی تھی اور بتلایا تھا کہ طاعون کا زور اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک لوگ اپنی اصلاح نہ کرلیں۔ نیز یہ کہ پنجاب میں اس کا زور بہت زبردست ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ بیماری بمبئی سے شروع ہوئی۔ مگر پھر پنجاب میں اس نے زور پکڑا۔ اور ایسا زور کہ بعض دفعہ ایک ایک دن میں ہزاروں آدمی اس سے لقمۂ اجل بنے۔ اور نو سال تک اس کا زور رہا۔ پھر جب لوگوں نے اپنی اصلاح کی اور کثرت سے احمدیت میں داخل ہونے لگے تو خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بتلایا کہ "طاعون تو گئی مگر بخار رہ گیا"۔ (حاشیہ تذکرہ ایڈیشن دوم صفحہ ۵۱۸) چنانچہ اس کے بعد طاعون کا زور ٹوٹ گیا۔ مگر بخار کا شدید حملہ پنجاب میں ہوا۔ حضرت مسیح موعودؑ نے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بتلایا ہے کہ دابۃ الارض سے مراد طاعون ہے (نزول المسیح صفحہ ۳۸) دابۃ کے خروج کی پیشگوئی میں خوردبین کی ایجاد کی طرف بھی اشارہ ہے ورنہ لوگوں کو کیونکر معلوم ہو سکتا تھا کہ طاعون کا باعث ایک دابۃ الارض ہے۔

۸۴-۸۶ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آخری زمانہ کے موعود کے ذریعہ اسلام کی صداقت ظاہر

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(۸۵) اور جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اُن سے کہیگا کیا تم نے میرے نشانات کا اس کے باوجود انکار کیا تھا کہ تم نے علم کے ذریعہ سے ان کی پوری واقفیت حاصل نہیں کی تھی یا یہ بتاؤ کہ تم (اسلام کے خلاف کیا) کیا سازشیں کیا کرتے تھے۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ○

(۸۶) اور ان کے ظلموں کی وجہ سے ان کے خلاف کیگئی پیشگوئی پوری ہو جائیگی اور وہ کچھ بات نہ کر سکیں گے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(۸۷) کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم نے رات کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ اس میں آرام حاصل کریں اور دن کو دیکھنے کی طاقت دینے والا بنایا - اس میں یقیناً مومن قوم کے لیے بڑے نشان ہیں۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ○

(۸۸) اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن بگل میں ہوا پھونکی جائیگی جسکے نتیجہ میں آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے گھبرا اٹھیگا سوائے اسکے جسکے متعلق اللہ تعالیٰ چاہیگا (کہ وہ گھبراہٹ سے محفوظ رہے) اور سب کے سب اس (یعنی خدا) کے حضور مطیع و فرمانبردار ہو کر آئینگے۔

کی جائیگی تو مختلف قومیں مختلف گروہ بن کر دہریت پھیلانے لگیں گی یعنی ہر گروہ اسلام کی منظم مخالفت کرنے لگے گا۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ مگر فرشتے ان کی تباہی کی تیاری کر رہے ہیں اور وہ دن آنے والا ہے جب ان کے ظلموں کی وجہ سے ان کے خلاف کی گئی پیشگوئیاں پوری ہو جائیں گی۔ (آیت ۸۶) یعنی اسلام غالب آجائے گا۔ تب ان کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ یعنی یا تو وہ آنحضرت پر درود بھیجنے لگیں گے یا تباہ ہو جائیں گے۔

۸۷ فرماتا ہے پہلے ہم لوگوں پر رات یعنی بلوت سے بُعد کا زمانہ لائے تاکہ وہ اس میں نئی طاقتیں حاصل کرلیں مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اب ہم ان پر نبوت کا دن چڑھائینگے تا وہ حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ مگر اس سے بھی صرف مومن فائدہ اٹھائیں گے۔

۸۸ بگل چونکہ قوموں کو جمع کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے اس لیے یہاں تمثیلی طور پر اس کا ذکر ہے۔ جب سب قوموں کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیا جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آسمان و زمین میں جو بھی رہتے ہیں گھبرا اٹھیں گے۔

اس میں ہوائی جہازوں اور ایٹم بم کا ذکر معلوم ہوتا ہے اور اِلَّا مَنْ شَاءَ کہہ کر بتایا

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ○

(۸۹) اور تو پہاڑوں کو اس صورت میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے خوب خبردار ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ○

(۹۰) جو کوئی نیکی کرے گا اس کو اس سے بہتر بدلہ ملیگا اور ایسے لوگ اس دن کے خوف سے (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) محفوظ رہیں گے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(۹۱) اور جو لوگ بُرے عمل لے کر خدا کی خدمت میں حاضر ہونگے ان کے سرداروں کو دوزخ میں اوندھا کرکے گرا دیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا۔ کہ کیا تمہاری جزا تمہارے عمل کے مطابق نہیں؟

گیا ہے کہ گو یہ تباہی عام ہوگی مگر پھر بھی دعا کا راستہ کھلا رہے گا۔ اور جو خدا تعالےٰ کو خوش کریگا وہ اس تباہی سے بچ جائے گا۔ یعنی دعاؤں کے نتیجہ میں ایٹم بم کا کوئی توڑ نکل آئے گا۔

۸۹ یہاں تمثیلی زبان میں بتایا ہے کہ جیسے ہوائیں بادلوں کو اڑا کرلے جاتی ہیں جب اسلام کی تائید میں نصرتِ الٰہی کی ہوائیں چلیں گی تو کفر و شرک کے دیو پیکر (جبال) سب اُڑ جائیں گے مگر یہ سب کچھ انسانی تدبیروں سے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ سے ہوگا۔ اور اس کی قدرت اور صنعت کا اس سے ظہور ہوگا۔ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ میں یہ اشارہ ہے کہ ایسا انقلاب اسی صورت میں آسکتا ہے۔ جب تم اپنی حالت بہتر بنالو، ورنہ خدا تعالےٰ کو کیا ضرورت ہے کہ ایک ظالم کو مٹا کر اس کی جگہ دوسرا ظالم بٹھا دے۔

۹۰-۹۱ یہاں یہ اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق خدا تعالےٰ یہ نہیں کرتا کہ انسان کو نیک اعمال کا اجر دے اور پھر کسی برے عمل کے بدلے اسے جونوں کے چکر میں ڈالے بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ وہ نیکیوں کا بدلہ بہت بڑھا کر دیتا ہے لیکن بدی کا بدلہ بہرحال بدی کے مطابق ہی دیتا ہے اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ سے ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے (اعراف ۱۵۷) اس لیے ایک دن بد سے بدتر انسان بھی اس رحمت کا مستحق ہو جائے گا۔ اور جنت پالیگا۔ دنیا کے لحاظ سے یہ معنے ہیں کہ مومنوں کو ان کی قربانیوں سے بہت بڑھ چڑھ کر

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ
هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا
وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّ أُمِرْتُ
أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝
وَأَنْ أَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ
اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ
إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ
اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا
رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

(۹۲) مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (یعنی مکہ) کے رب کی جس کو اس (یعنی اللہ تعالیٰ) نے معزز بنا دیا ہے عبادت کروں اور ہر چیز اسی کے قبضہ میں ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں۔

(۹۳) اور یہ بھی کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ پس جو اسے سُن کر ہدایت پا جائیگا تو اس کا ہدایت پانا صرف اسی کی جان کے کام آئیگا جو اسے سُنکر گمراہ ہو جائے گا۔ تو تُو اسے کہدے کہ میں صرف ایک ہوشیار کرنیوالا (وجود) ہوں۔

(۹۴) اور یہ بھی کہدے کہ اللہ ہی سب تعریفوں کا مستحق ہے۔ وہ تم کو اپنے نشان دکھائیگا۔ یہانتک کہ تم ان کو پہچان لوگے اور تمہارا رب تمہارے عمل سے غافل نہیں۔

اجر ملے گا۔ جیسا کہ صحابہؓ کو ملا۔

۹۲ اسلام کے دو معنے ہیں۔ ایک تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والا مسلمان ہے دوسرے ہر وہ شخص بھی مسلمان کہلاتا ہے جو مطیع اور فرمانبردار ہو۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے انبیاء اور ان کے سچے متبعین کو بھی اس نام سے یاد کیا ہے (۲/۱۲۹-۱۳۳ ، ۳/۴۸ ، ۱۲/۱۰۲)۔ مگر آنحضرتؐ کے متبعین کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ ان دونوں معنوں میں مسلمان ہیں۔

۹۳ یعنی مجھے قرآن پیش کر کے تبلیغ کرنے کا حکم ہے مگر جبر کا حکم نہیں ہر شخص آزاد ہے چاہے مانے یا نہ مانے۔

۹۴ اگر خدا تعالےٰ کے نشانات پچھلے انبیاء پر ختم ہو جاتے تو ہمارا الحمد للہ کہنا درست نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارا الحمد للہ کہنا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جب ہم بھی اس کے نشان دیکھیں اور ہر زمانہ میں اس کی قدرتوں کا ظہور ہو۔ پس یہاں بتلایا ہے کہ تو دنیا کو سُنا دے کہ اسلام ایک زندہ خدا پیش کرتا ہے۔ اگر تم اس سے تعلق پیدا کرلوگے تو سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وہ تمہیں بھی اپنے نشانات دکھلائے گا۔

آیاتہا ۸۹	سُوْرَۃُ الْقَصَصِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعاتہا ۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں اللہ تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰسٓمّٓ ۝ (۲) طاہر (پاک، سمیع (دعائیں سننے والا) مجید (بڑی بزرگی والا خدا اس سورۃ کو نازل کرنے والا ہے)

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ (۳) یہ (یعنی اس سورۃ کی آیات) ایک مدلل کتاب کی آیات ہیں۔

نزول وترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ نمل کے آخر میں نشانات دکھانے کا وعدہ تھا اس سورۃ میں ان نشانات میں سے بعض کی وضاحت کی گئی ہے مثلاً آنحضرتؐ کی مکہ سے ہجرت کی اور پھر بطور فاتح مکہ میں آنے کی خبر دی گئی ہے۔ پھر سورۃ نمل کے آخر میں قرآن پڑھ کر سنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سورۃ میں طٰسٓمّٓ رکھکر تبلایا ہے کہ طاہر، سمیع اور مجید خدا کی طرف سے ایک ایسی کتاب اتاری گئی ہے جو تمام مضامین کو کھول کر بیان کرنے والی ہے (آیت ۳) تاکہ اسے ہر جگہ پڑھکر سنایا جائے۔

۲ ان مقطعات میں بتلایا گیا ہے کہ خدا لطیفؔ ہے وہ لطف اور مہربانی سے کام لیتا ہے۔ وہ سمیعؔ ہے اس لیے جب دنیا نے اس سے ہدایت مانگی اس نے قرآن بھیج دیا۔ وہ مالکؔ ہے اپنے بندوں کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا یا میم مجید کا قائم مقام ہے اور یہ معنے ہیں کہ وہ بڑی بزرگی والا ہے پس اس کی شان کے خلاف تھا کہ بندے ہدایت سے محروم ہوتے اور وہ ان کی خبر نہ لیتا۔

سورۃ شعراء کے شروع میں بھی یہی مقطعات تھے اور وہاں جو آیت ان کے بعد رکھی گئی تھی وہی اس سورۃ میں رکھی گئی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حروف مقطعات کسی خاص غرض کے لیے ہوتے ہیں اور ایک جیسے حروف مقطعات ایک ہی قسم کے مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔

سورۃ نمل میں طٰسٓمّٓ کی بجائے جو سورۃ شعراء کے شروع میں رکھے گئے تھے طٰسٓ کے حروف رکھے گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مجد اور اس کی بزرگی جتنی رسول کریم صلعم کے وجود سے ظاہر ہوتی ہے جس کا ذکر سورۃ شعراء میں آتا ہے اتنی بزرگی موسےٰؑ اور سلیمانؑ کے وجود سے ظاہر نہیں ہوئی جن کا ذکر سورۃ نمل میں آتا ہے۔ اب اس سورۃ میں پھر طٰسٓ کے بعد میم بڑھا دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی آنحضرتؐ کا خاص طور پر ذکر ہے۔ خصوصاً فتح مکہ کا جس سے اللہ تعالیٰ کی بزرگی ظاہر ہوئی۔

۳ سورۃ نمل کی آخری آیت سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آنحضرت صلعم کو صرف منذر کیوں بنایا گیا آپؐ کو زبردستی کی اجازت کیوں نہ دی گئی۔ یہاں اس کا جواب دیا ہے کہ آپؐ کو جو کتاب دی

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (۴)

مومن قوم کے فائدہ کے لئے ہم موسٰے اور فرعون کے صحیح سوانح تیرے سامنے پڑھتے ہیں۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۵)

فرعون نے (اپنے) ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا تھا اور اس کے رہنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا (اس طرح کہ) ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا۔ اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور وہ یقیناً فسادیوں میں سے تھا۔

گئی ہے وہ ہر مضمون کے دلائل پیش کرتی ہے اس لیے زبردستی کی ضرورت ہی نہیں۔

ک یہاں خدا تعالیٰ اپنے لطیف اور سمیع ہونے کی مثال کے طور پر موسیٰؑ کا واقعہ بیان فرماتا ہے۔
بالحق: میں یہ اشارہ ہے کہ تورات نے اس واقعہ میں انسانی خیال ملا دیئے ہیں مگر قرآنی بیان ان سے پاک ہے۔

ه وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا سے ظاہر ہے کہ فرعون نے "ڈیوائیڈ اینڈ رول" کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی اور اس کی یہ کوشش تھی کہ اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں میں جھگڑا رہے تاکہ اس کی حکومت کے مظالم کی طرف ان کی نظر نہ پھرے۔ قرآن کریم اس پالیسی کی مذمت کرتا ہے اور اسے فساد فی الارض قرار دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک قانون کا اطلاق بلا امتیاز سب پر یکساں ہونا چاہیئے۔
بنی اسرائیل کو کمزور کرنے کے لیے فرعون نے پہلے تو دائیوں کے ذریعہ ان کی نسل بند کرنا چاہی مگر جب انہوں نے رحم سے کام لیا تو اس نے لڑکوں کو دریا میں ڈالنے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا حکم دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں (خروج $\frac{1}{15-22}$)
لفظ ذبح سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ فرعون بچوں کا گلا کاٹ دیتا تھا اس لفظ کے معنے ہلاک کردینے کے بھی ہیں (تاج العروس) خواہ یہ ہلاکت کسی طریق سے ہو۔ قرآن نے دوسری جگہ یقتلون ابناءکم کے الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں ($\frac{7}{142}$) اور ان سے ان معنوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔
قرآن نے اس واقعہ کے متعلق $\frac{2}{50}$ میں بھی يُذَبِّحُوْنَ کی بجائے يُذَبِّحُوْنَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان معنوں میں زیادہ سختی پائی جاتی ہے اور ان میں ان کے غصہ اور کینہ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ تلاش کر کرکے بنی اسرائیل کو ہلاک کرتے تھے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ

(۶) اور ہم نے ارادہ کر رکھا تھا کہ جن لوگوں کو اس نے ملک میں کمزور سمجھ رکھا تھا ان پر احسان کریں۔ اور ان کو سردار بنا دیں اور ان کو (تمام نعمتوں کا) وارث کر دیں۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝

(۷) اور ان کو ملک میں تمکنت بخشیں۔ اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں جس کا ان کو خوف لگا ہوا تھا۔

---

۶ نرید مضارع کا صیغہ ہے اس میں استقبال کے معنے بھی پائے جاتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ موسٰیؑ کے زمانہ میں ہم نے یہ ارادہ کیا تھا بلکہ آج محمد رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھی ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ حکومت جن لوگوں کو ظالمانہ طور پر کمزور کرنا چاہتی ہے ان کو طاقت دی جائے اور جس طرح الٰہی تدبیروں سے موسٰیؑ کے وقت میں کام لیا گیا اسی طرح الٰہی تدبیر سے محمد رسول اللہ کے وقت میں کام لیا جائے گا۔ اور وہ الٰہی تدبیر آیت ۳ میں بیان ہو چکی ہے کہ آپؐ کو بادلیل کلام دیا گیا ہے جس کے اثر سے لوگوں کے دل فتح ہو جائیں گے اسی لیے ۲۵/۵۳ میں قرآن کے جہاد کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے۔

۷ یورپین مستشرقین نے اس جگہ یہ اعتراض کیا ہے کہ ہامان فرعون موسٰیؑ کا کوئی وزیر نہیں تھا بلکہ پانچ سو سال قبل مسیح کے ایک ایرانی بادشاہ کا وزیر تھا۔ ان کے اس اعتراض کی بنیاد بائبل کی کتاب آستر ۳/۱ پر ہے لیکن محققین کی نگاہ میں خود یہ کتاب مشکوک ہے اور مارٹن لوتھر اور بعض اور محققین نے لکھا ہے کہ آستر کی یہ داستان محض ایک افسانہ ہے اس لیے یہ اعتراض قرآن کریم پر نہیں پڑ سکتا۔ پھر قرآن نے ہامان کے متعلق لکھا ہے کہ اسے فوجی طاقت حاصل تھی (آیت ۹) نیز لکھا ہے کہ عمارتیں اور قلعے وغیرہ بنانے کا کام اس کے سپرد تھا (آیت ۳۹) پس اگر فرعون موسٰیؑ کے زمانہ کا کوئی ایسا شخص ہمیں مل جائے تو قرآن کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔

مصر قدیم میں لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ہر دیوتا کا الگ الگ معبد اور الگ الگ کاہن تھا۔ مصر کے پایۂ تخت کے دیوتا کو آمان کہتے تھے اور اس کا کاہن تمام کاہنوں کا رئیس تسلیم کیا جاتا تھا۔ (تاریخ ملل قدیم مترجم اردو سید محمود اعظم فہمی ص ۳۹) جیمز ہنری نے بھی اپنی کتاب تاریخ مصر میں لکھا ہے کہ آمان کے کاہن اعظم نے فرعون مصر منفتاح یا اس کے باپ رعمیس کے زمانہ میں بے حد طاقت حاصل کر لی تھی۔ حتیٰ کہ سونے کی کانوں کے علاقہ پر اسے پورا

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ (۸)

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی تھی کہ اس کو (یعنی موسیٰ کو) دودھ پلا۔ پس جب تو اس (کی جان) کے متعلق خائف ہو تو اس کو دریا میں ڈال دے اور ڈر نہیں اور نہ کسی پچھلے واقعہ کی وجہ سے غم کر ہم اسکو تیری طرف لوٹا کے لائیں گے اور اس کو رسولوں میں سے ایک رسول بنائیں گے (چنانچہ موسیٰ کی ماں نے اس وحی کے مطابق عمل کیا اور موسیٰ کو دریا میں ڈال دیا)

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَ (۹)

سو اس کے بعد اس (یعنی موسیٰ) کو فرعون کے خاندان میں سے ایک نے اٹھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک دن وہ اُنکے لئے دشمن ثابت ہوا اور غم کا موجب بنا۔ فرعون اور

اختیار حاصل ہو گیا تھا (ص ۵۶)۔ پھر لکھتا ہے کہ ان کے معبد وسیع اور عالی شان محلات کی صورت اختیار کر گئے..... اور آمان کا کاہن فی الحقیقت ایک شہزادہ سمجھا جاتا تھا (ص ۲۴۷-۲۴۸) پھر لکھا ہے کہ کاہن اعظم...... کی رضا کے بغیر کوئی فرعون زیادہ دیر تک برسر حکومت نہیں رہ سکتا تھا (ص ۲۹۴) ص ۴۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے فوجی اقتدار بھی حاصل تھا۔

پھر انسائیکلوپیڈیا برٹینکا ص ۵۴۲ میں زیر لفظ مصر لکھا ہے کہ چونکہ آمان کے کاہن اعظم کے زیر انتظام عالی شان مذہبی عمارات کی تعمیر ہر وقت جاری رہتی تھی اس لیے اسے صناعوں کے رئیس اعظم کا خطاب بھی دیا گیا ان تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ قرآن نے جس شخص کو ہامان قرار دیا ہے وہ تاریخی شخصیت ہے اور اس کے متعلق قرآن نے جو باتیں بیان کی ہیں وہ سب صحیح ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ آمان دیوتا کا کاہن چونکہ مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اسے ہامان کا نام دیدیا گیا تھا۔ جس کے معنے ہیں "وہ ہے آمان" یعنی وہ عظیم الشان شخصیت جس کی طرف خود بخود انگلیاں اٹھتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے "ابرام" سے "ابراہام" بنا کیونکہ ھا بڑائی کے معنے دیتا ہے۔

المختصر بائیبل میں موسٰیؑ کے واقعات کے بیان میں ہامان کا ذکر نہ ہونا بتاتا ہے کہ اس نے ایک فاش تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ ہامان جیسی تاریخی شخصیت کا ذکر نہیں کیا اور قرآن نے جو کئی سو سال بعد نازل ہوئی اس غلطی کو ظاہر کر دیا ہے۔ اور شروع سورۃ میں قرآن کو کتاب مبین کہکر اس امر کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ قرآن تمام حقائق کو روشن کرنے والی کتاب ہے اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ موسیٰؑ اور فرعون کے سچے واقعات ہم بیان کر رہے ہیں مگر فائدہ وہی اٹھائیں گے جو ان باتوں پر ایمان لائیں گے (آیت ۴) چنانچہ دیکھو "سیبل" اور "ریری" وغیرہ نے

جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ۝ ہامان اور ان دونوں کے لشکر غلطی میں مبتلا تھے۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۱۰) اور فرعون کی عورت (یعنی فرعون کے خاندان کی ایک عورت) نے کہا۔ تیرے لئے اور میرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک کا موجب ہوگا۔ اس کو قتل نہ کرو ممکن ہے کہ ایک دن وہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں۔ اور اس کو اصل حقیقت معلوم نہ تھی۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۗ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۱) اور موسیٰؑ کی ماں کا دل (غم سے) فارغ ہوگیا۔ قریب تھا کہ اگر ہم اس کے دل کو مومن بنانے کے لئے مضبوط نہ کرتے تو وہ اس واقعہ کی سب حقیقت ظاہر کر دیتی۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۱۲) اور اس (یعنی موسیٰؑ کی ماں) نے اس (یعنی موسیٰ) کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جا۔ پس وہ اس کو دور سے دیکھتی رہی اور وہ (یعنی فرعون کے لوگ) بے خبر تھے۔

اس بیان سے فائدہ اٹھانے کی بجائے الٹا قرآن کو تاریخی غلطی کا مرتکب کہنا شروع کر دیا۔

ش۔۹ میں تصریح کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈالیں۔ بائیبل بھی اس کی تصدیق کرتی ہے (دیکھیں خروج ۲/۳) صرف یہ فرق ہے کہ بائیبل نے تابوت کی جگہ سرکنڈوں کا ٹوکرا لکھا ہے مگر اول تو ضروری نہیں کہ تابوت سے مراد لکڑی کا بکس ہی ہو۔ دوسرے جب بائیبل کہتی ہے کہ اس ٹوکرے کو چکنی مٹی لگا دی گئی تھی تو وہ بھی تابوت ہی بن گیا تھا۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اسے فرعون کے خاندان کے کسی فرد نے اٹھایا تھا۔ اس لیے یہاں آلِ فرعون سے اس کی بیٹی ہی مراد ہے بیوی مراد نہیں۔

ش۱۰ کیونکہ کوئی ماں اپنے بچے کو بغیر اس کے کہ مجبوری ہو دریا میں نہیں پھینک سکتی۔ جب فرعون کی بیٹی موسیٰ کو گھر لے گئی تو فرعون کو فوراً خیال آیا کہ یہ بنی اسرائیل کا بچہ ہے اس لیے اس نے قتل کا ارادہ کرلیا اس پر اس کی بیوی نے یہ سفارش کی۔

ش۱۱ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا۔ کے یہ معنے کہ اُمِّ موسیٰ کو ہر وقت موسیٰ کا غم کھاتا رہتا تھا غلط ہیں۔ صحیح معنے یہ ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے یہ خوشخبری دی کہ موسیٰؑ کو محفوظ رکھا

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝

(۱۳) اور ہم نے اس (یعنی موسیٰ) پر اس سے پہلے دودھ پلانے والیوں کو حرام کر دیا۔ پس اس (یعنی موسیٰؑ کی بہن) نے کہا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسے گھر والوں کی خبر دوں جو اس کو تمہارے لئے پال دیں اور وہ اس کے خیر خواہ ثابت ہوں گے۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع

(۱۴) اس طرح ہم نے اس (یعنی موسیٰؑ) کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے لیکن (منکروں میں سے) اکثر جانتے نہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(۱۵) اور جب وہ اپنی پختہ جوانی کو پہنچا اور (اپنے اعلیٰ اخلاق پر) مضبوطی سے قائم ہو گیا تو ہم نے اسے حکم اور علم بخشا اور ہم محسنوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى

(۱۶) اور (ایک دن) وہ شہر میں ایسے وقت میں آیا کہ لوگ غفلت کی حالت میں تھے (یعنی آرام سے) اپنے گھروں میں سو رہے تھے دوپہر کو یا آدھی رات کو) اس نے اس شہر میں دو آدمیوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے تھے ایک اس کے دوستوں کے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا پس اس نے جو اس کی جماعت میں سے تھا اس شخص کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا اس کی مدد طلب کی۔ اس پر موسیٰ نے اس (یعنی دشمن) کو ایک گھونسا

جا پڑے گا تو اس کے دل سے غم کا بوجھ اٹھ گیا اور اسے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر اس کے دل کو مضبوط نہ کیا جاتا تو قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی۔

۱۳؎ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی دائی اس وقت میسر نہ آئی۔ اور یہ بھی کہ موسےؑ نے اللہ تعالےٰ کے فضل سے دوسری دائیوں کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک الٰہی تدبیر تھی جس کے ذریعہ موسےؑ کو ان کی والدہ کی طرف لوٹا دیا گیا۔

۱۵؎ بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّهٗ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اٹھارہ سے تیس سال کی عمر کو پہنچ گیا (اقرب) لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی خاص عمر نبوت پر فائز ہونے کے لیے مقرر ہے آنحضرتؐ کو چالیس سال کی عمر میں مسیحؑ کو تیس سال کی عمر میں اور یحییٰؑ کو اس سے بھی کم عمر میں نبوت مل گئی تھی۔

فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝

مارا اور اس (گھونسے) نے اس کا کام تمام کر دیا پھر موسیٰ نے کہا یہ سب واقعہ شیطانی کرتوت سے ہوا ہے وہ (یعنی شیطان) (مومن کا) دشمن (ہوتا) ہے، امن کے راستہ سے کھلا کھلا بہکانے والا ہے

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

(۱۷) پھر موسیٰ نے دعا کی کہ اے میرے رب! میں نے اپنی جان کو تکلیف میں ڈال دیا ہے پس تو میرے اس فعل پر پردہ ڈال دے سو اس نے اس فعل پر پردہ ڈال دیا وہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝

(۱۸) تب اس (یعنی موسیٰ) نے عرض کی۔ اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے میں بھی کبھی مجرموں میں سے کسی مجرم کی مدد نہیں کروں گا۔

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَاۗىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۭ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝

(۱۹) اس کے بعد وہ شہر میں صبح کے وقت دشمنوں سے خوف کرتا ہوا اور ادھر اُدھر دیکھتا ہوا نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ جس نے اس سے کل مدد طلب کی تھی وہ پھر اسے مدد کیلئے بلا رہا ہے اس پر موسیٰ نے اسے کہا کہ تو یقیناً ایک کھلا کھلا گمراہ ہے

---

۱۶ حضرت موسیٰؑ کی بعثت مدین سے واپسی پر ہوئی تھی اور یہ واقعہ مدین جانے سے پہلے کا ہے اس لیے یہاں ترتیب زمانی کا بیان مقصود نہیں اس اہم واقعہ کا ذکر مقصود ہے۔
اَعْدَآئِہٖ کی جگہ عَدُوِّہٖ اس لیے فرمایا کہ عَدُوِّہٖ سے قوم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور قوم کی صفت مفرد بھی آسکتی ہے۔ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ شیطان کا مادہ شَطَنَ کے علاوہ شاط بھی ہے اور شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں کوئی چیز جل گئی اور استشاط غضباً کے معنے ہوتے ہیں غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ پس اس جملہ کے معنے یہ ہیں کہ یہ بات غصہ میں ہوگئی۔
اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ۔ ضَلَّ النَّاسِیْ کے معنے ہوتے ہیں کوئی بات یاد نہ رہی یا ذہن سے نکل گئی (اقرب) یعنی یہ غصہ انسان کا بڑا دشمن ہے اور اس پر نسیان غالب کر دیتا ہے۔

۱۷ غَفَرَ کے معنے پردہ ڈالنے کے ہوتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس مصیبت پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ گورنمنٹ کا کوئی آدمی اس موقعہ پر نہ پہنچا اور بعد میں خدا تعالیٰ نے آپ کی غلطی معاف فرمائی۔

۱۸ وہ شخص بظاہر مجرم نہیں تھا پھر موسیٰؑ نے جو یہ الفاظ فرمائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے روحانی طور پر اندازہ لگایا کہ جب اس کی مدد کا یہ نتیجہ نکلا ہے تو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں یہ ضرور مجرم ہوگا۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ○

(۲۰) پس جب اس نے ارادہ کیا کہ اس شخص کو پکڑے جو ان دونوں کا دشمن تھا تو اس (شخص) نے کہا۔ کہ اے موسٰے! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دے جس طرح تو نے کل ایک اور شخص کو قتل کیا تھا۔ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ کمزوروں کو ملک میں دبا دے اور اصلاح کرنے والوں میں شامل ہونا تیری غرض نہیں۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ز قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ○

(۲۱) اور اس وقت ایک شخص شہر کے دُور کے حصّہ سے دوڑتا ہؤا آیا۔ اور کہا۔ اے موسٰے! ملک کے رؤسا مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔ پس (میری بات سُن اور) اس شہر سے نکل جا۔ میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۡ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ ع

(۲۲) تب وہ اس شہر سے ڈرتے ہوئے نکل گیا۔ اور وہ ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا اُسوقت اس نے دعا کی اور کہا اے میرے رب! مجھے ظالم قوم سے نجات دے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ

(۲۳) اور جب وہ مدین شہر کی طرف چلا۔ تو اس نے کہا

۱۹-۲۰ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ :- چونکہ موسٰی روحانی طور پر سمجھ چکے تھے کہ غالباً پہلے دن بھی اس کا کوئی قصور تھا دوسرے انہوں نے یہ سوچا کہ ایک ہی شخص کو ساری دنیا مارنے پر کیوں تیار ہو گئی معلوم ہوتا ہے یہ مزدور لوگوں کو بھڑکا دیتا ہے اس لیے آپؑ نے اسے "فسادی" کہا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ بظاہر تو دوسرا ہی مجرم ہے آپ نے اسے پکڑنے کے لیے قدم اٹھایا مگر چونکہ منہ سے آپؑ کو فسادی کہہ چکے تھے اس نے سمجھا کہ مجھے پکڑنے لگے ہیں اور شور مچا دیا۔

جبّار کی صفت جب اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنے حاجات پوری کرنیوالے کے ہوتے ہیں اور جب یہ لفظ غیر اللہ کے لیے آئے تو اس کے معنی سرکشی اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے ہوتے ہیں (اقرب)

۲۱-۲۲ اس شخص کے شور مچانے سے لوگ سمجھ لئے کہ کل قوم فرعون کا جو شخص مارا گیا تھا اسے بھی موسٰیؑ ہی نے مارا تھا اس لیے انہوں نے آپؑ کو پکڑنا چاہا۔ جب موسٰیؑ کو یہ خبر ملی تو آپ (مدین کی طرف) بھاگ نکلے۔

قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○

مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھا راستہ دکھا دے گا۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۥ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○

(۲۴) اور جب وہ مدین شہر کے چشمہ کے پاس آیا تو اس نے اس پر لوگوں کا ایک گروہ کھڑا دیکھا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ان سے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوئی دو عورتیں دیکھیں جو اپنے جانوروں کو (ہجوم کی وجہ سے) ہٹا رہی تھیں موسیٰ نے ان سے کہا تم دونوں کو کیا اہم کام درپیش ہے۔ اس پر دونوں عورتوں نے کہا ہم پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ دوسرے چرواہے چلے نہ جائیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○

(۲۵) پس اس نے ان دونوں کی خاطر (جانوروں کو) پانی پلایا پھر ایک سایہ کی طرف ہٹ گیا۔ پھر کہا۔ اے میرے رب! اپنی بھلائی میں سے جو کچھ تو مجھ پر نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ڣ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

(۲۶) اس کے بعد ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک چلتی ہوئی آئی اور وہ شرما رہی تھی اور اس نے کہا میرا باپ تجھے بلاتا ہے تاکہ تجھے ہماری جگہ پر (جانوروں کو) پانی پلانے کا اجر عطا کرے پس جب وہ اس (یعنی لڑکیوں کے باپ) کے پاس آیا اور اس کے آگے (اپنا) سارا واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا ڈر نہیں۔ تو اب ظالم قوم کے پنجہ سے نجات پا گیا ہے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ

(۲۷) اس پر ان (دونوں لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا۔ اے میرے باپ! اس کو تو ملازم رکھ لے کیونکہ جن کو تو ملازم رکھے ان میں سے بہتر

---

۲۳ یعنی جیسے یعقوبؑ نے کہا تھا کہ مجھے یوسفؑ کی ہوا آ رہی ہے (۱۲ : ۹۵) معلوم ہوتا ہے اسی طرح موسیٰؑ کو بھی مدین سے ٹھنڈی ہوا آئی اور آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دیگا۔

۲۴ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کی (آیت ۲۲ والی) دعا خدا تعالےٰ نے سُن لی۔

۲۵ یعنی موسیٰؑ بغیر کسی مزدوری کی خواہش کے یا کسی شکریہ کی امید رکھا کر کے ہو کر دعا میں مشغول ہو گئے۔

۲۶ واقعات سنکر ان لڑکیوں کے باپ نے موسیٰؑ سے کہا کہ اب تو کسی بات سے مت ڈر تو ظالم قوم سے نجات پا چکا ہے۔

اَلْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ شخص وہی ہوگا جو مضبوط بھی ہو اور امانت دار بھی۔

قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ (۲۸) تب وہ شخص بولا (اے موسیٰ) میں چاہتا ہوں کہ اس

اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

شرط پر اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں کہ تو آٹھ سال تک میری خدمت کرے پس اگر تو آٹھ کے عدد کی جگہ پر دس کے عدد سے اپنے دعوے کو مکمل کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ اور میں تجھ پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے نیک معاملہ کرنے والوں میں سے پائے گا۔

---

۲۸ لڑکیاں پانی پلانے جاتیں تو وہاں کے اوباش مذاق کرتے ہونگے اسلئے انہوں نے سوچا کہ اگر اس شخص کو ملازم رکھ لیا جائے تو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ موسیٰؑ کے جرأت اور دلیری سے پانی پلانے سے انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ مضبوط آدمی ہے۔ اور پھر آنکھیں نیچی کیے درخت کے نیچے جا بیٹھنے سے یہ سمجھیں کہ یہ امانت دار بھی ہے۔ باپ لڑکیوں کی باتوں سے پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا اس لیے اس نے موسیٰؑ کو رشتہ پیش کر دیا۔

یہاں موسیٰؑ کے آٹھ دس سال تک بطور مہر کام کرنے کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں بلکہ دسویں حصہ کی آمد کو انتہائی قربانی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ خرچ بھی کرتے ہونگے اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ جس تنخواہ کے حقدار تھے اس کا دسواں حصہ بطور مہر اُن کے خسر کے پاس رہتا ہوگا۔ ان آیات سے اور "الوصیت" میں جو دسویں حصہ کی وصیت کی شرط ہے اس سے استدلال ہوتا ہے کہ ایک سال کی آمد جو دس سال کی آمد کا دسواں حصہ ہے بطور مہر دینا کافی ہے۔

بائیبل نے موسیٰؑ کے خسر کا نام کہیں تو "یترو" خروج باب ۳ اور کہیں "رعوایل" (خروج $\frac{2}{18}$) بتایا ہے مگر قرآن نے اس کا نام نہیں بتایا۔ مفسرین کا یہ خیال کہ شعیبؑ آپ کے خسر تھے غلط ہے کیونکہ موسیٰؑ کی بعثت قوم شعیبؑ کی تباہی کے بعد ہوئی (اعراف ع ۱۲) پھر $\frac{4}{11}$ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ لوطؑ کے قریب کے زمانہ میں ہوئے تھے۔

قرآن و بائیبل کے اس واقعہ کے متعلق اختلافات | قرآن کہتا ہے کہ موسیٰؑ کی والدہ کو الہاماً حکم دیا گیا تھا کہ خطرہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا۔ مگر بائیبل اسے ام موسیٰ کی اپنی تدبیر بتاتی ہے۔ اگر یہ ان کی اپنی تدبیر ہوتی تو بعد میں جو تائید الہٰی کے واقعات رونما ہوئے وہ

نہ ہوتے۔ پھر بائیبل کہتی ہے کہ ام موسیٰؑ نے انہیں ٹوکرے میں ڈال کر جھاؤ میں رکھ دیا (خروج ۲/۳)۔ اور وہیں سے فرعون کی بیٹی نے انہیں نکالا۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ انہیں دریا میں ڈالا گیا۔ لیکن خود بائیبل سے قرآنی بیان کی تصدیق ہوئی ہے کیونکہ لکھا ہے کہ فرعون کی بیٹی نے اس کا نام (موسیٰ) یہ کہہ کر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔"

پھر بائیبل کہتی ہے کہ موسیٰؑ نے عمداً ایک مصری کو مار کر اسے ریت میں چھپا دیا تھا (خروج ۲/۱۱ تا ۱۵) مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ اتفاقاً مارا گیا تھا۔

دوسرے دن کے واقعہ کے متعلق بائیبل کہتی ہے کہ اس دن لڑائی دو عبرانیوں میں ہو رہی تھی۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ وہی عبرانی اور ایک مصری لڑ رہے تھے۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ تب اس نے اسے جس کا قصور تھا کہا کہ "تو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے" (خروج ۲/۱۳-۱۴) اگر وہ دونوں عبرانی تھے تو موسیٰؑ کو کیسے پتہ لگ سکتا تھا کہ قصوروار کون ہے۔ نیز اگر دوسرا شخص بھی عبرانی تھا تو اسے اس بات کا کیسے پتہ لگ گیا اور اس نے کیسے کہہ دیا کہ "کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح کل اس مصری کو قتل کیا تھا۔" (خروج ۲/۲۰ تا ۲۹) کیونکہ بقول بائیبل موسیٰؑ نے مقتول کو ریت میں چھپا دیا تھا۔

پھر خروج ۲/۱۵-۱۶ کے مطابق مدین کے کاہن کی سات بیٹیاں پانی پلانے آئی تھیں مگر قرآن کہتا ہے کہ صرف دو لڑکیاں پانی پلانے آتی تھیں گو ممکن ہے کہ اس نے دو بڑی لڑکیوں کا ذکر کیا ہو۔ کیونکہ آگے چل کر ان کے بیاہ کا معاملہ پیش آنے والا تھا۔

پھر بائیبل کے نزدیک وہ پانی بھر رہی تھیں کہ گڈریوں نے آکر انہیں روکا۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ حیا سے الگ کھڑی تھیں اور یہی بات صحیح ہے کیونکہ جب وہ پہلے پہنچ چکی تھیں۔ تو گڈریوں کا ان کو روکنا خلافِ عقل ہے

پھر بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ نے گڈریوں سے مقابلہ کیا۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ موسیٰؑ نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ اور عقل اسی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ موسیٰؑ وہاں اجنبی اور بےسروسامان تھے نہ ان کا کوئی دوست تھا نہ مددگار ایسی حالت میں وہ ان سے لڑائی کس طرح مول لے سکتے تھے۔

پھر بائیبل نے اس معاہدہ کا ذکر نہیں کیا جو موسیٰؑ اور ان کے خسر کے درمیان ہوا تھا صرف یہ کہا ہے کہ موسیٰؑ اس کے ساتھ رہنے کو راضی ہو گئے تھے (خروج ۲/۲۱) حالانکہ بتانا یہ چاہیئے تھا کہ موسیٰؑ کا خسر انہیں رکھنے پر راضی ہو گیا تھا۔ کیونکہ موسیٰؑ تو پہلے ہی ٹھکانا ڈھونڈتے تھے۔ وہاں قرآن نے اس معاہدہ کا ذکر کیا ہے لیکن بائیبل کا اپنا بیان کہ "موسیٰؑ اپنے خسر... کی بکریاں چراتا تھا" (خروج ۳/۱) بتاتا ہے کہ ان کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝ ع

(۲۹) اس پر موسیٰؑ نے کہا۔ یہ بات میرے اور تیرے درمیان پختہ ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں ہوگا اور جو کچھ ہم کہتے ہیں، اللہ اس پر گواہ ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

(۳۰) جب موسیٰؑ نے وقت مقررہ کو پورا کر لیا اور اپنے گھر والوں کو لے کے چلا۔ تو اس نے طور کی طرف ایک آگ دیکھی (اور) اپنے گھر والوں سے کہا تم یہاں ٹھہرو۔ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید میں وہاں سے تمہارے لئے کوئی (ضروری) خبر لاؤں۔ یا کوئی آگ کا انگارہ لاؤں تاکہ تم سینکو۔

فَلَمَّاۤ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۙ

(۳۱) پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو مبارک مقام کے ایک مبارک حصہ کی طرف سے ایک درخت کے پاس سے اُسے پکارا گیا۔ کہ اے موسیٰؑ! میں اللہ ہوں۔ سب جہانوں کا رب۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۟ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝

(۳۲) اور یہ کہ تو اپنا عصا پھینک دے پس جب اس نے اس (یعنی عصا) کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے، تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (تب اسے کہا گیا)، اے موسیٰ! آگے بڑھ اور ڈر نہیں تو سلامتی پانے والے لوگوں میں سے ہے۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ

(۳۳) (اور) اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال۔ وہ بغیر بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا۔ اور اپنے بازو کو خوف کی وجہ سے (زور سے) کھینچکر (اپنے جسم سے) ملالے۔

غرض قرآن نے بعد میں نازل ہو کر موسیٰؑ کی زندگی کے صحیح واقعات پیش کیے مگر توریت نے بعض واقعات کو چھوڑ دیا اور بعض کو غلط بیان کیا۔ اسی لیے قرآن نے کہا تھا تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔

الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

یہ دو دلیلیں (علاوہ دوسری دلیلوں کے ہیں) جو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تیرے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہیں۔ کیونکہ وہ اطاعت سے نکلنے والے لوگ ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝

(۳۴) موسیٰ نے کہا۔ اے میرے رب! میں نے فرعون کی قوم میں سے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کردیں (اور تیرا پیغام نہ پہنچ سکے)

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۡ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝

(۳۵) اور میرا بھائی ہارون بات کرنے میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے پس اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝

(۳۶) فرمایا ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرے بازو کو مضبوط کرینگے۔ اور تم دونوں کیلئے غلبہ کے سامان پیدا کرینگے پس وہ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے تم دونوں اور جو تم دونوں کے متبع ہونگے ہماری آیات کے ذریعہ سے غالب ہونگے۔

مع

۳۰-۳۶ طور کی تشریح کے لیے دیکھیں سورۃ التین نوٹ زیر آیت و طور سینین۔

آیت ۳۱ سے یہ مراد نہیں کہ درخت نے کہا۔ میں اللہ ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا اور انہیں یوں معلوم ہوا کہ الہام کی آواز کسی درخت کی طرف سے آرہی ہے۔

وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ، میں بازو سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ چمٹائے رکھیو۔ اور ان کی تربیت کی طرف توجہ رکھیو تاکہ وہ بے دین نہ ہوجائیں۔

بائیبل کہتی ہے کہ موسےؑ ابھی اپنے خسر کے پاس تھے کہ ایک دن بکریاں چراتے ہوئے پہاڑ پر جا پہنچے اور وہاں آپ پر فرشتہ نازل ہوا۔ اس کے بعد موسےؑ لوٹ کر اپنے خسر کے پاس گئے۔ اور اپنے اہل کو ساتھ لے کر مصر جانے کی اجازت مانگی (خروج ۱۸ تا ۱۴) مگر قرآن کہتا ہے کہ موسیٰؑ اس وقت بکریاں چرانے نہیں گئے تھے بلکہ اپنے اہل کو لے کر کسی دوسری جگہ جارہے تھے کہ راستے میں خدا تعالےٰ نے ان سے ہمکلام ہوا اور انہیں فرعون مصر کی طرف جانے کا حکم دیا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○

(۳۷) پس جب موسےٰ ہماری کھلی کھلی آیتیں لے کر آیا تو فرعون کے لوگوں نے کہا۔ یہ تو ایک فریب ہے۔ جو بنا لیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے باپ دادوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(۳۸) اور موسےٰ نے کہا۔ میرا رب اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لائے خوب جانتا ہے۔ اور اس کو بھی جس کا انجام اچھا ہو۔ حق یہ ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

دوم :۔ بائیل کہتی ہے کہ جب موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ملا۔ تو انہوں نے بار بار انکار کیا (دیکھیں خروج ۳/۱۱، ۴/۱۴) تب خداوند کا قہر موسےٰؑ پر بھڑکا" (خروج ۴/۱۴) مگر قرآن موسےٰؑ کو ان الزامات سے بری اور سلامتی پانے والا قرار دیتا ہے (آیت ۳۲)

سوم :۔ بائیل کی رُو سے موسےٰؑ کا ہاتھ کوڑھ کی وجہ سے سفید ہُوا تھا۔ مگر قرآن نے مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کہکر بتایا ہے کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ بطور نشان تھا۔

بائیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسےٰؑ پہ خدا کا قہر بھڑکا تو اس نے اظہار ناراضگی کے طور پر موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کو بھی مبعوث کر دیا (خروج ۴/۱۴-۱۶) مگر قرآن اسے موسےٰؑ کی دعا کا نتیجہ اور خدا کا انعام قرار دیتا ہے (آیت ۳۵)

بائیل کہتی ہے کہ حضرت ہارونؑ موسےٰؑ کے حقیقی بھائی نہیں تھے مگر قرآن انہیں سگے بھائی قرار دیتا ہے یا کم از کم ماں کی طرف سے بھائی قرار دیتا ہے (۲۰/۹۵)

الفاظ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (آیت ۴) کی صداقت بائیل اور قرآن کے بیان کردہ واقعات کے اختلاف سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

۳۷؎ سحر ہر ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا ماخذ بہت دقیق ہو اور جھوٹ کو سچ بنا کر دکھلانا بھی اور ہر فریب اور چالاکی بھی سحر کہلاتے ہیں۔ یہاں یہ سب معنی ہی چسپاں ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کو بھڑکانے کے لیے اس نے کہا کہ یہ ایسی بات کہتا ہے جو ہم نے اپنے آباء سے نہیں سنی اس کی بات سچ مانیں تو وہ بیوقوف ٹھہرتے ہیں۔

۳۸؎ یعنی میں تو اپنے دعویٰ کو خدا کی طرف منسوب کر رہا ہوں۔ اگر یہ افترا ہے تو وہ اسے دیکھ رہا ہے پھر کیا وہ مجھے سزا نہیں دے گا۔ اس لیے تم اس معاملہ کو خدا پہ چھوڑ دو۔ اگر میں مفتری ہُوا تو

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

(۳۹) اور فرعون نے کہا۔ اے درباریو! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔ پس اے ہامان! میرے لیے گیلی مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں بنوا) پھر میرے لیے ایک قلعہ تیار کر۔ شاید اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو معلوم کر لوں۔ اور میں تو اس کو جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝

(۴۰) اور اس نے بھی اور اس کے لشکروں نے بھی ملک میں بغیر کسی حق کے تکبر سے کام لیا۔ اور خیال کیا کہ وہ ہماری طرف لوٹا کر نہیں لائے جائیں گے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(۴۱) پس ہم نے اس کو بھی اور اس کے لشکروں کو بھی پکڑ لیا۔ اور ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ پس دیکھ کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟

میرا انجام مفتریوں والا ہوگا۔ لیکن اگر میں خدا کی طرف سے ہوں تو تم سوچو مجھے مفتری کہہ کر تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ یعنی میری سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے کامیاب کر دیگا، اور تم نے مجھے مفتری کہہ کر جو ظلم کیا ہے اس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل کرے گا۔

یہاں ظالم سے مراد مفتری علی اللہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ شخص بھی جو کسی سچے مامور کا انکار کرے (دیکھیں عنکبوت ۳۰/۶۹)

ف۳۹ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ یعنی میرے محل بنوانے سے یہ نہ سمجھنا کہ مجھے شبہ ہے کہ شاید موسیٰ کا خدا موجود ہو۔ بلکہ اس حکم کی غرض تو موسیٰ کو جھوٹا ثابت کرنا ہے۔

چونکہ قدیم اقوام میں بلند میناروں پر خدا کے اترنے کا تصور پایا جاتا تھا (دیکھیں پیدائش ۱۱/۵) اس کے مطابق فرعون نے محل بنانے کا حکم دیا تاکہ جب اس پر چڑھ کر بھی خدا نظر نہ آئے تو موسیٰ کا کذب (نعوذ باللہ) ظاہر ہو جائے۔

ف۴۰-۴۱ یعنی ایک دن ایک سرکشی کی سزا میں ہم نے انہیں پکڑ لیا۔ اور وہ جو اونچے محل پر چڑھ کر ہمیں دیکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا اسے ہم نے سمندر کی تہ میں اپنا جلوہ دکھا دیا۔ اسی انجام کی طرف موسیٰ نے توجہ دلائی تھی (آیت ۳۸)۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ (۴۲) اور ہم نے ان کو (یعنی فرعونیوں کو) سردار بنایا تھا۔ جو (اپنی سرداری کے غرور میں) لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔ اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائیگی۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۝ ع (۴۳) اور اس دنیا میں بھی ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال لوگوں میں سے ہوں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (۴۴) اور ہم نے موسٰے کو بعد اس کے کہ ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کر دیا تھا کتاب بخشی۔ اس کی تعلیم لوگوں کو روحانی بینائی بخشتی تھی اور وہ ہدایت اور رحمت کا موجب بھی تھی (اور) اس غرض سے (دی گئی تھی) کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۴۵) اور تُو طور کے مغربی جانب نہیں تھا جب ہم نے موسٰیؑ کے سپرد رسالت کا کام کیا تھا اور نہ تو (اس وقت) گواہوں میں سے ایک گواہ تھا۔

---

۴۳ ان آیات کے مطابق موسٰیؑ پر تین ہزار سال سے سلام بھیجا جا رہا ہے اور تا قیامت ان پر خدا کی برکتیں نازل ہوتی رہیں گی لیکن فرعون پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے اور قیامت تک بھیجتی رہے گی۔ درحقیقت اللہ تعالٰے کسی پر لعنت کرے تو وہ لعنت چلتی ہی جاتی ہے اسی لیے آنحضرتؐ نے حجر شہر پر عذاب آنے کے ہزار سال بعد اس کا پانی تک استعمال کرنے سے صحابہؓ کو روکا تھا۔
یہ واقعات یہ بتانے کے لیے بیان کئے گئے تھے کہ جس طرح فرعون نے موسٰیؑ کا مقابلہ کیا اور تباہ ہوا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کے مقابل میں اٹھنے والے تباہ کئے جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ کے مخالفوں کی نسلیں تک ان کی طرف منسوب ہونا پسند نہیں کرتیں۔ اور آنحضرتؐ پر ہر جگہ درود بھیجا جاتا ہے۔

۴۴ وَهُدًى وَّرَحْمَةً : میں یہ بتایا ہے کہ تورات اپنے اندر ہدایت اور رحمت کا سامان بھی رکھتی تھی۔ یعنی اس میں محمد رسول اللہ صلعم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں تاکہ جب آپؐ آئیں تو لوگ ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائیں۔

۴۵ یہاں ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا اوپر ذکر تھا وما کنت بجانب الغربی سے یہ مراد ہو سکتا ہے کہ وہ مقام عرب کے مغربی جانب تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ مقام دشتِ سینا کے مغرب

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ (۴۶) لیکن ہم نے بہت سی قوموں کو پیدا کیا۔ پس ان پر عمر لمبی ہوگئی (اور وہ اپنی پیشگوئیوں کو بھول گئے) اور تو اہل مدین کے ساتھ بھی نہیں رہتا تھا کہ انکے سامنے ہمارے نشانات پڑھ کر سناتا۔ لیکن ہم ہی رسول بھیجنے والے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ (۴۷) اور اس وقت بھی تو موسٰی کے ساتھ نہیں تھا جبکہ طور پر ہم نے

کی طرف تھا۔ یہاں "امر" کلام الٰہی کے معنے رکھتا ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ دوسری آیات میں بھی آیا ہے (دیکھیں ۱۶/۴۵ ، ۲۸/۱۱۲)۔

آیات ۴۵ تا ۴۷ میں یہ اشارہ ہے کہ جب موسٰیؑ کو نبی بنایا گیا اور تیرے متعلق خبر دی گئی تو اس وقت تو اس کے پاس نہیں تھا جو یہ سمجھا جائے کہ تو نے اس سے مل کر سازش کر لی ہے۔ وہ تو تجھ سے ہزاروں برس پہلے ہوا۔ اس لیے اگر اس کے کلام سے تیری سچائی ظاہر ہوتی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تو خدا کی طرف سے آیا ہے۔

۴۷ یعنی ان پیشگوئیوں کی طرف لوگوں کی توجہ نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ عرصہ دراز گزر گیا جس کی وجہ سے قومیں بھول گئیں کہ موسٰیؑ پر ہم نے کیا کیا غیب ظاہر کیا تھا۔

وَمَا كُنْتَ ..... مُرْسِلِيْنَ :- میں یہ اشارہ ہے کہ جب موسٰیؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لیکر نکلے آپؑ دوبارہ اہل مدین میں آکر ٹھہرے اور نشانات دکھا کر ان کے ایمانوں کو جلا بخشتے رہے۔ بائیبل سے بھی پتہ لگتا ہے کہ آپؑ مدین میں ہی آکر ٹھہرے تھے (خروج باب ۱۸)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی موسٰیؑ مدین میں ہوں کہ آپؑ پر الہامات کا نزول شروع ہو گیا ہو اور آپؑ کو آنے والے نبی کی خبر دی گئی ہو۔ گو فرعون کی طرف جانے کا حکم انہیں بعد میں ملا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کے متعلق جو وحی تھی وہ موسٰیؑ پر دو دفعہ اتری ہو۔ ایک دفعہ مدین میں اور ایک دفعہ طُور پر۔ بہرحال چونکہ اوّل و آخر موسٰیؑ ہی کا ذکر ہے۔ یہاں کسی اور نبی کا ذکر معلوم نہیں ہوتا۔

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ جیسے موسٰیؑ قوم کے ظلم سے تنگ آکر بھاگے تو انہیں مدین میں پناہ دی گئی۔ اور وہاں کے ایک نیک دل نے آپ کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے اسی طرح محمد رسول اللہ کو بھی ان کی قوم مکہ سے نکال دے گی۔ مگر خدا ان کو مدینہ میں لے جائیگا۔ جہاں لوگ اپنے گھروں کے دروازے آپؐ کے لیے کھول دیں گے۔ پھر جیسے موسٰیؑ مدین میں آٹھ یا دس سال رہے آپؐ کا قیام بھی مدینہ میں اتنا ہی ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

موسیٰ پر وحی نازل کی بلیکن جو کچھ موسیٰ سے کہا گیا وہ اس لئے کہا گیا کہ تیری آمد پر اس قوم کو یقین ہو اور خدا تعالےٰ کی رحمت میں وہ بھی شریک ہو جائے۔ اور اس لئے کہ تو اس قوم کو ہوشیار کرے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنیوالا نہیں آیا تھا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ (۴۸) بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا

اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے کسی مصیبت کے آنے پر کہیں گے۔ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا۔ تا کہ ہم تیری آیتوں کے پیچھے چلتے

---

۴۷ یہاں جس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے وہ استثناء ۱۸/۱۸ تا ۲۲ میں پائی جاتی ہے لکھا ہے "میں ان کیلئے ان ہی کے بھائیوں (یعنی بنی اسمٰعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرونگا (یعنی وہ صاحب شریعت ہوگا اور اس کے واقعات تیرے واقعات سے مشابہ ہونگے) اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالونگا (یعنی اس کا الہام لفظی ہوگا) اور جو کچھ میں اسے حکم دونگا وہی وہ ان سے کہیگا (یعنی نڈر ہو کر کام کرے گا) اور جو کوئی میری ان باتوں کو جو وہ میرے نام سے کہیگا (یعنی اس کا کلام شرک کی تردید کرے گا) نہیں سنیگا۔ تو میں اس کا حساب اس سے لونگا" لیکن جو نبی .... ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا .... تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔"

بائیبل مانتی ہے کہ یہ خبر موسیٰؑ کو خروجِ مصر کے بعد طور پر دی گئی تھی۔

یہ سب باتیں آنحضرتؐ پر صادق آتی ہیں آپؐ بنی اسمٰعیل میں سے تھے آپؐ نے موسیٰؑ کی مانند ہونے کا دعویٰ کیا (۷۳/۱۶) پھر موسیٰؑ کی طرح آپؐ کو شریعت دی گئی۔ پھر جس طرح موسیٰؑ کے بعد تجدید دین کے لیے متواتر انبیاء آتے رہے اور آخر میں مسیحؑ آیا۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے بھی ہر صدی کے سر پر مجددوں کے آنے کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ آخر میں مسیح موعودؑ آئے گا۔ پھر آپؐ ہی کے متعلق خدا تعالےٰ نے فرمایا وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳/۴-۵)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا نام کلام اللہ بھی ہے (۹/۶)۔ پھر محمد رسول اللہ صلعم ہی وہ وجود ہیں جنہوں نے باوجود انتہائی مخالفت کے خدا تعالےٰ کا پیغام لوگوں کو بلا کم و کاست پہنچا دیا۔ اور حجۃ الوداع کے دن آپؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ "هل بلغت" تو سب نے یک زبان ہو کر خدا کو گواہ ٹھہرا کر کہا کہ آپؐ نے ایسا کر دیا ہے (سیرۃ ابن ہشام) پھر آپؐ ہی کی الہامی کتاب کا ہر باب بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے اور آپؐ ہی کے سب دشمن تباہ ہوئے

۴۸ اس میں بتایا ہے کہ اگر نبی نہ آئے تو لوگوں پر حجت تمام نہیں ہوتی اور وہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ہماری

رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور مومنوں میں سے بن جاتے (تو شاید ہم تجھے رسول بناکر نہ بھیجتے۔ مگر کفار پر حجت قائم کرنا ضروری تھا)

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝

(۴۹) پس جب (ان کے پاس) ہماری طرف سے حق آگیا۔ تو انہوں نے کہا کیوں اس (یعنی محمد رسول اللہ) کو ایسی تعلیم نہیں ملی جیسی کہ موسیٰ کو ملی تھی۔ کیا انہوں نے موسیٰ کی تعلیم کا اس سے پہلے انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے تو کہدیا تھا کہ یہ دو بڑے جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اور کہدیا تھا کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے دعوے کے منکر ہیں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۵۰) تو کہہ دے کہ (اگر موسیٰ اور ہارون اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کی باتیں جھوٹی ہیں تو) اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے ایک ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت دیتی ہو۔ تاکہ میں اس کی اتباع کروں۔

طرف نبی نہیں آیا ہم ہدایت سے محروم رہے چونکہ یہ عذر معقول ہوتا ہم نے سلسلہ نبوت جاری کیا ہے۔

۴۹ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے پر بجائے فائدہ اٹھانے کے کفار نے یہ اعتراض کر دیا کہ موسیٰ کی طرح آپ پر کوئی کتاب (اکٹھی) کیوں نہیں اتاری گئی یہ اعتراض ۲۵/۳۳ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے ان کی یہ بات غلط ہے موسیٰ کو شروع میں صرف دس احکام ملے تھے باقی تورات کئی سالوں میں مکمل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ اکٹھی کتاب اتری تو تم مان لیتے تو سوال یہ ہے کہ موسیٰ پر تمہارے خیال میں اکٹھی کتاب اتری تھی۔ پھر ان کو ان کے مخالفوں نے کب مان لیا تھا۔

سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا۔ میں موسیٰ اور ہارون بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور موسیٰ اور محمد رسول اللہ صلعم بھی۔ اور معنے یہ ہونگے کہ تم موسیٰ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہو۔ اور وہ تمہارے متعلق پیشگوئیاں کرتا ہے۔ اس لیے تم دونوں جھوٹے ہو (نعوذ باللہ)

انسان ایک سچائی کا انکار کرے تو دوسری کا بھی کرنا پڑتا ہے آنحضرت کے منکر ہوئے تو موسیٰ جن کے کلام میں آپ کے متعلق پیشگوئیاں تھیں ان کا بھی انکار کرنا پڑا۔

۵۰ یعنی تم نے تورات کا بھی انکار کیا جو تمہارے خیال میں اکٹھی نازل ہوئی۔ اور قرآن کا بھی جو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتری اس لیے اب اگر تم سچے ہو تو کوئی ایسی کتاب لاؤ جس میں ان دونوں سے زیادہ صداقت ہو اور کسی تیسرے طریق پر نازل ہوئی ہو۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ (۵۱) فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۠ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ (۵۲) لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۠

پھر اگر وہ کوئی جواب نہ دیں۔ تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہے جو اللہ کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً ظالم قوم کو کامیابی کا رستہ نہیں دکھاتا۔

اور ہم ان کے لیے پے درپے وحی اتارتے رہے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

---

۵۱ یعنی ان کا تیرے اس مطالبہ کو نہ ماننا ظاہر کر دیگا کہ وہ صرف ہوائے نفس کے پیچھے چلتے ہیں۔

۵۲ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ کے دو معنے ہیں ایک کہ ہم ان کی طرف پے درپے رسول یا کلام نازل کرتے رہتے ہیں ان معنوں کی تائید (۲۳/۴۴) سے ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اس قول یعنی قرآن کریم کو مربوط طور پر اتارا ہے یعنی اس میں اعلیٰ ترتیب پائی جاتی ہے۔ عام کتب کی ترتیب اور کتب الہامیہ کی ترتیب میں فرق ہوتا ہے عام کتب میں تو مختلف ابواب میں مختلف مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔ مگر کتب الہامیہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (اوّل) ان کے مدنظر سارے کلام سے دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے اور اگر الگ باب رکھے جاتے تو لوگ صرف اپنے اپنے مذاق کے مطابق حصوں کو پڑھتے اور انہی پر عمل کرتے (دوسرے) اس طرح غور کرنے کی عادت پڑتی ہے اور باریک مطالب کی طرف نگاہ جاتی ہے (تیسرے) الہامی کتب سطحی ترتیب کو چھوڑ کر نئی اور حقیقی باطنی ترتیب اسلئے بھی اختیار کرتی ہیں۔ کہ ان کے مدنظر اصلاح ہوتی ہے وہ قلبی تغیرات کا ذکر کرتی ہیں مثلاً نماز میں اگر دل حاضر ہو تو بعض دفعہ انسان الحمد للہ کہتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے احسانات میں محو ہو جاتا ہے اور گو وہ امام کے پیچھے باقی نماز بھی پڑھتا ہے مگر اس کے دل پر حمد ہی جاری ہوتی ہے۔ تو قلوب پر بعض روحانی واردات آتی ہیں۔ اور وہی حقیقی نماز ہوتی ہے۔ پس قرآنی ترتیب ان واردات پر مبنی ہے وہ نماز کے بعد روزے کا ذکر نہیں کرے گا۔ بلکہ جو خیالات اس کی آیات کے نتیجہ میں انسان کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں وہ ان کو بیان کر دے گا۔ اس لیے علماء کو تو اس میں ترتیب نظر آتی ہے دوسروں کو نظر نہیں آتی۔

اس لیے انسان کو چاہیئے۔ کہ سارا قرآن پڑھے۔ دوسرے جب اس کے دل میں جذبات محبت خاص طور پر جوش ماریں اس وقت ضرور قرآن پڑھے اور پھر یہ یقین رکھ کے پڑھے کہ اس میں معارف کے لامحدود خزانے ہیں جو اس کے معارف کو پہلی تفسیروں تک محدود سمجھتا ہے اس پر یہ کتاب بند ہو چکی ہے

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ٥

(٥٣) وہ لوگ جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر (دل میں) ایمان رکھتے ہیں۔

وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ٥

(٥٤) اور جب وہ (یعنی قرآن) ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں یہ ہمارے رب کی طرف سے برحق کلام ہے ہم تو آج سے پہلے ہی اس (کتاب کے مضامین) کے متبع تھے (گو خفیہ)

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥

(٥٥) ان لوگوں کو ان کا بدلہ ان کے صبر کی وجہ سے دو دفعہ دیا جائے گا۔ اور وہ نیکی سے بدی کا مقابلہ کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس کو خرچ کرتے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ٥

(٥٦) اور (یہودیوں میں سے مسلمان) جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے کافرو ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لیے ہیں۔ تم پر سلامتی نازل ہو (یعنی خدا تمہیں ایمان نصیب کرے) ہم جاہلوں سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔

٥٣-٥٤ یعنی جنہیں پہلے صرف نام کے طور پر کتاب نہیں ملی حقیقی طور پر ملی ہے اور وہ اس پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس کی پیشگوئیاں دیکھ کر قرآن پر ایمان لے آتے ہیں۔

٥٥ صبر کے معنے گناہ سے بچنے نیکیوں پر استقلال سے قائم رہنے اور تکالیف پر شکوہ اور جزع فزع سے اجتناب کرنے کے ہیں پس صَبَرُوْا کہہ کر بتایا کہ وہ دوہرے اجر کے مستحق اس لیے ہیں کہ وہ ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان کو مامور پر ایمان لانے کی توفیق دی۔ پھر وہ نیکیوں پر قائم رہے جس کی وجہ سے خدا نے انہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی قبول کرنے کی توفیق دے دی تیسرے انہوں نے تورات کو مان کر بھی تکالیف سہیں اور قرآن کو مان کر بھی مگر ان کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا۔ پس ان نیکیوں کا بدلہ خدا انہیں یہاں بھی دے گا۔ اور اگلے جہان میں بھی۔

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ۔ کے لئے دیکھیں سورہ رعد نوٹ ٢٣)

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ رَزَقْنٰهُمْ میں جہاں ہر چیز میں سے خرچ کرنے کا حکم ہے وہاں رزق کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ ہماری دی ہوئی کوئی بھی چیز بیکار نہیں۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ○

(۵۷) تو جس کو پسند کرے ہدایت نہیں دے سکتا۔ لیکن اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَقَالُوا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

(۵۸) اور وہ کہتے ہیں اگر ہم اس ہدایت کی جو تجھ پر نازل ہوتی ہے اتباع کریں۔ تو اپنے ملک سے اُچک لئے جائیںگے (تو کہدے) کیا ہم نے ان کو محفوظ اور امن والے مقام میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے عطیہ ہے۔ مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ○

(۵۹) اور بہت سی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا۔ جو اپنی معیشت (کی افراط) کی وجہ سے متکبر ہوگئی تھیں پس (دیکھ) یہ ان کی بستیاں ہیں جن میں ان کے بعد کوئی نہیں رہا۔ اور ہم ہی ان کے وارث ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُوا

(۶۰) اور تیرا رب جب تک کسی بستیوں کے مجموعہ کی) مرکزی بستی میں ایسا رسول نہ بھیج دے جو انکے سامنے ہماری آیتیں پڑھکر سنائے ان بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو ہلاک کرنیکا

---

۵۶ یہاں اہل کتاب کی یہ خوبی بیان ہوئی ہے کہ وہ لغویات سے اعراض کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ آج مسلمان بھی سینما دغیرہ جیسی لغویات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

۵۷ یعنی تو تو سب دنیا کا خیر خواہ ہے اور سب کی ہدایت چاہتا ہے مگر الٰہی سنت یہی ہے کہ وہ انہی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے جویاں کر اس کے مستحق ہوتے ہیں۔

۵۸ یہاں ابراہیمؑ کی مثال دے کر بتایا ہے کہ خدا تعالےٰ قربانی کرنے والوں کی قربانی ضائع نہیں کیا کرتا اس لیے یہ خیال کہ اسلام کی پُرامن تعلیم پہ چلے تو لوگ ان کو ذبح کر کھا جائیں گے محض ایک وسوسہ ہے۔

۵۹ اس میں اشارہ ہے کہ ابراہیمیؑ دعاؤں کے نتیجہ میں سامانِ معیشت کی جو بہتات انہیں میسر ہے انہیں چاہیئے کہ اس کی وجہ سے مبتلائے غرور ہو کر قبول صداقت سے محروم نہ رہیں۔

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝

از تماب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ انصاف کے خلاف ہے) اور ہم کسی بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو کبھی ہلاک نہیں کرتے سوائے اس کے کہ ان کے رہنے والے ظالم ہو جائیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(۶۱) اور جو کچھ تمہیں دیا جاتا ہے وہ تو صرف ورلی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے کیا تم عقل نہیں کرتے؟

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝

(۶۲) کیا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا (یعنی اخروی زندگی کی کامیابی کا) وعدہ کیا ہو اور وہ اسے یقیناً پا لینے والا ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو ہم نے صرف دنیوی زندگی کا سامان دیا ہو۔ پھر وہ قیامت کے دن (خدا کے رو برو جواب دہی کے لیے) پیش کیا جانے والا ہو۔

---

۶۰ یعنی جب تک کسی ایسے مقام پر جو خدا کی نگاہ میں دین کا مرکز بننے کے لائق ہو نبی نہ آئے۔ یا تو ہیں ظالم نہ بن جائیں۔ ان پر عذاب نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی آئے بغیر اگر عذاب آ جائے تو لوگ کہیں گے کہ نبی آتا تو ہم ایمان لے آتے۔ اور اس عذر کو خدا تعالیٰ تسلیم فرماتا ہے بلکہ بغیر ہوشیار کئے عذاب بھیجنے کو ظلم قرار دیا ہے (دیکھیں $\frac{۲۰}{۱۳۵}$ اور $\frac{۶}{۱۳۲-۱۳۱}$) اس زمانہ میں بھی جو طرح طرح کے عذاب آ رہے ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی نبی مبعوث ہو چکا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ جب اپنی سنت کے مطابق عذاب کے بعد کچھ مدت سہولت دے دیتا ہے تو لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ دکھ اور سکھ ہمارے آباد کو بھی پہنچا کرتے تھے اس میں صداقت انبیاء کا کیا ثبوت ہے؟ ($\frac{۷}{۹۶-۹۵}$) مگر یہ خطرناک خیال ہے اور حق یہی ہے کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

۶۱ یعنی دنیوی سامان کتنا ہی ہو وہ تھوڑے عرصہ کے لیے ہوتا ہے لیکن نبی کی پیروی سے جو قومی ترقی ملتی ہے وہ اس سے بہت بہتر اور پائیدار ہوتی ہے اس لیے عقلمندی یہی ہے کہ اس کے حصول کی کوشش کی جائے۔

۶۲ اگر وہ مومن ہے تو خدا کے وعدے کو حاضر سے کم نہیں سمجھے گا۔ اور چونکہ ان کا حاضر مادی ہے اور موعود روحانی اس لیے علامت ایمان یہی ہے کہ وہ اس موعود کو بڑا سمجھے۔

وعدہ کے ساتھ حَسَنًا کے الفاظ اس لیے بڑھائے ہیں کہ وعدہ کا لفظ عذاب کے لیے بھی آ جاتا

ربع

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝

(٦٣) اور یاد کرو، جس دن وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان کو بلائے گا پھر پوچھے گا کہ میرے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم میرے مقابل پہ معبود قرار دیتے تھے۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ۝

(٦٤) رتب، جن پر ہمارے عذاب کی خبر پوری ہو چکی ہوگی کہیں گے اے ہمارے رب! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا تھا۔ ہم نے ان کو اس طرح بہکایا تھا جس طرح ہم خود بہک گئے تھے آج ہم تیرے پاس اپنی گمراہی سے براءت ظاہر کرتے ہیں (یہ لوگ ہمارے عبادت گذار نہیں تھے بلکہ اپنے خیالوں کے پیچھے چلتے تھے)

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ۝

(٦٥) اور (جب یہ سب کچھ ہو جائیگا تو پھر ان سے) کہا جائیگا کہ (اب تو تمہیں مہلت مل چکی ہے شاید اب تم کو اپنے مزعومہ معبودوں کو بلانے کی طاقت ہو گئی ہو اگر ٹھیک ہے تو اب) اپنے جھوٹے معبودوں کو بلا کر دیکھو اس پر وہ (لوگ) بیچارے (یعنی جھوٹے معبودوں) کو بلائیں گے لیکن وہ ان کے بلانے کے جواب میں آگے نہیں اور وہ سارے کے سارے (مل کر) خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے کاش کہ وہ اس کو دیکھ کر ہی ہدایت پا جاتے (مگر افسوس کہ ایسا بھی نہ ہوا)

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ۝

(٦٦) اور اس دن کو بھی یاد کرو جب خدا ان کو پکاریگا اور کہیگا تم نے رسولوں (کے دعوے) کا کیا جواب دیا تھا؟

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ۝

(٦٧) پس اس دن ساری دلیلیں انھیں بھول جائیں گی اور وہ ایک دوسرے سے کوئی سوال نہ کر سکیں گے۔

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ۝

(٦٨) پس جو کوئی توبہ کرے گا۔ اور ایمان لائے گا اور مناسب حال عمل کرے گا۔ قریب ہوگا کہ وہ بامراد لوگوں میں شامل ہو جائے۔

---

٦٢ (ت) ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ: میں بتایا کہ اچھی بات تو وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو۔ محضرین میں مجہول کا صیغہ رکھکر بتایا کہ وہ حاضر ہونا نہیں چاہیں گے۔ مگر مجرموں کی طرح حاضر کئے جائیں گے۔

٦٣ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ: یعنی وہ شریک تھے تو نہیں مگر تم انہیں شریک ٹھہراتے تھے۔

٦٤ اس آیت سے ظاہر ہے کہ یہاں ایسے معبودوں کا ذکر ہے جو دنیا میں شرارتیں کر کے لوگوں کو بہکا دیتے تھے۔

٦٥ یہاں ان وجودوں کا ذکر ہے جن کو وہ واقعہ میں شریک ٹھہراتے تھے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

(۶۹) اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ ان کو اس بارہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ (تعالیٰ) پاک ہے اور ان کی مشرکانہ باتوں سے بلند ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

(۷۰) اور تیرا رب اس کو بھی جانتا ہے جس کو وہ سینہ میں چھپاتے ہیں اور اسے بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

(۷۱) اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ (تعالیٰ) کی ذات ایسی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ابتدائے آفرینش میں بھی وہ تعریف کا مستحق تھا اور آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا سب بادشاہت اسی کے قبضہ میں ہے اور تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ

(۷۲) تو ان سے کہہ۔ مجھے بتاؤ تو سہی اگر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قیامت کے دن تک رات کو لمبا کر دے تو اللہ کے سوا اور کون ہے۔ جو

---

۶۷ عَسٰی کا لفظ گو امید کے لیے آتا ہے لیکن جب اسے خدا تعالیٰ استعمال کرے تو اس کے معنے قطعیت کے ہوتے ہیں اور یہی یہاں مراد ہیں۔

۶۹ وَرَبُّكَ ..... يَخْتَارُ۔ یعنی تیرا رب جو (تغیر) چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جب ہدایت کی ضرورت پڑے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ مگر معبودانِ باطلہ ایسا نہیں کر سکتے اس لیے وہ خدا کے شریک نہیں ہو سکتے۔

۷۰ یعنی خدا تعالیٰ نے شرک کو مٹانے کا فیصلہ کر چکا ہے اس لیے ان کی ظاہرہ و مخفی تدابیر انہیں کامیاب نہیں کر سکتیں۔

۷۱ یعنی خدا تعالیٰ واحد ہے اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ ابتداء اور انجام سب اسی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور چونکہ ہر چیز کی ابتداء میں وہی رحمانیت کے ماتحت سب سامان مہیا کرتا ہے اس لئے وہی حمد کا مستحق ہوتا ہے اور پھر رحیمیت کے ماتحت وہ ہر چھوٹی نیکی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے حتی کہ ایک دن دوزخی بھی دوزخ سے نکل آئیں گے اس لیے انجام کے لحاظ سے بھی وہی حمد کا مستحق ہے اور پھر یہ امر کہ سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔ اور صرف اس کی ذات قائم رہتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی احدیت کا ثبوت ہے۔

يَأْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝

تمہارے پاس روشنی لائے گا؟ کیا تم سنتے نہیں؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(۷۲) تو کہدے مجھے بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ تعالےٰ دن کو قیامت کے دن تک تمہارے لیے لمبا کر دے تو اللہ تعالےٰ کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہارے پاس رات کو لے آئے جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(۷۳) اور یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں۔ کہ اس (یعنی رات) میں تم سکون حاصل کرو اور اس (یعنی دن) میں تم اس کا فضل تلاش کرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

(۷۴) اور جس دن وہ ان کو پکارے گا۔ اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ میرے مزعومہ شرکاء جن کو تم (معبود) خیال کرتے تھے۔

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ع

(۷۵) اور (اس وقت) ہم ایک (مشرک) امت میں (ایسے) گواہ کھڑے کرینگے (جنکو یہ لوگ معبود سمجھتے تھے) پھر ہم (ان سے) کہیں گے کہ اپنی (وہ) دلیلیں لاؤ (جن سے) تم شرک کو جائز قرار دیتے تھے تب وہ جان لینگے کہ کامل حق اللہ (تعالیٰ) ہی کے پاس ہے، اور ان کا سب افتراء ان سے کھویا گیا!

---

۷۱ چونکہ دن سورج نکلنے سے چڑھتا ہے اور مشرک سورج کو دیوتا مانتے ہیں اس لیے اگر وہ کہیں کہ ہمارا فلاں معبود سورج کو نکالتا ہے تو ان کی قوم انہیں کہے گی کیا تم اس معبود کو سورج دیوتا سے بڑا جانتے ہو۔ اس لیے بجز خاموشی اس کے لیے چارہ نہیں یہی دلیل ۲/۲۵۹ میں بیان ہوئی ہے۔

۷۲ چونکہ مشرک سورج کے ڈوبنے کو بھی کسی معبود باطل کی طرف منسوب نہیں کرتے یہ دلیل بھی ان کے لیے حجت ہے۔ رات میں انسان کانوں سے زیادہ کام لیتا ہے اور دن میں آنکھوں سے زیادہ اسی مناسبت سے رات کے لیے افلا تسمعون اور دن کے لیے افلا تبصرون فرمایا۔

۷۳ جس طرح کام کر کے خدا کے فضل حاصل کرنے کے لیے دن کی اور آرام کر کے نئی طاقتیں حاصل کرنے کے لیے رات کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی ترقی کیلئے بھی قبض و بسط کی حالت ضروری ہوتی ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ (۷۷) مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝	قارون (دراصل) موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا۔ مگر وہ انہی کے خلاف ظلم پر آمادہ ہوگیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ جن کی کنجیاں ایک مضبوط جماعت کے لیے بھی اٹھانا مشکل تھیں۔ (یاد کرو) جب اس کی قوم نے اسے کہا کہ (اتنا) فخر مت کر۔ اللہ (تعالیٰ) فخر کرنے والوں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔

۷۵-۷۶ وَنَزَعْنَا اور فَقُلْنَا دونوں میں جمع کا صیغہ ہے۔ یہ کلام الملوک کہلاتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ اظہار طاقت کے لیے ہم کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

شَهِيْدًا سے مراد ہر قوم کا نبی ہے جس کے نمونہ کو پیش کرکے مشرکوں کو شرمندہ کیا جائیگا۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ :- اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ تمام اعمال جن کی بنیاد افترا پر تھی رائیگاں چلے جائیں گے

۷۷ بائیبل میں قارون کا نام قورہ آتا ہے اور گنتی $\frac{16}{35}$ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون مصر کی تباہی کے بعد دشتِ سینا میں قارون نے موسیٰؑ کے خلاف فتنہ کھڑا کیا تھا اور آپ پر طرح طرح کے اعتراضات کئے تھے۔ اور قارون کے ساتھ ڈھائی سو آدمی مل گئے تھے۔ موسیٰؑ نے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کھڑا کرکے دعا کی جس کے نتیجہ میں زمین ان کو (یعنی قارون اور اس کے ساتھیوں کو) نگل گئی۔ اگر یہ بیان درست ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ نے قارون سے مباہلہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہوگیا۔ لیکن قرآن نے قارون، فرعون اور ہامان کا اکٹھا ذکر کیا ہے (۳۹/۲۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔

محض مالدار ہونا قوم پر ظلم کرنے کی کوئی وجہ نہیں اس لیے قرآن کے اس بیان سے کہ اس نے اپنی قوم پر ظلم شروع کردیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسر خزانہ تھا اور فرعون کی خوشنودی کے لیے قوم پر ظلم کرتا تھا۔ قرآنی الفاظ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ بھی بتلاتے ہیں کہ یہ سرکاری خزانے تھے جو اس کی تحویل میں رہتے تھے۔ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ یہ اس لیے فرمایا کہ اس زمانہ میں چابیاں لکڑی کی ہوتی تھیں اور لوہے کی بھی ہوں تو بہت بڑے بڑے تالے اور چابیاں ہوتی تھیں۔ اور چونکہ بنک وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ بادشاہ سفروں میں خزانے بکسوں میں رکھ کر ساتھ لے جاتے تھے اور انکی کنجیوں کا بہت سا وزن ہو جاتا تھا۔ ممکن ہے وہ

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

(۷۸) اور جو کچھ تجھے اللہ (تعالیٰ) نے دیا ہے۔ اس سے اُخروی زندگی کے گھر کی تلاش کر۔ اور دنیوی زندگی سے تجھے جو حصہ ملا ہے اسے بھی بھول نہیں (ہم تجھے ایک حد تک دنیا کی آسائشوں کے استعمال سے روکتے نہیں) اور جس طرح اللہ (تعالیٰ) نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی لوگوں پر احسان کر اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ اللہ تعالیٰ یقیناً مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(۷۹) اُس (یعنی قارون) نے کہا یہ سب رتبہ مجھے ایک ایسے علم کی وجہ سے ملا ہے جو صرف مجھے حاصل ہے کیا وہ جانتا نہیں تھا کہ اس سے پہلے اللہ (تعالیٰ) نے بہت سی نسلوں کو جو اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ مالدار تھیں ہلاک کر دیا تھا اور مجرموں کو (جب عذاب دیا جاتا ہے تو) ان کے گناہوں کے متعلق ان سے پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔

کنجیاں بھی اونٹوں پر لادی جاتی ہوں۔ کیونکہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ انہیں آدمی اٹھاتے تھے بلکہ یہ کہا ہے کہ اگر اٹھاتے تو وہ بار ان کے لیے گراں ثابت ہوتا۔

۷۸ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ یعنی دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نہ چھوڑ۔ سچا مذہب میانہ روی چاہتا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان دنیا کو بالکل چھوڑ دے نہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا کو ہی انسان اپنا مطلوب قرار دے لے اور خدا کو بھول جائے۔ گو بعض لوگوں کا جن کے اخراجات کا کفیل خدا تعالیٰ براہ راست ہو جاتا ہے، فرض یہی ہوتا ہے کہ وہ صرف دین کا خیال رکھیں مگر باقی سب کا یہی مقام ہے کہ وہ دنیا بھی کمائیں اور دین کی طرف بھی توجہ رکھیں۔ قارون کو بھی یہی نصیحت کی گئی۔

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ اس میں اشارہ ہے کہ جن چیزوں سے تو نے مال و دولت حاصل کیا وہ سب خدا کی عطا ہیں پس جس طرح تجھ پر احسان کیا گیا ہے تو بھی لوگوں سے احسان سے پیش آ۔ کیونکہ خدا مفسد کو پسند نہیں کرتا۔ چونکہ انسان سے خدا کو محبت ہوتی ہے اس لیے جو انسانوں سے فساد کرے گا سیدھی بات ہے کہ اسے خدا کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔

۷۹ قارون نے تکبر کیا اور کہا یہ مال مجھے ذاتی علم اور محنت کی بنا پر ملا ہے اور یہ نہ سوچا کہ

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ ؕ (۸۰) (ایک دن ایسا ہوا کہ) وہ اپنی زینت (یعنی اپنے باڈی گارڈ) کے ساتھ نکلا۔ اس پر وہ لوگ جو کہ دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے تھے بول اُٹھے۔ اے کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا۔ جو قارون کو دیا گیا۔ اس کو تو دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ ملا ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِىَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۸۱) اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ بولے۔ تمہارا ستیاناس! اللہ کی طرف سے ملنے والی جزاء مومن اور ایمان کے مناسب حال عمل کرنے والے کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے اور یہ (جزاء) صرف صبر کرنیوالوں کا گروہ ہی پاتا ہے۔

وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

دماغ اور دوسرے تمام ذرائع جن سے وہ کام لے رہا ہے خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہر کام میں کامیابی کے سامان بھی خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور ہر کام کا نتیجہ بھی وہی نکالتا ہے۔ آخر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ بعض لوگ کام سیکھ ہی نہیں سکتے۔ بعض سیکھ لیتے ہیں مگر انہیں کام ملتا نہیں۔ بعض کو مل جاتا ہے مگر انہیں وہ کمایا ہوا روپیہ استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اس لیے جتنا کسی کو خدا زیادہ بڑا بناتا جائے اسے زیادہ فروتنی دکھانی چاہیئے۔ لیکن جو ایسا نہیں کریگا وہ خدا سے دُور جا پڑیگا چونکہ غرباء میں تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء کی جماعتوں میں زیادہ تر غرباء ہی شامل ہوتے ہیں اگر انسان سمجھے کہ ہر چیز اسے خدا تعالیٰ نے دی ہے اور وہ اس کی ایک امانت ہے تو اسے خدا کی راہ میں خرچ کرنا اسے بوجھ معلوم نہیں ہوگا۔

اَكْثَرُ ... جَمْعًا: یہاں خدا تعالیٰ نے قارون کے مقابلہ پر مالدار لوگوں کی جگہ مالدار قوموں کو پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قارون کے پاس بھی قوم ہی کی دولت تھی۔

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ: چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا آتی ہے وہ طبعی ہوتی ہے اور طبعی سزا آپ ہی بتا دیتی ہے کہ مجرم اس کا مستحق تھا۔ اس لیے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

۸۰ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ: یعنی وہ شاہانہ کرّ و فر کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے سے گزرا تاکہ انہیں دکھلائے کہ اصل کامیابی فرعون کی اطاعت میں ہے۔

فرعون نے اسرائیلیوں کو کمزور کرنے کے لیے ایک یہ ذریعہ بھی اختیار کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ہی اس نے قارون کو سرکاری افسر بنا رکھا تھا تاکہ ایک طرف یہ ظاہر ہو کہ فرعون بنی اسرائیل کے قابل آدمیوں کی قدر کرتا ہے اور دوسری طرف جو ظلم ان کے ذریعہ کیے جائیں وہ فرعون کی طرف منسوب نہ ہوں۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ○

(۸۲) پھر ہم نے اس کو اور اس کے قبیلہ کو مکروہات میں مبتلا کر دیا - اور کوئی جماعت ایسی نہ نکلی جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتی - اور کسی تدبیر سے بھی وہ اپنے دشمن سے اپنے نہ سکا -

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ

(۸۳) اور وہ لوگ جو کل تک اس کے مقام پر ہونے کی تمنا کرتے تھے کہنے لگ گئے - تجھ پر ہلاکت ہو -

---

۸۱ یعنی علماء اور ربانی لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ تم اس چند روزہ زندگی کے مال و متاع پر کیوں مرتے ہو دائمی زندگی کا سامان کرو -

وَلَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ :- صبر کے معنے برے خیالات کا اثر قبول کرنے سے رکنے کے ان کا مقابلہ کرنے کے اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنے کے بھی ہوتے ہیں - اس لیے اس میں بتایا ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا مقام اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے - کہ تم ان خیالات کا مقابلہ کرو جو قارون وغیرہ کی دنیوی شوکت دیکھ کر تمہارے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور قارون کی طرح ظلم پر کمربستہ ہونے کی بجائے ہمیشہ بدیوں سے بچتے رہو - اور نیکیوں پر استقلال سے قائم رہو - یاد رہے کہ صبر کے یہ معنے نہیں کہ انسان اپنے حقوق چھوڑ دے - کیونکہ یہ صبر نہیں بزدلی ہے - صبر استقلال کے ساتھ بدیوں کا مقابلہ کرنے، نیکیوں پر قائم رہنے اور آئندہ نیکیوں کے حصول کی کوشش کرنیکا نام ہے۔ صبر کے یہ معنے بھی ہیں کہ انسان جزع فزع نہ کرے اس صبر کی دو قسمیں ہیں ایک ان معاملات میں صبر کرنا جو اللہ تعالےٰ سے تعلق رکھتے ہیں - انسان کا ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا جیسے موت بیماری، قحط وغیرہ - دوسرے ان معاملات میں صبر کرنا جو بندوں سے تعلق رکھتے ہیں - ان معاملات میں صبر یہ ہے کہ انسان میں بدلہ لینے کی یا مقابلہ کی مقدرت ہو مگر پھر بھی وہ چپ رہے - اگر مقدرت ہی نہ ہو یا بزدلی کی راہ سے وہ چپ رہے تو یہ صبر نہیں -

۸۲ بائیبل میں آتا ہے کہ زمین پھٹی اور قارون اپنے ساتھیوں سمیت اس میں سما گیا - گویا اس کی تباہی زلزلہ سے ہوئی - اور خسف کے لفظی معنے بھی زمین میں دھنسنے کے ہی ہیں - لیکن خسف فلانا کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اسے ذلیل کر دیا - اور یہاں یہی معنے چسپاں ہوتے ہیں -

انتصر کے معنے ہوتے ہیں امتنع من عدوہٖ اپنے دشمن سے بچ گیا - پس وما کان من المنتصرین کے یہ معنے ہیں کہ نہ اپنی تدبیر سے اور نہ اپنے علم سے جس پر اسے ناز تھا وہ اس تباہی سے بچ سکا -

وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۧ

اللہ (تعالیٰ) ہی یقیناً اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے۔ اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ (تعالیٰ) نے احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی مصیبتوں کا شکار کر دیتا۔ تجھ پر ہلاکت ہو (بات یہی ہے کہ) کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

(۸۴) یہ (جو) اُخروی (زندگی کا) گھر ہے) ہم اسے انہی کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔ جو ملک میں ناجائز غلبہ اور فساد نہیں چاہتے۔ اور انجام متقیوں کا ہی (اچھا) ہوتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(۸۵) جو شخص پسندیدہ عمل کرے۔ اُسے اُس سے بہتر بدلہ ملے گا۔ اور جو کوئی بُرا عمل کرے گا۔ تو بُرے اعمال کرنے والوں کو ان کے اپنے عمل کے برابر جزا دی جائے گی۔

۸۳؎ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کی تائید کرنا یا ان کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے والوں کی حمایت کرنا بھی انسان کو مستحق سزا بنا دیتا ہے سوائے اس کے کہ خدا تعالےٰ اسے توبہ کی توفیق دیدے
وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔ یعنی فلاح اپنے مقاصد میں بامراد ہونے کا نام ہے اور انبیاء کے مقابلہ پر کافر کبھی بامراد نہیں ہوتے۔

۸۴؎ یعنی گو ابتداء میں دنیا کامیابی کا ذریعہ یہی سمجھتی ہے کہ دوسروں کو گرایا جائے۔ اور ملک میں شورش پیدا کی جائے۔ مگر انجام متقیوں، امن پسندوں اور ناجائز غلبہ نہ چاہنے والوں کا ہی اچھا ہوتا ہے

۸۵؎ اس میں بتایا ہے کہ خدا تعالےٰ نیکوں سے احسان کا اور گنہگاروں سے انصاف کا سلوک کرتا ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ تمام نیک اعمال انسان خداداد طاقتوں ہی سے بجا لاتا ہے۔ اور ان کا بدلہ نہ ملے تب بھی درست ہے۔ مگر پھر بھی خدا تعالےٰ نے اپنی مالکیت کا اس رنگ میں اظہار نہیں کیا کہ وہ انسان کے اعمال کو بدلہ سے محروم کر دے بلکہ اس رنگ میں ہے کہ ان کا بدلہ بڑھا کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ پر اگر انسان گناہ کرے تو وہ توبہ کرنے پر اسے معاف کر دیتا ہے اور اگر کوئی توبہ نہ کرے تو جتنا گناہ ہو وہ اتنی ہی سزا دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○	(۸۶) وہ خدا جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اس مقام کی طرف لوٹا کر لائیگا جس کی طرف لوگ لوٹ لوٹ کر آتے ہیں تو کہدے میرا رب (اسکو بھی) خوب جانتا ہے جو ہدایت پر قائم ہوتا ہے اور (اسکو بھی) جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے ۔
وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ	(۸۷) اور تو (کوئی) امید نہیں رکھتا تھا کہ تجھ پر ایک مکمل کتاب نازل کی جائے گی ۔ مگر تیرے رب کی طرف

ف ۸۶ اس بات کے ثبوت میں کہ انبیاء کا مقابلہ کرنے والے تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور انجام کار مومن کامیاب ہوتے ہیں محمد رسول اللہ صلعم کی مکہ سے ہجرت کی اور پھر واپسی کی پیشگوئی فرماتا ہے ۔

معاد اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ بار بار آتے ہیں اور بار بار لوگ مکہ ہی کی طرف آتے تھے جیسے مثابۃ للناس کے الفاظ سے ظاہر ہے (پ۱ ع۱۵) اس جگہ مثابۃ کا لفظ رکھا جاتا تو اخفاء نہ رہتا ۔ اس لیے اس کا ہم معنی لفظ معاد رکھ دیا تا پیشگوئی بھی ہو جائے اور اخفاء بھی رہے ۔

اگر آنحضرت صلعم کو ہجرت کی خبر دی جاتی تو آپ کو صدمہ پہنچتا اس لیے خدا تعالےٰ نے واپسی کی خوشخبری سنائی جس میں ضمناً جانے کا ذکر خود بخود آگیا ۔ کیونکہ واپس وہی آسکتا ہے جو گیا ہو ۔

عیسائیوں نے اس سورۃ کو مکی قرار دیا ہے اور اس طرح گویا اپنی زبان سے اقرار کر لیا ہے کہ مکی زندگی میں کی ہوئی یہ پیشگوئی پوری ہوئی ہے ۔

مکہ سے ہجرت کی خبر اور مکی سورتوں میں بھی دی گئی تھی ۔ دیکھیں سورۃ بلد اور (پ۱۷ ع۸) ۔

حضرت یسعیاہ نے ددان اور تیما کی نسلوں کو جو نواح مدینہ میں آباد تھیں بطور پیشگوئی بتایا تھا کہ ایک دن قریش کے مظالم کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑے گی تمہارا فرض ہے کہ تم ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھو ۔ چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق آپ ایسی حالت میں مکہ سے نکلے کہ آپ کے گھر کا دشمنوں نے ننگی تلواروں سے احاطہ کیا ہوا تھا ۔

پھر اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ اس ہجرت کے ٹھیک ایک سال بعد آپ کی دشمنوں سے جنگ ہوگی جس میں دشمن شکست کھائے گا ۔ چنانچہ عین ایک سال بعد جنگ بدر ہوئی جس میں قریش اپنے سرداروں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے ۔

اسی طرح فتح مکہ کی خبر استثناء $\frac{33}{21}$ میں دی گئی تھی ۔

قُلْ رَّبِّيْ ...... مبین ۔ یعنی خدا تعالیٰ ہدایت لانے والے کو بھی جانتا ہے اور گمراہوں کو بھی جانتا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ ہدایت لانے والا ناکام ہو جائے ۔

رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝
سے رحمت کے طور پر ایسا ہوا - پس تو کافروں کا مددگار کبھی نہ بنیو۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
(۸۸) اور تجھے کوئی شخص اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تجھ پر اتاری گئیں ان سے روکنے والا نہ بنے اور تو اپنے رب کی طرف (لوگوں کو) بلا - اور مشرکوں میں شامل نہ ہو۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝
(۸۹) اور (اے مخاطب) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی معبود کو مت پکار اس کے سوا کوئی معبود نہیں - ہر ایک چیز ہلاک ہونیوالی ہے سوائے اسکے جس کی طرف اس (یعنی خدا تعالیٰ) کی توجہ ہو حکم اسی کے اختیار میں ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹا کر لے جائے جاؤ گے۔

ولا تدع

ع ۹ ۱۲

---

۸۷ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ :- میں بظاہر آنحضرتؐ مخاطب ہیں مگر آپ کے متعلق تو خدا تعالےٰ فرما چکا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۲) اس لیے اصل میں یہ خطاب امت محمدیہ سے ہے خدا تعالےٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ جب ہم ایک کامل کتاب اتار چکے ہیں تو تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ اس پر عمل میں تساہل سے کام لو - کیونکہ اگر تم ایسا کروگے تو اپنے عمل سے کفار کے مددگار ہو جاؤ گے۔

۸۸ اس میں بتایا ہے کہ گو قرآن کامل کتاب ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے بعد آیات اللہ کا نزول ہی نہیں ہوگا - آیات اللہ کا نزول مجددین، ماموریں اور معجزات وغیرہ کی شکل میں ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا - اس لیے ان پر ایمان لانا ضروری ہے اسی لئے آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب مسیح موعودؑ آئے تو تم اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑو - خواہ تمہیں گھٹنے کے بل چلکر جانا پڑے۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ - یعنی خود ایمان لانے کے بعد دوسروں کو بھی اس کی طرف بلاؤ۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ :- اس میں بھی آنحضرتؐ سے خطاب نہیں آپ کی جماعت سے ہے کیونکہ آپؐ نے کبھی شرک نہیں کیا - اس جملہ میں یہ اشارہ ہے کہ آیات اللہ کا انکار اور تبلیغ میں کوتاہی بھی شرک ہی کا رنگ رکھتی ہے - کیونکہ لوگوں سے انسان ڈرتا ہے جب ہی ایسا کرتا ہے۔

۸۹ چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو تبلیغ کی طرف توجہ دلائی تھی اور اسلام کا سب سے بڑا مقابلہ عیسائیت سے ہونا تھا جو تین خداؤں کے قائل ہیں اس لیے عیسائیت کے غلط عقائد کی تردید پر زور دیا گیا ہے اور بالخصوص توحید پر قائم رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت خلیفہ اولؓ کو ایک دفعہ لَآ اِلٰہَ کے معنے سمجھائے گئے اور بتایا گیا کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالےٰ کی ذات مفرد ہے باقی سب چیزیں مرکب ہیں۔ روح و مادہ کے ازلی ہونے کی بحث بھی لغو ہے کیونکہ وہ بھی مرکب ہیں۔ نیز یہی وجہ ہے کہ فنا سے صرف خدا کی ذات ہی پاک ہے کیونکہ فنا کے معنے ہیں مرکب کے اجزا کا الگ الگ ہو جانا اور مفرد کے اجزا ہوتے ہی نہیں یہی دلیل کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ میں بیان ہوئی ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ سے شبہ ہو سکتا تھا کہ جنت اور نیک لوگ بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گے اس لیے فرمایا اِلَّا وَجْھَہٗ جن کی طرف اس کی توجہ ہو گی وہ محفوظ رہیں گے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ کے سوا ہر چیز کے لیے موت لازمی ہے ان جو وَجْہُ اللّٰہ میں محو ہو جائیں گے اور ان کی روح کا غذا سے استعمال ہو جائیگا ان پر ہمیشہ کی فنا نہیں۔ یہ بات ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک شعر میں بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سر سے میرے پاؤں تک وہ یار مجھ میں ہے نہاں
اے مرے بدخواہ کرنا ہوش کر کے مجھ پہ وار

حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹنے پر جو اُن کی قوم پر عذاب آیا یہ بھی اس لیے تھا کہ حضرت صالحؑ خدا کے ہو گئے تھے اور ان پر حملہ خدا پر حملہ تھا۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ اللہ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اگر کسی چیز میں اللہ تعالےٰ کا وجہ نظر آتا رہے یعنی وہ چیز اپنی غرض پیدائش کو پورا کرتی رہے وہ موجود رہتی ہے ورنہ وہ ہلاک ہو جاتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات عالم کے ہر ذرہ میں خدا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ یعنی ہر ذرہ سے اس کی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔

لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یعنی بادشاہت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز نے فنا بھی ہونا ہے اور فنا ہو کر اسی کی طرف جانا ہے پھر اس کے غیر سے ڈرنے اور شرک کرنے کے کیا معنے

اٰیاتہا ۶۰	سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو بے حد کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

الٓمّٓ ۝ (۲) میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ (۳) کیا (اس زمانہ کے) لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کا یہ کہدینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (کافی ہوگا) اور وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۝ (۴) حالانکہ جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں ان کو ہم نے آزمایا تھا اور اب بھی وہ ایسا ہی کرے گا، سو اللہ تعالیٰ ظاہر کردیگا ان کو بھی جنہوں نے سچ بولا اور ان کو بھی جنہوں نے جھوٹ بولا

نزول و ترتیب: ۔ یہ سورۃ مکّی ہے سورہ القصص کے آخر میں مسلمانوں کو تبلیغ کرنے اور غیر اللہ سے نہ ڈرنے کی تعلیم دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ خدا کے سوا سب فنا ہونے والے ہیں۔ یہ سورۃ بھی اسی مضمون کے تسلسل میں ہے اور اس میں بتایا ہے کہ بیشک تم مشرکوں میں گھرے ہوئے ہو۔ مگر سنت اللہ یہی ہے کہ وہ صرف منہ کے اقرار سے کسی قوم کو انعامات کا حقدار قرار نہیں دیتا بلکہ وہ انہیں آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالتا ہے تاکہ ان کے ایمان کا صدق و کذب ظاہر ہوجائے اور لوگوں کو یہ بھی پتہ لگ جائے کہ خدا کے حضور کس پایہ کا ایمان قابل قبول ہوتا ہے۔

۴ ۔ علم الٰہی ایک تو وقوعہ سے پہلے ہوتا ہے دوسرا بعد میں اس کا وقوعہ سے پہلے کا علم بھی سچا ہے مگر اس کی بناء پر کسی کو جزا یا سزا دی جائے تو اسے شبہ رہے گا کہ جزا و سزا ٹھیک ہے یا غلط لیکن وقوعہ کے بعد کوئی انکار نہیں کر سکتا اس جگہ لَیَعْلَمَنَّ کے یہی معنے ہیں کہ ہم اپنے علم قدیم کو علم واقعہ سے بدل دینگے۔

ان آیات میں یہ قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے کہ دعویٰ ایمان اور ابتلاء اور آزمائش لازم و ملزوم ہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو صرف دعویٰ ایمان کی وجہ سے مومن سمجھ لیا گیا ہو بلکہ ہمیشہ ایمان کے دعویدار کو آزمایا جاتا ہے اور ابتدائی زمانہ اور ترقی کے زمانہ دونوں میں ابتلاء آتے ہیں۔ ان قربانیوں کی نوعیت آیت لَتُبْلَوُنَّکُمْ بِشَیْءٍ ...... میں بیان ہوئی ہے۔

جس طرح دانہ جب تک مٹی میں نہ ملے شگوفہ نہیں نکلتا اسی طرح جب تک قوم مرنے کو تیار نہ ہو وہ

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

(۵) کیا جو لوگ بدیاں کرتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری سزا سے بچ جائیں گے۔ اُن کا فیصلہ بہت بُرا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

(۶) جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے (اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ) اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ وقت ضرور آنیوالا ہے اور وہ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

تندہ نہیں ہوسکتی۔ مصائب آنے پر گھبرانا بزدلوں اور منافقوں کا کام ہے (بقرہ) مومن وہ ہوتا ہے جو مصائب میں اور بھی مضبوط ہوجاتا ہے۔ قالوا ھذا ما وعدنا ربنا)
حضرت مسیح موعودؑ نے رؤیا میں دیکھا کہ آپ نظام الدین کے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور رؤیا میں ہی فرماتے ہیں کہ اس میں ہمارا داخل ہونا کچھ جسمی طریق پر (یعنی صلح اور پیار و محبت سے) اور کچھ جسمی طریق پر (یعنی قربانی و شہادت سے) ہوگا۔ نظام الدین کے معنے دین کا نظام ہیں اور اس رؤیا میں بتایا گیا ہے کہ جماعت احمدیہ ایک دن "نظام دین" بن جائے گی اور دنیا کے تمام نظاموں پر غالب آجائے گی مگر یہ غلبہ کچھ تو صلح و پیار و محبت سے ہوگا اور کچھ قربانیاں دینے سے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے انوار الاسلام صفحہ ۲۳ پر فرمایا ہے کہ "اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہوجائے مجھے کیا معلوم کہ ابھی کون کون سے ہولناک جنگل اور پرخار بادیہ درپیش ہیں جن کو میں نے طے کرنا ہے۔ پس جن لوگوں کے نازک پیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ زحمت اٹھاتے ہیں جو میرے ہیں وہ مجھ سے جدا نہیں ہوسکتے نہ مصیبت سے نہ لوگوں کے سب و شتم سے نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے اور جو میرے نہیں...... وہ عنقریب الگ کیے جائیں گے۔"

ابتلا ایک تو اس لیے آتے ہیں کہ خود مدعی ایمان پر اس کے ایمان کی حقیقت کھل جائے اور دوسرے اس لیے کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ ان کا ایمان کیسا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جتنا بڑا کوئی انسان ہو اتنے ہی اس پر زیادہ ابتلا آتے ہیں۔

ﮥ اس میں اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی سزا طبعی ہوتی ہے جو انسان آپ ہی آپ بھگتتا ہے اور سوائے توبہ اور اصلاح نفس کے اس سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اس لیے بدعملوں کا یہ خیال کہ وہ دھوکہ دے کر اس سزا سے بچ جائیں گے غلط ہے۔

ﮦ اوپر آزمائشوں کا ذکر تھا اس لیے یہاں لقاء الٰہی سے مراد تائید الٰہی ہے اور مومنوں کو توجہ دلائی ہے کہ ابتلاؤں کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ نہیں وہ تو تمہارے ساتھ ہے اور

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۷) اور جو شخص خدا تعالیٰ کے لیے کوشش کرتا ہے درحقیقت وہ اپنی جان ہی کے لئے کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے (اور ان کی عبادت کا محتاج نہیں)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(۸) اور جو لوگ ایمان لائے اور ایمان کے مطابق انہوں نے عمل کیے ہم ان کی بدیوں کو ان سے دور کر دینگے اور جو کام وہ کرتے تھے اس کے مطابق جو بہترین جزا ان کو مل سکتی ہوگی وہ ہم ان کو دیں گے۔

اس نے جو ترقی کے وعدے تم سے کیے ہیں وہ ضرور پورے ہونگے کیونکہ وہ سمیع اور علیم ہے مومنوں کی دعائیں سننے والا اور ان کے حالات جاننے والا ہے۔ اگر کوئی کسی کو اس لیے مارتا ہے کہ اس نے خدا کی تھی تو خدا اسے بے سزا نہیں چھوڑے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ کے متعلق انبیاء نے کہا کہ وہ کونے کا پتھر ہے جس پر وہ گریگا وہ بھی چکناچور ہوگا اور جو اس پر گریگا وہ بھی چکناچور ہوگا۔

۷ اس میں یہ اشارہ ہے کہ قربانیوں کا موقع ملے تو کبر یا خودپسندی میں مبتلا ہونے کی بجائے ہمیشہ خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے جس نے ایمان کی توفیق دی اور مصائب میں ثابت قدم رکھا۔ ورنہ خدا تعالیٰ کسی کی قربانی کا محتاج نہیں۔

۸ کفارہ کے معنے مٹا دینے کے ہیں اور اس میں گناہ کی خواہش اور عادت اور اس کی سزا اور نتیجہ کو مٹا دینا شامل ہے۔ — ۵/۹۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کے معنے بدلہ دینے کے بھی ہیں — اور تکفیر جو کفر کا مصدر ہے اور جس سے کفارہ بنا ہے کے معنے کسی عمل کو اس حد تک ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں کہ گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کفر کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ کفر یا کفرانِ نعمت کو دور کرنا جیسے تمریض کے معنے مرض دور کرنے کے ہوتے ہیں (مفردات)

اس آیت میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ سچی توبہ کرنے والے کو معاف ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے گناہوں کے نقش کو بھی یا تو مندمل کر دیتا ہے یا بالکل مٹا دیتا ہے یعنی فراموش کر دیتا ہے۔ صالح صَلُحَ سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں کسی چیز کے مطابق ہونا پس عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے معنے ہوئے ایمان کے مطابق عمل کیا۔

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ بعض اعمال کا بدلہ نہیں دیگا۔ بدلہ تو ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کا ملیگا۔ (فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ ۹۹) ورنہ چھوٹے اعمال کو الگ کر دیا جائے تو انعام کی مقدار کم ہو جائیگی زیادہ نہیں ہوگی۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ (۹) حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ٥

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور (کہا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ سے اس بات میں بحث کریں کہ تو کسی کو میرا شریک قرار دے حالانکہ اس کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان دونوں کی فرمانبرداری نہ کر کیونکہ تم سب نے میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور میں تمہارے عمل (نیکی بدی) سے تم کو واقف کر دونگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۱۰) لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ٥

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اس کے مطابق انہوں نے عمل بھی کیا ہے ہم ان کو اچھے بندوں میں داخل کرینگے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا (۱۱) بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي

اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں) جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لے آئے ہیں پھر جب اللہ (تعالیٰ) کی وجہ سے ان کو تکلیف دی جاتی ہے وہ لوگوں کے عذاب کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے مدد آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم (در حقیقت) ہم بھی تمہارے ساتھ تھے کیا دنیا جہان کے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو

اس جگہ جس قسم کی جزا کا ذکر ہے اس میں بُرے عمل کو الگ کر لینے میں انسان کا فائدہ ہے اور یہ جزا قوتِ محرکہ کی پیدائش ہے۔ ذہن کی عام قابلیت اگر اعلیٰ سے اعلیٰ کام کے مطابق رکھی جائے تو عام کام کی اوسط نکال کر اس کے مطابق رکھتے سے یقیناً اعلیٰ ہوگی۔ اس لیے یہاں اشارہ ہے کہ دوسری زندگی میں جو قوتِ عملیہ انسان کو دی جائیگی وہ پہلی زندگی کی ان گھڑیوں کے مطابق ہوگی جن میں انسان نے دنیا انتہائی کمال حاصل کیا ہوگا۔ خواہ وہ گھڑیاں عمر کے کسی حصہ میں گذری ہوں اور اس طرح اسے ایک اعلیٰ نکتہ مطابقت بخشا جائے گا۔

ف إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ کہکر بتایا کہ چونکہ تم نے آخر خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے اس لیے تمہارا کام یہی ہے کہ جب شرک کا سوال آئے تو والدین کی اطاعت نہ کرو۔ لیکن اس استثناء کے سوا تمام دنیاوی معاملات میں ان سے حسن سلوک کرو اور ان کی کامل فرمانبرداری کرو۔ آنحضرت صلعم نے کافرہ ماں سے بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

[آیت ۸ کے تسلسل میں یہاں سب سے اچھے اعمال بتائے گئے ہیں حقوق اللہ میں سے شرک نہ کرنا اور حقوق العباد میں سے والدین کی اطاعت]

صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ — اللہ تعالیٰ اچھی طرح نہیں جانتا؟

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ — (۱۲) اور اللہ تعالیٰ ضرور ظاہر کر دیگا ان کو بھی جو ایمان لائے اور ان کو بھی جو منافق ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ — (۱۳) اور کافر مومنوں سے کہتے ہیں۔ تم ہمارے پیچھے چلو۔ ہم تمہارے گناہ اٹھا لیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہ (بالکل) نہیں اٹھا سکتے۔ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ؗ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ — (۱۴) حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائینگے اور اپنے بوجھوں کے سوا اور لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائینگے (جن کو وہ دھوکا دیتے ہیں) اور قیامت کے دن ان سے ان کے اس افترا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

---

۱۰ اعمال صالحہ کرنے والے صالحین ہوتے ہیں پھر انکو صالحین میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے؟ سو جاننا چاہئے کہ صالحیت کی دو قسمیں ہیں "پہلا نیکی کرنا یہ مگر تکلیف و تکلف سے اور دوسرا ذوق و لذت سے یہ مقام ہوتا ہے صالحین کا" (حضرت مسیح موعودؑ) الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۲ء)

۱۱ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب اور ابتلاء میں بڑا فرق ہے مگر لوگ غلطی سے ابتلاؤں کو خدا کا عذاب سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ ان کی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ابتلاء اور عذاب میں یہ فرق ہیں کہ (۱) عذاب کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے ابتلاء کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا۔ (۲) عذاب کے نتیجہ میں نقصان کی زیادتی ہوتی ہے اور ابتلاء کے نتیجہ میں نفع کی۔ (۳) عذاب مایوسی یا کبر پیدا کرتا ہے مگر ابتلاء میں اطمینان ہوتا ہے اور انسان کی خدا پر حسن ظنی بڑھ جاتی ہے (۴) عذاب کے دور کرنے کی کوشش میں انسان ٹھوکریں کھاتا ہے مگر جس پر ابتلاء آتا ہے اس کا فہم رسا ہو جاتا ہے۔ (۵) ابتلاء میں احساس ہلا نہیں ہوتا بلکہ انسان ان تکالیف کو حقیر سمجھتا ہے۔ اور ان میں لذت محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ کے لئے قربان کر رہا ہے (۶) عذاب میں دعا کم ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں زیادہ۔

۱۲ اس میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ متواتر ایسے ابتلاء پیدا کرتا جائیگا جن سے ظاہر ہو جائیگا کہ کون سچا مومن ہے۔ اور کون منافق۔

۱۳ اوپر کی آیات میں قرآن نے گناہوں سے بچنے کا یہ طریق بتلایا تھا کہ انسان توبہ کرے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

(۱۵) اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا پس وہ ان میں نو سو پچاس سال تک رہا۔ سو اس کی قوم کے لوگوں کو طوفان نے آلیا۔ اور وہ ظالم تھے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

(۱۶) پس ہم نے اس کو اور اس کی کشتی میں بیٹھنے والے ساتھیوں کو نجات دی۔ اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان کے لوگوں کے لیے ایک نشان بنا دیا۔

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(۱۷) اور ہم نے ابراہیمؑ کو بھی رسول بنا کر بھیجا تھا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

(۱۸) تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا (دوسری ہستیوں) کی عبادت کرتے ہو اور (مذہب کے بارے میں) جھوٹی باتیں بناتے ہو۔ وہ ہستیاں جن کی تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرتے ہو تمہیں رزق نہیں دے سکتیں۔ پس اللہ (تعالیٰ) سے اپنا رزق مانگو اور اس کی عبادت کرو۔ اور اس کا شکر ادا کرو۔ تم کو اسی کی طرف لوٹا کر لے جایا جائے گا۔

اور خدا کی طرف رجوع کرے مگر اس کے مقابلہ پر کفار جو طریق بتلاتے ہیں اور جس کا یہاں ذکر ہے وہ کس قدر غیر طبعی ہے؟

۱۵-۱۶ے اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر ۹۵۰ سو سال تھی بلکہ یہ ہے کہ آپ کا زمانہ اتنا تھا اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ شروع ہو گیا۔

۱۷ے حضرت ابراہیمؑ چونکہ حضرت نوحؑ کی امت میں سے تھے (صافات ۸۴) اس مناسبت سے نوحؑ کے بعد ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۸ے حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں شرک ایک فلسفیانہ مضمون بن گیا تھا اور ساتھ ہی توحید کی ایک راہیں بھی نکل آئی تھیں جن پر عمل کرنا موٹے موٹے مسائل پر عمل کرنے سے بہت مشکل تھا اس لیے حضرت

وَإِنْ تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ (۱۹) اور اگر تم میری بات کو جھوٹا قرار دو تو یہ کوئی
أُمَمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ نئی بات نہیں، تم سے پہلی قوموں نے بھی اپنے رسولوں
وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ کو جھٹلایا تھا۔ اور رسول کا کام تو صرف کھول کھول کر
الْمُبِينُ ۝ پہنچانا ہوتا ہے (زبردستی منوانا نہیں ہوتا)
أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ (۲۰) کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پیدائش عالم کو
اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ کس طرح پہلی دفعہ شروع کرتا ہے پھر اس کو بار بار لوٹاتا
إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ جاتا ہے یہ کام اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۲۱) تو کہہ۔ ملک میں چاروں طرف پھرو۔ پھر دیکھو کہ
فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش کس طرح
ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ شروع کی تھی۔ پھر مرنے کے بعد ان کو دوبارہ

ابراہیم نے یہاں صرف بتوں کی پرستش ہی سے نہیں روکا بلکہ اس فلسفہ کو بھی رد کیا ہے جو اس زمانہ میں بت پرستی کے پیچھے کام کر رہا تھا۔

فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ کہہ کر بتایا کہ بجائے اس کے کہ بتوں کے سامنے جھک کر اپنی طاقتیں ضائع کرو تمہیں چاہیئے کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق خداداد طاقتوں کے ذریعہ حصول رزق کی کوشش کرو۔

ف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ اور نوحؑ کے درمیان بھی کئی نبی گذرے ہیں اور ان سب کی امتوں کو کفار سے تکالیف پہنچیں۔

وَمَا ۔۔۔۔ مُبِيْن میں یہ اشارہ ہے کہ تلوار کی بجائے تبلیغ سے کام لینا ہی دینیاتی اصول ہے اور قرآنی تعلیم بھی یہی ہے کہ جبر جائز نہیں دلیل سے بات منوانی چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب صداقت سے دور ہٹ چکے ہیں۔ مگر وہ سب اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو حق ہے کہ ان کو جھوٹا سمجھنے کی وجہ سے ان پر جبر کریں تو انہیں بھی ایسا ہی حق مسلمانوں کے خلاف ہونا چاہیئے۔ مگر قرآن نے یہی تعلیم دی ہے کہ اگر تم ہدایت لینا پسند نہیں کرتے تو ہم جبراً ہدایت نہیں دے سکتے

ف یہاں وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْن کی دلیل دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کس طرح انبیاء کے ذریعہ روحانی جماعتیں قائم کرتا رہا ہے۔

يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۔ جیسا کہ آیت ۲۱ سے ظاہر ہے اس جگہ آخرت کا نہیں دنیا کا ذکر ہے اور چونکہ دنیا میں مردے زندہ نہیں ہوتے اس لیے پیدائش اول سے

الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

زندہ کرتا چلا گیا۔ اللہ (تعالےٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَن يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ۝

(۲۲) وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹا کر لایا جائیگا۔

وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

(۲۳) اور تم نہ زمین میں نہ آسمان میں خدا (تعالےٰ) کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکتے۔ اور خدا (تعالےٰ) کے سوا نہ کوئی تمہارا دوست ہے نہ مددگار۔

ع ۲

مراد قوموں کو تمکنت بخشنا اور پیدائش ثانی سے مراد غالب قوموں کے زوال کے بعد ان میں دوبارہ بیداری پیدا کرنا ہے۔

۲۱ اس آیت میں بتایا ہے کہ بدء عالم کا صحیح علم حاصل کرنا چاہو تو ساری دنیا میں پھرو کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر مختلف تہذیبیں عروج پر رہی ہیں ان کے آثار سے تاریخ عالم کا پتہ ملیگا۔

۲۲ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالےٰ اندھا دھند رحم یا عذاب نازل کر دیتا ہے کیونکہ ۹/۱۲ اور ۷/۱۵۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہی پر رحم کرتا ہے جو نیکیاں کر کے اس کے مستحق بن جاتے ہیں اسی طرح عذاب کے متعلق بھی بتایا ہے کہ وہ صرف ایسے لوگوں پر آتا ہے جو رسول کی تکذیب کرتے ہیں۔ دیکھیں آیات ۴/۱۴۷، ۸/۲۵تا۳۳، ۱۱/۱۱۷تا۱۱۸ اور ۲۸/۵۹۔ اندھا دھند سزا دینا ظلم ہوگا مگر خدا تعالےٰ ظلم نہیں کرتا (۲۱/۱۳۸)، ۷/۱۰۰، ۴/۴۱، ۱۰/۴۵۔

پھر قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان سے سلوک اس کے عمل کے مطابق ہوگا۔ ۵۳/۴۲-۴۰، ۹۹/۹۲۸، ۹۱/۱۰۱) اگر سوال ہو کہ اس جگہ مشیت کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے یہ کیوں نہیں کہا کہ نیک کو سمجھے گا اور بد کو سزا دیگا۔ تو جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی مشیت اور حقیقت سے انصاف ایک ہی چیز ہے وہ حسن کی کان ہے اور ہر سچائی اس کے حسن کا ایک بیرونی پہلو ہے۔ پس اس کی مشیت کو سچائی کے تابع کہنا ایسا ہی ہے جیسے بیٹے کو اپنے باپ کا باپ قرار دینا۔

۲۳ چونکہ ۶/۳۶ میں مومنوں کی کامیابی کا یہ طریق بتلایا تھا کہ ایک تو تم لوگوں کے دلوں میں سرنگ لگاؤ یعنی تبلیغ کو کمال تک پہنچاؤ۔ اور دوسرے آسمان کی طرف سیڑھی لگاؤ۔ یعنی دعا کرو۔ یہاں کفار کو بتلایا ہے کہ اگر مومنوں کے مقابلہ میں تم بھی یہی طریق اختیار کر لو۔ تو یاد رکھو۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(۲۴) اور وہ لوگ جو اللہ (تعالےٰ) کے نشانوں کا اور اس سے ملاقات ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لوگ ایسے ہیں جو میری رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں اور وہی ہیں جن کو دردناک عذاب ملیگا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(۲۵) پس اس کی (یعنی ابراہیم کی) قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا اس کو قتل کر دو یا اس کو جلا دو (چنانچہ انہوں نے اسکو آگ میں ڈال دیا) مگر اللہ تعالیٰ نے اسکو آگ سے بچا لیا۔ اس میں یقیناً مومن قوم کیلئے بڑے نشان ہیں۔

کہ تم کبھی کامیاب نہیں ہوگے کیونکہ محمد رسول اللہ کی کامیابی کا فیصلہ خدا تعالیٰ کر چکا ہے اور اس فیصلہ کو کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔

۲۴ اس میں بتایا ہے کہ آیات الٰہی اور اس کی لقاء کا انکار خدا کی رحمت (اور بخشش) سے مایوسی کی وجہ سے ہوتا ہے (انبیاء چونکہ حیاۃ الآخرۃ کا ذکر کرتے ہیں اور کفار کو اس سے گھبراہٹ ہوتی ہے وہ انہیں مارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں)

۲۵ جس طریق سے ابراہیم کو بچایا گیا تھا اس کا ذکر ($\frac{۲۱}{۷۰-۶۹}$) میں ہے۔ فرمایا ہم نے آگ کو کہا کہ (ابراہیمؑ کے دل میں ہماری محبت کی ایسی آگ جل رہی ہے جس کے مقابلہ میں تیری گرمی کی کوئی حقیقت نہیں اس لیے) تو ابراہیمؑ کے لیے سرد ہو جا۔ ممکن ہے اس وقت بادل آ گیا ہو۔ اور بارش برسنے سے وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی ہو۔ حضرت مسیح موعودؑ نے بتلایا ہے کہ بیشک فتنہ و فساد کی آگ ہر نبی کے خلاف بھڑکائی جاتی ہے مگر ظاہری آگ کا فرو کر دینا بھی خدا تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ بلکہ حضورؑ نے فرمایا مجھے بھی ابراہیمؑ قرار دیا گیا ہے۔ مخالف مجھے آگ میں ڈال کر دیکھ لیں کہ میں اس میں سے سلامت نکلتا ہوں یا نہیں۔ حضورؑ نے آگ وغیرہ سے بچائے جانے کے متعلق اپنے بعض واقعات بھی تحریر فرمائے ہیں دیکھیں الحکم ۱۰ رجون ۱۹۰۳ء۔ نیز فرمایا ہے کہ "جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل آگ کی تیزی دور کرنے کے لیے خارج میں کوئی ایسے اسباب پیدا کرے جس سے آگ کی تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ...... اسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب پیدا کر دے جن سے خاصیت احراق دور ہو جائے کیونکہ اس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔" (براہین احمدیہ حصہ چہارم حاشیہ صفحہ ۴۰۴ تا ۴۰۹)

یہی مضمون آپ نے برکات الدعاء ایڈیشن اول حاشیہ صفحہ ۲۶، ۲۷ پر بیان فرمایا ہے

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَاجِ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

(۲۶) (اس یعنی ابراہیمؑ نے کہا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں سے تعلق قائم کر چھوڑا ہے (اور تمہارا یہ فعل اس) ورلی زندگی میں دوسرے مشرکوں سے محبت بڑھانے کیلئے (ہے) پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار کرینگے اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت ڈالیں گے اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور جن کو تم مددگار سمجھتے ہو ان میں سے کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّيْ مُهَاجِرٌ إِلٰى رَبِّيْ ۭ إِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(۲۷) اس (نصیحت) کے بعد لوطؑ اس پر ایمان لے آئے اور (ابراہیم نے) کہا میں تو اپنے رب کی طرف ہجرت کر کے جانیوالا ہوں وہ یقیناً غالب (اور) بڑی حکمت والا ہے

وَوَهَبْنَا لَهٗ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ أَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(۲۸) اور ہم نے اُسے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ بخشے۔ اور اس کی ذریت کے ساتھ نبوت اور کتاب مخصوص کر دی اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی اس کا اجر بخشا۔ اور آخرت میں بھی وہ نیک بندوں میں شامل کیا جائے گا۔

اور بتایا ہے کہ انسان کامل خدا تعالیٰ کی روح کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جب کبھی کامل انسان پر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اس جلوہ کا عین وقت ہوتا ہے تو اس وقت ہر چیز اس سے ایسی ہی ڈرتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ سے" یہی وجہ ہے کہ اولیاء کو بعض اوقات پانی ڈبو نہیں سکتا اور آگ جلا نہیں سکتی۔

۲۶ہ اس میں بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خدا کے ایسے عاشق تھے کہ گو قوم نے تو انہیں آگ میں ڈال دیا تھا مگر اس سے نکلتے ہی انہوں نے بتوں کے خلاف وعظ شروع کر دیا۔

مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں بتایا کہ تمہارا مذہب دلیل پر مبنی نہیں۔ اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ہے۔

۲۷ہ ابراہیمؑ کے آگ سے سلامت نکل آنے کا معجزہ دیکھ کر آپ کے بھائی ہاران کے بیٹے لوطؑ بھی آپ پر ایمان لے آئے۔

۲۸ہ تاریخ بائیبل اور قرآن (۳۵/۲۶-۲۵ - ۱۳/۸) سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے غیر قوموں میں

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ٥

(۲۹) اور لوطؑ کو بھی (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بدی کرتے ہو جس کا ارتکاب دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥

(۳۰) کیا تم (عورتوں کو چھوڑ کر) مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے مارتے ہو۔ اور اپنی مجالس میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہو۔ اس پر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ انہوں نے کہدیا کہ اگر تو سچے لوگوں میں سے ہے۔ تو اللہ (تعالیٰ) کا عذاب ہم پر نازل کر دے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ٥

(۳۱) اس پر لوطؑ نے کہا۔ اے میرے رب! مفسد قوم کے خلاف میری مدد کر۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚۖ

(۳۲) اور جب ہمارے رسول ابراہیمؑ کے پاس بشارت لائے۔ تو انہوں نے کہا۔ ہم اس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ اس کے باشندے ظالم ہیں۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۗ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ

(۳۳) (ابراہیم نے جواب میں) کہا کہ اس بستی میں تو لوط بھی رہتا ہے انہوں نے کہا ہم اس (بستی) کے رہنے والوں کو خوب جانتے ہیں ہم

بھی نبی آتے رہے اس لیے جعلنہ ..... کے یہ معنے نہیں کہ غیر قوموں میں نبی نہیں آئیگا بلکہ یہ ہیں کہ ابراہیمؑ کا اخلاص دیکھ کر خدا تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ "النبی" یعنی محمد رسول اللہ صلعم آپ کی نسل میں سے ہوں اور چونکہ آپ کے بعد آنیوالے انبیاء آپ کے امتی ہوں گے اس لیے قیامت تک آپ کے ذریعہ نبوت ذریت ابراہیمؑ سے وابستہ ہوگی وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ یعنی (۱) آخرت میں بھی انہیں بڑے درجات ملیں گے (۲) آخری زمانہ میں لوگ اسے نیک قرار دیں گے چنانچہ مسلمان، یہود اور عیسائی سب آپ کی عزت کرتے ہیں (۳) ساعۃ اخرٰی میں جو بروز ابراہیمؑ ظاہر ہوگا وہ بھی خدا کے نزدیک اپنے کام کا اصل ہوگا۔

۲۹-۳۱ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی طرح اس وقت بھی لوگ مجالس میں ارتکاب فواحش کر لیا کرتے تھے۔

وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِينَ ۝
اس (یعنی لوطؑ) کو اور اس کے گھر والوں کو سوائے اسکی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو جائیگی نجات دیں گے۔

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيْءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِينَ ۝
(۳۴) اور جب ہمارے رسول لوطؑ کے پاس آئے تو ان کی وجہ سے اسے دکھ پہنچا نیز انکی وجہ ان کا دل تنگ ہو گیا اور (اس کی اس حالت کو دیکھکر ان پیغام لانیوالوں نے کہا کسی (آئندہ) بات کا خوف نہ کر اور نہ کسی گذشتہ واقعہ پر افسوس کر ہم تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو سوائے تیری بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو جائیگی نجات دینے کے لئے آئے ہیں۔

إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلٰى أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝
(۳۵) ہم اس بستی پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝
(۳۶) اور ہم نے اس بستی کے (واقعہ کے) ذریعہ سے ایک کھلی عبرت کا سامان عقل والے لوگوں کے لئے پیچھے چھوڑا ہے۔

۳۳-۳۲ اس عذاب کی خبر اول تو لوطؑ کو دی جا چکی تھی صرف وقت عذاب کی خبر صحابہ کے ذریعہ دیگئی مثلاً اذان کی خبر حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمر کو دیگئی نیز اس کی طرف حدیث المومن یُریٰ او یُریٰ لہٗ میں بھی اشارہ ہے۔
إِنَّا مُهْلِكُوا أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے عذاب کی خبر دینا مراد ہے نہ کہ خود عذاب نازل کرنا۔ اگر وہ رسول فرشتے فرض کر لیے جائیں پھر بھی یہی معنے ہونگے کیونکہ فرشتے بھی خود عذاب نہیں دیا کرتے بلکہ عذاب کی خبر دیا کرتے ہیں۔

۳۴ لوطؑ کو دکھ پہنچنے اور آپ کا سینہ تنگ ہونے کی وجہ کیلئے دیکھیں (۱۱/۷۸-۷۷) إِنَّا مُنَجُّوكَ۔ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ قرآن میں انتشار ضمائر کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

۳۵ ان رسولوں کا اس تباہی کو اپنی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ فرشتے نے حضرت مریم کو کہا تھا کہ میں تیرے رب کا پیغامبر ہوں تا کہ تجھے ایک پاک لڑکا دوں (۱۹/۲۰)۔ حالانکہ لڑکا خدا تعالیٰ دیا کرتا ہے یہاں بھی عذاب کی خبر دینا مراد ہے ورنہ عذاب خدا تعالیٰ ہی لایا کرتا ہے۔ دیکھیں ۸/۸۳، ۸۴ـ۸۲

۳۶ یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ عذاب خدا تعالیٰ نے اتارا تھا۔ کیونکہ نشان چھوڑنے کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا فَقَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱرْجُوا۟ ٱلْيَوْمَ ٱلْءَاخِرَ وَلَا تَعْثَوْا۟ فِى ٱلْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ ٱلرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا۟ فِى دَارِهِمْ جَٰثِمِينَ ۝

(۳۷) اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا (جب وہ آیا تو) اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اور اُخروی زندگی کے وقت کو یاد رکھو اور ایسے مفسدانہ کام نہ کرو کہ ملک میں تمہارے کاموں کی وجہ سے فساد پھیل جائے۔

(۳۸) اس پر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ اور ایک ہلا دینے والے عذاب نے ان کو پکڑ لیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

وَعَادًا وَثَمُودَا۟ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَٰكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ ٱلسَّبِيلِ وَكَانُوا۟ مُسْتَبْصِرِينَ ۝

(۳۹) اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی (ہماری طرف سے ایک ہلا دینے والے عذاب نے پکڑ لیا۔ اور) اے اہل مکہ، تم پر ان کی بستیوں کا حال ظاہر ہے اور شیطان نے ان کے عمل اچھے کر کے دکھائے۔ اور اس نے (یعنی شیطان نے) ان کو (اللہ تعالیٰ کے) راستہ سے روکا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتے تھے۔

وَقَٰرُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَٰمَٰنَ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مُّوسَىٰ

(۴۰) اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ہم نے عذاب میں گرفتار کیا) اور موسیٰ ان کے

ف ۳۷-۳۸ حضرت شعیبؑ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے پہلے گزرے ہیں اس لئے ان کے ذکر سے خدا تعالیٰ نے نوحؑ سے لیکر موسیٰؑ تک تمام نبیوں کے آنے اور ان کے ماننے والوں کے امتحان میں پڑنے کا ذکر فرما دیا۔

قوم شعیبؑ کا فساد ڈاکے ڈالنے اور بیع و شراء میں تول و ماپ کی کمی کرنے کی صورت میں تھا۔ (دیکھیں ۱۱/۸۵)

ف ۳۹ عاد و ثمود اپنے زمانۂ عروج میں دنیا کے معلم تھے۔ اور ہر اونچی جگہ پر نشان کھڑا کر کے سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کا نام قائم رہے گا۔ (۲۶/۱۲۸-۱۲۹، ۷/۷۵) مگر ان کے انبیاء کی مخالفت کرنے اور ناشائستہ افعال کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ :۔ یعنی تواتر سے برے اعمال بجا لانے کی وجہ سے انہیں اپنا روحانی کوڑھ بھی خوبصورت نظر آنے لگ گیا۔

كَانُوا۟ مُسْتَبْصِرِينَ سے ظاہر ہے کہ انہیں خوب معلوم تھا کہ ان کے اعمال کا نتیجہ اچھا نہیں۔ مگر طاقت نے انہیں مغرور کر دیا۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شیطان کے گمراہ کرنے

بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۚ

پاس کھلے کھلے نشان لے کر آئے تھے۔ پھر بھی (وہ نہ مانے بلکہ) انہوں نے تکبر سے کام لیا اور (ہمارے عذاب سے) بھاگ کر بچ نہ سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

(۴۱) پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لیا۔ سو ان میں سے کوئی تو ایسا تھا کہ ہم نے اس پر پتھروں کا مینہ برسایا اور کوئی ایسا تھا کہ اس کو کڑی اور سخت عذاب نے پکڑ لیا۔ اور کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اس کو ملک میں ذلیل کر دیا۔ اور کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اسے غرق کر دیا۔ اور اللہ (تعالیٰ) ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

(۴۲) ان لوگوں کا حال جنہوں نے اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر اور دوست بنا لیے۔ مکڑی کا سا حال ہے جس نے (اپنے لیے) ایک گھر تو بنایا لیکن گھروں میں سے سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ جانتے۔

ے انسان معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اس کے لیے حقیقت معلوم کرنے کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے (دیکھیں ۹۰/۱۱-۹)

لکھ ہامان فرعون اور قارون کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ مگر ثمود موسیٰؑ کے زمانہ میں مدین میں بس گئے تھے اور وہ عاد ہی کی ایک شاخ تھے اس لیے ان کا ذکر بھی عاد و ثمود کے ساتھ ہی کر دیا ہے۔

۴۱ے فرماتا ہے گناہوں کی پاداش میں سب پکڑے گئے ان میں سے بعض پر ہم نے قوم لوطؑ کی طرح (۸۲/۱۱، ۸۲/۱۵) پتھروں کا مینہ برسایا اور بعض کو (قارون کی طرح ۸۱/۲۸) ملک میں ذلیل کر دیا اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا جیسے قوم نوح یا فرعون غرق ہوئے۔

۴۲ے یہاں فرماتا ہے گذشتہ قوموں کی تباہی کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے بعض خیالی پناہ گاہیں تجویز کر لیں۔ کوئی ہامان کی خوشنودی حاصل کرنے کے پیچھے پڑ گیا کوئی قارون کی اور کوئی فرعون کی۔ ملا خدا کی پناہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پناہ میں آنا ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے مکڑی کا جالا بنا کر

إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(۴۳) اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کو جس کو یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں جانتا ہے اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

(۴۴) اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔ لیکن عالموں کے سوا کوئی ان کو اپنے پلّے نہیں باندھتا۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۴۵) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس میں مومنوں کے لئے ایک بڑا نشان ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ

(۴۶) اس کتاب (یعنی قرآن) میں جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے پڑھ (اور لوگوں کو پڑھ کر سنا) اور نماز کو (اس کی سب شرائط کے ساتھ) ادا کر یقیناً نماز سب بُری اور

سمجھ لینا کہ وہ حوادث زمانہ سے محفوظ رہے گی اسی لیے قرآن نے اتقوا اللہ کہہ کر خدا تعالیٰ کو ڈھال بنانے کی اور حقیقی کارساز سمجھنے کی تعلیم دی ہے۔ مومن کا اصل مقام یہی ہے کہ خدا کی عبادت کرے اور اس سے مدد چاہے (۲؍۵) ہمیں یہ بھی اشارہ ہے کہ محض مذہب کا نام اختیار کر لینا اور عملاً غیر اللہ کی طرف جھکے رہنا ایسی ہی کم عقلی ہے جیسے عنکبوت کا اپنے گھر کو گھر سمجھ لینا۔ مسیح کا قول ہے کہ "درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے" پہچانا تو درخت یوں بھی جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کی قیمت پھلوں سے پہچانی جاتی ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کے دل میں قرب الٰہی کی خواہش پیدا کرنا ہے۔ پس وہی مذہب کا سچا پیرو سمجھا جائے گا جس کے دل میں قرب الٰہی کی سچی تڑپ ہو

۴۳ یعنی وہ بے حقیقت ہستیوں پر انحصار رکھتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی کی اصل راہ یہی ہے۔ کہ عزیز و حکیم خدا سے تعلق رکھا جائے۔

۴۴ اس جگہ عالم سے مراد خشیت اللہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵؍۲۹)

۴۵ اس میں بتایا ہے کہ جیسے مخالفین انبیاء کی تباہی خدا کے عزیز و حکیم ہونے کا ثبوت ہے ویسے ہی پیدائش ارض و سما میں اٹل قوانین کا پایا جانا اور اشیاء میں غیر معتدل خواص کا ہونا بھی اس کا ثبوت ہے۔ ۔ اِلَّا بِالْحَقِّ کے لیے دیکھیں

الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝

ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد یقیناً اور سب کاموں سے بڑی ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

---

۴۳ زمانا ہے پیدائش زمین و آسمان میں مومنوں کے لیے بہت بڑا نشان ہے مگر کافر اس کو نہیں سمجھتے۔ اس لیے تو قرآن لوگوں کو سنا تارہ تاکہ اس کی ہدایت سے لوگ حقیقت کو سمجھیں۔ اصل میں مسلمانوں کا تمام دارومدار قرآن ہی پر ہے۔ یہ ایک روحانی غذا ہے مگر جو اسے پڑھتے تو ہیں مگر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوتی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوتی ہوں۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ۔ قرآن ہی تھا۔ اسی میں سب کچھ آجاتا ہے۔ اس لیے آپ کو یہی کتاب دی گئی اور یہی آپؐ نے لوگوں کو پڑھائی۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ کہہ کر قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے علاوہ اسے ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔ گویا بتایا گیا ہے کہ تبلیغ میں زیادہ زور قرآن کے پیش کرنے پر ہونا چاہیے۔ مگر آیت ولتکن منکم ..... المنکر کے مطابق ضروری ہے کہ ایک امت (یعنی ایسی منظم جماعت جو کسی مرکزی نقطہ کے گرد چکر کھا رہی ہو) ہو جس کا کام ہی تبلیغ کرنا ہو۔ آنحضرت صلعم کے بعد مسلمانوں نے بطور جماعت تبلیغ کی طرف توجہ نہیں کی۔ بلکہ ابتدائی زمانے میں بھی جہاد بالسیف اور تبلیغ کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا جس کے نتیجہ میں اشاعت اسلام بند ہوگئی۔ تلوار سے دل فتح نہیں ہوسکتے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے قرآن کے جہاد کو (بڑے) بڑا جہاد قرار دیا ہے۔ قرآن کا عربی میں نازل ہونا بھی مسلمانوں کے لیے ایک امتحان تھا خدا تعالیٰ دیکھے کہ وہ اسے (ترجمے کروا کر) دنیا میں پھیلاتے ہیں یا نہیں۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ کے مقابعہ اَقِمِ ..... والمنکر کہہ کر ایک تو یہ بتایا کہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کے ساتھ عملی نمونہ بھی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ تلاوت قرآن سے تم دنیا کے خیالات بے شک تبدیل کر سکتے ہو مگر حقیقی پاکیزگی بغیر فضل الٰہی کے نہیں ہوسکتی۔ اور یہ فضل دعاؤں سے ہی حاصل ہوگا اس لیے نمازیں پڑھو اور دعائیں مانگو۔

عبادات کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ بندوں کو خدا تعالیٰ کے قریب کر دیا جائے۔ اور گناہوں سے بچنے کی طاقت پیدا کی جائے اور ایسی عبادت کی طرف ہدایت کرنے والا مذہب ہی سچا ہوسکتا ہے جو یہ اغراض پوری کرے۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں ایسے ذرائع اختیار کئے گئے ہیں جو اس غرض و غایت کو پورا کرنے والے ہیں۔

پہلا ذریعہ:۔ چونکہ جسم کا اثر روح پر پڑتا ہے اس لیے تمام اشکالِ تذلل جن کے اثر سے مختلف المذاق لوگوں کے دلوں میں تذلل پیدا ہوتا ہے نماز میں جمع کر دی گئی ہیں اس لیے انسانی قلب جوش سے بھر جاتا ہے اور خدا کے حضور جھک جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ:۔ دعا کو نماز کا مغز قرار دیا گیا ہے حدیث میں آتا ہے "الدعاء مخ العبادة"۔ اور دعا سے قرب الٰہی اور گناہوں سے نفرت حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا ذریعہ:۔ نماز میں ایسی عبارتیں رکھی گئی ہیں جو خدا تعالیٰ کے احسان جتا کر اس کی محبت پیدا کرتی ہیں اور اس سے قطع تعلق کے نتائج بد سے ڈراتی ہیں جس کے نتیجہ میں انسان پر ایسی انقطاعی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی امر کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کہ نماز کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ تو یہ سمجھے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

اب اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں کہ خدا بعض کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا نہ یہ مطلب ہے کہ آگے پیچھے تو وہ انسان کو نہیں دیکھتا مگر نماز میں دیکھنے لگ جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان اس یقین پر قائم ہو جائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اسی طرح خدا کے دیکھنے کے بھی عام معنے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ تو ہر ایک کو دیکھ رہا ہے صرف نمازی کو نہیں اس لیے اس کے دیکھنے سے مراد حفاظت کرنا ہے اور یہ معنے قرآن سے ثابت ہیں ($\frac{۵۲}{۲۹-۵۰}$) اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو کہ اس کی نماز ایسی درست ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کر سکتا جسے خدا نظر انداز کر دے۔ جیسے حضرت مسیح موعودؑ کا الہام ہے اِنّی معینٌ من اراد اعانتک و انّی مُھینٌ من اراد اھانتک۔

حدیث میں نماز کا اصلی درجہ یہ بیان ہوا ہے کہ انسان سمجھے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے یعنی اس مقام پر وہ خدا تعالیٰ کے سلوک اور اس کے نشانات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ نماز اور دوسری عبادتیں ظاہر کی بھی ہیں اور دل کی بھی اور ان دونوں کا مجموعہ موجبِ برکت ہوتا ہے جبھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو یہ فرمایا کہ قربانی کا گوشت خدا کو نہیں پہنچتا۔ صرف دل کا اخلاص پہنچتا ہے مگر پھر یہ نہیں کہا کہ ظاہری قربانی کرو ہی نہیں۔

محبت کی بڑی علامت یہ ہے کہ انسان اٹھتے بیٹھتے اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے چونکہ نماز بھی خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انسان نماز پڑھے خواہ کیسے ہی حالات ہوں اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ کفر و بے ایمانی کی گرمی میں انسانی روح کو حلاوت ملد

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(۴۶) اور اہل کتاب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظلم کرنیوالے ہوں (ان کو الزامی جواب دے سکتے ہو) اور ان سے کہو کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو تم پر بھی نازل ہوا ہے اس پر بھی اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

نماز کی اپنے - یہ نہیں سوچنا چاہیئے - کہ سفر ہے یا کپڑے گندے ہیں بلکہ کپڑے پاک میسر نہ ہوں تو اسی طرح نماز پڑھ لینی چاہیئے - اور کپڑوں کی ناپاکی کا خیال کر کے دل کو ناپاک نہیں ہونے دینا چاہیئے -

نماز روحانی جسم کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے جس طرح بیمار جسم محض یہ کہکر موت سے نہیں بچ سکتا کہ وہ بیمار ہے اس لیے غذا نہیں کھا سکتا - اسی طرح بیمار جسم یہ کہکر کہ وہ بیمار ہے اس لیے نماز نہیں پڑھ سکتا روحانی موت سے بچ نہیں سکتا -

درستی اخلاق کے لیے سب سے بہتر نسخہ نماز باجماعت ہی ہے انسان کیسا ہی بد ہو جائے اگر وہ نماز باجماعت کا عادی ہے تو اس کی اصلاح کا موقع ہاتھ سے نہیں گیا - جو لوگ بچوں کو نماز باجماعت کی عادت نہیں ڈالتے وہ ان کے قاتل ہیں -

شرائط کی پابندی سے نماز ادا کی جائے تو انسان کو پوشیدہ بدیوں پر اطلاع دی جاتی ہے - اور اسے شیطان کے مقابلہ کی مقدرت عطا ہوتی ہے کیونکہ جب بندہ خدا تعالیٰ کے لیے تذلل اختیار کرتا ہے تو وہ کہتا ہے اسے رفعت دو -

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ :- یعنی بری اور ناپسندیدہ باتوں سے رکنا بھی ایک بڑا مقصد ہے مگر نماز میں جو اللہ کو یاد کیا جاتا ہے یہ اس سے بھی بڑا مقصد ہے -

اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ :- یعنی اللہ تمہارے کاموں سے واقف ہے اس لیے جب تم اسے یاد کرو گے تو وہ بھی تمہیں یاد کرے گا - یہی خطبہ جمعہ میں یہ کلمات پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے - کہ اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ اور قرآن میں ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲) - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر موقعہ کے لیے ذکر تجویز کیا ہے - مگر ذکر حضور قلب سے ہونا چاہیئے -

۴۶ چونکہ قرآنی تبلیغ کے بڑے مخاطب یہود و عیسائی ہی ہو سکتے تھے - اور انہیں تبلیغ کرنے کے نتیجہ میں تورات و انجیل کا قرآن سے مقابلہ ہونا تھا اس لیے اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝

(۴۸) اور اسی طرح پہلی کتابوں کی مصدق بنا کر ہم نے تجھ پر یہ مکمل کتاب (یعنی قرآن کریم) اتاری ہے پس وہ لوگ جن کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں سے (یعنی اہل کتاب میں سے بھی) بعض اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہماری آیتوں کا ضد کے ساتھ انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

(۴۹) اور اس (یعنی قرآن کے نازل ہونے) سے پہلے تو کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا نہ لوگوں کو سناتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا اگر ایسا ہوتا تو جھٹلانے والے شبہ میں پڑ جاتے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

(۵۰) مگر یہ (قرآن) تو کھلی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔ اور ہمارے نشانات کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔

کے حکم کے بعد فرماتا ہے کہ اہل کتاب سے بحث پیش آئے تو مضبوط اور خوبصورت نظر آنے والی بات پیش کیا کرو۔ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ سے قرآن کریم مراد ہے جیسا کہ ۳۹/۲۴ میں وضاحت ہے۔

خاص اہل کتاب کے لیے یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ان کے پاس الہامی کتاب موجود ہے جو خواہ محرّف و مبدل ہی ہو مگر پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ تو کلام الٰہی موجود ہے

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ: یعنی اصولِ ہدایت تو یہی ہے کہ قرآن پیش کرو۔ لیکن اگر مخالف ظالم ہو یعنی مقدسوں پر گند اچھالے تو اسے الزامی جواب بھی دے سکتے ہو۔ اس آیت کی بنا پر حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے عیسائیوں کو الزامی جواب دیئے ہیں بلکہ جب آنحضرت صلعم پر یہ اعتراض ہوا کہ یہ کیسا نبی ہے جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے تو فوراً قرآن نے یہ جواب دیا کہ پہلے نبی بھی ایسی کچھ کرتے تھے۔ پھر بعد کے علماء نے بھی الزامی جواب دیئے ہیں۔

اِلَّا استثناءِ متصل کی بجائے استثناءِ منقطع بھی ہو سکتا ہے۔ اور معنے یہ ہونگے کہ ایسے لوگوں کو سچائی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس لیے ان سے بحث نہ کرو۔

وَقُوْلُوْٓا ...... مُسْلِمُوْنَ: اس طریق کی وضاحت آلِ عمران ۳/۶۵ میں ہے۔ قرآنی تعلیم دیکھو کہ یہود کو جو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے (۵/۸۳) اور انہوں نے ہمیشہ آنحضرت صلعم سے عہد شکنیاں کیں اور طرح طرح کی سازشیں آپؐ کے خلاف کرتے رہے اور عیسائیوں کو جو آپؐ کو کذاب

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝	(۵۱) اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانات نہیں اُترے کہو کہ نشانات تو خدا کے پاس ہیں (جب وہ فائدہ دیکھتا ہے اتارتا ہے) اور میں تو ایک کھلا کھلا ہوشیار کرنے والا ہوں۔
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ع ۵	(۵۲) کیا ان کے لیے (یہ نشان) کافی نہ تھا کہ ہم نے تجھ پر ایک مکمل کتاب (یعنی قرآن) کو نازل کیا۔ جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس امر میں مومنوں کے لیے تو بڑی رحمت اور نصیحت کے سامان ہیں۔

سمجھتے تھے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اشاعت توحید کی دعوت دی ہے۔

۴۸ کافر منکر صداقت کو کہتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ مشرک بھی ہو۔ (تفسیر صغیر)

۴۹-۵۰ تلاوت دو طرح ہوتی ہے ایک کتاب دیکھ کر پڑھنے سے دوسرے کسی بات کو دہرانے سے اور یہاں دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ قرآن میں کتاب کا استعمال کتابوں میں سے ہمیشہ کتب سماویہ کے متعلق ہوتا ہے۔ مخالف اعتراض کرتے تھے کہ آپ تورات و انجیل کی باتیں دہرا دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا۔ کہ اول تو اس نے کتب سماویہ پڑھی نہیں۔ دوسرے جو آیات یہ پیش کرتا ہے ھو اٰیٰت بَیِّنٰتٌ ..... العلم۔ وہ آیات بینات ہیں۔ اور ان امور پر مشتمل ہیں جن سے پہلی کتب خالی ہیں۔ علم رکھنے والے فوراً دلوں میں محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ پھر یہ پہلی کتب کی نقل کیسے ہو سکتا ہے۔

۵۱-۵۲ فرمایا وہ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ نشان (یعنی عذاب) کیوں نہیں آیا۔ کیا یہ نشان کم ہے کہ ہم نے تجھ پر ایک کامل کتاب اُتار دی ہے۔ ر

یتلٰی علیھم یعنی یہ وہ کنواں ہے جو خود پیاسوں کے پاس آیا ہے اور یہ وہ استاد ہے جسے بَلِّغْ کا حکم ہے (رش)

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً: دوسری جگہ آنحضرتؐ کا نام رحمت اور رسول کریم رکھا گیا ہے۔

وَذِکْرٰی: یعنی (۱) اس میں نصیحت کی باتیں ہیں۔ (۲) جو اس پر سچے دل سے ایمان لائیں گے ان کا ذکر نیک دنیا میں جاری رہے گا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں عربی میں سات کا عدد کثرت کے لیے بھی آتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ تھا کہ دنیا میں سات (یا کئی) بڑے بڑے عقلی اور علمی تغیرات آئیں گے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (۵۳) تو کہدے میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ فیصلہ کرنیوالا
شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ — اللہ ہی کافی ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین
وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — میں ہے اسے وہ جانتا ہے اور جو لوگ باطل پر عمل کرتے
بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ — ہیں اور اللہ (تعالے) کے احکام کا انکار کرتے ہیں
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ — وہی گھاٹے میں پڑنے والے ہیں۔
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ (۵۴) اور وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کی خواہش کرتے ہیں
وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ — اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو عذاب ان کے پاس آجاتا
الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً — اور اب بھی وہ انکے پاس ضرور (آئیگا اور) اچانک آئیگا
وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ — اس حالت میں کہ وہ جانتے بھی نہ ہونگے۔
يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ (۵۵) (اور) وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کا مطالبہ کرتے
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ — ہیں۔ اور جہنم کافروں کو یقیناً تباہ کرنے
بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ — والی ہے۔
يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ (۵۶) (جس دن کہ جہنم کا عذاب کافروں کو گھیر کر تباہ کردے گا)

اور ہر تغیر کے زمانہ میں خدا تعالٰے قرآن کے ایسے معنی کھول دیگا۔ جو اس وقت کے لوگوں کو تسکین دینے والے ہوں۔ چونکہ قرآن میں یہ کمال ہے کہ اس میں تھوڑے سے الفاظ میں ہزاروں مضامین بیان کردیئے گئے ہیں اس لیے اس کے معارف و حقائق کا خزانہ ختم نہیں ہو سکتا (۱/۳۰ ع)۔ اور جس طرح زمین کے دنیوی ایجادات کے اور قانون قدرت کے خزانے ختم نہیں ہوتے اس طرح کلام الٰہی کے خزانے بھی ختم نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ مجید خدا کا کلام ہے جو کل یوم ھو فی شأن ۵۵/۳۰ کا مصداق ہے اسلئے وہ تمام معنے جنکی عقل سے اور قرآن کی دوسری آیات سے اور لغت سے تائید ہوتی ہو وہ درست ہونگے۔

۵۳ یعنی خدا تعالٰی تو قرآن کے ذریعہ ایک بہت بڑا نشان دکھا چکا ہے لیکن تم اس کا انکار کرو اور عذاب ہی کا نشان دیکھنا چاہو تو وہ یہ نشان بھی دکھا دیگا اور جھوٹا فنا ہو جائیگا۔

۵۴ [فرمایا اگر اس نے ایک وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو عذاب بھی آجاتا۔ اب بھی وہ آئیگا تو سہی مگر اچانک آئیگا اور ایسی حالت میں آئیگا کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی جیسے فتح مکہ کے وقت ہوا]

۵۵ متواتر ایک مطالبہ کے دہرانے سے ظاہر ہے کہ ایک مطالبہ دنیوی عذاب کے متعلق ہے اور دوسرا اُخروی عذاب کے متعلق۔ چنانچہ دوسرے مطالبہ کے بعد جہنم کا بھی ذکر ہے۔

۵۶ من فوقھم میں ہر قسم کا آسمانی عذاب اور من تحت ارجلھم میں ہر قسم کے زمینی عذاب

فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

(یہ وہ دن ہوگا کہ) خدائی عذاب ان کے اوپر سے بھی انہیں ڈھانک لیگا۔ اور ان کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر بھی ان کو گھیر لیگا اور (خدا) کہیگا اپنے عملوں کا نتیجہ چکھو۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝

(۵۷) اے میرے مومن بندو! میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی عبادت کرو۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝

(۵۸) ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر ہماری طرف ہی تم سب کو لوٹایا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝

(۵۹) اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں ہم ان کو جنت میں بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ (ایسی جنت میں) کہ اس کے (سایوں) تلے نہریں بہتی ہوں گی وہ (یعنی مومن) ان جنتوں میں ہمیشہ کے لیے رہتے چلے جائیں گے اور اچھے عمل کرنیوالوں کا اجر بہت اچھا ہوتا ہے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝

(۶۰) ان (مومنوں) کا جو (اپنے عقیدہ اور عمل پر) جمے رہتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

شامل ہیں۔

۵۷-۵۸ ان آیات میں نصیحت کی گئی ہے کہ خدائے واحد کا نام ہر جگہ پھیلاؤ اگر ایک ملک تمہیں امن نہیں دیتا تو خدا کی زمین وسیع ہے اس سے اگلے میں چلے جاؤ اور صرف میری عبادت کرو اس بات سے نہ ڈرو کہ تبلیغ کے نتیجہ میں لوگ تم پر جینا دوبھر کر دیں گے ایک دن سب نے مرنا ہے اور خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اگر تم گھروں میں مر گئے تو کیا فائدہ۔ مومنوں کو چاہیئے۔ کہ وہ خدا کے لیے وطن چھوڑنے کو ہر دم تیار رہیں۔ اور باہر جا کر روحانی نو آبادیات بھی قائم کریں۔

۵۹-۶۰ سیاق کی روشنی میں یہاں عمل صالح سے مراد خدا تعالیٰ کے لیے وطن چھوڑنا اور جان قربان کرنا ہے یہاں جنتیوں کے بالاخانوں کے نیچے نہریں بہنے کا ذکر ہے۔ ۲/۲۲ میں باغات کے نیچے بہنے کا اور اعراف ۴۴ میں مومنوں کے نیچے بہنے کا۔ دراصل پانی کی ایک خصوصیت زندگی بخشنا ہے الانبیاء ۳۵ اور قرآن نے ۴/۱۲۳، ۱۳/۲۴ اور ۳۹/۲۱ میں جنتی انسانوں، باغات اور غرف تینوں کو ہمیشہ قائم رہنے والے بتایا ہے اور ۲۱/۳۱ میں بھی فرمایا ہے کہ جَعَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ پانی کی دوسری خصوصیت جسم کو پاک بنانا ہے ۲۵/۴۹ اور ۵۶/۲۶-۲۷ سے ظاہر ہے کہ جنتی لغویات اور گناہوں

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۶۱) اس دنیا میں بہت سے جانور بھی ہیں جو اپنے ساتھ (انسانوں کی طرح) اپنا رزق نہیں اٹھائے پھرتے اللہ ہی ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی اور وہ بہت دعائیں سننے والا (اور) حالات سے خوب آگاہ ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (۶۲) اور اگر تو ان لوگوں سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو (بغیر مزدوری کے) کس نے انسانوں کی خدمت میں لگایا ہوا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ نے (پھر جب وہ یہ بات جانتے ہیں) تو کس طرف کو بہکے جا رہے ہیں:

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (۶۳) اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق پھیلاتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ (۶۴) اور اگر تو ان سے پوچھے کہ بادل سے کس نے

سے پاک رہیں گے اس لیے تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے معنے قائم رکھنے اور پاک ٹھہرانے کے ہونگے۔

۶۱ تیسری شکل جو کمزوروں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں زندگی وقف کرینگے تو کھائیں گے کہاں سے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دنیا کی ان گنت مخلوق کو رزق دے رہا ہے کیا وہ تمہیں رزق نہیں دے سکتا وہ سمیع و علیم ہے وہ تمہارے حالات کو جانتا ہے اگر تم اس کو پکارو گے تو وہ تمہاری سنے گا۔

۶۲ اب پھر اصل تبلیغ کے مضمون کی طرف رجوع کر کے بتاتا ہے کہ منکرین توحید کو کیا دلائل دینے چاہئیں۔ وَلَئِنْ ...... وَالْاَرْضَ میں یہ اشارہ ہے کہ دشمن سمجھتا ہے کہ تم بے سروسامان ہو غلبہ کیسے پاؤ گے تو اس سے پوچھ کہ زمین و آسمان کو کس نے بنایا ہے جو خدا بغیر مرئی سامانوں سے یہ سارا کارخانہ چلا سکتا ہے کیا وہ مسلمانوں ہی کو غالب نہیں کر سکتا۔

۶۳ اس میں مخالفوں کو تنبیہہ ہے کہ تم دنیا کی دولتوں اور حکومتوں پر فریفتہ ہو خدا تعالیٰ کفر و دنیا کو طاقتور اور بادشاہوں کو فقیر بنانے پر قادر ہے وہ تم سے چھین کر مسلمانوں کو دیدے گا اور تم پہ رزق تنگ کر دیگا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ یعنی خدا تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ (۶۴) پانی اتارتا ہے؟ اور پھر اس کے ذریعے زمین کو
الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا مرنے کے بعد زندہ کیا ہے؟ تو وہ کہیں گے یقیناً
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ اللہ نے۔ تُو کہہ دے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے
لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ لیکن ان (یعنی انسانوں) میں سے اکثر نہیں سمجھتے۔
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ (۶۵) اور یہ ورلی زندگی صرف ایک غفلت اور کھیل
اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَاِنَّ کا سامان ہے۔ اور اخروی زندگی کا گھر ہی
الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ درحقیقت اصل زندگی کا گھر کہلا سکتا ہے۔
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

رکوع ۲ — اوقف لازم

مسلمانوں میں زندگی کے اور کفار میں موت کے آثار پائے جاتے ہیں اس لیے وہ مسلمانوں ہی کو ترقی دے گا۔

۶۴ اس میں بتایا ہے کہ وہ اقوام جن سے تمہارا مقابلہ ہوگا وحی کی بھی منکر ہوں گی اس لیے انہیں اس طرح پر سمجھانا کہ جو خدا ساری زمین کی پیاس بجھانے کے لیے بارش برساتا ہے اس نے دلوں کی زمین کو زندہ کرنے کے لیے بارش برسائی ہے مگر تم نے پھر بھی عقل سے کام نہیں لیا۔ اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ جیسے بارش کے نتیجہ میں دیرپا درخت ترقی کرتے ہیں ویسے جلد سڑ جانے والی گھاس بھی ترقی کرتی ہے پس تمہیں چاہیے کہ محمد رسول اللہ پر ایمان لا کے پھل دار درخت بنو۔ تھوہر کے درخت نہ بنو۔

۶۵ لَهْوٌ۔ سے مراد غفلت پیدا کرنے والی چیزیں ہیں اور لَعِبٌ سے مراد کھیل کود کا رنگ رکھنے والی چیزیں۔ قیام زندگی کے لیے کام اور آرام دونوں ضروری ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے کہ کبھی آرام کرنا (تا نئی طاقت حاصل ہو) اور کبھی دنیوی کاموں میں مشغول ہونا دونوں ضروری کام ہیں۔ اور اسلام اس کی اجازت دیتا ہے مگر اصل زندگی آخرت کی ہے اور یہ زندگی اس کے لیے ایک زینہ ہے اگر سارا وقت لہو ولعب میں مستغرق رہو گے تو اصل مقصد تباہ ہو جائے گا۔

یہاں توکل کا یہ سبق بھی دیا ہے کہ جب دنیوی زندگی محض لہو ولعب ہے تو نہ کروڑوں ملنے پر مال کی ناجائز محبت پیدا ہونی چاہیے نہ فاقے آنے پر خدا تعالیٰ سے شکوہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ کھیل میں انسان کے بادشاہ یا فقیر بننے سے فرق نہیں پڑتا۔

اس میں کفار کو بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر تم دنیا کو محض لہو ولعب سمجھتے اور جانتے کہ اُخروی زندگی ہی اصل ہے تو اسلام پر ایمان لے آتے مگر تم نے دارِ آخرت پر دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۙ

(۶۶) اور جب وہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنی عقیدت کو خالصۃً (اللہ تعالیٰ) کیلئے کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں مگر جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دیکر پہنچا دیتا ہے تو اچانک پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں تاکہ ہم نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) جو کچھ انہیں دیا ہے اس کا انکار کر دیں اور (اس انعام کو خدا کے سوا دوسرے شریکوں کی طرف منسوب کر دیں)

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

(۶۷) اور اس (عارضی تو بہ) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ انکو چھوڑ دیتا ہے اور) وہ ایک عرصہ تک دنیوی سامانوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں پس (ایک دن یہ بخشش ختم ہوجائیگی اور) وہ (اپنی حقیقی جزا کو) دیکھ لیں گے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ۝

(۶۸) کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہم نے حرم (یعنی مکہ) کو امن کی جگہ بنا دیا ہے۔ اور ان لوگوں کے اردگرد سے (یعنی مکہ کے باہر سے، لوگ اُچک لئے جاتے ہیں۔ تو کیا وہ جھوٹ پر تو ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ۝

(۶۹) اور جو شخص (اللہ تعالیٰ) پر جھوٹ باندھ کر افترا کرتا ہے اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے یا (اس سے) جو سچی بات کو اس وقت جھٹلاتا ہے جب وہ اسکے پاس آجاتی ہے کیا ایسے کافروں کی جگہ جہنم میں نہیں ہونی چاہیئے؟

۶۶-۶۷ یہ مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جب تک انسان کو دوسرے ذرائع نظر آتے ہیں باوجود اس کے کہ وہ سب ہی خدا کے مہیا کردہ ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا لیکن جب کوئی اور سہارا نہ رہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نظر اٹھتی ہے لیکن جب خدا وہ آفت دور کر دیتا ہے تو وہ پھر اسے غیروں کی طرف منسوب کرنے لگ جاتا ہے۔ فرماتا ہے وہ کب تک ایسا کریں گے ایک دن وہ ان مواقع سے بھی محروم ہوجائیں گے۔

۶۸ اس میں بتایا ہے کہ امن انہیں کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان لا کر بیت اللہ سے سچا تعلق رکھتے ہیں باقی سب دنیا میں بدامنی پائی جاتی ہے یہ امن جو انہیں ملا ہے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے نتیجہ میں ہے (۱/۱۲۷) مگر ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے توحید کی تعلیم دی تھی نہ کہ شرک کی (۱/۱۲۶) پھر ان کا باطل کی طرف جھکنا کتنا شرمناک ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ؏

(۷۰) اور وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کو ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشیں گے اور اللہ تعالیٰ یقیناً محسنوں کے ساتھ ہے۔

---

۶۹ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا یعنی وہ ایسا افترا کرے جس کی بنیاد کسی الہام پر نہیں بلکہ جھوٹ پر ہے دیکھیں ۶/۹۴، ۶/۲۰، ۷/۱۲۱) فرماتا ہے کہ کفار بھی ایک طرف تو خدا پر بہتان باندھتے ہیں دوسری طرف سچائی کو جھٹلاتے ہیں ناکامی کی موت کے سوا ان کے لئے کچھ مقدر نہیں۔

۷۰ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اس میں بتایا ہے کہ رب العالمین نے سب انسانوں کے لئے اپنی محبت کے دروازے کھول دیئے ہیں اس لئے اگر کوئی خدا کو نہ ماننے والا چاہے، کہ اگر دنیا کا کوئی خدا ہے تو اسے اس کا علم حاصل ہو جائے تو وہ صدق دل سے دعا کرے (اور کم از کم چالیس دن کرتا رہے) تو ضرور خدا تعالےٰ اس پر ظاہر ہو جائیگا۔ یا اگر کوئی کسی دین کی صداقت معلوم کرنے کی دعا کرے تو اس پر بھی حق کھل جائے گا۔

اس طرح اس میں مومنوں کو بتایا ہے کہ اگر وہ سچے دل سے حصول قرب الٰہی کی کوشش کرتے رہیں۔ تو اللہ تعالےٰ انہیں اپنے قرب کے غیر متناہی راستوں پر چلاتا چلا جائے گا۔ اور ان کے دامن کو گوہرِ مقصود سے بھر دے گا۔

اسی طرح اس میں دعاؤں کی قبولیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور بتایا ہے کہ اگر کوئی صدق دل سے دعا کرتا رہے تو ہم اس کے لئے ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں

اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ صرف منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ لینا کافی نہیں۔ قرب الٰہی کے راستے صرف اسی پر کھلتے ہیں جو سچی محبت اور تڑپ سے کام لیتے ہیں۔

اس میں حصول اطمینان قلب کا طریق بھی تبلایا ہے اطمینانِ قلب دو طرح ہی ہو سکتا ہے یا اس طرح کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو پوری ہو جائے یا اس طرح کہ تمام لغو خواہشات مٹ جائیں۔ قرآن پہلے بتاتا ہے کہ پیدائش انسان کا مقصد صفات الٰہیہ کو اپنانا ہے اور پھر تبلایا ہے کہ جو اس کے لئے کوشش کرے گا۔ ہم ذمہ دار ہیں کہ ان کو یہ مقصد حاصل ہو جائے گا

بے شک بعض لوگ دنیاوی کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں اور ان کو کسی قدر اطمینان قلب بھی حاصل ہو جاتا ہے لیکن ان کا اطمینانِ قلب مقاصد عالیہ کا پورا ہونا نہیں ان کو بھلا دینا ہوتا ہے وہ فکری کا انبوں کے شکار ہوتے ہیں۔

۶/۱۵۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا ایک ہی راستہ ہے اور شیطان کے کئی راستے ہیں مگر سُبُلَنَا

میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے بھی کئی راستے ہیں۔ سو جاننا چاہیئے۔ کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ قرب الٰہی کے لئے مختلف مذاہب کے پیچھے چلنے کی ضرورت نہیں اسلام ہی پر چلنا کافی ہے۔ اور سُبُلَنَا کا یہ مطلب ہے کہ روحانی ترقیات کے غیر محدود راستے ہیں۔

[اس آیت سے یہ استدلال کہ ہر مذہب پر چل کر خدا مل سکتا ہے غلط ہے کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع حصول محبت الٰہی کے لئے ضروری ہے (دیکھیں آیت قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ ۔۔۔۔۔)]

محسن کے معنے اس شخص کے ہیں جو حکم کو تمام شرائط کے ساتھ پورا کرے اس لئے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ میں بتلایا ہے کہ جب لوگ ہمارے مندرجہ بالا حکم پر عمل کریں گے ہم ان کے ساتھ ہونگے اور ہر میدان میں ان کو کامیاب کریں گے ؎

تصحیح

صفحہ	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۲۰	۱۹	اس	وہ
۳۳	۲	×	اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائے جائیں۔
۹۵	۱۳	جمعہ	الجمعۃ ۶۲/۲
۹۸	۱۷	ذوالکفل	ذالکفل
۱۱۱	۵	بنی نوع	بنی نوع انسان
۱۱۳	۱۱	اسلامی توحید	اسلامی نظریہ توحید
۱۱۵	۱۱	شعائر	شعائر اللہ
۱۴۱	۱	×	مخزن معارف سورۃ التین صفحہ ۹۴
۱۴۱	۴	کشتی میں	کشتی کی صورت میں
۲۱۳	۹	مادی بنیاد	ساری بنیاد

جلد سوم

صفحہ	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۵۳	سطر نوٹ ۸	لوط	صالح

صفحہ ۱ تا ۲۰۷ ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے اور باقی حصہ خالد پرنٹنگ پریس سرگودھا سے چھپوا کر مؤلف نے ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا۔

شریعت

شیطان

صراط مستقیم

طاعون

عائشہؓ

عباد الرحمٰن

عبادت

عذاب

عمل

کامیابی

کشف

کفار

کفّارہ

کفارہ کے بنیادی اصول اور ان کا رد ص۲، شریعت لعنت نہیں ص۲، انسان فطرتًا نیک ہے ۲/۲۲، مسیح سے پہلے بھی کئی لوگ نیک ہوئے ص۶، جب تین اقنوم تھے پھر مسیح کے ذمہ کفارہ کیوں لگا ص۶، نجات دہندہ ہونے کا دعویٰ صرف مسیح کا نہیں ص۶، بائیبل کی رُو سے گناہ معاف ہو سکتا ہے پھر کفارہ کی کیا ضرورت ہے ص۷، کیا کفارہ کے لئے مسیح کو ابن اللہ ماننا ضروری ہے؟ نہیں ص۷، کیا مسیح ابن اللہ تھا؟ — نہیں ص۷، کیا مسیح میں خدائی طاقتیں تھیں؟ ص۸، مسیح صلیب پر خوشی سے نہیں چڑھا ص۸، کیا مسیح آدم کے گناہ سے پاک تھا؟ ص۸ اگر گناہ ورثہ میں آتا ہے تو مسیح دوسروں سے زیادہ گناہ کے قریب تھا ص۹، اگر مسیح ابن اللہ تھا تو باپ سے بھی گناہ کا ورثہ نہ لیتا پھر اسے بے باپ کیوں پیدا کیا گیا ص۹، کیا صلیب پانے سے مسیح دنیا کا کفارہ ہو سکتا تھا؟ ص۹۔ دوزخ میں کون گیا تھا ابن اللہ یا ابن آدم ص۹، مسیح نے وہ قربانی پیش نہیں کی جو کفارہ کے لئے ضروری تھی ص۱۰، مسیح صلیب پر مرا ہی نہیں ص۱۱، مسیح واقعہ صلیب کے بعد کشمیر آئے ص۱۳، مسیح نے کسی کا بوجھ نہیں اٹھایا ۵۲/۹، ورثہ کے گناہ کا مسئلہ غلط ہے کیونکہ (۱) آدم ہی نے گناہ نہیں کیا (۲) آدم کیسے گناہگار ہو سکتا تھا ص۴، آدم کے بعد بھی بیگناہ لوگ ہوئے ص۵، آدم کا سارا واقعہ تمثیلی ہے ص۵، بخشنا عدل الٰہی کے خلاف نہیں ۲۱/۱۹،

کلمۂ طیّبہ

چار اجزائے روحانی کا مجموعہ ۱۵۸/۱۱۷، بارش کے ساتھ بعثت انبیاء کی مشابہت ۲۹۲/۶۱، ابراہیمؑ اور نوحؑ کے درمیان کئی نبی گذرے ہیں ۳۴۳/۱۹، ایک وقت سب

بستیوں کی طرف رسول نہ بھیجنے کی وجہ ۲۱۰/۵۰-۴۹، سنت اللہ یہی ہے کہ انبیا کو شریف خاندانوں سے پیدا کرتا ہے۔ ۲۲۰، عہدہ نبوت کے لئے کوئی خاص عمر مقرر نہیں ۳۰۸/۱۵،

قرآن

قرآن رحمت و بشارت ہے لعنت نہیں ۵۳/۹۸، نزول قرآن کا مقصد — لوگوں کو مقرب الٰہی بنانا ۵۵/۴، نزول قرآن صفت رحمانیت کے ماتحت ہوا ۵۶/۹ قرآن میں کتب سابقہ کی تمام صداقتیں بھری ہیں ۹۰/۵۱-۴۹، قرآنی بیان قصے نہیں پیشگوئیاں ہیں ۱۹۷/۱۷، قرآن کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کی وجہ ۳۰۶-۳۰۵/۳۴-۳۳، قرآن کی ایک فضیلت ..... پہلے انبیاء کی کتب میں اس کا ذکر ہے ۲۶۴/۱۹۷، قرآنی آیات کے ایک معانی انفرادیت کے لحاظ سے اور ایک سیاق و سباق کے لحاظ سے ہوتے ہیں ۲۶۸/۲۲۰، قرآن کا بکثرت پڑھے جانے میں کوئی کتاب مقابلہ نہیں کرتی، ۲۷۱/۲، کتاب مبین میں یہ اشارہ کہ اکثر لوگ قرآن کے کتاب ہونے سے فائدہ اٹھائیں گے اس لئے مسلمانوں میں تعلیم کا رواج چاہیئے ۲۷۲، کتاب کہلانے کی مستحق کتاب کونسی ہے ۲۷۳، قرآن ہدایت کامل اور بشارت ہے مگر صرف منہ سے اظہار ایمان کرنیوالوں کے نہیں ۲۷۳، قرآن کے پاک ہونے کا ثبوت ۲۲۷/۳، کتاب مبین کی شناخت ظاہری دلائل کے علاوہ فطرت صحیحہ اور ضمیر کی آواز ہے ۲۲۹/۳، آیت بسم اللہ کے متعلق مسروقہ ہونے کا اعتراض اور اس کا جواب ۲۸۳/۳۲-۳۰، قرآن کے بعد بھی آیات اللہ کا نزول ہوتا رہے گا ۳۳۵/۸۸، قرآن کے عربی میں نازل ہونے میں مسلمانوں کا ایک امتحان ۳۵۲/۴۶، تبلیغ میں زیادہ زور قرآن پیش کرنے پر ہونا چاہیئے، ۳۵۲/۴۶، تلاوت کی دو قسمیں ۳۵۶/۵۰-۴۹، قرآن کریم کے سات بطن ہیں ۳۵۶/۵۲-۵۱، قرآنی معارف کا خزانہ ختم نہیں ۳۵۶/۵۲،

بقیہ فہرست

قربانی

قیامت

لقائے الٰہی

مساجد

مسلمان

مریمؑ

مسیحی

معبودانِ باطلہ

مومن

نظام

نیکی

وحی

انسان کبھی وحی کے بغیر نہیں رہا صلا۵۴ ، الہام ہر قسم کے لوگوں کی رُوحانی غذا ۶۳/۵۵ ، روحانی پانی کی ضرورت ۸۶/۳۱ ، الہام کے بغیر عقل کافی نہیں ۱۳۸/۲۳-۲۲ ، اللہ تعالیٰ جس سے خفا ہوتا ہے صرف اس سے کلام نہیں کرتا۔ ۱۵۶/۱۱۲-۱۰۶ ، روحانی پانی سے بھی لوگ بقدر استعداد فائدہ اٹھاتے ہیں ۱۸۱/۴۶ ، فطرتِ صحیحہ الہام کو کھینچتی اور الہام فطرتِ صحیحہ کو ابھارتا ہے ۲۲۴/۱۳ ، دل کا ہر خیال وحی نہیں ہوتا ۲۶۴/۱۹۵ ، پوری پاکیزگی کے بغیر الہامات کی طرف دل لگانے کا نتیجہ..... اضغاث احلام ۲۶۶/۲۲۴ ، مکالمات الٰہیہ کی اپنے نفس سے خواہش ظاہر نہیں کرنی چاہیئے۔ ۲۶۹/۲۲۴ ، منکرین وحی کو سمجھانے کا طریق ۲۷۰/۴۴ ،

ہامان

کے متعلق قرآنی بیان ہی صحیح ہے۔ ۳۰۵-۳۰۶/۷

ہدایت

ہدایت و کفر کے ادوار کا بدلنا ضروری ہے ۱۸۱/۴۵ ، ہدایت صرف فضل الٰہی سے ملتی ہے ۱۸۲/۴۷ ، تربیت و اصلاح کے لئے ضروری امور ۲۶۷/۲۲۰-۲۱۸ ، کامل ہدایت کا یہ مطلب نہیں کہ اسے مان لیں ۲۹۸/۸۲-۸۱ ، جبراً ہدایت نہیں دی جاتی ۳۴۳/۱۹

یاجوج ماجوج

کے غلبہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اٹھانے کا الٰہی فیصلہ ۱۰۱/۹۷-۹۶ ، مومن یاجوج ماجوج کے عذاب کی بھنک بھی نہیں پائیں گے ۱۰۲/۱۰۳-۱۰۲ ، اجاج سے یاجوج و ماجوج دونوں مراد ہیں ۳۱۱/۵۴ ، سب سے بڑا فتنہ ، فتنۂ دجال ۷۱۲/۵۴

یہود

یہود کا بیت المقدس میں واپس آنا صداقتِ اسلام کا ثبوت ہے ۱۰۳/۱۰۸-۱۰۶ ، یہود فلسطین پر قابض ہوگئے تو عبادالصالحین کے قبضہ کا کیا ہوا؟ ۱۰۴/۱۱۱ ، یہود کے ارضِ مقدس پر قبضہ سے مسلمانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۱۰۴/۱۱۳ ،

متفرق

روحانی دنیا میں بے جان چیزوں کا باتیں کرنا ۴۹/۸۳ ، بعض حالات میں تدبیر کی ممانعت ۵۰/۸۵ ، اصل مال وہی ہے جو الٰہی بنک میں جمع ہو ۴۸/۷۶ ، نباتات کے بھی جوڑے ہیں ۶۳/۵۵ ، ہر وقت زیادتی علم کی دُعا چاہیئے۔ ۴۴/۱۱۵ ، فرشتوں کے حکم میں اہل زمین بھی شامل ہوتے ہیں ۶۵/۱۱۷ ، من و سلویٰ کے متعلق بائیبل و قرآن کا اختلاف ۶۷/۶۸-۶۷ ، ایمان کے مقابل پر ہر چیز ہیچ ہوتی ہے ۶۶/۷۷-۷۳ ، پیدائش ، موت اور بعثتِ ثانی کا تعلق زمین ہی سے ہے ۶۳/۵۶ ، فرعونِ مصر کی حکومت انگریزوں کی ہند میں حکومت کے مشابہ تھی ۶۳/۵۹ ، جائز مقصد کے لئے ناجائز ذرائع ناجائز ہیں ۶۴/۶۵ ، چندے مانگنے کی وجہ ۸۰/۱۳۳ ، نیکی بدی کی لہریں ۸۲/۱۴-۱۲ ، انسانی فطرت میں جلد بازی ہے ۸۷/۳۸ ، ہر صدی کے سر پر مجدد آنے کی پیشگوئی ۹۳/۷۴ ، خدا تعالیٰ انسان سے اس کی حسب طاقت ہی امید کرتا ہے ۱۳۶/۶۳ ، حلال و طیب غذا کے استعمال میں حکمت ۱۴۵/۵۲ ، جزا سزا میں بھی معذوریوں کا لحاظ رکھا جائیگا صد۱۴۷ ، عربی نام اشیاء کی علامت اور امتیاز پر دلالت کرتے ہیں صد۱۲۹ خواہ سمجھ نہ آئے احکام الٰہی کی اتباع کا حکم ہے ۱۲۸/۷۸ ، صرف منہ کا ایمان کافی نہیں ۱۲۸/۷۹ ، الٰہی جماعتوں کی ترقی کے گُر ۱۲۸-۱۲۷/۷۸ حب الوطنی کی جنگ دو اسلامی حکومتوں میں بھی ہوسکتی ہے ۱۱۹/۴۸-۴۷ ، اسلام کا روحانی باغ ہمیشہ تازہ پھل

دیتا رہے گا ۱۳۸/۲۱ ، انسان فطرتاً ایک بالا طاقت
کا احساس رکھتا ہے ۱۳۸/۲۳-۲۲ ، دشمن سے معاملہ عفو
چاہیئے یہ ڈر نہیں چاہیئے کہ وہ دوبارہ شرارت نہ کریں
۱۵۳/۹۷ ، ارواح کا بھی آپس میں تعلق ہوتا ہے ۱۵۹/۲۰
رفع کے معنے اونچا کرنا۔ حفاظتی نقطہ نگاہ سے بعض
اہم اوقات ۱۸۹/۶۰-۵۹ ، یہ غلط ہے کہ بزرگ کھانے سے
مستغنی ہوتے ہیں ۱۹۷/۱۰-۸ ، احکام الٰہی ماننے اور نہ ماننے
کے نتائج ۱۹۲/۶۵ ، ابتلاء کھوٹے اور کھرے میں امتیاز
کے لئے ہوتے ہیں۔ ۲۰۱/۲۱ ، کفار کے نزدیک صداقت
کا ثبوت ۲۰۲/۲۲ ، گندے ہم جلیس موجب تباہی ہوتے ہیں
۲۰۳/۲۴ ، تمدن انسانی ترقی کا بڑا ذریعہ ازدواجی تعلقات
۲۱۲/۵۵ ، قبول مذہب کی ہر اک کو آزادی ہے ۲۱۳/۵۸ ،
عرش سے مراد ۲۱۴/۶ ، ایک مسرت روحانی بھی ہوتی ہے
۲۱۶/۶۴-۶۳ ، روحانی رات اور دن کو یکے بعد دیگرے
لانے میں حکمت۔ ۲۱۷/۶۳ ، نعماء الٰہی کا شکر ادا کرنے کا
فائدہ ۲۲۶ ، زندگی ہمیشہ عشق نے پائی ہے ۲۲۹/۴
نشانوں میں کسی قدر اخفاء رکھنے میں حکمت ۲۳۰/۵
تقدیر اور تقوی میں مناسبت ۲۳۲/۱۳-۱۲ ، چیزوں کی
ابتداء کو نہیں انتہاء کو دیکھا جاتا ہے ۲۳۴/۱۹
روحانی بادشاہت کی انگوروں سے تشبیہ ۲۴۲/۵۲-۴۹
دشمن کے حملہ کی کبھی تمنا نہ کرو ۲۴۹/۷۸-۷۴ ، کوئی
چیز فی ذاتہ نقصان دہ نہیں نقصان دہ غلط
استعمال ہوتا ہے ۲۴۷/۸۱ ، انسان کو ہر لمحہ خدائی
مدد کی ضرورت ہوتی ہے ۲۴۸/۸۳ ، شعور علم اور
عقل میں فرق ۲۵۴/۱۱۴-۱۱۳ ، حصول عزت کا طریق —
تقویٰ ہے ۲۵۸/۱۵۳-۱۴۲ ، نفرت بدی سے چاہیئے نہ کہ
بد دل سے ۲۶۰/۱۶۹ ، عاد کے زمانہ میں آلاتِ جنگ
کی حیرت انگیز ایجادات ۲۵۹/۱۳۳-۱۲۹ ، توپیں چاہیں تو
ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہیں ۲۹۴ ، یہ غلط ہے کہ روپیہ
صرف بے ایمانی سے ملتا ہے ۳۹۴/۱۸۲ ، قارون فرعون
کے خزانہ کا افسر تھا ۳۲۹/۷۷ ، صبر کی دو قسمیں ۳۳۲/۸۱
مجرموں کی تائید بھی موجب سزا بنا دیتی ہے ۳۳۳/۸۳
جو چیز اپنی غرض پیدائش کو پورا کرتی ہے۔ وہ
موجود رہتی ہے ۳۳۶/۸۹ ، صلاحیت کی دو قسمیں
۳۴۱/۱۰ ، ثمود عاد ہی کی ایک شاخ تھے ۳۵۰/۴۰
گزشتہ اقوام کی تباہی کی وجہ ۳۵۰/۴۲ ، محض مذہب
کا نام اختیار کر لینا کافی نہیں ۳۵۱/۴۴ ، امن کن
کو حاصل ہے ۳۶۱/۶۸ ، حصول اطمینان قلب کا
طریق ۳۶۲/۷۰ ۔